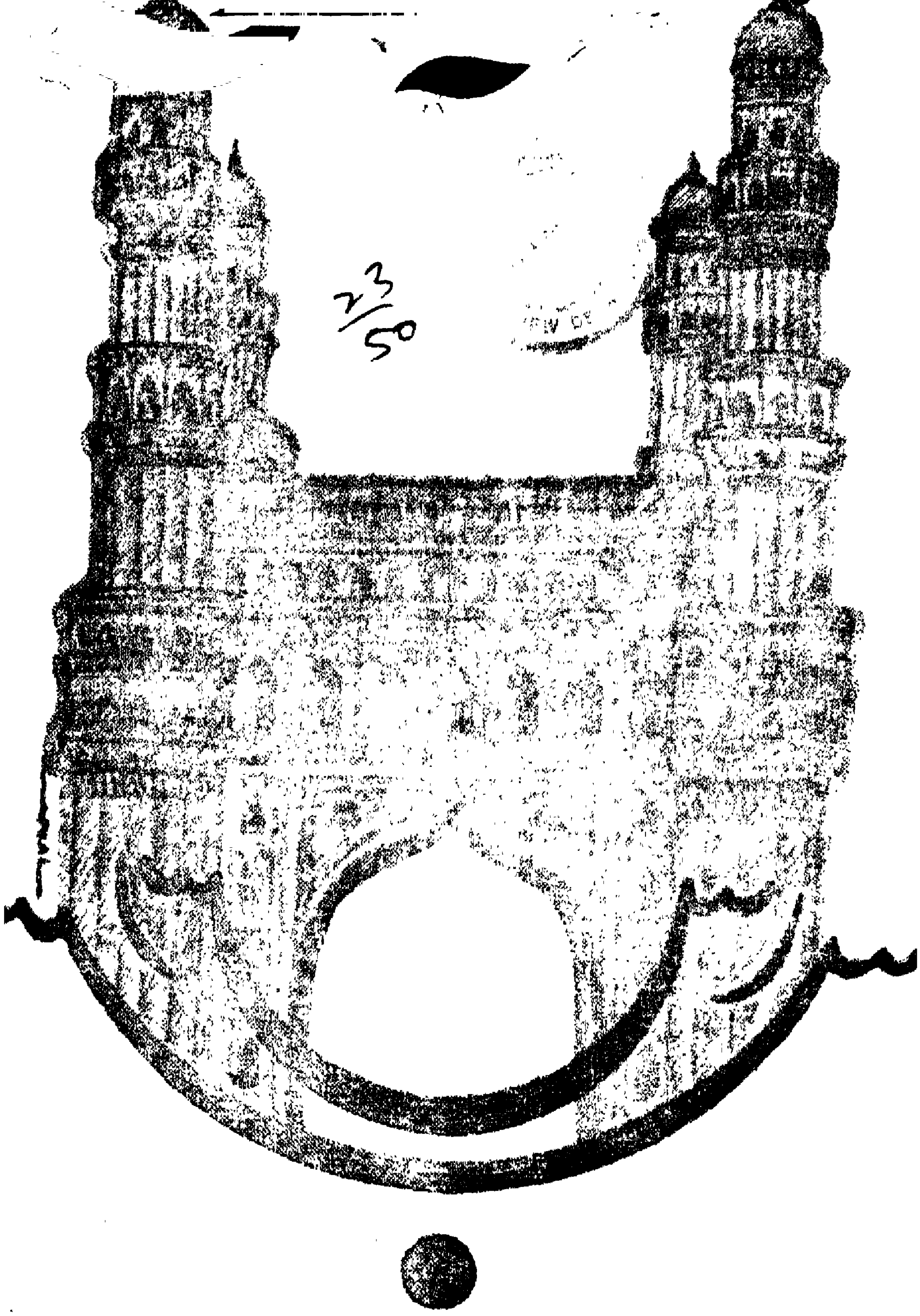


سنِ اجراء ۱۹۳۸ء   فون ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہ نامہ

سب رس حیدرآباد

معتمد مجلسِ مشاورت و مدیر اعزازی
ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر
وقار خلیل

جلد: ۴۳
شمارہ: ۱ تا ۴
جنوری تا اپریل ۱۹۸۰ء

زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
ششماہی: ۱۰ روپے
ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری: تعارف

فی شمارہ ایک روپیہ پچھتر پیسے

— بیرونی ممالک سے —

مشرقِ وسطیٰ: ۱۰ ڈالر   امریکہ: ۱۲ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون: ۸ ڈالر

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد

مقامِ اشاعت: ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد ۴

ترتیب

حضرت امیر خسرو — میر سراج الدین علی خاں ۲
غزل — رئیس امروہی ۶
قدیم دکنی شاعری میں تصوف — ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ ۷
غزلیں — قمر ساحری، سکندر توفیق ۱۳
اردو سندھی کہانیاں: ایک جائزہ — ڈاکٹر افغان اللہ خاں ۱۴
غزلیں — محمد عبدالکریم ماہر ۱۸
عزم انصاری
نصیر پرواز

— (قندِ مکرر) —

گولکنڈہ کی عظمت — پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۹
گولکنڈہ (نظم) — مہدی نظمی ۲۷

— (حیدرآباد کے شاعر) —

سعیدہ عروج مظہر (تعارف اور کلام) ۲۸
وقار خلیل ۲۹

— (نقد و نظر) —

نئی کتابوں پر تبصرے — وقار خلیل، عقیل الرحمن عقیل ۳۳

— (اردو نامہ) —

ادبی سرگرمیاں — وقار خلیل ۳۵

میر سراج الدین علی خان

حضرت امیر خسرو

حضرت امیر خسرو کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ کو اپنے علمی کارناموں اور بالخصوص صوفیانہ شاعری کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ اقطاعِ عالم میں شہرتِ دوام حاصل ہے۔ امیر خسرو نہ صرف فارسی اور ہندی کے بلند پایہ شاعر تھے، بلکہ ایک عالم و فاضل۔ درویش کامل، ماہر موسیقی اور محبِ وطن تھے اور فارسی۔ عربی۔ ہندی۔ ترکی سنسکرت اور دیگر صوبائی زبانوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ امیر خسرو نے شاہی ملازمت میں رہ کر کئی فوجی مہمات میں حصہ لیا۔ اپنی انقلابی زندگی میں تختِ دہلی پر سات بادشاہوں کو تخت نشین ہوتے دیکھا اور چار بادشاہوں کے دربار میں مصاحبِ خاص رہے۔

امیر خسرو ترکی النسل تھے۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان کے شہر کش کے باشندہ اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ وہ ترکِ وطن کر کے بعہدِ سلطان شمس الدین التمش ہندوستان آئے اور دہلی کے قریب بمقام پٹیالی مقیم ہو گئے۔ امیر سیف الدین محمود، دربارِ دہلی میں عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ آپ کی شادی ایک درباری امیر عماد الملک کی لڑکی سے ہوئی اور امیر خسرو ۶۵۱ ھ میں بمقام پٹیالی پیدا ہوئے۔ جس وقت امیر خسرو کی عمر آٹھ سال کی تھی ان کے والد امیر سیف الدین محمود کا انتقال ہو گیا۔ امیر خسرو کی تعلیم و تربیت ان کے نانا عماد الملک کی نگرانی میں ہوئی اور آپ نے (۲۰) سال کی عمر تک تمام علوم و فنون کی تکمیل کر لی۔

امیر خسرو بچپن ہی سے اُس عہد کے بلند پایہ صوفی اور روحانی پیشوا حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے لیکن ۶۷۱ ھ میں آپ باقاعدہ مرید ہوئے۔ امیر خسرو نے شب و روز اپنے مرشد کی خدمت میں رہ کر تصوف اور معرفت کے درس حاصل کئے اور بالآخر وہ امتیازی مقام حاصل کر لیا، جو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے کسی ارادت مند یا مرید کو حاصل نہ ہو سکا۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی اور امیر خسرو میں جو روحانی تعلق تھا اور امیر خسرو کو اپنے مرشد سے جو عقیدت یا محبت تھی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بھی امیر خسرو کو انتہائی درجہ عزیز رکھتے تھے۔ حضرت نے آپ کو "ترک اللہ" کا خطاب دیا تھا اور اکثر فرمایا کرتے تھے: "میں سب سے اکتا جاتا ہوں، لیکن خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا۔" اسی طرح ایک مرتبہ فرمایا: "قیامت کے دن مجھے امید کہ اس ترک اللہ کے دل میں جو آگ سُلگ رہی ہے، اُس کی گرمی سے میرا نامۂ اعمال پاک ہو جائے گا۔" آپ نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو میری قبر میں دفن کیا جائے۔

جب امیر خسرو نے اپنی تالیف افضل الفوائد جو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے اقوال اور پند و نصائح پر مشتمل ہے۔ لکھنا شروع کیا تو اس کے چند اوراق آپ کے ملاحظے میں پیش کئے۔ آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ "نیکو نوشتہ و نیکو کردہ" یعنی خوب لکھا ہے اور نام بھی خوب رکھا ہے۔ آپ نے اس مسودہ کو کئی جگہ اپنے ہاتھ سے درست کیا اور پھر حاضرین سے فرمایا کہ: "خسرو کے لئے واقعی یہ بات قابلِ فخر ہے کہ اس نے اتنی باتیں یاد رکھیں اور لکھیں۔ حالانکہ وہ ہر وقت سرتاپا خیالات کے سمندر میں غرق رہتا ہے لیکن خدا نے خسرو کے تمام اعضا کو علم و دانش سے خمیر کیا ہے۔ کیوں کہ وہ دن رات خیالات کے بحر میں شناوری کرتا ہے اور ہزاروں موتی نکال کر لاتا ہے۔"

امیر خسرو کے دل میں اپنے پیر و مرشد سے جو عقیدت تھی وہ ان کے کلام سے بخوبی واضح ہے۔ چنانچہ آپ کی کوئی ایسی تصنیف نہیں ہے جس میں حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی بزرگی اور کرامات کا ذکر یا ان سے اپنی ارادت کا اظہار نہ ہو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے انتقال کے وقت امیر خسرو شاہی لشکر کے ساتھ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے جب دہلی واپس ہوئے تو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے وصال کی اندوہناک خبر سُن کر رنج و غم سے بے تاب ہو گئے اور قبر کی زیارت کو پہنچے۔ وہاں: آپ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی حالت میں آپ نے دوہا پڑھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو ندیس

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے وصال کے بعد امیر خسرو زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہے۔ طبیعت افسردہ ہو گئی اور شاعری سے بھی ان کو کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ بالآخر ۱۸ ر شوال ۷۲۵ھ کو امیر خسرو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

امیر خسرو نے نظم اور نثر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان کے اشعار کی تعداد کئی لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ نظم میں امیر خسرو کے پانچ دیوان تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال ہیں۔ تاریخی مثنویوں میں قران السعدین۔ مفتاح الفتوح، خضر خاں دول رانی۔ نہ سپہر اور تغلق نامہ ہیں۔ اس کے علاوہ خمسۂ خسرو میں پانچ مثنویاں۔ مطلع الانوار۔ شیریں و خسرو۔ مجنوں و لیلیٰ۔ آئینہ سکندری اور ہشت بہشت ہیں۔ ہندی کلام اس کے سوا ہے۔

نثر میں امیر خسرو کی تین تصانیف ہیں۔ یعنی اعجازِ خسروی۔ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی اور افضل الفوائد۔

امیر خسرو کی تصانیف کو دنیا میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ہندستان کے علاوہ آکسفورڈ۔ لینن گراڈ۔ تاشقند برٹش میوزیم۔ انڈیا آفس۔ روم۔ ترکی۔ پیرس۔ برلن۔ طہران اور کابل کے کتب خانوں میں امیر خسرو کی تصانیف کے قلمی قدیم نسخے موجود ہیں اور نہایت ہی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ تاشقند کے خزانۂ مخطوطات میں کلیاتِ امیر خسرو کا قدیم ترین نسخہ ہے، جس کے کئی صفحات امیر خسرو کے تحریر کردہ ہیں اور جس کو آپ نے اپنی زندگی ہی میں مرتب کیا تھا۔ اس نادر قلمی نسخہ کا سن کتابت ۶۷۷ھ ہے، اس کے علاوہ تاشقند کے خزانۂ مخطوطات میں امیر خسرو کے تین مثنویاں خسرو شیریں۔ آئینہ سکندری اور ہشت بہشت موجود ہیں، جن کو حافظ شیرازی نے

خسرو کے وصال کے تینتیس سال بعد اپنے قلم سے لکھا تھا۔ ان کا سنِ کتابت ۷۵۶ ہجری ہے۔
جہاں تک کہ امیر خسرو کی غزلیات کا تعلق ہے، یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جو شیرینی، سوز و گداز اور تصوف و معرفت کی لذت امیر خسرو کی غزلیات میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو کے وصال کے سات سو سال بعد بھی آج امیر خسرو کا کلام مقبولِ خاص و عام ہے۔ جس کے سننے سے صاحبانِ دل پر بے خودی اور کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ امیر خسرو کے فارسی کلام کی ہمہ گیری اور عظمت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ اہلِ ایران کے نزدیک ہندوستان کے فارسی گو شعراء میں صرف امیر خسرو کی زبان مستند تصور کی جاتی ہے۔ چنانچہ امیر خسرو کے ہم عصر اساتذہ میں سعدی شیرازی نے اور مابعد کے اساتذہ میں حضرت جامی، حافظ شیرازی اور عرفی نے امیر خسرو کے کلام کو سراہا اور اس کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔

امیر خسرو کی تاریخی مثنویوں کی غیر معمولی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ان سے اس عہد کے تاریخی، ادبی اور ثقافتی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

امیر خسرو نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام دست بردِ زمانہ سے ضائع ہو گیا۔ خود امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے ہندی کلام کو مرتب کرنے کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ امیر خسرو کے بعد ان کے کسی ہم عصر کو بھی ان کے ہندی کلام کو یکجا کرنے کا خیال نہیں ہوا۔ اس بے توجہی کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندی کو اس زمانے میں اتنی مقبولیت حاصل نہیں تھی، جو فارسی کو حاصل تھی۔ دوسرے یہ کہ فارسی حاکموں کی زبان تھی اور معراجِ کمال کو پہنچ چکی تھی اور ہندی ابھی ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔

بہر حال اس وقت جو ہندی کلام خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ بالکلیہ امیر خسرو کا کلام ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصلیت کا ہمارے پاس کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔

امیر خسرو نے نثر میں جو کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کی افادیت تاریخی اور ادبی حیثیت سے مسلمہ ہے۔ ان میں امیر خسرو نے مرصع و مزین نثر اور صنائع و بدائع کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں اور جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے، وہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔

امیر خسرو فنِ موسیقی کے استاد تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے فنِ موسیقی میں کئی راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ فنِ موسیقی میں آپ کو نایک کا خطاب ملا تھا اور آپ ستار کے موجد ہیں۔

امیر خسرو سچے محبِ وطن تھے اور ہندوستان سے بے پایاں جذباتِ محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو نے ان فارسی مثنویوں میں جو نظامی گنجوی کے خمسے کے جواب میں لکھی ہیں۔ ہندوستان۔ ہندوستان کے موسم۔ پھول، پھل اور دیگر تہذیبی خصوصیات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کی مثنوی نُہ سپہر اور دول رانی خضر خاں میں سیکڑوں اشعار ہندوستان کی تعریف میں ہیں۔

اب یہاں حضرت امیر خسرو کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں، جن سے اُن کے کلام کے معیار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

جاں ز تن بُردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

ملکِ دل کردی خراب از تیغِ ناز
و اندریں ویرانہ سلطانی ہنوز

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتہ !
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بُتانِ آذری !
ہر چند وصفت می کُنم در حُسن ازاں بالاتری

آفاق را گردیدہ ام مہرِ بُتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

من تو شُدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

ما دل شدگانِ بے قراریم
ما سوختگانِ خام کاریم !

آتش زدگانِ سوزِ عشقیم
رُسوا شدگانِ کوئے یاریم

اے تُرک چہ جائے رحمت ایں جا
تو تیر بزن کہ ما شکاریم

ما خاکِ رہیم ہمچو خسرو !
در کوئے کسے بیادگاریم

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا !
تنم از بے دلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا

گر اے زاہد دعائے خیری گوئی مرا ایں گو !
کہ آں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

دیوانہ شدم در آرزویت
اے چشمِ ہمہ جہاں بسویت

خسرو کہ بکمند تو اسیر است
بیچارہ کجا رود ز کویت

بیا بیا کہ مرا طاقتِ جدائی نیست
رہا مکُن کہ دلم را ز غم رہائی نیست

زبانِ شوخِ من تُرکی و من تُرکی نمی دانم !
چہ خوش باشد کہ می بودی زبانش در دہانِ من

عمرم بآخر آمد و روزم بہ شب رسید
مستی و بت پرستیِ من ہم چناں ہنوز

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھئے)

رئیس امروہوی

غزل

من نگر جس کی جوت سے روشن!
بدلیاں کس طرف ہیں آج رواں
دیکھیے کس طرف نکل جائیں
بس اسی آرزو میں جیتا ہوں
اے ہوائے شمال و بادِ جنوب!
کیا سمن زارِ ماوراء النہر؟
اے سکھی! تیری آنکھ اور آنسو؟
اپنا کوئل کو کوکتی ہے گھٹا!
اور گھٹا کی تلاش میں کوئل
پھر ادھر رخ ہوا بلاؤں کا؟
میں تو خود ہی شکستہ خاطر ہوں
اک تصور سہی مگر ہے تو
کون پڑھتا ہے؟ یہ پہیلی بوجھ
خواب میں خضر نے کہا مجھ سے
دیلمؔ و دل سے ہے خفا دیدار
نیمۂ عمر ما بخواب گذشت
صبح چمکی چمک اٹھا سورج!
یہ مری ہرزہ گوئی گفتار

اے سکھی! چاند ۔ نا سکھی چندن!
گوپیوں کا ہے دیس بندرا بن
لے کے ہم لوگ جوگیوں کا برن
تو یہاں آئی چوں روم از تن
اُس پریزاد کا کہاں ہے وطن؟
یا رشی کیش و ہردوار کے بن
نا سکھی! قطرہ ہائے گنگ و جمن
اپنے آہو کو ڈھونڈتا ہے ختن
اور ختن کے سراغ میں ہے ہرن
چھت پہ ہے کیوں ہجوم زاغ و زغن
زلف بکشا و لے برخ مشکن
چاند کا روپ چاندنی کا بدن
اے سکھی! ناچ؟ نا سکھی آنگنا!
تجھ سے ناراض ہے ترا بچپن
اور درشن سے سرگراں درپن
آ کے سپنوں ہی میں دکھا درشن
رات ڈھلکی و ہمک گئے ساجن
گفت از تست و باز گفت از من

ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ

قدیم دکنی شاعری میں تصوف[۱]

قدیم دکنی شاعری میں صوفیانہ افکار اور تصورات ہر جگہ نظر سے گذرتے ہیں اور بیسیوں اشعار ملتے ہیں جو تصوف کے ہر موضوع اور ہر پہلو کو واضح کرتے ہیں جن کی تفصیل کے لیے طویل وقت درکار ہے۔ میں صرف چند موضوعات اور چند منتخب اشعار پر اکتفا کروں گا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ تصوف کیا ہے اور صوفی کسے کہتے ہیں۔ اس تعلق سے حکماء و محققین نے بے شمار تصورات پیش کیے ہیں۔ تصوف کے لغوی معنی ہیں پشمینہ پوشی یا خواہشاتِ نفس سے پاک ہونا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ لفظ "تصوف" "صوف" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "پشم" یا "اون" اور صوفی وہ لوگ کہلاتے تھے جو صوف کا لباس پہنتے تھے اور فقیر منش ہوا کرتے تھے۔ قدیم صوفی ابوالحسن نوری کہتے ہیں کہ تصوف تمام نفسانی لذتوں کے ترک کر دینے کا نام ہے اور صوفی وہ لوگ ہیں جن کی جانیں بشریت کی تاریکی سے نکل گئیں۔ ابوعلی قزوینی کے نزدیک پسندیدہ اخلاق کا نام ہے۔ جنید بغدادی کے الفاظ میں صوفی زمین کے مانند ہے جسے نیک و بد سب روندتے ہیں اور ابر کی مانند ہے جو سب پر سایہ کرتا ہے اور بارش کی مانند ہے جو ہر ایک کو سیراب کرتا ہے۔

پروفیسر رینالڈ نکلسن اپنی تصنیف THE IDEA OF PERSONALITY IN SUFISM میں لکھتے ہیں کہ تصوف اپنی ابتدائی منازل میں محض سنجیدگی، تہذیبِ نفس، گوشہ نشینی اور خدا کی طرف محویت کا نام تھا۔ لفظ "صوفی" پہلی بار اس شخص کے لیے مستعمل ہوا جو درویشی اور گوشہ نشینی کی زندگی گذارتا اور عبادت و ریاضت میں محو ہوتا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں یکایک کاروبارِ دنیوی سے دوری اختیار کرنے کی تحریک نہایت شد و مد سے شروع ہوئی اور ہزاروں مردوں اور عورتوں نے اس قسم کی مذہبی زندگی بسر کرنا شروع کی۔

تصوف کی بنیادیں قرآنِ حکیم، احادیثِ نبوی اور سنتِ رسول پر قائم ہیں۔ تصوف اللہ کے وجود کو سمجھنے، اُس سے قریب ہونے اور اس کی مخلوق سے محبت کرنے کا درس دیتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک صوفیت ایک اٹل اور واضح طرزِ زندگی اور اندازِ فکر بن گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد صوفیانہ طرزِ زندگی، اخلاق اور تعلیمات کا علمی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جانے لگا اور ایک باقاعدہ علم یا فلسفہ پیدا ہوا جو فلسفہ کا لازمی جز بن گیا۔

رفتہ رفتہ تصوف اسلامی دنیا میں چاروں طرف فروغ پانے لگا اور ادب، شاعری، فلسفہ اور مذہب کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ خصوصاً فارسی شاعری نے تو اسے اپنے دل میں جگہ دی اور رگ رگ میں سمو لیا۔ بقول شبلی نعمانی کے فارسی کی کلاسیکی

۱- یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس منعقدہ ۲۵ فروری ۱۹۸۰ء میں پڑھا گیا۔

شاعری بڑی حد تک صوفیانہ خیالات اور جذبات سے مملو ہے۔ اور فارسی شاعری اس وقت تک قالبِ بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا۔

غرض بہت جلد عرب، عراق، شام اور مصر سے تصوف کا ابر بہاری ہر چمن کی آبیاری کرتا ہوا ایران اور خاص کر خراسان پہنچا جس کی سرزمین اس کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی اور بے شمار صوفیا اور صوفی شعرا پیدا ہوئے۔ تصوف نے ایران کی راہ سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور یہاں اوّل فارسی پھر اُردو ادب میں اپنے بیش بہا دفینے محفوظ کر دیے۔

اُردو زبان کے شعرا تصوف سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ دکن کے قدیم شعرا سے لے کر عہد حاضر کے شعرا تک تقریباً تمام اساتذۂ سخن گلستان تصوف کے رنگ و بو میں مست رہے۔ ہر دور میں شعوری اور غیر شعوری طور پر تصوف کے مسائل و مباحث کو رنگا رنگ طریقے سے پیش کیا جانے لگا۔ تصوف ہی کے سبب سے اردو شاعری میں فلسفیانہ بانکپن، فکر کی صد رنگی، نزاکت، لوچ اور اثر پیدا ہو گیا۔

تصوف میں سب سے اہم اور دلچسپ بحث خود خدا کے وجود پر ملتی ہے۔ قدیم یونانی مفکرین اور ہندو حکماء سے لے کر موجودہ زمانے کے فلسفیوں اور حکما کو خدا کی حقیقت نے سرگرداں اور پریشان کر رکھا ہے۔ صوفیوں نے خدا کے وجود کو سمجھنے کے لیے وحدت الوجود یا توحید وجودی کے تصور کو پیش کیا ہے جس کی رُو سے صرف ایک ہی حقیقت ہے جو اپنے آپ کو مختلف طریقوں اور مختلف صورتوں میں ظاہر کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ حقیقت صرف خدا کی ذات ہے جو گوناگوں اشکال اور بوقلموں صورتوں میں اپنے آپ کو دکھاتی چلی جا رہی ہے۔ وہی تمام کائنات کے اندر اور اس سے باہر ہر جگہ موجود ہے۔ مشہور صوفی شیخ محی الدین ابن العربی کہتے ہیں کہ عالم ہستی اللہ تعالیٰ کی صورت ہے۔ وہ تمام مظاہر میں نئی نئی تجلیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ابوالحسن علی ہجویری اور الغزالی نے بھی توحید وجودی کے تصور کو واضح کیا ہے۔ شعرائے اردو میں شاہ برہان الدین جانم، سلطان محمد قلی قطب شاہ، غواصی، محمود بحری، شاہ علی جیوگام دھنی، ولی دکنی، سراج، درد، میر، غالب، اصغر، توفیق، اقبال، امجد اور جگر نے پیش کیا ہے۔ جانم کہتے ہیں۔

لامکاں ہیں اس کا ٹھار ؛ دوسرا نئیں واں کوئی بچار
سب میں اچھ منترہ دیکھ ؛ نہ وہ ملیا کس تھے بھیکھ
سب میں تو وہ دستا ہے سب تھے الیت بستا ہے
ایسا آپین آپ بسے نہیں پنے میں یہیں دسے
ہر ایک شئے میں دیکھ بچار محیط دیسے ٹھاریں ٹھار

یعنی اللہ کا مقام لامکاں ہے۔ سوچ کر دیکھو تو کوئی دوسرا اس کی جگہ موجود نہیں۔ وہ سب میں موجود رہ کر بھی سب سے پاک ہے۔ اس کا بھیس کسی سے نہیں ملتا۔ اگرچہ وہ ہر شئے میں چھپا ہوا ہے پھر بھی سب سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ وہ خود ہر جگہ موجود ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی دیکھنے کی طاقت رکھتا ہو تو اُسے اپنے قریب ہی دیکھے گا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کہتے ہیں:

رکھ ایک ہے ہر ٹہنی کدھن لاکھ چمن ہے ٭ مکھ جوت ہے ہر ٹھار ولے ٹیک رتن ہے

یعنی ایک جڑ ہے اور لاکھوں چمن ہیں۔ ایک موتی ہے جس کی ہر جگہ لاکھ چمک ہے۔

غواصی کا خیال ہے کہ:

بے مثل ہور نروپ ہولک رنگ روپ سوں ٭ اظہار دو جہاں میں اپس جاں نہاں کیا

یعنی اللہ بے مثل ہے اور اس کی کوئی شکل نہیں ہے پھر بھی وہ اپنے آپ کو لاکھ رنگ روپ کے دو جہاں میں ظاہر کرتا ہے اور خود اپنے آپ کو چھپا کر رکھتا ہے۔ محمود بحری کہتے ہیں:

سب تجہ میں اگر کہے تو سچ ہے ٭ جوں جل کے منجھار کچ ہے مچ ہے

کہے ایک دریا ہے موجاں ہزار ٭ ابلتے ہیں موجاں کے فوجاں ہزار

سراج اورنگ آبادی کا خیال ہے کہ:

ہو نہاں اپس کوں دکھایا نہیں ٭ ہو ظاہر اپس کوں چھپایا نہیں

کہیں آپ دستا ہے محبوب ہو ٭ کہیں آپ چھپتا ہے محجوب ہو

شاہ علی جیو گامدھنی کائنات کی مختلف اشیا میں خدا کی ذات کو جلوہ گر دیکھتے اور کہتے ہیں:

پھول کلی ہو آپیں آیا ٭ اجلا نیلا بھیس بھرایا

مانک، موتی، سیکھ سنکارا ٭ یہ سب بھیس پیا کا سارا

خدا کو انسان کے اندر دیکھتے ہوئے شعرائے اردو نے بڑے پُرلطف مضامین باندھے ہیں۔ انھوں نے بعض آیاتِ قرآنی کو پیش نظر رکھ کر کئی نکتے پیدا کیے ہیں۔ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ ہم سنتے ہیں کہ اس کی روح اس سے کیا کہتی ہے۔ ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد"۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ "وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِی"۔ یعنی "ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی"۔ حاتم کہتے ہیں کہ

تجھ میں داخل اچھے یوں ٭ وہ تجھ بن خارج دستا کیوں

وہ ہے تجھ میں جیتن ہار ٭ سب جگ کا جے سرجن ہار

شاہ علی جیو گامدھنی کہتے ہیں کہ خدا نے مختلف انسانوں کے بھیس میں نئے نئے روپ اور حسین انداز اختیار کر کے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے:

پرکھ، نار ہو آپیں آیا ٭ دیکھن بھیس ادھ نیاری لایا

کہیں سو مجنوں ہو برلاوے ٭ کہیں سو لیلا ہو دکھلاوے

کہیں سو خسرو شاہ کہاوے ٭ کہیں سو شیریں ہو کر آوے

آپیں ناچے آپیں گاوے ٭ آپیں آپس بھاؤ دکھاوے

ولی کہتے ہیں:

سجن کے باج عالم میں دگر نئیں ✤ ہمیں میں ہے و لے ہم کو خبر نئیں

صوفیا کے یہاں حسن کا ایک خاص تصور ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ حسن ایک نرم اور ملائم شئے ہے جو روح کے اندر جگہ پیدا کر لیتی ہے۔ الغزالی نے حسن کی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک حسن ظاہری اور دوسرے حسن باطنی۔ پہلی قسم کے حسن کو جانور اور انسان سب ہی دیکھتے ہیں اور دوسری قسم کے جمال کا ادراک اہل دل کے لیے مخصوص ہے۔ باطنی حسن اخلاق و کردار، علم و عقل اور نیکی اور خیر میں موجود رہتا ہے۔ ایسا ہی حسن خدا کی ذات میں موجود ہے جس کو جمال مطلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی حسن انبیا، آئمہ اولیا اور مذہب و ایمان میں موجود ہوتا ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام فرماتے تھے "اللہ جمیل و یحب الجمال" یعنی اللہ حسین و جمیل ہے حسن سے محبت کرتا ہے عبدالکریم جیلی نے اللہ کے حسن و جمال کی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک ظاہری جو مخلوقات میں ظاہر ہے اور دوسری قسم کا حسن معنوی ہے جو اس کی رحمت، علم و حکمت، خلاقیت اور رزاقیت میں چھپا ہوا ہے۔ حسن کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور صرف ظاہر کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ داد و تحسین بھی چاہتا ہے۔ جمال مطلق نے بھی اپنے آپ کو نہ صرف دوسروں پر ظاہر کرنا اور داد و تحسین حاصل کرنا بلکہ خود اپنے حسن کا مشاہدہ کرنا چاہا۔ اس کو ایک آئینہ بنانے کی ضرورت ہوئی جس میں وہ اپنے حسن کا عکس دیکھ سکے تو اس نے کائنات کی تخلیق کی اور اس کو اپنے لیے آئینہ بنایا۔ خواجہ بندہ نواز کہتے ہیں کہ "حسن نے چاہا کہ اپنے آپ کو دیکھے تو اس کو ایک آئینہ بنانے کی ضرورت ہوئی تاکہ اس میں اپنے عکس جمال کا مشاہدہ کرے۔ اور خود کو اسکے اندر منعکس اور عیاں دیکھے۔ جب آئینہ پیدا کیا تو اپنا عکس دیکھ کر آپ عاشق ہوا۔ اس کا عکس کہیں نبی کی صورت میں، کہیں ولی، کہیں مومن، کہیں مسلم اور کہیں کافر و مشرک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ایسے ہی تصورات ظاہر کرتے ہوئے وجدی کہتے ہیں:

جب کوئی نئیں دیکھ سکتا وہ جمال ✤ آرسی پیدا کیا ہے ذوالجلال

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

سو اس آرسی میں کیا جیوں نظر ✤ ہوا عاشق اپنا اپس دیکھ کر

ہر ذرۂ کائنات میں جمال مطلق کی جلوہ گری کا مضمون سلطان محمد قلی قطب شاہ نے باندھا ہے وہ کہتے ہیں:

چند ر صور ترے نور تھے بدن کوں نورانی کیا
تیری صفت کن کر سکے تو آپیں میرا ہے جیا

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

سنپورن ہے تجھ جوت سوں سب جگت ✤ نہیں خالی ہے نور تھے کوئی شئے

حسن مطلق کی ضیا پاشی کا ذکر وجدی نے ان الفاظ میں کیا ہے

اصل موجودات اس کا نور ہے ✤ جس سے مخلوقات یہ معمور ہے

ولی کہتے ہیں:

ترے جلوے سوں ہے گُل تازہ و تر ÷ چمن میں بلبلاں کا ہر طرف جوش

لیکن حسنِ مطلق کا مشاہدہ ہرکس و ناکس کے لیے ممکن نہیں۔ ہر انسان صاحب نظر اور ہر نظر باخبر نہیں کہ ذرّے میں آفتاب اور شرر میں شعلے کا مشاہدہ کرسکے۔ اس کے لیے پاکیِ قلب و نگاہ ضروری ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ انسان حسنِ کائنات سے کائناتِ حسن کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ سراج نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے:

سبب لیلیٰ کے پایا لیلیٰ اصلی کو مجنوں نے ÷ رخِ دلدار کوں آئینۂ معنی نما کہیئے

حُسن کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ عشق پیدا کرتا ہے۔ افلاطون نے محبت کو "ایزدی جنون" (DIVINE) سے تعبیر کیا ہے۔ انجیل مقدس نے خدا کو بجائے خود "عشق" کا نام دیا ہے اور قرآن حکیم نے اُسے "ودود" یعنی محبت کرنے والا بتایا ہے۔ فلسفۂ عشق تصوف کی جان ہے۔ صوفیا ہمیشہ جامِ عشق سے سرشار رہے عشق کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ بندہ نواز کہتے ہیں۔ عشق بت پرستوں کا پیشوا ہے۔ زاہدوں اور عابدوں کا قبلہ ہے۔ مالک دوجہاں ہے۔ عشق ہی بت پرست ہے۔ عشق ہی بت شکن ہے۔ عشق خدا سے جدا نہیں۔ ایسا ہی خیال جانم اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

ایسا عشق وہ آپیں رب ÷ اس عشقِ رب کا عالم سب

عشق کب اور کیسے پیدا ہوا یہ سوال کرتے ہوئے بحری کہتے ہیں

یا مجھ میں نوا ہوا ہے پیدا ÷ یا جگ میں اول تے ہے ہویدا

عشق کی بے پناہ قوت کے آگے انسان کو سپر ڈالنا پڑتا ہے بقول بحری کے:

اب لگ ہے وہی چلن وہی چاچ ÷ یو عشق جدھر لے گیا ادھر کاچ

صوفیا کا یہ بھی خیال ہے کہ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ ولی کہتے ہیں:

دروادیِ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے ÷ اول قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرنا
عشق کے مفتی نے یوں فتویٰ دیا ÷ دیکھنا خوباں کا درسِ خوب ہے

الغزالی کا خیال ہے کہ مستحق محبت صرف خدائے پاک کی ذات ہے۔ اہلِ بصیرت کے نزدیک سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کوئی محبوب نہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کہتے ہیں:

رہے پاؤں دل سوں چلوں تیرے پینتھ ÷ ترے پنتھ چلنے کوں دل پاؤں ہیں

صوفیا نے عشقِ حقیقی کو اصلِ مذہب اور جانِ ایمان قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ایمان بغیر عشق کے بے روح ہوتا ہے صاحبِ عشق کفر اور اسلام سے آگے نکل جاتا ہے۔ وجہی کہتے ہیں:

عشق میں جن کا قدم ثابت ہے وو ÷ کفر اور اسلام سے گذرا ہے وو

صوفیا عموماً وسیع المشرب اور وسیع النظر ہوتے ہیں اور رواداری، ہمدردی اور محبت و خلوص کو اپنا شیوہ بناتے ہیں۔ چوں کہ وہ خدا سے محبت کرتے ہیں اس لیے خدا کی تمام مخلوق سے محبت، انس اور ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہ ان اہلِ شریعت اور واعظوں، ملاؤں، اور شیخ و زاہد پر طنز و تضحیک سے دریغ نہیں کرتے جو کافر، مشرک یا گنہگار سے خشک مزاجی سے

پیش آتے اور متنفر رہتے ہیں اور جو خود عشقِ حقیقی، معرفتِ حق اور علم و حکمت سے محروم رہتے ہیں۔ بلکہ ریاکاری سے دریغ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ علی جیو گام دھنی کہتے ہیں:

خشک زاہد دوزخ کا کندہ ٭ عشق نہ جانے کیسا ھندہ

سراج کے نزدیک عاشقِ صادق کا مقام زاہدِ خشک سے برتر ہے۔

زاہد کو روزِ محشر جز بوریا نہیں ہے ٭ مجلس میں عاشقوں کی جامِ طہور ہوگا

شیخ و زاہد کے علم و معرفت کے فقدان پر افسوس کرتے ہوئے سراج کہتے ہیں۔

عالمِ باطن کا اسکوں سیر نئیں ٭ شیخ و زاہد آنکھ سے معذور ہے

ولی دکنی ریاکاری پر اس طرح چوٹ کرتے ہیں:

زاہد کوں مثلِ دانۂ تسبیح ایک آن ٭ کوچے ستی ریا کے نکلنا محال ہے

(اردو ہندی کہانیاں ص۱۷ سے آگے)

کی ایک سربریدہ آخری آدمی اردو کی بالکل نئی کہانی کہی جاسکتی ہے جس کی آواز پہلے نہیں سنی گئی تھی، اسی طرح سجاد نظر اور انیس رفیع کی کہانیوں کا مطالعہ بھی بنگال کے پس منظر میں ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں انیس رفیع اور سجاد نظر کی کہانی "فاسٹ فوڈ سنٹر" کے خلاف نہ صرف ٹھوس کہانیاں ہیں بلکہ ایک عملی قدم ہیں۔

میرے خیال میں ان کہانی کاروں کی کہانیوں کو سنجیدگی سے لینا ہوگا اور ان کا مطالعہ آج کے سیاق و سباق میں کرنا چاہیے۔

(بقیہ تعارف: ایچ ای ایچ دی نظام اردو ٹرسٹ لائبریری۔) (بقیہ ص۳۱ سے آگے)

عبارت مختصر: نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری حلقۂ اربابِ ذوق اور مجلہ "میصر" کو سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع مرحوم کی شایانِ شان یادگار کی حیثیت سے خشتِ اول قرار دیا جائے گا۔ ضرورت ہے ان تمام شعبوں میں اس کی اپنی علامت میں ان مقاصد کو بے نہایت ترقی دی جائے تاکہ برصغیر ہند و پاک میں اسے مرحوم جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کا پہلا سا مرتبہ اور مقام [illegible]

(ص۵ سے آگے) ابر باراں و من و یار ستادہ بوداع ٭ من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا

یک قدم بر جانِ خود نہ یک قدم در کوئے دوست ٭ زیں نکوتر رہروانِ عشق را رفتار نیست

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ٭ ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

قمر ساحری

ہر شہر اس زمین کا شہرِ دکن بنے
میرا لہو جہاں بھی گرا ہے چمن بنے

مقصودِ شوقِ راہ نوردی یہی تو ہے
کانٹوں کی وادیوں میں کوئی پھول بن بنے

اب ان کی خوش گلوئی بھی کھلنے لگی تجھے
وہ نغمہ گر جو تیرے لئے نعرہ زن بنے

کچھ تو پتہ چلے کہ وہ سورج ہے کس طرف
اس دَور کے لئے تو کوئی برہمن بنے

اب تک ہے تم کو چاند کے غاروں پہ اعتماد
تم میرے ہم خیال کہاں جانِ من بنے

لوگو، یہ زندگی ہے پہاڑوں کا راستہ
انسانِ آب جو ہے جسے کوہکن بنے

سکندر توفیق

بخت کو نارسا ہی رہنے دو　　ہم کو خود سے جدا ہی رہنے دو
قیمتِ حسن کیا؟ خراجِ نظر　　عشق کو بے بہا ہی رہنے دو
داغِ دل روشنی میں چمکیں گے　　اس دیے کو بجھا ہی رہنے دو
زیست کو دیں تو کون سا عنواں　　"عشق کا ماجرا" ہی رہنے دو
یوں نہ الٹو بساطِ دنیا کو　　روزِ محشر لگا ہی رہنے دو
شعر گوئی بدل ہے وحشت کا　　شغلہ ہے، بُرا ہی رہنے دو
آئینہ کی کسوٹی چہرہ ہے　　عکس کو جاں فزا ہی رہنے دو
کس کو فرصت ہے زیست کرنے کی　　ہم کو ہم سے خفا ہی رہنے دو
ہو اگر مستجاب حیرت ہے　　تم دعا کو دعا ہی رہنے دو

دل کو توفیقؔ دل بر آری ہے
راز ہے یہ چھپا ہی رہنے دو

٥

ڈاکٹر افغان اللہ خاں

اُردو ہندی کہانیاں ـــــ ایک جائزہ

کوئی بھی ادب خلا میں پرورش نہیں پاتا۔ بلکہ اس کے پس منظر میں ایک عہد سانس لیتا ہے۔ ایک معاشرے کی پوری سماجی اور تہذیبی تاریخ پنہاں ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک ہی معاشرے میں تخلیق شدہ ادب، خواہ وہ کسی زبان میں کیوں نہ ہو۔ تقریباً یکساں ہوا کرتا ہے۔ اُس کی بنیادی قدریں اور رویّے مشترک ہوتے ہیں۔ ہاں اشیاء اور ضرورتوں کو دیکھنے کا زاویہ ضرور مختلف ہو سکتا ہے۔ دراصل ہندی اور اُردو دونوں کہانیوں کی بنیاد پریم چند کی ٹھوس کہانیوں پر رکھی گئی۔ اس سلسلے میں پریم چند کی حیثیت منارۂ نور کی سی ہے۔ پریم چند کا عہد نسبتاً آج سے کافی ٹھہرا ہوا، پُرسکون اور ہموار تھا۔ کسی طرح کی کوئی ذہنی پیچیدگی نہیں تھی۔ فرد اپنے طبقے یا اپنوں کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ کسی کی کوئی انفرادی حیثیت نہ تھی۔ پریم چند نے اسی ماحول میں اپنی کہانیاں ترتیب دیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں کسی طرح کی کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی نہ تو کرداروں میں اور نہ کہانیوں کے اظہار میں۔

پریم چند خود ذاتی طور پر ترقی پسند تھے۔ مگر وہ اپنی ترقی پسندی کو وہ نعرہ بننے دینا نہیں چاہتے تھے جو آدمی کی ساری پہچان کھو دے۔ انھوں نے سماج کی فرسودہ اور کھوکھلی رسم و رواج کے خلاف قلم اٹھایا۔ سماج کے کچلے ہوئے طبقوں کی کمزوریوں اور کمیوں کی بھی نشاندہی کی، چنانچہ ان کی کہانیاں صرف کہانیاں رہیں فارمولہ نہیں۔ اور نہ ہی صرف نعرہ۔ مگر ترقی پسند تحریک اور خاص طور ترقی پسند افسانہ نگاروں کو پریم کی کہانیوں سے بڑی تقویت ملی۔ انھوں نے پریم چند کی کہانیوں کو ماڈل بنا کر کہانیاں لکھیں۔ اور کامیاب بھی ہوئے۔ خواجہ احمد عباس۔ کرشن چندر اور بیدی نے ایسی کامیاب کہانیاں لکھیں جو ایک طرف تو اپنے عہد کی ضرورتوں کا احساس بھی رکھتیں اور مارکسی نظریہ کی تشریح بھی۔ مگر اس تحریک میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہوگئے جو ذاتی طور پر ترقی پسند نہیں تھے۔ مگر اس تحریک کی مقبولیت نے ترقی پسند بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس نظریہ کو ذات کا حصہ یا تجربہ بننے کے بجائے فیشن کے طور پر قبول کر لیا، اور کہانیاں لکھنے لگے۔ انجام جو ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان کی کہانیاں صرف نعرہ یا فارمولہ بن کر رہ گئیں آج اس طرح کی تمام تر کہانیاں معدوم ہو چکی ہیں، صرف چند نام باقی ہیں۔ بالکل یہی صورتِ حال ہندی میں بھی تھی۔ ہنا

کہانی کار حضرات بھی اس تحریک سے اسی قدر متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی مارکسی نظریہ کو مدِنظر رکھ کر کہانیاں لکھیں مگر سوائے یشپال اور اشک کے کوئی کامیاب نہ ہوسکا۔ کیوں کہ دوسرے حضرات نے کہانی کی صرف احساس اور مانگ کو یکسر نظر انداز کردیا۔ چنانچہ ان کی کہانیاں بھی یاد نہیں رکھی گئیں۔ اور معدوم ہوگئیں۔ مگر اسی دور میں ایک دوسرا رجحان بھی پنپ رہا تھا۔ یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا مگر زندہ اور منفرد تھا۔ یہ رجحان یلدرم۔ ممتاز مفتی، ممتاز شیریں اور حسن عسکری وغیرہ لوگوں سے عبارت تھا۔ ان لوگوں کی کہانیاں ترقی پسند کہانیوں سے یکسر مختلف تھیں، انھوں نے انشائیہ اور طنزیہ اسلوب کے اشتراک سے سماج کی کھوکھلی قدروں پر سخت حملے کئے، اور انسانی ذہنی گتھیوں کو بھی کہانیوں کا موضوع قرار دیا۔ ہندی میں "اگیہ" کی سرکردگی میں یہ رجحان آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر ہندی اور اردو دونوں جگہ ترقی پسند تحریک کے نعروں کی گونج سے یہ آواز دب سی گئی تھی۔ بہرحال کہانیاں کے یہ دونوں دھارے الگ الگ سمتوں میں بہتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

تقسیم ہند، اور اس سے پیدا شدہ ردعمل اور فرقہ وارانہ فسادات نے سماج کا سارا نظام ہی بکھیر کر رکھ دیا۔ اخلاقی قدریں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئیں۔ سماج کی ہمہ جہتی پارہ پارہ ہوگئی۔ فرد۔ جو اپنے طبقے یا اپنوں کی نسبت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ اپنی انفرادی حیثیت میں آگ و خون، لوٹ گھسوٹ کے اس دریا سے گزرا جو ذرا تقسیم کے دونوں جانب رواں دواں تھا۔ یہ ایک ایسا المیہ تھا۔ جسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فن کار کو تو اس سے اور بھی زیادہ متاثر ہونا تھا۔ چنانچہ تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فسادات کا المیہ اردو کہانی کا خاص موضوع قرار پایا، اور اس موضوع پر بیشمار کہانیاں لکھی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہنگامی ادب آفاقی ادب نہیں ہوسکتا۔ لیکن کیا کوئی احمد ندیم قاسمی کی پرمیشر سنگھ، ڈاکٹر صلاح الدین ایوب کی البم اور سائے۔ آغا بابر کی کبتو۔ خدیجہ مستور کی دس نمبری، عزیز احمد کی کالی رات۔ قدرت اللہ شہاب کی یا خدا عائشہ آگئی۔ منٹو کی ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کھولدو کون بھول سکتا ہے۔ دراصل جذبہ بھی تجربہ بن کر ادب میں ڈھلتا ہے تو آفاقی ادب کا ظہور ہوتا ہے، ہندی میں یش پال اور اشک وغیرہ نے اس موضوع پر کہانیاں تو ضرور لکھیں مگر ان کہانیوں کے مقابلے میں بے جان سی نظر آتی ہیں۔ اور ویسے بھی ہندی میں اس موضوع پر تعداد کے لحاظ سے اردو کے مقابلے میں کم کہانیاں لکھی گئیں اردو میں تو سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو نسل پاکستان گئی۔ وہاں اس نے اپنے کو اجنبی پایا۔ اُسے اپنے زمین کی تلاش تھی۔ جو وہاں نہیں تھیں۔ احمد ہمیش اور انتظار حسین کی کہانیوں میں یہی احساس ایک لہر کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

۱۹۵۰ کے بعد کی ہندی اور اردو کہانیوں پر مقصدیت حاوی رہی۔ ترقی پسند کہانی کار کہانی کی دنیا پر چھائے رہے۔ سوشل کمٹمنٹ سے بھی وابستگی اور مثبت کردار نگاری کے اشتراک سے کہانیوں کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس دور کے تمام افسانہ نگاروں کا مطالعہ کیجئے تو محسوس ہوگا کہ یہ کردار یک رخ نہیں یا تو یکسر نیکی کی علامت یا بدی کے، یہ افسانہ نگار

ان کرداروں کو منعکس کرنے کے لیے ایسے ایسے واقعے معرضِ تخلیق میں لاتے کہ کرداروں کی پوری صفات ابھر کر سامنے آجاتیں۔ اور ایک غیر متوقع موڑ پر لا کر قاری کو چھوڑ دیا جاتا اور قاری حیرت و تجسس کا شکار ہو کر رہ جاتا۔ یہ فن لوگوں نے موپاساں سے سیکھا تھا۔ دراصل تقسیم کے فوراً بعد کے افسانہ نگاروں پر سہل نگاری کا جو رجحان غالب نظر آتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ تذبذب اور اضطراب کی پیدا کردہ سہل نگاری تھی۔ ہندی کہانیوں کا موضوع یہیں آکر ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فسادات کے اثرات جب ذرا مدھم ہوئے تو ہندی میں اپنی اپنی پہچان۔ اور علاقائیت کی پہچان شروع ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں۔ قصبے۔ نگر، مہانگر کو کہانیوں کا موضوع قرار دیا گیا، اس کی بہترین مثال رینو کی "تیسری قسم" ہے۔ رانگے راگھو کی "گدل" بھی اس سلسلے کی بہترین کہانی ہے۔ ہندی کہانیوں نے اس دور میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں۔ قصبوں۔ نگروں اور مہانگروں میں اپنے ایک عام کی تلاش اور پہچان شروع ہوئی۔ اس طرح ہندی کہانیوں میں ایک عام آدمی مختلف پس منظر میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان کے دس برس اردو ہندی کہانیوں کے لیے تجربوں کا سال ہے۔ آزادی کے بعد کے یہ پچھلے تیس سال اپنے اندر مزاج کی ایک پوری تاریخ رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند اور اس کے اثرات، فرقہ وارانہ فسادات اور اس سے پیدا شدہ ردِ عمل۔ ہجرت کے مسائل سب اپنے اپنے اثرات مرتب کر رہے تھے۔ مگر صرف ایک خواب تھا جس کے سہارے لوگ زندہ تھے یا زندہ رہنے کا ناٹک کر رہے تھے۔ ویسے زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی خواب ضروری ہوتا ہے چاہے وہ خوابِ مستقبل کے حسین خواب ہی کیوں نہ ہو۔ مگر جب یہ خواب دھیرے دھیرے بکھرنے لگے، تو فرد اپنے اندر ہی اندر ٹوٹنے اور بکھرنے لگا۔ پاکستان میں سنہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ اور مستقل غیر یقینی صورت حال اور غیر محفوظیت کا احساس دھیرے دھیرے آدمی کو ذہنی طور پر کھا رہا تھا۔ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی بیکاری۔ تعلیمی سرمایہ داری اور فرقہ وارانہ فسادات نے فرد کو اندر ہی اندر توڑ کر رکھ دیا۔ نئی نسل کے سامنے ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کیا کرے؟ کیوں کرے؟ کیسے کرے؟ اور کس کے لیے کرے، ایک خواب تھا جو بکھر چکا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے پاس بھی کوئی نیا نعرہ نہیں تھا۔ پرانا اپنی چمک دمک کھو چکا تھا۔ نتیجتاً فرد انفرادی طور پر اپنے اندر ہی اندر ٹوٹنے اور بکھرنے لگا۔ یہ شکست انفرادی نہ رہ کر اجتماعی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ اس کا اظہار بھی ہونے لگا۔ چاہے وہ شاعری ہو یا کہانی سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان دو کہانیاں تو ضرور لکھیں مگر کوئی نئی کہانی نہ دے سکے۔ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ حضرات بھی اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ ہندی میں بھی صورتِ حال بالکل یہی تھی، ہندی میں "موہ بھنگ" والی کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ گیان رنجن اور کاشی ناتھ سنگھ وغیرہ نے ذاتی اور انفرادی شکست و ریخت کو کہانی کا موضوع بنایا۔ مگر کملیشور، اور کامتا ناتھ اور مدھوکر سنگھ نے آدمی عام کی کہانیاں، جو اس ذاتی اور سماجی شکست و ریخت سے پرے کی کہانیاں تھیں ان کی یہ کہانیاں بائیں بازو کی انتہا پسند کہانیاں تھیں اور اردو کہانیوں میں یہ رویہ اس زمانے میں لاکھ تلاش کے بعد بھی نہیں ملے گا۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد ہندی کہانیوں پر کہانی کی مانگ اور تجارت حاوی رہی۔ یعنی بازار جیسی کہانی چھپے۔ ویسی کہانی لکھی جائے چنانچہ کہانی میں وہ پرانے گھسے پٹے موضوعات در آئے۔ محبت، دولت، اور نفرت کے ارد گرد کہانیاں بھی

نے لگیں۔ دیپتی کھنڈیلوال۔ نروپما سیوتی، مرنال پانڈے وغیرہ نے ایسی کہانیاں لکھیں۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد ہندی کہانی ایک مقام پر آکر ٹھہر سی گئی۔ مختصر طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جتنی اچھی کہانیاں ہندی میں سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان لکھی گئی تھیں ۱۹۶۰ء اور سنہ ۱۹۷۰ء کے درمیان ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان لکھی جانے والی کہانیوں میں امرکانت کی ڈپٹی کلکٹر، رکنڈے کی ننہا جانی اکیلا، بھارتی کی گل کی بنّو، بھیشم ساہنی کی چیف کی دعوت، وغیرہ۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد تو یہ تعداد اور بھی گھٹ گئی اور محسوس ہونے لگا کہ ہندی کہانیوں پر ایک جمود سا طاری ہو گیا ہے غالباً اسی لیے قرۃل ورما نے کہا ہے کہ اگر کہانی کو نئے معنی پانا ہیں تو ہمیں بات کہانی کی موت سے شروع کرنی چاہیے یعنی کہانی کے نام پر جو ڈھانچہ ہے اُسے توڑ دینا چاہیے۔

اردو میں صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے، ۱۹۵۰ء میں جو لوگ کہانیاں لکھ رہے تھے سنہ ۱۹۶۰ء میں بھی انھیں کی کہانیاں سامنے آئیں، ان میں ترقی پسند افسانہ نگار زیادہ تھے منٹو، بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی وغیرہ۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ فہرست ذرا طویل ہو جاتی ہے اور ان میں دو ایسے شامل ہو جاتے ہیں جو اپنے پیش رؤں سے ہر معنی میں مختلف تھے، وہ ہیں قاضی عبدالستار۔ اور قرۃ العین حیدر۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اقبال متین اور گدی وغیرہ نے کچھ اچھے افسانے لکھے، مگر قاضی عبدالستار اور قرۃ العین حیدر کے علاوہ اور کوئی نام ایسا نظر نہیں آتا جس نے سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۶۰ء یا ۱۹۷۰ء کے دوران اردو کہانیوں کے رائج اسلوب اور موضوع سے ہٹ کر کہانیاں لکھیں ہوں۔

۱۹۷۰ء کے بعد اردو کہانی کاروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ جو پرانے کہانی کاروں سے یکسر مختلف تھے "کہانی" کے لحاظ سے اور کہانی کے اظہار کے لحاظ سے بھی نئے کہانی کاروں نے دنیا کو اپنی ذات کو بھی ایک نئی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے اپنی ذات کو بھی کہانیوں کا موضوع قرار دیا۔ انھوں نے اپنے اندر کے "میں" کو باہر نکال کر کہانیوں میں سمویا چنانچہ کہانیوں کا علامتی اظہار کہانی کا ایک نیا ڈھانچہ لے کر سامنے آیا۔ اب کہانی میں ریاضی سے بھی مدد لی جانے لگی۔ مختصراً ہم اتنا کہہ سکتے ہیں بلراج مین را، سریندر پرکاش اور احمد ہمیش وغیرہ نے کہانیوں کو ایک نئے افق سے آشنا کیا۔

۱۹۷۰ء کے بعد اردو کہانی میں جن کی پہچان ہوئی ان میں "سلام بن رزاق"، صغرا مہدی، فیاض رفعت، کنور سین، حمید سہروردی، سلطان سبحانی، شمس الحق عثمانی، انور خاں، انیس اشفاق، فیروز عابد، شفق، شوکت حیات، قمر احسن، ظفر اوگانوی، رضوان، احمد اور انیس رفیع قابل ذکر ہیں۔

ان نئے افسانہ نگاروں کو میں دو خانوں رکھتا ہوں۔ پہلے خانے میں قمر احسن، شوکت حیات اور شفق وغیرہ ہیں۔ دوسرے خانے میں سلام بن رزاق، انور خاں اور رضوان احمد وغیرہ ہیں۔ قمر احسن، شوکت وغیرہ علامتی کہانیاں لکھتے ہیں۔ شوکت تو کہانی کے اظہار ہی کو اصل کہانی سمجھ بیٹھے ہیں۔ نتیجتاً وہ کہانی پر سے قابو کھو دیے ہیں اور کہانی، کہانی کے علاوہ اور کچھ ہو جاتی ہے۔ رضوان احمد، سلام بن رزاق اور انور خاں کہانی پر اپنا قابو برقرار رکھتے ہیں۔ اور کہانی میں کہانی پن اور بیان کے قائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ شفق اور شوکت حیات کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب ہیں۔ فیروز عابد بھی اپنی کہانیوں کے تانے بانے کسی ٹھوس واقعے کے ارد گرد بنتے نظر آتے ہیں اور ان کی کہانیوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔

انیس اشفاق، سجاد ظہیر اور انیس رفیع کی کہانیاں مندرجہ بالا کہانیوں سے مجھے یکسر مختلف نظر آتی ہیں، انیس اشفاق

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھیے)

محمد عبدالکریم ماہر حیدرآبادی

(نذرِ زور)

شرما کے گُل نظر نہ ملائیں تو کیا کریں
کانٹے ہی بڑھ کے آنکھ بچھائیں تو کیا کریں
زخموں تھپک تھپک کے سلائیں گے ہم تمہیں
جھونکے اگر ہوا کے جگائیں ۔ تو کیا کریں
کچھ بھی ہو احترامِ بہاراں ضرور ہے
کنجِ قفس اگر نہ سجائیں تو کیا کریں
ڈر ہے کہ مر نہ جائیں روایاتِ فکر و فن
غم کو جو شعر میں نہ چھپائیں تو کیا کریں
ہنس لو جو ہم نے شمع جلائی ہے صبح دم
بیدار جب کسی کو نہ پائیں تو کیا کریں،

ماہر جنونِ شوق گوارا تمام عمر
لمحے خرد کے دھوم مچائیں تو کیا کریں،

عزم انصاری

زنداں سے رہا ہو کے ہوئے اور پریشاں
پروردۂ صیاد تھے ارباب گلستاں
ترتیب دیا کس نے یہ آئینِ گلستاں
ہر خار ہے نکھرا ہوا ہر پھول ہے ویراں
یہ کون ہے رعنائیٔ فردوس پہ نازاں
سیکھی نہیں کیا اس نے تری چشمِ غزالاں
کہہ دو یہ بہاراں سے ذرا ٹھہر بھی جائیں
سینا ہے ابھی مجھ کو مرا چاک گریباں
تنہا کبھی چھوڑا نہ مہربانوں نے مجھ کو
ساتھی غمِ جاناں تھا کبھی تھا غمِ دوراں
اے دوست عنایت سے تری آج مرا دل
اک شہرِ خموشاں ہے جو تھا شہرِ نگاراں
کیا خوب اجالا ہے کہ اب اپنے چمن میں
جلتے ہیں نشیمن بھی بعنوانِ چراغاں
رخ پھیر دیا اُن کا مرے عزم نے آخر
اُٹھے تھے بڑے زور سے ہر سمت سے طوفاں

نصیر پرواز

سارے پیکر جل گئے پرچھائیاں باقی رہیں
روز و شب کی بھیڑ میں تنہائیاں باقی رہیں
اور تو سب فاصلے لمحات نے پُر کر دیئے
روح میں صدیوں کی گہری کھائیاں باقی رہیں
بے حسی کی راکھ میں اب کوئی چنگاری نہیں
صرف یاروں کی کرم فرمائیاں باقی رہیں
سو گئی غاروں میں جا کر شہر کی بوجھل ہوا
گاؤں میں بیدار کچھ انگنائیاں باقی رہیں
جلد کی رنگت تو سورج کی تپش نے چاٹ لی
صرف چہرے پر غموں کی جھائیاں باقی رہیں
بانٹ لیں لوگوں نے آپس میں خوشی کی بستیاں
میرے حصے میں خیال آرائیاں باقی رہیں
جیسے تجھ پر وقت نے ڈالا نہیں کوئی نقاب
تیرے چہرے پر سبھی رعنائیاں باقی رہیں
ہو چکیں پرواز ساری وسعتیں بے پیرہن
دیدۂ احساس کی پہنائیاں باقی رہیں،

پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی

قندِ مکرر

گولکنڈہ کی عظمت

گولکنڈہ کی دوسو سال کی تاریخ ہے ۔ دکن کی اور ہمسر سلطنتوں کے ساتھ پندرھویں صدی کے آخری عشرہ میں اس کی داغ بیل پڑی تھی اور سترھویں صدی کے اواخر میں اس کا رشتۂ حیات منقطع ہوا ۔ یہ تلنگانہ کی سلطنت تھی اور اس طرح یہ ہندوستان کے عظیم الشان تمدنی مرکزوں اور شاہراہوں سے اس قدر دور تھی کہ اس کا بہت سوں کو علم نہیں تھا ۔ اور اب بھی ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے بادل ناخواستہ اس کا ذکر کر دیتے ہیں اور بہ مشکل اس کو تاریخ ہند کے ایک باب میں جگہ دیتے ہیں ۔ وسط ایشیا کے تاجر صرف ہیروں کی وجہ سے اس کو یاد کر لیتے تھے ۔ باہر کے سیاح سرراہے اس کے کھنڈر دیکھنے کے لئے آجاتے ہیں ۔ حیدرآباد کے رہنے والے اس سلطنت کو زر و جواہر کے ان دفینوں کی وجہ سے یاد کر لیتے ہیں جن کو قطب شاہوں نے اڑے وقت کے لئے اندوختہ کیا تھا ۔ لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو سلطنت گولکنڈہ آندھرا پردیش کی بہت بڑی سلطنت تھی ۔ اس کی وہ تاریخ ہے جس کے ہر دو جز میں تمدن کی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں یہ وہ سلطنت تھی جس کا خوش گوار تمدن دوسو سال تک تلنگانہ کے رہنے والوں کو گرویدہ کئے ہوئے تھا اور مغربی سیاحوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں ۔ اس کے کھنڈروں میں نہ صرف زر و جواہر کے دفینے ہیں بلکہ قیمتی تمدن کی نشانیاں بھی ہیں ۔ اطالوی سیاح لوئی نے گولکنڈہ کا نظر افروز مرقع کھینچ کر لکھا تھا کہ " یہ ہے وہ گولکنڈہ جو تین صدیوں تک ہندوستان کا عجوبہ بنا ہوا تھا"۔

گولکنڈہ کی سلطنت بڑے آب و تاب کے ساتھ قائم کی گئی تھی اور اس کی تعمیر میں وہ نصب العین شامل تھا جو ایک [illegible] سلطنت کے لئے ضروری تھا ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کی تاسیس اور تعمیر ایسے ہاتھوں سے ہوئی تھی جو دنیا کے بڑے تاریخ ساز تھے ۔ اور بہت بڑی خاندانی روایات کے ساتھ تلنگانہ آئے تھے ۔ سلطان قلی قطب شاہ اس سلطنت کا بانی ہے جس کو اہل گولکنڈہ "بڑے ملک" کے مقبول عام نام سے یاد کرتے تھے ۔ اس کے ذاتی اوصاف یعنی بلند پایہ علمیت اور تجربہ کے ساتھ خاندانی اعزاز و وجاہت بھی شامل تھی ۔ ترکستان کے مشہور قراقوئیلس قبیلے سے اس کا تعلق تھا جس نے جہاں شاہ اور سکندر ثانی جیسے جلیل القدر حکمران پیدا کئے تھے ۔ خود سلطان قلی کے باپ دادا ہمدان کے ولی رہ چکے تھے ۔ اور اس طریقہ سے سلطنت کی خاندانی روایات اس کے شامل حال تھیں ۔ اس کے علاوہ

سلطان قلی پہلے بہمنیوں کی عظیم الشان سلطنت کا حلقہ بگوش رہ چکا تھا جو اپنے بلند پایہ تمدن سے دنیا کو گرویدہ کئے ہوئے تھی ۔ یہ صحیح ہے کہ جب وقت سلطان قلی بیدر آیا تھا اس سلطنت کا سفینۂ حیات بڑے سخت منجدھار میں تھا ۔ تاہم اس سلطنت نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنے خوش گوار تمدن کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ جو کبھی نہیں ہو سکتے ۔ تمام قطب شاہی سلاطین اس تمدن کے خوشہ چیں تھے ۔ سلطان قطب شاہ نے اپنے فیاض مربی محمود شاہ بہمنی کے دربار سے حکمرانی کے بہت سے تجربے سیکھے تھے اور ظاہر ہے کہ دکن کے لئے خاص سرمایۂ سیاست کی ضرورت وہ صرف بہمنی دربار سے حاصل ہو سکتا تھا ۔ سیاست کے اس زریں سرمایہ کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ تلنگانہ میں پہلے صوبہ دار کی حیثیت سے آیا تھا اور اس شخص کے لئے جو آئندہ تلنگانہ کا بادشاہ ہونے والا تھا یہ صوبہ داری مفید تھی ۔ جب سلطنت قائم تو اس کے لئے وہ اسلوب اختیار کیا گیا جو اس کے جغرافیہ اور قدرتی خصوصیات کے مناسب تھا حکومت کی ضبط و تنظیم کی گئی ۔ لائق ارباب بست وکشاد مامور کئے گئے اور قلعہ گولکنڈہ کو سلطنت کا مرکز بنایا گیا ۔ اور جہاں تک زمانہ اجازت دے سکتا تھا سلطنت کو جغرافی حدود تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ۔ اور قلیل مدت میں جدید رعایا کی اس قدر دلجوئی کی گئی کہ اہل تلنگانہ سلطان قلی قطب شاہ کو اپنا بادشاہ سمجھنے لگے تھے جو سلطنت گولکنڈہ کا خاص امتیاز ہے یعنے شروع ہی سے اس کی بنیاد رعایا پروری اور مذہبی و قومی رواداری پر رکھی گئی تھی ۔ اس تمام پیش رفت میں سلطان قلی قطب شاہ کی پختہ کاری ظاہر ہے لیکن اس کا ساتھ اس کا جذبۂ وفاداری بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے ۔ جب تک سلطان محمود شاہ بہمنی زندہ تھا اس وفادار صوبہ دار نے خود مختاری کا اعلان نہیں کیا حالانکہ بہمنی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر شمال کے تمام صوبہ دار خود مختار ہو رہے تھے اور خود سلطان قلی نے اپنے مربی کی زندگی تک خود مختاری کی جراءت نہیں کی ۔ مسجد صفا کا کتبہ سلطان قلی کی وفاداری کی بڑی یادگار ہے جس کے پڑھنے کے بعد اس کی وفاشعاری میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہو سکتا ۔ نیز فرشتہ نے لکھا ہے کہ جب بریدیوں کی ناعاقبت اندیشی اور بےوفائی نے محمود شاہ بہمنی کو اس قدر جکڑ دیا کہ وہ اپنی روزمرہ ضروریات کے لئے محتاج ہوگیا ۔ تو سلطان قلی گولکنڈہ سے پانچ ہزار ہون بادشاہ کی خدمت میں بھیجتا تھا ۔ اس سے زیادہ اس کی وفاداری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے ؟

سلطنت کی داغ بیل ڈالنا ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اہل ملک کے ذہنی اور اخلاقی تربیت کا سامان پیدا کرنا اور ملک میں تمدنی ذخائر جمع کرنا سلطنت کا حقیقی نصب العین ہوتا ہے ۔ ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ جو گولکنڈہ کے معمار ہیں اس کام کے لئے وقف تھے ۔ گولکنڈہ کی تاسیس ہو چکی تھی، اب اس سلطنت کو ارتقائے تمدن کی شاہراہوں پر ڈالنا تھا ۔ ابراہیم قطب شاہ نے ارتقائے تمدن کا ایک خاکہ تیار کیا اور اس کے راستے ڈال دیئے ۔ اس کے لائق جانشین محمد قلی قطب شاہ نے اس کی تکمیل کی، زراعت کا انتظام کیا گیا پانی کے خزانے بنائے گئے جو تمام تلنگانہ میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ شہروں کی تعمیر کر کے اہل تلنگانہ کی تمام ذہنی اور اخلاقی قوتیں ایک جگہ جمع کر دی گئیں تاکہ اس سرچشمہ کی سوتیں ملک کے تمام طول و عرض میں پھیل سکیں، مسجدیں بنائی گئیں اور مدرسے قائم کئے گئے ۔ باغ و عمارات کے ذریعہ فنون لطیفہ کی اس قدر خدمت کی گئی کہ اس کی ہندوستان میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں ۔ مغربی سیاح اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں ۔ سلطان محمد قطب شاہ کا عہد اس دورِ ترقی کا تتمہ تھا ۔ سلطان محمد نے اپنی پاکیزہ زندگی اور زہد و تقویٰ سے اس سلطنت کو چاند لگا دیئے تھے ۔ یہ عجیب خوشگوار اتفاق تھا کہ سلطان محمد کی شادی محمد قلی قطب شاہ کی مشہور بیٹی حیات بخشی بیگم سے ہوئی تھی :
گولکنڈہ کی ہیروئن ہے ۔ یہ ایسا مبارک سنجوگ تھا کہ اس کی برکتیں برسوں تک اہل گولکنڈہ کو فیض یاب کرتی رہیں ۔ حیات بخشی بیگم

نہ صرف خاندانی فرائض انجام دیئے بلکہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ۴۰ سال تک گولکنڈہ کی سیاسی رہنمائی بھی کی اور گرتی ہوئی سلطنت کو
پایا۔ ۱۶۳۶ء کے بعد جب سلطان محمد کے ساتھ دکن کے تمام رہبر دنیا سے رخصت ہوگئے اور مغلوں کی گھٹائیں چوطرف چھانے لگیں تو
قطب شاہی خاندان کی یہ ہیروین تنہا گولکنڈہ کے لئے سینہ سپر تھی۔ جب ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب کی فوجوں نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور
تمام ارباب سیاست بے دست و پا ہو کر رہ گئے تو اسی ہیروین نے گولکنڈہ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی تھی۔
محاصرین سے مردانہ وار گفتگو کر کے بیچ بچاؤ کیا۔
اگرچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے بہت ہمت شکن ہے کیونکہ اس دور میں خود گولکنڈہ کا اخلاقی
انحطاط اور کچھ مغل حکومت کی بیجا دست درازیوں سے تمام سیاسی زمینیں خشک اور دماغ معطل ہو کر رہ گئے تھے لیکن اس کے باوجود گذشتہ
روایات فنا نہیں ہوئیں۔ تمدنی کام برابر ہوتا رہا۔ اس افراتفری کے زمانہ میں جب کہ ۱۶۵۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کی فوجوں نے قلعہ
کا محاصرہ کر لیا تھا گولکنڈہ نے اپنی روایتی خود داری اور اولوالعزمی ہاتھ سے جانے نہیں دی۔ مغل فوج کے مقابلہ میں اہل قلعہ نے اس قدر
دل کھول کر مدافعت کی کہ شہنشاہی طاقت کے باوجود قلعہ کی تسخیر کے لئے آٹھ مہینوں سے زیادہ لگ گئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوئی تھی کہ چند
بیوفاؤں نے قلعہ کے دروازے کھول دیئے تھے۔ لیکن اس حوصلہ فرسا ماحول میں بھی گولکنڈہ میں اکثر افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے
اپنی روایتی وفاداری کے لئے اپنی عزیز جان سے بھی دریغ نہیں کیا۔ گولکنڈہ کے محاصرے کے ساتھ دکن کے ہیرو عبدالرزاق لاری کا نام
ہمیشہ یادگار رہے گا جس نے اپنے بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ کے لئے ہر قسم کی قربانی کی۔ رات کی تاریکی میں جب دشمن قلعہ میں گھس آئے
تو عبدالرزاق دیوانہ وار دشمن کی تلواروں پر گر گیا۔ جب تک اس کے ہوش برجا تھے "تا جان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود" کی دل
ہلا دینے والی آواز دور دور تک سنائی دیتی رہی۔ اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس انتشار میں جب کہ قلعہ کے اندر ہر طرف بدحواسی
طاری ہوگئی ابوالحسن قطب شاہ کا اطمینان قلب ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ جب شہنشاہی افسر اعتبار خاں اور روح اللہ خاں اس کو گرفتار
کرنے کے لئے آئے تو انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ ابوالحسن اپنی شاہی نشست پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے چہرہ سے ذرہ برابر پریشانی ظاہر
نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پوری دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی اپنے تمام معمولات پورے کئے اور اتفاق یہ ہے کہ اس اثنا میں اس کے کھانے کا
وقت بھی آگیا تو حسبِ عادت کھانے میں شرکت کی گئی اور دسترخوان پر دوست و دشمن سب بٹھائے گئے۔ اور گفتگو کے دوران میں ان
مغل افسروں نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آپ اس قدر خاطر جمع معلوم ہوتے ہیں۔ ابوالحسن نے کہا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ خدا نے مجھے
یہ عزت دی تھی وہ اس کو واپس لینا چاہتا ہے قدرت کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں ہر شخص کو سر تسلیم خم کرنا چاہیئے"۔ اگرچہ انھیں مغل افسروں
نے ہندوستان میں ایسے بے شمار بدقسمت تاجداروں کو گرفتار کیا تھا لیکن یہ بلند کردار سوائے گولکنڈہ کی دیواروں کے کسی جگہ نہیں پائے گئے۔
جس طرح سلطنت گولکنڈہ کی تاسیس ایک بلند پایہ اخلاق کی روشنی میں ہوئی تھی اسی طرح اس کا خاتمہ بھی خودداری اور اولوالعزمی کا سچا مظاہرہ تھا۔
قطب شاہ بہت بڑے تمدن کے شمع بردار تھے۔ ان تاجداروں نے نہ صرف ترکستان اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے اپنا سرمایہ حاصل
کیا بلکہ اس کو تلنگانہ کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا تھا کہ یہ ایک نئی چیز معلوم ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے
اس بات کو بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ان کی سلطنت تلنگانہ میں بحیثیت ترکستانی اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی اس طرح
شامل ہونے چاہئیں کہ یہ اس سرزمین کی خصوصیات کا پورا جواب دے سکے۔ سچ پوچھو تو سلطنت گولکنڈہ کا سرمایۂ افتخار یہ ہے کہ اس نے

اپنے آپ کو تلنگانہ کی قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہونے لگی۔ اور شاہانِ قطبیہ آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ گولکنڈہ کی سلطنت صرف تلنگانہ کے حدود پر قائم تھی جس میں ایک جغرافیہ اور ایک قوم تھی اس لئے قطب شاہی حکومت کے لئے اس ملک کی خصوصیات اور جذبات کی صحیح پیمائش کر کے اس کی تمدنی تعمیر کرنا آسان تھا۔ اس ملک میں انہوں نے ہر قسم کی تعمیر کی۔ سچی بات یہ ہے کہ قطب شاہی خاندان کا تلنگانہ آنا اس ملک کے لئے آیۂ رحمت ثابت ہوا۔ اس کے یہاں آنے سے تلنگانہ کے جسد مردہ میں زندگی کی ایک رو دوڑ گئی۔ اس خاندان نے آندھرا قوم کو آگے بڑھایا۔ ان کی زبان کو ترقی دی اور اس میں بہت بڑا ادب پیدا کیا اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیئے اور غالباً یہ تلنگانہ کا سنہری زمانہ تھا۔

حکومت کی ضبط و تنظیم میں گو سلطنت بہمنی کا تجربہ آزمایا گیا تھا لیکن مقامی حالات کا بھی پورا لحاظ تھا۔ سلطنت کا وقار مرکزی حکومت کے رعب داب سے ہوتا ہے۔ قطب شاہی دربار جو بادشاہ اور اس کے وزراء اور امراء پر مشتمل ہوتا تھا عجیب شان رکھتا تھا۔ بادشاہوں کا جلوس جب کہ امراء و وزراء ہمرکاب ہوتے تھے اور اس کے ساتھ فوجوں کی قطاریں ہوتی تھیں خاص کیفیت پیدا کرتا تھا۔ باہر کے لوگ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ مغربی سیاح شاہی دربار اور جلوس کی شان و شوکت کو اس قدر دلچسپی اور حیرت سے بیان کرتے ہیں کہ یہ چیز کہیں ان کے مشاہدہ میں نہیں آئی اور یہ گولکنڈہ کے لئے خاص تھی۔

اہلِ حیدرآباد کو وہ نظارہ بھی یاد ہے جب کہ بادشاہ شاہ نشین پر بیٹھتے تھے اور تمام قطب شاہی افواج قلعہ کے مشرقی دروازہ سے داخل ہو کر شاہی سلام کی عزت حاصل کرتی تھیں۔ گولکنڈہ کا سیاسی وقار اس بات میں تھا کہ قطب شاہی سلاطین اپنی سلطنت کی کارکردگی اور اس کے رکھ رکھاؤ کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ وہ خود بھی قابل پڑھے لکھے تھے۔ اور اس کے علاوہ وہ اپنی پوری مردم شناسی صرف کر کے سلطنت کی رہنمائی کے لئے بہترین اربابِ حل و عقد جمع کرتے تھے۔ گولکنڈہ کے وزراء کی بھی ایک بہت بڑی فہرست ہے جس میں غیر معمولی قابلیت کے افراد تھے۔ حضرت مومنؒ استرآبادی اور حضرت حسین شاہ ولیؒ کی علمی اور عملی قابلیت نہ صرف دکن میں مشہور تھی بلکہ مشرقی ممالک میں اس کے چرچے تھے۔ ان وزراء نے گولکنڈہ کی ذہنی اور مادی ترقی میں جو حصہ لیا اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

نمایاں قطب شاہوں کی یہ اخلاقی اور سیاسی عظمت ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے جو سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت کہے گئے تھے۔ اس مبارک تخت نشینی کے وقت حضرت مومنؒ استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے ایک قصیدۂ تہنیت پڑھا تھا جو ان تمام ترقیوں کا خلاصہ ہے:

با محبت باز بستم عہد و پیمان نوی	کہنہ جامے می نشانم پیش جاناں نوی
سر مرشد خاک تلنگانہ زفرخ پائے تو	اے فدائے خاک پایت ہر زماں جاں نوی
گر صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ	حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ قطب شاہی خاندان بھی کبھی علم کا سچا پرستار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیجاپور کے ساتھ ساتھ اس خاندان نے بھی علمی اور ادبی سرمایہ میں بیش بہا اضافے کئے تھے۔ یوں تو اس خاندان کے تمام سلاطین ذی علم تھے۔ فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے گولکنڈہ کی سلطنت قائم ہوئی تھی تلنگانہ میں علم کی بساط بچھ گئی۔ یہاں سے دور دور سے آکر علماء جمع ہونے لگے۔ بہمنی سلطنت کی طرح گولکنڈہ بھی اہلِ علم کی پناہ گاہ بن گیا۔ لیکن اس خاندان کے آخری چار سلاطین دنیائے علم و ادب کے

مشاہیر ہیں جنھوں نے علم و ادب کی غیر معمولی سرپرستی کی ۔ یہ سرپرستی نہ صرف فارسی زبان اور تلنگی کی ترقی کا باعث ہوئی بلکہ ان کی علم نوازی نے ایک طرف مقامی زبان تلنگی کو فروغ دیا تو دوسری طرف اُردو ادب کی بنیاد بھی ڈالی ۔ ابراہیم قطب شاہ کو علمی خدمت سے اس قدر گہرا شغف تھا کہ اس نے دنیائے ادب میں ایک ہلچل پیدا کردی تھی ۔ فارسی کے ساتھ تلنگی زبان کی سرپرستی اس کا طغرائے امتیاز تھا ۔ اس نے مدرسے قائم کئے تھے جہاں طلبا کو وظیفے اور انعامات دیئے جاتے تھے ۔ طلبا و شعرا شاہی محل میں رکھے جاتے تھے ۔ محمد قلی قطب شاہ کی علمی شہرت اس سے بھی زیادہ ہے ۔ یہ حکمران جس طرح اپنی تعمیر کاری کے لئے مشہور ہے اس سے زیادہ اس کو علمی سرپرستی کی عزت حاصل ہے ۔ یہ بہت بڑا شاعر تھا ۔ اس کی شاعری فارسی، اُردو اور تلنگی پر حاوی ہے ۔ ہر زبان میں اس کے دیوان موجود ہیں ۔ ادبا جانتے ہیں کہ اس کے اصنافِ سخن کی گہرائی اور لطافت بڑے بڑے استادوں کو محو حیرت کردیتی ہے ۔ چارمینار کی تعمیر ہوئی تو اس پر بھی مذہبی ضروریات کے ساتھ تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا ۔ سلطان محمد قطب شاہ کی زندگی تمام تر علمی خدمات کے لئے وقف تھی ۔ اس نے اپنی خاندانی روایت اور اعلیٰ ذوق سے پورا فائدہ اٹھایا تھا ۔ شاعروں اور ادیبوں کی مخلصانہ سرپرستی کی تھی وہ خود بھی شاعر تھا ۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اس کے دیوان موجود تھے ۔ اگرچہ عبداللہ کا عہدِ حکومت مغلوں کے سیلاب کی وجہ سے ہمیشہ منتشر رہا ۔ اس وقت یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ اس عہد میں بھی کوئی علمی کام ہوگا ۔ لیکن حیرت بات یہ ہے کہ وہ علم کی رَو بند نہیں ہوئی ۔ عبداللہ کو بھی علم کا اچھا ذوق تھا یہ خود بھی شاعر تھا اس کے بھی فارسی اور اُردو میں دیوان موجود ہیں اور عجیب چیز یہ ہے کہ اس کے عہد میں اردو سلطنت کی مستند زبان بن گئی تھی ۔ اور اُردو میں بڑا مواد جمع ہوگیا تھا ۔ ابوالحسن قطب شاہ کو سیاسی حیثیت سے بہت بدقسمت ہے لیکن اس کا ادبی ذوق اس کو قید میں بھی شعر گوئی کے لئے مجبور کرتا تھا ۔ اگرچہ اس کا کوئی دیوان نہیں ہے لیکن مختلف اشعار ہر جگہ ملتے ہیں اور جب تک وہ برسرِ حکومت رہا اس نے مقدور بھر علم کی سرپرستی کی ۔

ان بادشاہوں کی علم دوستی کا نتیجہ یہ تھا کہ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں بے شمار علم و ادب کے خوش گوار حلقے بن گئے تھے ، دیوان لکھے گئے ، تاریخیں لکھی گئیں ، فلسفہ و منطق پر کتابیں تیار ہوگئیں ۔ حضرت میر مومنؒ استرآبادی کا استادانہ کلام جو سلطنت کی ہر تقریب میں کہا گیا تھا اب بھی بہت سوں کے زبان زد ہے ۔ دکھنی شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جو ایک مستقل مضمون کی طالب ہے ۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کے شاعر وجہیؔ کو دنیائے اُردو کبھی نہیں بھول سکتی جس نے اپنے مختلف اصنافِ سخن سے گولکنڈہ کی علمی فضا مسحور کر رکھی تھی ۔ اس کی نظمیں سب رس اور قطب مشتری دکھنی ادب کے شہ پارے ہیں ۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے شاعر غواصیؔ اور ابن نشاطی اردو کے بڑے محسن ہیں جو شاہی دربار کی آد بھگت سے اپنے کمال کو دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے ۔ غواصیؔ کا طوطی نامہ اور ابن نشاطی کی پھول بن' ادبی بلند پردازی کا بہترین مواد ہے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ بیجاپور کے مقابلہ میں گولکنڈہ کی علمی خدمات اور ادبی سرمائے زیادہ مستقل اور پائیدار ثابت ہوئے ۔ بیجاپور کے خاتمہ کے بعد یہاں کے تمام علمی چراغ گل ہوگئے اور علمی دنیا میں بیجاپور کا نام کبھی نہیں سنائی دیا ۔ لیکن یہ غالباً قطب شاہوں کے بلند حوصلے تھے کہ گولکنڈہ کے زوال کے بعد ان کی علمی روایت باقی رہیں ۔ اگرچہ مغلوں کے سیلاب سے گولکنڈہ ویران ہوگیا اور علماء و شعرا ملک کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں نکل گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ٹوٹا ہوا گھر پھر کبھی نہ جڑے گا ۔ لیکن دکن کی خوش قسمتی سے چالیس سال بعد ہی سلطنتِ آصفیہ قائم ہوگئی اور اس کی بدولت گولکنڈہ کی تمام علمی روایتیں محفوظ ہوگئیں ۔

اگرچہ قطب شاہوں کی سیاست اور علم نوازیاں ایک افسانہ ہوکر رہ گئیں لیکن ان کے تعمیر کئے ہوئے شہر و عمارات ان کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس وقت موجود ہیں۔ پہلے خود گولکنڈہ کو آباد کیا گیا تھا اس میں تمام شہری ضرورتیں بہم پہنچائی گئی تھیں۔ یہ اتنا بڑا شہر ہوگیا تھا کہ دکن کا مشہور مورخ خافی خاں لکھتا ہے کہ " از وسعت آں بہ مرتبہ نقل می نمائند تا چہل ہزار سوار اندرون حصار می گنجند۔ عمارتہائے عالی و دلنشیں تا حصار داشت"۔ لیکن قطب شاہوں کی بلند خیالی اور گولکنڈہ کی بڑھتی ہوئی آبادی اس بات کی مقتضی تھی کہ قلعہ سے باہر وسیع رقبہ میں ایک بڑے شہر کی تعمیر کی جائے۔ دریائے موسیٰ کی خوش گوار وادی اس کے لئے منتخب کی گئی۔ یہ آندھرا پردیش کی مبارک گھڑی تھی جب کہ ۱۵۹۰ء میں شہر بھاگ کی بنیاد رکھی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مرکز نقل دریافت کرکے چارمینار کی سی سڈول عمارت قائم کی گئی جس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ عجیب دلفریب منظر تھا کہ موضع چھلیم کے چھوٹے بڑے معمار تلنگی گیتوں کو کورس میں چارمینار تعمیر کرتے تھے اور اس کا مسالہ جمع کرتے تھے۔ یہ ایسی خوش آئند تقریب تھی کہ اہل حیدرآباد کو برسوں تک یاد تھی۔ اس سڈول عمارت کو شہر کے بیچ میں قائم کرکے چاروں طرف سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف بے شمار عمارتیں نکالی گئیں۔ اس کے علاوہ مدارس، شفاخانے، مساجد اور حمام بنائے گئے اور مسافروں کے لئے کاروان سرائیں تعمیر کی گئیں۔

غرض اس شہر میں وہ تمام عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں جو ایک متمدن شہر کے لئے ضروری ہے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کا اکیلا شہر تھا جس میں زمانۂ حال کی خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ اس شہر کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر لاتی تھی اور محو حیرت کرتی تھی۔ جو سیاح یورپ سے ہندوستان کی سیاحت کے لئے آتے تھے وہ بھاگ نگر کو دیکھنے کے لئے ضرور آتے تھے۔ برنیر، ٹیوریز اور تھیونو کے سیاحت ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر کے لوگ بھاگ نگر سے کس قدر متاثر تھے۔ حالانکہ یہ سیاح شمال کے عظیم الشان شہنشاہی شہروں کو دیکھ کر آتے تھے جن سے مغل سلطنت کی پوری عظمت ٹپکتی تھی۔ اس کے باوجود شہر حیدرآباد کی تعریف کرنا بہت کچھ حیرت انگیز ہے۔ مورخ فرشتہ نے جس کے زمانے میں شہر حیدرآباد کی تعمیر ہوئی تھی کہا تھا " شہرے کہ در شمالی ہندوستان شرقاً و غرباً، جنوباً و شمالاً مثل آں در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"۔ حالانکہ یہ اکبر و جہانگیر کا عہد ہے جب کہ آگرہ و لاہور جیسے شہنشاہی شہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے۔ اور ان کی شہنشاہی عظمت دور دور تک شہرت تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نوخیز شہر بھاگ نگر کی آن بان ان سے کہیں بڑھی ہوئی تھی۔ عہدِ عالمگیری کا مورخ کہتا ہے " حوضہائے آں شہر لطافت آب و ہوائے آں سرزمین و صفہائے تمکین آں سبز فام و سیر حاصلیٔ آں مرز و بوم اگر پیدازم از سررشتۂ سخن باز میمانم"۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ محمد ساقی جو شہنشاہ کے ساتھ تسخیر گولکنڈہ کے وقت موجود تھا حیدرآباد کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے " آرامگاہے است بر قطعہ زمین و بہشت راحت جسم و آرام جاں، آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال، عمارات رفیع تر از پایۂ اندیشہ رطوبت ہوا و عذوبت و روانی چشمہا شادابی سبزہ بمرتبہ کہ پنداری گل و سبزہ ایں سرزمین را آب و رنگ زمرد و لعل است"۔۔۔ حالانکہ عالمگیری عہد میں ہندوستان کے شہنشاہی شہروں کی جو حالت تھی وہ سب جانتے ہیں۔ آگرہ و لاہور کے علاوہ شاہجہاں آباد کی دنیا میں شہرت تھی۔ ان سیاحوں کا جو شاہجہاں آباد میں رہ کر آئے تھے حیدرآباد کی اس طرح تعریف کرنا اس شہر کی عظمت کا سچا ثبوت تھا۔ اس زمانہ میں خود اہلِ حیدرآباد بھی یہ سمجھتے تھے کہ حیدرآباد کے مقابلہ میں ہندوستان کے شہنشاہی شہر بے حقیقت ہیں۔ حیدرآباد کی تعریف میں ایران کے شہروں کی مثال

دی جاتی تھی ۔ شاہجہاں آباد کا کسی نے نام نہیں لیا ۔ چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت حضرت میر مومنؒ استرآبادی نے اپنے قصیدۂ تہنیت میں کہا تھا ؎

چوں صفاہان نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ　　حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوی

آندھرا سرزمین میں ایسے عظیم الشان شہر کی تعمیر ایک بہت بڑا تمدنی انقلاب تھا ۔ اس شہر کی تعمیر سے آندھرا دیس کے تمام طول و عرض میں ایک تمدنی لہر دوڑ گئی ۔ اس سرزمین کا جتنا تمدن ہے وہ کچھ تو قدیم سلطنت آندھرا کا دیا ہوا ہے اور باقی قطب شاہوں کا عطیہ ہے ۔ اس زمانہ میں بھی حیدرآباد آندھرا پردیش کا واحد شہر ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے ۔

قطب شاہوں کا تعمیری کام بھی بڑی عظمت کا حامل ہے ۔ قطب شاہوں نے جس ذوق اور سلیقہ سے اپنی عمارتیں بنوائی ہیں وہ ان کے عظیم الشان تمدن کی رہنمائی کرتی اور بتاتی ہیں ۔ یہ لوگ بہت بڑے تمدن کے پرستار تھے ۔ ان کا پاکیزہ ذوق اور بلند خیالی ان کی تمام عمارتوں سے ظاہر ہے ۔ عمارتوں پر لاکھوں روپے اور بڑی محنت صرف کی گئی ۔ بعض عمارتیں ایسی بنائی گئیں جو کئی عہدوں میں جا کر تیار ہوئیں ۔ اگرچہ ان عمارتوں کے بنانے والے جانتے تھے کہ یہ ان کی مختصر زندگی میں ختم نہ ہو سکیں گی لیکن ان کی بلند خیالی اس بات کو گوارہ نہیں کرتی تھی کہ کوئی چیز ان کے حوصلے سے کم بنے ۔ چارمینار اور مکہ مسجد تو ایسی عمارتیں ہیں جو دنیا کے عجائبات میں شمار کی جا سکتی ہیں ۔ ان کی رفعت و عظمت کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ۔ مکہ مسجد دنیا کی بہت بڑی عمارت ہے ۔ سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی ۔ رنگیا میستری اور فیض اللہ بیگ انجنیر نے اس کا کام شروع کیا تھا لیکن ۷۷ سال میں یہ کام ختم ہوا اور یہ اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جب کہ اورنگ زیب کی عملداری قائم ہوئی تھی ۔ ہزاروں آدمیوں نے اس پر کام کیا ہے ۔ اس کی اکیلی محراب جو صرف ایک پتھر سے تراشی گئی ہے پانچ سال میں تیار ہوئی تھی اور پانچ ہزار آدمیوں نے اس پر کام کیا تھا جب وقت فرانسیسی سیاح ٹیوریز گولکنڈہ آیا تھا اس وقت ابھی یہ مسجد ناتمام تھی ۔ اسی نامکمل مسجد کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ اگر یہ پوری ہو جائے تو دنیا میں سب سے بڑی اور ایشیا میں سب سے بہترین عمارت ہوگی ۔ اگر اورنگ زیب کی کفایت شعاری سنگ راہ نہ ہوتی تو آج اس کے مینار سلطان محمد کی حقیقی بلند خیالی ظاہر کرتے ۔ لیکن اس کوتاہی کے باوجود حیدرآباد کا یہ "بیت العتیق" قطب شاہوں کی اصل عظمت کو یاد دلاتا ہے ۔ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی عمارت نہیں ہے جو ہزاروں ہون کے خرچ کے ساتھ ۷۷ سال کی طویل مدت میں جا کر ختم ہوئی ہو ۔ آج بھی حیدرآباد میں یہ واقعہ سب کو یاد ہے کہ زہد و تقویٰ کے بڑے دعوے کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا ۔ اس مقدس رسم تاسیس منانے کے لئے سلطنت کے تمام علماء اور زہاد کو دعوت دی گئی کہ وہ سب اس میں شریک ہوں اور اس مجمع سے کہا گیا کہ رسم تاسیس وہ شخص انجام دے جس کی نمازِ تہجد بھی قضا نہیں ہوئی ۔ یہ قطب شاہی خاندان کی امتیازی شان ہے کہ اس پورے مجمع میں صرف بادشاہ ہی ایسے تھے جو اس معیار پر پورے اترے تھے ۔ خود سلطان محمد نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے سنگِ بنیاد رکھا تھا کہ بارہ سال کی عمر سے میری نمازِ تہجد کبھی قضا نہیں ہوئی ہے ۔ چنانچہ اہلِ مذہب اس بات کا دعوے کرتے ہیں کہ بادشاہ کی یہ معصومیت اس وقت بھی اس مسجد کے در و دیوار سے ٹپکتی ہے اور ۲۴ گھنٹوں میں کبھی یہ مسجد عبادت گذاروں سے خالی نہیں رہتی اسی وجہ سے اس زمانہ کے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

طوافِ خانۂ اشرف گرت میسر نیست　　بیا بہ کعبۂ ملک دکنؔ عبادت کن

قطب شاہوں کی حقیقی عظمت ان کے محلات سے ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے دوسال کی تاریخ میں قطب شاہوں نے اتنے قصر اور محلات بنائے تھے جو دنیا کے کسی خاندان نے نہیں بنائے۔ خود گولکنڈہ کے اندر جو سلطنت کا بڑا مستقر تھا، بے شمار محل بنائے گئے تھے۔ اس وقت یاد رکھنے کے لئے اگر چند کے نام گنائے جائیں تو الٰہی محل، محمدی محل، وحیدر محل وہ تھے جن پر کئی لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔ مشک محل اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے علحدہ شہرت رکھتا تھا۔ اور گولکنڈہ کی ایک تاریخ کے الفاظ ہیں "مثل آں قصرہا بروے زمین بناشدہ" سلطان محمد قطب شاہ نے خود کئی محل تعمیر کئے تھے اس کا بنایا ہوا امان محل اکیلا بہت بڑی تفصیل کا محتاج ہے۔ محل کی آرائش اور اس کے ساتھ جو باغ محمد شاہی بنا تھا اس کی دلچسپیاں سلطان محمد کے حقیقی ذوق کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا تھا کہ ؎

وہ چہ قصرے کو ز رفعت با فلک بوسا درش وہ چہ باغے کز لطافت ہست چوں باغ جناں

اگرچہ زمانہ کی ستم ظریفی اور مغل حملہ آوروں کی بے دردی نے ان کا خاتمہ کر دیا کئی محل ایسے ہیں جن کا نام و نشان باقی نہیں رہا صرف تاریخوں اور سیاحت ناموں کے صفحات پر ان کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی فنا ہو رہے ہیں لیکن ان کے بوسیدہ در و دیوار سے قطب شاہوں کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عمارتوں کا مسلسل وسیع دالان اور اونچے سقف پانچ پانچ اور سات سات منزلوں تک ان کی بلندی، بادشاہ اور بادشاہ بیگموں کی رہائش کا شاندار انتظام اور شاہ نشین کا رعب الفاظ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام تعمیروں کے ساتھ آب رسانی کا انتظام زیادہ حیرت انگیز ہے۔ تمام محلوں کے اندر نلوں کا جال بچھایا ہوا تھا۔ بلند دیواروں اور چھتوں پر بھی پانی پہنچایا گیا چھتوں پر بھی پانی کے چشمے بنائے گئے تھے۔

جب شہر بھاگ نگر کی تعمیر ہوئی تو شاہی حکومت اور سلطنت کے کاروبار کے لئے اس نوخیز شہر میں بھی متعدد محل بنائے گئے۔ منجملہ ان کے داد محل جو معدلت گستری کا مرکز تھا بذات خود ایک مستقل مضمون کا طالب ہے۔ اس کی رفعت اور شاہی نشست جہاں بادشاہ جلوس کر کے دادخواہوں کی فریاد سنتے تھے اب بھی بہت سوں کو یاد ہے اور باہر کے سیاح بڑی دلچسپی اور اچنبے کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے اردگرد شاہی سکونت کے متعدد محلات تھے۔ جو بہت کچھ تفصیل کے محتاج ہیں۔ کمان سحر باطل شاہی دولت سرا کا دروازہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک قیمتی طلائی دروازہ تھا جس کو حیدرآباد کی تسخیر کے بعد مغل اپنے ساتھ لے گئے۔ اس دروازہ کے مقابل کالی کمان کے پاس نوبت بجتی تھی اور ان دونوں کمانوں کے درمیان شاہی حفاظت کے لئے فوجیں کھڑی ہوتی تھیں اور شاہی رعب داب میں اضافہ کرتی تھیں۔ ندی کے کنارے ندی محل اور چار محل کے نام سے شاندار قصر بنائے گئے تھے جو دور سے نظر آتے تھے اور دریائے موسیٰ کی روانی کے ساتھ ایک پرکیف منظر پیدا کرتے تھے۔ گوشہ محل جو سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں تیار ہوا تھا اس کے باقیات اب بھی موجود ہیں، اس کے عظیم الشان حوض سے اس محل کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے خود مغل بھی جو شاہجہانی عمارات کے رہنے والے تھے قطب شاہی محلات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد جب شہنشاہ اورنگ زیب حیدرآباد میں داخل ہوئے تو شہنشاہ نے قطب شاہی محلات کی رفعت اور ذوق تعمیر کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ نعمت خاں عالی نے جو شہنشاہ کے ہمرکاب تھا عرض کیا کہ "بلند ہمت بودند عمارتہائے بلند ساختند" شہنشاہ کی حیرت اور نعمت خاں عالی کا جواب قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ غالباً مغلوں کو قطب شاہی تمدن کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا۔ عینی مشاہدے نے ثابت کر دیا کہ قطب شاہ بلند ترین تمدن کے حامل تھے۔ جب شہنشاہ کا چھوٹا بیٹا شاہزادہ کام بخش حیدرآباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنی سکونت کے لئے علحدہ مکان تعمیر کر لیا تھا

بس کو شہنشاہ اسراف سمجھتے تھے لیکن شاہزادے نے جواب دیا تھا کہ " قطب شاہی محلات میں رہنا اس سے زیادہ اسراف ہے۔" طب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پر عظمت ہیں کہ ان کی کما حقہ' پرداخت تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے۔ ایک تیموری شہزادہ لے یہ الفاظ جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا بہت معنی خیز ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی تمدن مغلوں کے معیار سے کہیں بلند تھا۔

ایسے پاکیزہ تمدن کا بالآخر مغل حملہ آوروں کے ہاتھ سے برباد ہونا ایک دردناک سانحہ تھا اور اہلِ گولکنڈہ کا اس بربادی پر خون ے آنسو بہانا ایک قدرتی بات تھی۔ عبدالرزاق اور اس کے اہلِ خاندان برسوں تک روتے رہے اور اس المناک نظارہ سے باہر والوں ے قلوب بھی بے چین ہو کر رہ گئے۔ نعمت خاں عالی جو فاتح فوج کے ساتھ حیدرآباد آیا تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ گولکنڈہ کی اس سوس ناک بربادی پر جو اس کے آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی ایک بہت ہی پُر درد مرثیہ کہا تھا جو اپنی درد بھری آواز میں ان مرثیوں ے کم نہیں ہے جو شیخ سعدیؒ نے زوالِ بغداد پر اور ابن رشد نے زوالِ اندلس پر کہے تھے۔

دریں ملکِ خراب امروز کس را نیست سامانے — چو گنج افتادہ اند اہلِ ہنر در کنج ویرانے
بہ آں حد رسیدہ خلق را افلاس و ناداری — کہ معنی ہم ندارد ایں زماں حرفِ سخندانے
سپاہی ہم بہ میدانِ قناعت میکند جولاں — ز شمشیر و سپر دارد دم آب لبِ نانے
دریں لشکر بجانم یا ر دم با خویش می سنجد — نماندہ در دکاں بقال را جز سنگ میزانے
یکے گفت خداوندِ بحقِ نوحؑ پیغمبر
برائے قلعۂ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے

(مجلہ طیلسانین حیدرآباد جنوری ۱۹۳۸ء)

گولکنڈہ

مہدی نظمی

وہ گولکنڈہ، قطب شاہ دور کا قلعہ
وہ برج، ترشا ہوا جیسے خود پتھر کا
وہ شان و شوکت و اقبال و جاہ و حشمت دیکھ
حیات بخشی و تاراجی کے وہ ایوان
منارے چار وہ تحسین آفریں تعمیر
کمالِ فن، خمِ محراب، قوس کی تصویر
قلی قطب کی محبت کے وہ نقوشِ دوام

وہ چوڑی چوڑی فصیلیں وہ اونچا دروازہ
جھروکے، جیسے سپاہی کے دیدۂ بینا
یہاں سے گزرے ہوئے کارواں کی عظمت دیکھ
فضا میں پیار کی خوشبو مہک رہی ہے یہاں
وہ مردمانِ جفاکش کے خواب کی تعبیر
منارے جیسے کہ کھنچتا ہوا کمان میں تیر
کہ جیسے بھاگ متی باغ میں ہے محوِ خرام

(طویل نظم آندھرا پردیش سے اقتباس)

حیدرآباد کے شاعر

(۲۵)

سیدہ عروج مظہر

۱۹۶۲ء میں مطبوعہ ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے تذکروں کا سلسلہ

جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل خواتین میں بہ حیثیت شاعرہ، افسانہ نویس اور مضمون نگار محترمہ سیدہ مظہر نے حیدرآباد کے شعری و ادبی ماحول کو چونکایا تھا۔ ریڈیو پروگراموں اور سنگانہ کالج کے ڈراموں میں سیدہ نے اپنی ذہانت کے نقوش چھوڑے۔ جامعہ عثمانیہ میں ۱۹۴۳ء میں داخلہ لیا اور فارسی سے بدرجہ اول ایم۔ اے کیا۔ بعد ازاں ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ نظیری کی شاعری پر سیدہ مظہر کا مقالہ اہم ریسرچ قرار پایا۔ وہ نظامیہ کالج میں فارسی کی لکچرار رہیں۔ سیدہ کا نام مظہر النساء تھا۔ والد سید محمد مرتضٰی حسین نیاز تخلص کرتے تھے۔ گھر میں شعر و ادب کی موجیں رواں تھیں، اسی ماحول نے انہیں شاعر اور قلمکار بنایا۔ ایک ناولٹ ضخیم شائع ہو چکا ہے۔ عربی فارسی اور انگریزی ادبیات پر گہری نظر تھی۔ ۱۹۴۹ء میں حسن محمود عروج کیساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں اور تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئیں اور وہیں سررشتہ تعلیمات میں درس و تدریس کو پیشہ بنایا۔ یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں اور ۲۵/ مارچ ۱۹۷۸ء

انتخابِ کلام

زلف کے بل، زنجیر کی کڑیاں جیسے جواب سوالوں کے ٭ سنگ میں راہیں جوں پگڈنڈی پھیل جائیں خیالوں کے
تصویر ہو اک ہے جیسے چاند پہ سائے بالوں کے ٭ شمع کی لَو کے حوالوں میں پروانوں کی پرچھائیں
جیسے کسی نے من بھاوے پھول سبز ے پر کالوں کے ٭ دُوب پہ بکھرے شبنمی موتی ڈھونڈ کے پاؤں دھرنا

زخمِ جاں، سوزِ جگر، اشک نشانی مانگے ٭ دلِ طلب گارِ فسانہ ہے کہانی مانگے
ہے کوئی شخص جو گم گشتہ جوانی مانگے ٭ قصر تعمیر کرے یوسفِ ثانی مانگے
ہم دھنک کے رستے سے دور افق کے پار اترے ٭ جھنڈ کے رہ جانے پوچھا آپ ادھر کدھر تنہا
جلے نہ دل تو بھلا شعر میں کہاں تاثیر ٭ جو لحن میں نہ لچک ہو تو کیا گداز آئے
بغیر درد کے نغموں میں کیسے مزا مظہر ٭ بغیر سوز کے کیا خاک لطفِ ساز آئے
سانپ کا کاٹا تو پھر بھی سنبھل سکتا ہے ٭ ہجر کی رات جو کاٹے تو نہ پانی مانگے
سایۂ گل میں مری قبر بنا لو لوگو ٭ دل ہے پیغامِ بہاراں کی نشانی مانگے
فاصلوں کی کوئی حد نہیں ہے ٭ فاصلے تو بہت متصل ہیں
زندگی سے چھٹے کیسے دامن ٭ سرو کی طرح سب پابہ گِل ہیں
اُن کا تحفہ ہے ادوار کی کشمکش ٭ زخم دل کے بھی کتنے سجل ہیں
پی پی پیہا، کوکو کوئل، چھم چھم رقصاں مور ٭ ایسے میں آ ہجر بیت جا، ان میں اپنا زہر نہ گھول
پیار کا روپ الوپ نرالا سو سو رنگ دکھائے ٭ جیسے دوشیزہ قوسِ قزح کا آنکھوں میں لہرائے
میرا دل ہے کانچ کا ٹکڑا، تیرا لمحہ سورج کی کرن ٭ ہائے تصور تیرا ظالم میرے دل سے ٹکرائے
راز ان کا ہے تو قالبِ جان بدن میں اُبھرے ٭ بات اُنکی ہے تو کیوں ظرفِ سخن میں ٹھہرے
کنگن ہاتھ میں تھوڑا سا ہے، کن کن کرتے کلائی میں ٭ قریب ہلکا سا ہے تصور، آگ پہ رکھا پارہ ہے
یاد کے شیشہ محل، اُنکی بھلا کیا ہے بساط ٭ آئینہ ہاتھ سے اک چھوٹ رہا ہو جیسے
سمندر سے قطروں کا اَن مٹ ہے رشتہ ٭ تو پھر کیسے تجھ سے جدا ہو گئے ہم
جنہیں حوادثِ عالم سکھائے بخیہ گری ٭ وہ اپنا چاک گریباں بھی خود ہی سیتے ہیں
گھپ اندھیرے چھٹے چاندنی ہو گئی ٭ مصطفٰیؐ آ گئے روشنی ہو گئی
صحنِ حرم میں بھیس بدل کر کتنے برہمن بیٹھے ہیں ٭ چپکے چپکے ڈھالا رہے ہیں رنگ ونسل کے لات

● ●

میں بمقام کراچی رحلت کر گئیں۔ سیدہ عروج کی وفات پر ماہنامہ "سب رس" کراچی بابتہ جنوری ۱۹۷۹ء کے "یادِ رفتگان" نمبر میں کئی اہلِ قلم احباب نے مضامین نظم و نثر کے ذریعہ اس ذہین شاعرہ کو خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ محشر بدایونی کے قطعہ تاریخ کا یہ مصرعہ ہے ؎

"جانِ فردوسِ بریں اب ہے سیدہ مظہر ۱۹۷۸ء"

(دائرہ)

وقار خلیل

ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری: تعارف

فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو برصغیر میں اردو کے اہم مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قطب شاہوں اور آصف جاہوں نے ن دیس میں اردو تہذیب ادب و ثقافت کو عہد بہ عہد استوار کیا۔

ساتویں آصفی حکمراں نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع نے جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ قائم کر کے تاریخ ادب اردو وقار اور اعتبار بخشا۔ سہ لسانی ریاست حیدرآباد میں کنڑی، مرہٹی اور تلگو کے ساتھ اردو کو بھی فروغ ہوا۔ ملک کی آزادی اور سقوط حیدرآباد کے بعد لسانی صوبوں کے قیام نے اردو کو اس کے گھر حیدرآباد ہی نہیں اس کے وطن ہندوستان میں بے وطن اور سب سے چھوٹی اقلیت بنا دیا اور اس پر طرح طرح کے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ سخت جانی سے عبارت اردو بہرحال زندہ ہے در رہے گی۔

ان حالات میں ۱۹۶۲ء میں حضور نظام کے بناء کردہ نظامس چیاریٹیبل ٹرسٹ کے ٹرسٹیز نے آصف سابع کی اردو نوازی در سلطانی علوم و فنون کے سطح جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک فلاحی ٹرسٹ "ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ" قائم کیا۔ س کے صدر نشین آصف ثامن نواب میر برکت علی خاں مکرم جاہ کے بھائی نواب مفخم جاہ بہادر ہیں اور اراکین میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی سابق گورنر یوپی، جناب جگجیون چند (آئی اے ایس)، جناب مولوی محامد علی عباسی (آئی اے ایس) اور جسٹس شرف الدین احمد ــــ شامل یں۔ جناب مولوی عبدالمحمود صاحب بہ حیثیت سکریٹری ٹرسٹ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ نظامس اردو ٹرسٹ کا قیام اردو ی بقاء ترویج و ترقی کے لیے فال نیک ہے اس کے اغراض و مقاصد میں نایاب کتابوں اور ہی مطبوعات کی اشاعت میں معاونت کے علاوہ اردو میں دیگر زبانوں کے ادب کی منتقلی اور اس کے علاوہ محفل مذاکرات اور وقتاً فوقتاً ادبی اجتماعات شامل ہیں۔

نظامس اردو ٹرسٹ نے اردو اداروں کو علمی امور کی انجام دہی کے باب میں اعانتیں بھی منظور کی ہیں، ادبی ٹرسٹ، اردو تعلیمی ٹرسٹ اور مختلف کتب خانوں اور اداروں اقبال اکیڈیمی، سنٹرل اردو لائبریری ادارۂ ادبیات کو جزوی طور پر گرانٹ منظور کر کے ریاست میں ادب اور ثقافت کو روشن رکھا ہے۔ اس ٹرسٹ کی جانب سے اب تک (۲۵) کتابوں کے مصنفوں کو مالی اعانت دی گئی ہے جن سے ریاست میں شعر و ادب تاریخ و تمدن اور سائنس و تراجم کی مفید مطبوعات زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

جناب عبدالمحمود سکریٹری نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری نے بتایا کہ اس ٹرسٹ کی جانب سے پوسٹ گرائجویٹ طلباء کی تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے جامعہ عثمانیہ کو رولنگ شیلڈ دی ہے اور شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام سالانہ بین کلیاتی تقریری مقابلوں میں حصہ لینے والے طلباء اور طالبات کو انعامات بھی ٹرسٹ کی اعانت سے دیے جاتے ہیں۔

نظامس اردو ٹرسٹ کی جانب سے تحقیقی کاموں کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں جناب ریاست علی تاج کو آندھرا پردیش کے لوک گیت پر ریسرچ ورک کے لیے ماہانہ دو سو پچاس روپئے کا فیلوشپ ایک سال کے لیے منظور کیا گیا۔ اس کام کی نگرانی پروفیسر رفیعہ سلطانہ سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی نے کی۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ سلسلہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی عدم توجہی کے باعث ملتوی ہو کر رہ گیا ہے۔ ارباب نظامس اردو ٹرسٹ کو چاہیے کہ وہ اس مفید تحقیقاتی پراجکٹ کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ اس میں وسعت پیدا کرتے ہوئے عہدِ عثمانی کے علمی و ادبی اور تہذیبی ابواب پر منصوبہ بند ریسرچ کو ٹرسٹ کا دوامی حصّہ قرار دے۔

آندھرا پردیش میں تحریکِ کتب خانہ کو جناب عبدالحمود ایسے تجربہ کار عہدہ دار نے فروغ دینے میں گراں قدر خدمات کا ریکارڈ بنایا ہے، موصوف کے تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی نگرانی میں نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری ۱۹۷۸ء سے سرگرم عمل ہے۔ اس لائبریری کی طرف سے مستقبل قریب میں شہر حیدرآباد کے مختلف محلوں میں شاخوں کے قیام کا ایک منصوبہ عملی شکل اختیار کرنے والا ہے ٹرسٹ کی مرکزی لائبریری لبرٹی روڈ بشیر باغ میں ایک مختصر سی اور محدود عمارت کے ایک گوشے میں تشنگانِ علم و ادب کے ذوق کی تکمیل کر رہی ہے۔ مختلف علوم و فنون کی قدیم، جدید اور نایاب کتابیں جن کی مجموعی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے، علم کتب خانہ داری کی درجہ بندی کے جدید اصولوں پر ایک فہرست ڈسمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آگئی ہے جس کے مطالعہ اور ورق گردانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس لائبریری میں حیدرآباد کے ثقافت اور تمدن، تاریخ اور ادب کے علاوہ اقبالیات، غالبیات، اسلامیات۔ فکشن اور ادب اطفال کے علاوہ عربی اور فارسی ادبیات پر اہم مطبوعات کا ذخیرہ موجود ہے۔ گنتی کی چند قلمی کتابیں بھی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اس کتب خانہ میں ایک بک سلکشن کمیٹی پانچ اصحاب پر مشتمل کام کر رہی ہے جن کی منظوری کے بعد کتابیں خریدی جاتی ہیں اس کمیٹی کے اراکین میں جناب محامد علی عباسی، ڈاکٹر سید جعفر، جناب محمد اکبر الدین صدیقی محترمہ نقی بلگرامی کے علاوہ ڈائرکٹر لائبریری و نظامس اردو ٹرسٹ جناب عبدالحمود شامل ہیں۔ اس کتب خانہ میں ملک کے اہم علمی و ادبی رسائل و جرائد کے علاوہ اردو، تلگو اور انگریزی کے روزنامے اور ہفت روزہ اخبارات بھی خریدے جاتے ہیں جن سے صبح اور شام کے اوقات میں اوسطاً ہر روز (۴۰) افراد استفادہ کرتے ہیں۔ کتب خانہ کی گشتی لائبریری کے ۱۱۰ اراکین ہیں، جن سے ابتدائی شرکت فیس چھ روپئے کے علاوہ ماہانہ ایک روپیہ لیا جاتا ہے اور بطور ڈپازٹ بیس روپئے جمع کروانا پڑتا ہے۔

کتب خانے عصری تہذیب کی کردار کی ادائیگی میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے ارباب فکر و نظر کو بھی اس کا خاصہ احساس رہا ہے اور یہ ادارہ اردو زبان کی ترویج، ترقی اور تحفظ کے باب میں مقدور بھر حصّہ ادا کر رہا ہے۔ اور کتابوں کے مطالعہ کے ذوق کو عام کرتے ہیں ماہانہ علمی محفلوں کے انعقاد سے نقد و نظر، تعارف و تبصرہ کے فرائض کو بھی گزشتہ کئی سال سے تمام و کمال انجام دے رہا ہے۔

"حلقۂ ارباب ذوق" کے نام سے جدید اور اہم کتابوں پر فاضل نقادوں، پروفیسروں، دانشوروں اور منقدر اہل قلم اصحاب سے مضامین خصوصی طور پر لکھوائے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر اردو عثمانیہ یونی ورسٹی کے اشتراک و تعاون سے کئی ماہانہ علمی محفلیں منعقد ہوئیں۔ ان دنوں

جناب محمد منظور احمد سابق لکچرار گورنمنٹ سٹی کالج کی نظامت میں حلقۂ اربابِ ذوق کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں۔ مبصرین کو تبصرہ لکھنے کا معاوضہ بھی نذر کیا جاتا ہے اور زاں بعد ایسے تمام تبصروں کو لائبریری کے علمی و ادبی ترجمان "مبصر" کی اشاعتوں میں شائع کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۷ء سے مجلہ "مبصر" شائع ہو رہا ہے اور اب تک اس کے سات شمارے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ "تبصرہ" کی مجلس ادارت میں سر زمحمد اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف سرمست، محمد منظور احمد اور ڈاکٹر غیاث صدیقی کے نام شامل ہیں۔ اس کی نگرانی کے فرائض جناب عبدالمحمود صاحب کے سپرد ہے۔ مشاورتی کمیٹی میں پروفیسر سید علی اکبر، جناب حامد علی عباسی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبدالستار دلوی ایسے مشاہیر شامل ہیں۔

نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے زیر اہتمام ۲۵/۲۶ نومبر ۱۹۷۸ء کو دو روزہ سیمینار "آندھرا پردیش میں اردو کے ۲۲ سال" کے موضوع پر منعقد کیا گیا تھا جس میں تحقیقی ادب، تخلیقی ادب، لسانی سرگرمیوں، صحافتی، تعلیمی مسائل پر درجنوں فاضل دانشوروں نے مقالے پیش کئے جن میں ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، جناب حسن الدین احمد، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، جناب مصطفیٰ کمال۔ جناب رشید الدین، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے یس)، جناب محبوب نارائن، ڈاکٹر عبدالقادر عمادی، محترمہ سلطانہ شرف الدین، جناب مصلح الدین سعدی اور جناب سید یعقوب میراں شامل ہیں۔ جناب یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈمی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور حضور نظام کے عہد میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء پر مخاطب کیا۔ جناب ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ جناب جگ جیون چند آئی اے یس ٹرسٹی نظامس چیاریٹیبل ٹرسٹ نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اور کہا کہ "اردو ٹرسٹ اپنی کارکردگی کے دس سال تکمیل کر چکا ہے اور اس دہے کی تکمیل پر سیمینار منعقد کر رہا ہے۔ اس سیمینار میں ریاست کے متعدد اہلِ قلم دانشوروں نے ریاست میں اردو ادب کی ۲۲ سالہ سرگرمیوں پر اظہار خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے تعاون سے نوازا ہے۔ جناب جگ جیون چند نے آگے چل کر فرمایا کہ "ریاست آندھرا پردیش سے اردو کا رشتہ بہت قدیم اور گہرا ہے۔ اس سرزمین نے محمد قلی قطب شاہ جیسا عظیم المرتبت صاحبِ دیوان شاعر پیدا کیا۔ اس کی شاعری میں بھاگ متی کی محبت کا نغمہ آج تک ہمارے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ آندھرا پردیش میں ملا وجہی جیسا شاعر اور ادیب پیدا ہوا جسکی کتاب "سب رس" کو دکنی ادب کے شہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی سرزمین میں شاہ نصیرؔ، داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، فصاحت جنگ جلیلؔ اور کئی اردو شاعروں اور ادیبوں کو اپنے جوہر نکھارنے کے مواقع ملے۔ جو شاعر اور ادیب یہاں آ نہیں سکے انھوں نے یہاں آنے کی آرزو کی۔ مرزا غالبؔ نے اس سرزمین کو "روضۂ رضوان" کہا۔ شبلی، شررؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، دوارکا پرشاد افقؔ اور فانی بدایونی نے بھی اس سرزمین میں نغمہ سرائی کی، اسی سرزمین نے کشن پرشاد شادؔ، امجدؔ، کیفیؔ، صفیؔ، ڈاکٹر زورؔ، مخدومؔ، وجدؔ، عبدالقادر سروری اور عزیز احمد جیسے صفِ اول کے ادیب و شاعر پیدا کیے۔

جناب عبدالمحمود سکریٹری نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری نے رپورٹ پیش کی تھی "مبصر" کے خصوصی شمارے میں اس اہم سیمینار کی رپورٹ اور تمام مقالوں کو شامل کیا گیا ہے جن کے مطالعے سے آندھرا پردیش میں اردو زبان اور ادب کی رفتار ترقی سے تکمیل و کمال واقفیت ہوتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر دیکھئے)

نقد و نظر

(تبصرہ کیلئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ادارہ)

نام کتاب :- جھلکتے ویرانے (شعری مجموعہ) بانو طاہرہ سعید، کراؤن سائز مجلد معہ گرد پوش صفحات (۲۴۸)
قیمت : ۱۲ روپیئے، ناشر: ادارۂ ادبیاتِ اردو "ایوانِ اردو" پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۴

بانو طاہرہ سعید، اردو، فارسی اور انگریزی کی شاعرہ اور نثر نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں شہرت رکھتی ہیں۔ شعر، نقش اور بچوں کے ادب پر ان کی کتابیں اس امر کی دلیل ہیں کہ وہ صلہ و ستائش سے بے نیاز تخلیقی کام میں منہمک رہتی ہیں۔ حیدرآباد کے شعری اور ادبی ماحول میں، بانو طاہرہ نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ بہت پہلے "برگِ سبز" کے نام سے پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر "جھلکتے ویرانے" بانو کے شعری سفر کا ارتقائی زینہ ثابت ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ۸۰ نظمیں، امریکن شاعر لانگ فیلو کی ۱۴ نظموں کے خوبصورت منظوم تراجم، چند قطعات اور ۸۴ غزلیں شامل ہیں۔

بانو نشاطِ غم کی شاعرہ ہیں، فطرت کے مناظر کی نیرنگیوں سے انہیں بے پناہ نسبت ہے۔ دلِ گرفتہ کے سبب نم دیدہ ماحول سے تاثر قبول کرتی رہی ہیں۔ ان کی نظموں کا روشن افق تو ان کا شعور ہے جو ارتقاء ہے۔ تہذیبوں کی شکست و ریخت کا احساس بھی تجربہ، محبت اور نفرت کے ارتعاش اور سنہرے گوشوں کی آرزومندی ان کی نظموں کو نسوانی سچائی سی لگتی ہے۔ شاعرہ دل و دماغ اور ترسیل کے اظہار پر قدرت رکھتے ہوئے جب وہ کسی خیال کو نظم کا جامہ پہنا پاتی ہیں۔ تو پڑھنے اور سننے والے پر خوشگوار اثر چھوڑتی ہیں۔ زندگی کے بوقلموں مسائل اور اسرار و رموز پر بانو نے شعر کہے ہیں۔ اور اچھی نظمیں خلق کی ہیں۔ "جھلکتے ویرانے" کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بانو طاہرہ سعید عصری شعور اور کلاسیکی لہجے کو متوازن طور پر برتنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مخمور نظامی، آغا آزاد اور جناب سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اردو نے بانو کی شعری ذکاوت و ذہانت پر اس مجموعے کے لئے اپنے تاثرات رقم کئے ہیں۔ "جھلکتے ویرانے" باذوق قارئین کے انبساطِ مطالعہ کو مہمیز کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ خریدئے اور پڑھئے۔ چند غزلیہ اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں:-

نور سے بھی نہ مٹ سکی ظلمت ÷ بجھ گئی شمع رات باقی ہے
ایک غم ہے کہ ہے مرا ہمدم ÷ اس کے دم سے حیات باقی ہے
ابھی آنکھوں میں اشک باقی ہیں ÷ ابھی آبِ حیات باقی ہے
فرشِ گل کو کہ زینت تھے باشعور فرزانے ÷ دار پر نظر آیا ایک منچلا خالی
ہمارے خون سے لکھی گئی کتابِ چمن ÷ ہمارا نام کہیں پھر بھی داستاں میں نہیں
اب زندگی کی شام کو ڈھلنے کا وقت ہے ÷ اپنا پتہ بتا کہ کہاں تجھ سے آ ملوں

بہت اُداس ہوں، دل تنگ ہوں، پریشاں ہوں ⁂ جلادے ایسے میں خوشبوئے پیرہن کے چراغ
ہمارا نام بھی ہے خادمانِ اُردو سے ⁂ جلائے ہم نے بھی ہیں طاقِ سخن کے چراغ

(دلدار خلیل)

نام کتاب:۔ "پرندوں سے جانوروں تک" (معلوماتی مضامین کا مجموعہ) محمد شاہد عظیم، کراؤن سائز (۱۱۲ صفحات)
قیمت: ۱۰ روپیے ناشر: اتحاد ڈیلی کیٹیز ۲/۱۱۲۔۲۔۱۸ ملک نما، حیدرآباد۔ ۵۰۰۲۵۳

اردو میں سائنسی اور معلوماتی کتابوں کی کمی کے پس منظر میں شاہد عظیم کی یہ کتاب کئی جہتوں سے اہمیت، مقصدیت اور افادیت کی حامل قرار پاتی ہے۔ ضرورت ہے، ایسی مفید کتابوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ثانوی درجوں کے تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ محمد شاہد عظیم نے سلیس اور عام فہم پیرائے میں جانوروں اور پرندوں کے عادات و اطوار اور ان کی نفسیات پر بھرپور انداز میں مضامین لکھے ہیں۔ تقی حسین جعفری نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے درست ہی تحریر کیا ہے کہ "یہ کتاب بلاشبہ دلچسپ اور معلومات کا خزانہ [illegible] بہترین تخلیق قرار پاتی ہے۔ اور اُردو دنیا میں تازہ ہوا کے جھونکے کے مصداق ہے۔ جسے خوش آمدید کہنا چاہیئے"۔ اس کتاب میں گینڈا، گوریلا، گدھا، مور، طوطا، جگنو، شارک مچھلی، وھیل، کتا، بلی، نیولا اور تیز رفتار پرندوں اور جانوروں کے بارے میں معلومات کئی کتابوں کے مطالعہ کے بعد فراہم کی گئی ہیں۔ شاہد عظیم، ادبِ اطفال کے باشعور ادیب، اُردو کے نئے صحافی اور کئی مثبت قدروں کے باصلاحیت مگر ذرا لاابالی نوجوان ہیں۔ ان سے کسی ادارہ یا اکیڈیمی کو ایسے موضوعات پر کتابوں اور مضامین کی تیاری کیلئے تعاون حاصل کیا جاسکے تو مفید سائنسی اور معلوماتی مواد مرتب ہو کر [illegible] ادب کا ماحول مالا مال ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کی اعانت سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۵ روپیئے مقرر کی جاتی تو عمومی طور پر مطالعہ اور استفادہ کی اہل قرار پاتی ویسے کتب خانوں میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(عقیل الرحمن عقیل)

نام کتاب:۔ "آئینۂ دل" (شعری مجموعہ) رئیس اختر مجلد مع خوبصورت گردپوش ڈیمائی سائز قیمت: ۱۶ روپیے
ملنے کا پتہ: نور منزل ۱/۳۳۶۔۴۔۲۱ کوچہ گلاب سنگھ حیدرآباد۔۲

رئیس اختر ریاستِ حیدرآباد کے خطۂ کرناٹک بیدر کے متوطن شاعر ہیں۔ اور حیدرآباد ان کا وطنِ ثانی بن گیا ہے۔ شرافت، تہذیب، شاعری اور شیریں زبانی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ علم، تہذیب اور محبت کے شہر بیدر کے ماحول نے رئیس اختر میں شعر و ادب سے تعلق کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں معاونت کی۔ ۱۹۶۵ء میں رئیس اختر نے شعری سفر کا آغاز کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے علمی و شعری ماحول نے ان کے چھپے ہوئے ذوق کو آئینہ دکھایا اور دلی واردات کو غزل کا پیراہن متعدد بار عطا کیا۔ ابتداء میں رئیس اختر نے جناب رشید احمد رشید سے مشورۂ سخن کیا پھر غزل کے نامور سخنور حضرت شاہد صدیقی اور نئی غزل کے باکمال شاعر حضرت خورشید احمد جامی سے رموزِ سخن سیکھے۔ غزل کی جمالیاتی آبگینہ گدازی کو رئیس اختر نے کمال ہنرمندی سے برتا ہے۔ ان کی شاعری میں نغمگی، لطافت، جھرنوں کا سا سبک، گنگناتا ترنم رقصاں نظر آتا ہے۔ رئیس اختر کی قلبی واردات کا یہ "آئینۂ دل" ڈاکٹر سیدہ جعفر کے الفاظ میں "قدیم فنی روایات کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات

نئے علائم اور اظہار و ابلاغ کے نئے پیکروں کا نگار خانہ ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے "آئینۂ دل" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے رئیس اختر کی خوش گفتاری اور غزل سرائی حسن کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔

"آئینۂ دل" میں جو (۲۱۶) صفحات پر مشتمل ہے، رئیس اختر کی کئی خوبصورت اور دلوں کو متاثر کرنے والی غزلیں "خونِ دل" کے ذیلی عنوان کے تحت شامل ہیں۔ "رنگِ دل" کے تحت پابند اور آزاد نظمیں ہیں۔ جن میں "سناٹا"، "پیار"، "آواز"، "تمہارے شہر میں"، "رسمِ وفا"، "آدمی کا سازِ خاموش ہے"، "آوارگردِ سفر" خاص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ ان نظموں میں جذبات کی سرشاری، تخیل کی بلند پروازی اور فکر و خیال کی رنگا رنگی خوشگوار احساسات کو جگاتی نظر آتی ہے۔

"آئینۂ دل" میں ۷۲ غزلیں ہیں جن میں رئیس اختر کے سخن کی سگندھ اور خوشبو رواں دواں ملتی ہے، غزل کی زبان میں چاہنے اور چاہے جانے کے شریفانہ جذبات اپنا تاثر چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے اتار چڑھاؤ، رنجشوں، خواہشوں اور آرزوؤں کے احساسات متاثر کرتے ہیں۔ ذیل میں رئیس اختر کی خوبصورت غزلوں سے چند کلیاں اور سلگتے ستارے پیش ہیں:

روشنی کی خواہش میں جل اٹھے نہ پیراہن ؎ روشنی میں شعلے ہیں، روشنی سے مت کھیلو

اپنا ضمیر جھوٹ کبھی بولتا نہیں ؎ تم ہی کہو کہ صاحبِ کردار کون ہے

اشکوں کے پھول بیچنے میں نکلا تو ہوں رئیس ؎ یہ دیکھنا ہے ان کا خریدار کون ہے

چلا بھی گیا وہ لوٹ کے آیا نہیں مگر ؎ ہر شخص چاہتا ہے تری رہگزر رہے

مدت کے بعد مل تو گئی روشنی رئیس ؎ لیکن ہمارے راستے میں سب جلے گھر ملے

نئی سحر نے اجالے جنم دیئے ہیں مگر ؎ یہ خواب پھر بھی اندھیرا دکھائی دیتا ہے

یہاں جو بانٹتا پھرتا ہے تشنگی کا بھرم ؎ مجھے تو خود بھی وہ پیاسا دکھائی دیتا ہے

یہ کیسی آگ میں ہم لوگ جل رہے ہیں رئیس ؎ ہر اک وجود پگھلتا دکھائی دیتا ہے

●●

(وقار خلیل)

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر کا نام :- سید علی اکبر — پتہ: ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد ۔ ۴
قومیت :- ہندوستانی — پبلشر کا نام: سید علی اکبر
پتہ: ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد ۔ ۴ — قومیت : ہندوستانی
پرنٹر: سید علی اکبر — پتہ: ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد ۔ ۴
قومیت :- ہندوستانی — نام و پتہ مالک ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد ۴

میں، سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

سید علی اکبر (دستخط)

اردو نامہ

علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

وقار خلیل

یکم ڈسمبر:۔ دکن مجلس انتظامی ادارۂ ادبیاتِ اردو جناب راجے گرد ھر ریج سکسینہ (آئی، اے، ایس) کا انتقال ہوا۔

۷/ ڈسمبر:۔ ریاستی اردو اکیڈیمی کی طرف سے قائم شدہ "اردو رائیٹرس اینڈ جرنلسٹ ویلفیر فنڈ" کی مجلس انتظامی نے اردو زبان، ادب، شعر اور صحافت کی خدمات میں معروف دس افراد کے خاندان والوں اور پسماندوں کو بطور اعانت ماہانہ ۵۰ روپیے وظیفہ منظور کیے۔ جن میں مسز بشیر ہلال (ادیب) محمد ابراہیم (خوشنویس) محمد عبدالحق اور محمد عبد الغفار (صحافی) مسٹر طالب رزاقی (شاعر) مسز تاج قریشی (شاعر) مسٹر شمس الملک تمیز (جرنلسٹ) بیگم بہیم حمید (آرٹسٹ) اور بیگم تراب علی (جرنلسٹ) شامل ہیں۔

۱۰/ ڈسمبر:۔ نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری میں حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب اختر حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا جناب رشید الدین نے مرزا ظفر الحسن کی تصنیف "ذکر یار چلے" پر تبصرہ سنایا۔

۱۵/ ڈسمبر:۔ سروجنی نائیڈو صد سالہ تقاریب کمیٹی کے زیر اہتمام ایک محفل مشاعرہ جناب ایم، باگا ریڈی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ جناب صلاح الدین نیّر نے سروجنی دیوی کی انگریزی نظم گولکنڈہ کے منظوم ترجمے سے محفل شعر کا آغاز کیا۔ مسز کیفی اعظمی، کرشن بہاری نور، تسنیم فاروقی، ڈاکٹر مغنی تبسم، شاذ تمکنت، اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، راشد آذر، وقار خلیل، خیرات ندیم، خواجہ شوق، جہاندار افسر، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، منوہر لال بہار، صادق نقوی، علی الدین نوید، بانو طاہرہ سعید، زمیال سنگھ ورما، اور عزیز النساء صبا، ثریا جبیں، شجاعت جاہ، راجہ لال راجہ نے کلام سنایا۔

۱۶/ ڈسمبر:۔ آلیم انب کے ادبی اجلاس میں جمیل شیدائی نے "روایت اور ادب" پر مضمون سنایا۔ پروفیسر سراج الدین پرنسپل ایوننگ کالج نے جلسہ کی صدارت کی۔ آخر میں محفل شعر بھی منعقد ہوئی۔

۱۸/ ڈسمبر:۔ ڈاکٹر ایم چنا ریڈی، چیف منسٹر آندھرا پردیش نے اردو کی نامور ادیبہ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کی وفات پر تعزیتی بیان میں ان کی علمی و ادبی اور ترقی پسند تحریک کو خراج عقیدت ادا کیا۔

۲۱/ ڈسمبر:۔ استاد سخن فصاحت جنگ جلیل مانکپوری کی یاد میں بمقام "جلیل منزل" ایک مختصر شعری محفل جناب اختر حسن کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے حضرت جلیل کی حیات اور شاعری پر خطاب کیا۔ ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو مسٹر ڈی۔ ستیہ باو ہیجا، جناب محمود انصاری ایڈیٹر "منصف" اور جناب اسد اللہ سعید سابق کلکٹر نے بہ حیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت کی۔ جناب صلاح الدین نیّر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے محفل مشاعرہ میں مسز شاذ تمکنت، مغنی تبسم، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، رمیش اختر، محمد منظور احمد، منوہر لال بہار، داؤد نصیب، بشیر وارثی، صادق نقوی، مظفر الدین صاحب دلاور حزیں، شجاعت جاہ اور ابرار واحدی نے کلام سنایا۔

۲۹/ ڈسمبر:۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ جلسہ میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ نے "مثنوی مولانا روم" پر لکچر دیا۔ مولانا قطب الدین حسینی صابری نے صدارت کی۔

۳۰/ ڈسمبر:۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں بمقام "اردو ہال" منعقد ہوا۔ جناب راشد آذر نے "ادب کی جدیدیت" پر اور جناب محمد

منظور احمد نے "پیام اقبال کے چند اساسی پہلو" کے زیر عنوان مقالے سنائے۔ ابتداء میں مسٹر سرنیواس لاہوٹی نے سہیل عظیم آبادی اور رضیہ سجاد ظہیر کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ محفل شعر میں راشد آذر، عابد مجاز، تاج کوسنگری، رحمن جامی، صادق نقوی، تدبیر انصاری، منظور احمد، شجاعت جاہ اور عزیز عبارتی نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۸۰ء: — زندہ دلان حیدرآباد کی مجلس عاملہ نے طنز و مزاح کے معروف شاعر گلی نلگنڈوی (متوفی ۲۹ ڈسمبر ۱۹۷۹ء) کی رحلت پر قرارداد تعزیت منظور کی۔ مسٹر چندرسری واستو سکریٹری / ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے تعزیتی بیان میں گلی کی وفات پر رنج و الم کا اظہار کیا۔

● محفل خواتین کا ادبی اجلاس محترمہ فاطمہ عالم علی (دختر قاضی عبدالغفار مرحوم) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بانو طاہرہ سعید نے محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور ایک قرارداد تعزیت بھی منظور کی۔ قمر جمالی صاحبہ نے کہانی سنائی۔ آخر میں خواتین شعراء نے کلام پیش کیا۔

۱۰/ جنوری: — سٹی سنٹرل لائبریری میں مدیر اردو اکیڈیمی جناب بیم باگا ریڈی نے اکیڈیمی کے بک اسٹال کا افتتاح کرتے ہوئے عوام اردو سے اپیل کی کہ وہ اردو کی کتابیں اور اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کی طرف توجہ دیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور مسٹر چندرسری واستو نے بھی مخاطب کیا۔

● عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام، لسانیات کی بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کے ماہر لسانیات پروفیسر انور دل (یونیورسٹی پروفیسر کیلی فورنیا) نے مقالہ پیش کیا اور اردو فن خطاطی کے نئے انداز اور طریقہ پر اپنے تجربات کو واضح کیا۔

۱۳/ جنوری: — انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ فرقہ پرستی، سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کا حل نہیں ہے۔ پروفیسر حبیب الرحمن صدر انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر راج کشور پانڈے، محترمہ جیلانی بانو، مسٹر کے۔ ایل چندرا (یم ایل سی) مسٹر چندرا سری واستو ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی، جناب راشد آذر، جناب احسن علی مرزا، جناب جاندار افسر اور جناب سرنیواس لاہوٹی نے خطاب کیا۔ اور قومی یکجہتی کو استحکام بخشنے میں قلمکاروں کے رول کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد سکریٹری نے شکریہ ادا کیا۔ اور خیر مقدمی تقریر کی۔

۱۴/ جنوری: — پروفیسر انور دل نے ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کا معائنہ کیا۔ اور حیدرآباد میں اردو زبان اور ادب سے متعلق سرگرمیوں پر اظہار طمانیت کیا۔

● بچوں کے عالمی سال کے موقع پر وقار خلیل کی بچوں کیلئے لکھی گئی نظموں کا خوبصورت مجموعہ "ڈالی ڈالی پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی اشاعت کیلئے ریاستی اردو اکیڈیمی، ادبی ٹرسٹ اور نظامت تعلیمات نے اعانت دی ہے۔

۱۸/ جنوری: — نمائش سوسائٹی کا سالانہ مشاعرہ نواب لیاقت جاہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سعید شہیدی، ہاشم جاہ، اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، شاذ تمکنت، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر مغنی تبسم، راشد آذر، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، عزیزالنسا عباد، رحمن جامی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۲۷/ جنوری: — جناب بس۔ اے بشیر کے شعری مجموعہ "شہر دل" کی جناب تجمل حسین نے اردو ہال میں رسم رونمائی انجام دی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے اس خوشگوار محفل کی صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر سجاد حسین رضوی ریڈر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، جناب احسن علی مرزا، اور جناب نذیر الدین احمد نے صاحب تصنیف کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی اور مبارکباد دی۔ ممتاز موسیقار مسٹر وٹھل راؤ نے سازوں پر کلام بشیر بھی پیش کیا۔

۳۱/جنوری:۔ کل ہند نعتیہ مشاعرہ جناب الحاج عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر تمنا مظفر، حافظ طیفوری، صابر مخی آبادی، برق کڑپوی، مرزا شکور بیگ، بجرنگ سنگھ فقیر، ذاکر گوڈ درشاہی، سعید شہیدی، معلم جیدی، راز حامدی، شاذ تمکنت، ریحانہ اختر، ڈاکٹر ناظم مرزائی نے نعتوں کے فرائض انجام دیے۔

۲/فروری:۔ ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے ٹورسٹ فیسٹول کے موقع پر گنبدان قطب شاہی واقع گولکنڈہ پر میلہ کا افتتاح کیا۔ اور پتنگ بازی کے مقابلہ میں قصہ میلہ کی رونق بڑھادی۔ ڈاکٹر ریڈی نے قطب شاہی عہد کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی، دیرینہ حیدرآبادی کی روایات کو استحکام بخشنے میں عوام سے بھرپور تعاون کی اپیل کی ٹورسٹ فیسٹول کے موقع پر ایک ہفتہ تک کشمیر کلچرل اکیڈیمی کے گروپ آف ڈرامہ کی طرف سے محمد قلی قطب شاہ کے عہد اور شاعری پر ایک اسٹیج ڈرامہ "پیا باج پیالہ" پیش کیا گیا۔ جسے ہزاروں شائقین نے دیکھا اور پسند کیا۔

۳/فروری:۔ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے ایک علمی محفل میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی شخصیت اور علمی نظریات اور ان کے شعری و ادبی رجحانات پر خطیب مصلح الدین سعدی نے سیر حاصل اظہر دیا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اس محفل کی صدارت کی۔

——— شجاع احمد قائد مرحوم کے ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل کتاب "سیاہ آنسو" کی رسم اجرا جناب بے دیال باویجہ ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے انجام دی۔ جناب عباس رضوی نے جلسہ کی صدارت کی۔ پروفیسر سجاد حسین رضوی، جناب فضل الرحمان سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، محترمہ جیلانی بانو، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، جناب اختر حسن، جناب رشید قریشی، جناب اظہر افسر اور جناب رشید الدین نے شجاع مرحوم کو خراج عقیدت ادا کیا۔ کتابت کی ترتیب کار محترمہ افشاں جبین نے مقررین کا شکریہ ادا کیا۔

۴/فروری:۔ محفل خواتین کا اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ فریدہ زین اور محترمہ بلقیس عابد علی نے علی الترتیب کہانی اور فکاہیہ سنایا۔ خواتین شعراء نے غزل سرائی کی اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے شکریہ ادا کیا۔

۹/فروری:۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور مخدوم سوسائٹی کے زیر اہتمام مخدوم کے ۲۷ ویں یوم پیدائش پر ایک سمپوزیم "فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہمہ جہتی ترقی کیلئے ضروری ہے" کے موضوع پر بصدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ منعقد ہوا۔ مسرز جعفر بیگ گپتا، بی نرسا ریڈی، کے بی منعم را اور شریمتی سعیدہ اجو شی نے مخاطب کیا۔ مقررین نے مخدوم کی شعری و قومی خدمات کو بھی زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے شکریہ ادا کیا۔

۱۰/فروری:۔ مخدوم کی یاد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے، چار مینار کے شہر میں ایک مشاعرہ جناب شاذ تمکنت کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قدیم و جدید مکتب سخن کے معروف شعراء نے کلام سنایا۔ جناب جاندار افسر نے نظارت کے فرائض انجام دیے۔

۱۴/فروری:۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، پرنسپل سٹی کالج کی تصنیف "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" کی اعظم ہال سٹی کالج میں جناب پی۔ گنگا ریڈی ریاستی منسٹر نے رسم اجراء انجام دی۔ مسٹر ین ۔ کرشنا مورتی پرنسپل سٹی کالج نے صدارت کی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر یوسف سرمست، شر خیدر کرشنا، وقار صدیقی اور عقیل ہاشمی صاحبان نے ڈاکٹر اکبر کی علمی و ادبی خدمات، ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کو خراج تحسین ادا کیا۔

ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں محفل شعر بھی منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر مسیم، راشد آزاد، عبدالمتین نیاز، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر اشرف رفیع، محمد منظور احمد، رؤف اختر صادق نقوی، اور وقار صدیقی نے کلام سنایا۔ جناب محمد منظور احمد نے نظارت کے فرائض انجام دیے۔

۲۱/فروری:- ریاستی اردو اکیڈیمی کی تعلیم و نظم و نسق سے متعلق ذیلی کمیٹی کا اجلاس جناب اکرام جاوید کی صدارت میں ہوا جس میں ریاستی نظم و نسق میں اردو کے استعمال سے متعلق مسائل پر کارروائی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۲۳/فروری:- اردو کے بزرگ صحافی جناب اسمٰعیل ذبیح ایڈیٹر روزنامہ "ذبیح" طویل علالت کے بعد رحلت کر گئے۔

۲۴/فروری:- ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام یوم محمد قلی قطب شاہ کا ۱۰۱واں سالانہ افتتاحی اجلاس گنبد محمد قلی واقع گولکنڈہ پر بصدارت جناب بدم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی منعقد ہوا۔ جناب اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے افتتاحی تقریر کی۔ اور محمد قلی کے عہد کی ادبی خدمات اور ثقافتی اقدار کی صیانت میں ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور کی ادبی خدمات کا ذکر کیا۔ جناب رحمن راج سکینہ معتمد یوم محمد قلی نے خیر مقدمی تقریر کی اور سالانہ رپورٹ سنائی۔ جناب خیرات ندیم، محترمہ عزیز النساء صبا اور محترمہ سعادت جہاں رضوی سحر نے محمد قلی اور حیدرآباد پر نظمیں سنائی۔ کیپٹن عباس نقشبندی نے محمد قلی کا مرثیہ پڑھا۔ معروف فنکاروں نے خواجہ بہاء الدین کی دھنوں پر محمد قلی قطب شاہ کا کلام سازوں پر پیش کیا۔ جناب عزیز احمد خاں وارثی اعوان کے ساتھیوں نے قوالی سنائی۔ افتتاحی اجلاس سے قبل دوپہر میں ادیبات، شاعرات اور محبانِ اردو کا پاٹ لک ہوا اور پھر جناب سعید شہیدی کی صدارت میں محفل شعر بھی آراستہ ہوئی۔ جناب ناظم مرزائی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ شعراء و صاحبان نے مزار محمد قلی قطب شاہ کے وسیع چبوترے پر اپنا کلام سنایا۔

۲۵/فروری:- یوم محمد قلی کا ادبی اجلاس "ایوان اردو" میں صبح ۱۱ بجے ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ، ڈاکٹر محمد ہاشم علی اور محترمہ آمنہ انصاری نے محمد قلی کے عہد، ادب اور دکنی شاعری پر مقالے سنائے۔ ڈاکٹر جین نے ڈاکٹر زور کی گرانقدر خدمات تحقیق اور کلیات سے ان کی وابستگی پر خطاب کیا۔ اور زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم رکن مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اردو نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اسی شب "ایوانِ اردو" کے خوبصورت آڈیٹوریم میں محفل مشاعرہ آراستہ ہوئی۔ صدر مشاعرہ جناب بی۔ این۔ رامن نائی (آئی۔ اے۔ ایس) پرنسپل سکریٹری ریاستی محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ نے شمع روشن کی اور حیدرآباد کے شعری و ادبی ماحول کو ملک کے سیکولر اور گنگا جمنی کلچر کی سربلندی کے لئے مثالی قرار دیا اور ادارۂ ادبیات اردو کی دیرینہ خدمات کی ستائش کی۔ اس مشاعرہ میں مسرز شاذ تمکنت، سعید شہیدی، ڈاکٹر مغنی تبسم، امیر احمد خسرو، ڈاکٹر غیاث صدیقی، علی احمد جلیلی، جہاندار افسر، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، خیرات ندیم، فیض الحسن خیال، اسلم عمادی، وقار خلیل، سکھ پرشاد کنول، بشیر وارثی، رحمن جامی، محمد منظور احمد، خالد سعید، علی الدین نوید، جوہر ہاشمی، منوہر لال بہار، عباس عابد، داؤد نصیب، ناظم مرزائی، عبد المتین نیاز، انور ہاشمی، بانو طاہرہ سعید، عزیز النساء صبا، روشن خیال، جگجیون، اسحٰق سحر اور ساتر مظہری نے کلام سنایا۔ وقار خلیل نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔

۲۶/فروری:- عثمانیہ ریسرچ اسوسی ایشن کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ "جدید غزل کی لفظیات" پر ڈاکٹر مغنی تبسم نے مبسوط مقالہ سنایا۔ مباحث میں ڈاکٹر ہاشم علی، ڈاکٹر یوسف کمال اور خالد سعید نے حصہ لیا۔

یکم مارچ:- گورنمنٹ پریس ایمپلائز یونین کی "اردو انجمن" کو خطاب کرتے ہوئے جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" نے کہا کہ ریاست میں اردو

کی ترویج و اشاعت کیلئے "انجمن ترقی اردو" نے ہمہ جہتی اردو تعلیمی پروگرام مرتب کیا ہے تاکہ ریاست میں اردو کا حق محفوظ رہے اور مستقبل روشن بنے۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ، سلام شاہد، امجد باغی، اور صدر جلسہ مسٹر سی ست نارائن، نائب صدر دار البلدیہ مز عمدہ یزدانی اور شیخ محبوب علی معتمد انجمن اردو نے بھی مخاطب کیا۔ اور اردو کی ترویج و اشاعت میں اپنے اشتراک کا یقین دلایا۔

۵/مارچ:۔ محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ فاطمہ عالم علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر فرحت لطیف اور قیوم نیاض نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ خواتین شعراء نے کلام سنایا۔ مظفر النساء ناز معتمد محفل نے شکریہ ادا کیا۔

● جناب عاتق شاہ جن کی اب تک ۹ کتابیں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں، دسویں کتاب "انڈین کاجو" کے نام سے شائع کی ہے۔ شاہ کی یہ کتاب طنز و مزاح پر مشتمل ہے۔

۸/مارچ:۔ پانچال کی ہند شنکر جی یادگار مشاعرہ جناب جسٹس مرتضیٰ فضل علی کی صدارت میں ہوا۔ معروف نے اپنے کلام سے مشاعرہ کا آغاز کیا اور مختصر تقریر کرتے ہوئے مشاعروں کو اردو کی ترویج و اشاعت کیلئے اہم میڈیا قرار دیا۔ ابتداً جناب عابد علی خاں نے خیر مقدمی تقریر کی اور شنکر جی کی اردو دوستی کا ذکر کیا۔ مسٹر پی نرسا ریڈی، سابق وزیر ... اور جناب سید مظہر شاہ صدر نشین لیجسلیٹو کونسل نے بھی مخاطب کیا۔ جناب احمد علی نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ مہمان اور میزبان شعراء میں مسرز کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی، عالم فتح پوری، بیکل اتساہی، شاذ تمکنت، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی، مینا قاضی، وقار خلیل، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، کنول پرشاد کنول، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، امیر احمد خسرو، عزیز النساء رعنا اور نایاب سلطانہ نے کلام سنایا۔

● نئی غزل کے باکمال سخنور خورشید احمد جامی کی دسویں برسی کے موقع پر ادارہ برگ آوارہ اور شالیمار پبلی کیشنز کی طرف سے سالانہ فاتحہ کے بعد مزار جامی پر چادر گل چڑھائی گئی۔

● ریاستی انجمن ترقی اردو کے سہ روزہ سالانہ کنونشن کے سلسلے میں بمقام "اردو ہال" اساتذہ کا مشاورتی اجلاس ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم (کنوینر) نے اس اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کا اردو سے ناواقف اور اساتذہ کیلئے ایک چیلنج ہے۔ اس اجلاس میں ریاست کی درسگاہوں کے مندوبین اساتذہ نے شرکت کی اور تعلیمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۹/مارچ:۔ انجمن ترقی اردو کا سولہواں سالانہ کنونشن پروفیسر حبیب الرحمن صدر انجمن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جسٹس مرتضیٰ علی (سپریم کورٹ) نے افتتاح کرتے ہوئے حیدرآباد کو اردو کا گہوارہ قرار دیا اور کہا کہ یہاں اردو کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے نمایاں کام ہو رہے ہیں۔ آپ نے اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے مطالبہ کی تائید کی اور اردو والوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس زبان کو عام فہم اور عوامی بنائیں۔ معتمد ریاستی انجمن جناب عابد علی خاں نے ابتداً خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مبسوط کلیدی خطبہ سنایا۔ مسز کے پی چندرا (ایم ایل سی) نے بھی مخاطب کیا۔ پروفیسر حبیب الرحمن نے صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو کے مطالبات کی تکمیل کیلئے انجمن کو جمہوری و آئینی حربے استعمال کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ جو جمہوریت کے عصری تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ اردو کے مطالبات کے لئے "اردو ہفتہ" منایا جائے۔ سرنیواس لاہوٹی نے شکریہ ادا کیا۔ اسکے دوسرے پہر مندوبین کے اجلاس میں کئی قرار دادیں بحث و مباحثہ کے بعد منظور کی گئیں۔ اور رات میں محفل مشاعرہ جناب شاذ تمکنت کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مندوب شعراء اور میزبان سخنوروں نے کلام سنایا۔ غیاث ندیم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● معروف ڈرامہ نویس ادیب جناب قدیر الزماں کے ڈراموں کا مجموعہ "لنگر دا گھوڑا" کے نام سے شائع ہوا اور یہی ڈرامہ اسٹیج بھی کیا گیا۔ جناب عالم خوندمیری نے ان ڈراموں کا جائزہ لیتے

ہوئے خدیجہ الزماں کی ڈرامہ نگاری کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا۔

۱۴/مارچ: — ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ رام ریڈی نے اسمبلی میں بتایا کہ قانونِ سرکاری زبان کی دفعہ (۱) کے تحت ریاستی نظم و نسق میں اردو زبان کے استعمال کے لئے ضمن احکامیہ جاری کئے گئے ہیں اور جہاں اردو بولنے والوں کا تناسب پندرہ فیصد سے زائد ہے۔ ان احکامات کا نفاذ ہوگا نیز اردو کی ترقی کیلئے مدارس میں اردو کے علیحدہ سیکشن بھی کھولے گئے ہیں۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو علیحدہ اسکول بھی منظور کیا جاسکتا ہے۔

۱۵/مارچ: — آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ملک کے صف اول کے شاعر مخدوم محی الدین کی یاد میں ہر سال کسی ادبی شخصیت کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں دس ہزار روپے کا "مخدوم ایوارڈ" دیئے جانے کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلے میں قواعد و ضوابط کی تیاری کیلئے ایک ادبی کمیٹی بھی اکیڈیمی نے تشکیل دی ہے۔ جس کے اراکین ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، اعجاز قریشی، ناصر کرنولی اور داور اشرف ہیں۔

۱۶/مارچ: — ریاستی حکومت نے تلگو سال نو (اگادی) کے موقع پر کالجوں اور جامعات کے ۳۲ اساتذہ کو قومی ایوارڈ دیا ہے۔ اس زمرہ میں اردو کے رفیق دانشور ڈاکٹر حسینی شاہد، پرنسپل اردو آرٹس کالج بھی شامل ہیں — جناب ایم، باگا ریڈی صدر اردو اکیڈیمی و ریاستی وزیر پنچایت راج نے اردو کے دیرینہ حل طلب مسائل پر غور و فکر کیلئے اردو تنظیموں کے ایک مشترکہ اجلاس کی تجویز رکھتے ہوئے اپنے بیان میں کہا کہ انجمن ترقی اردو کی یادداشت پر حکومت سرکاری زبان میں جائزہ لیا جارہا ہے یقین ہے ڈاکٹر چناریڈی کی حکومت ریاست کی دوسری بڑی اور اہم زبان کے ساتھ انصاف کے تقاضوں کو روبہ عمل لائے گی۔

۲۱/مارچ: — معروف غزل گو اور خوش فکر شاعر جناب رئیس اختر کا پہلا شعری مجموعہ "آئینہ دل" ریاستی اردو اکیڈیمی اور محکمہ تعلیمات کی اعانت سے شائع ہوا۔

۲۳/مارچ: — اردو ریسرچ اسوسی ایشن جامعہ عثمانیہ کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی صدارت میں منعقد ہوا جناب محمد منظور احمد سابق لکچرار سٹی کالج نے "پروفیسر سید محمد کی ادبی خدمات" پر مقالہ سنایا۔

۲۴/مارچ: — بزم اردو نظامت صنعت و حرفت کی طرف سے پہلا سالانہ مشاعرہ جناب کے اوما پتی اسپیشل آفیسر مجلس بلدیہ حیدرآباد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اوج یعقوبی، سعید شہیدی، وقار خلیل، سعد حسن، امیر احمد خسرو، صلاح الدین نیر، خیرات ندیم، فیض الحسن خیال، رحمن اختر، راجہ لال راہی، عزیزہ ان وصبا، نور اللہ ملکی، یوسف یکتا، ظہیر شرفی، کشفی کیفی، میزان منیر اور یوسف چشتی نے کلام سنایا۔

۲۵/مارچ: — ریاستی وزیر پنچایت راج جناب ایم، باگا ریڈی نے اردو بولنے والوں اور اردو کے ہمدرد اداروں کے واجبی اور معقول مطالبے کو قبول کرتے ہوئے تمام ضلع پریشدوں کو سختی سے ہدایت جاری کی ہے کہ وہ اپنے زیر انتظام مدارس میں اردو اساتذہ کی ماموری کا فی الفور انتظام کریں اور غیر اردو داں اساتذہ کو بدل دیا جائے۔

۲۶/مارچ: — ڈائرکٹر و سکریٹری ریاستی اردو اکیڈیمی جی ڈی سریواستو نے چارمینار کے قریب شہر میں اکیڈیمی کی طرف سے قائم کئے جانے والے اردو ریسرچ سنٹر اور لائبریری کی تفصیلات سے صحافیان اردو کو منسٹر کے دفتر پر خطاب کیا۔ اور بتایا کہ اکیڈیمی کی نگرانی میں اردو میڈیم کی چھٹی تا دسویں کی نصابی کتب بھی تیار کرائی ہیں۔

۲۸/مارچ: — انجمن اتحاد طلبائے قدیم اردو آرٹس کالج کی جانب سے ایک استقبالیہ جلسہ میں ڈاکٹر حسینی شاہد کو ایوارڈ ملنے پر دلی مبارکباد دی گئی۔ اس جلسہ کی صدارت پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے کی دیگر مقررین میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سری رام شرما، جناب فضل الرحمن، ڈاکٹر حفیظ قتیل، مسٹر جی ڈی سریواستو اور احمد منصوری نے اظہار خیال کیا۔ معتمد انجمن جناب نصرت محی الدین نے شکریہ ادا کیا۔

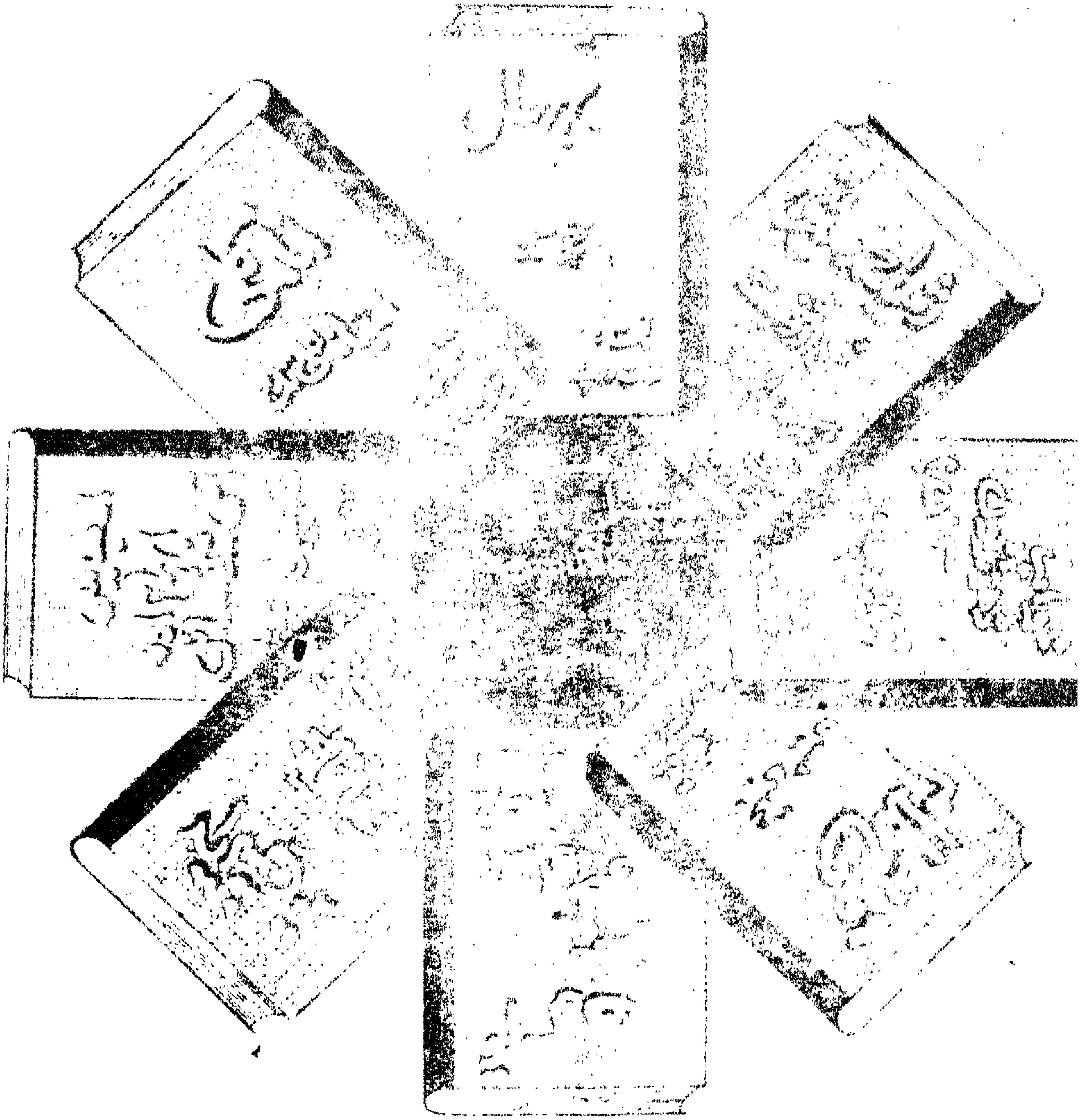
۳۰/مارچ: — اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس بصدارت ڈاکٹر حفیظ قتیل منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صفدر علی بیگ نے "تصوف کے مسائل اور مباحث" پر جناب محمد منظور احمد نے "مولانا عبدالماجد دریا بادی" پر مضامین سنائے۔

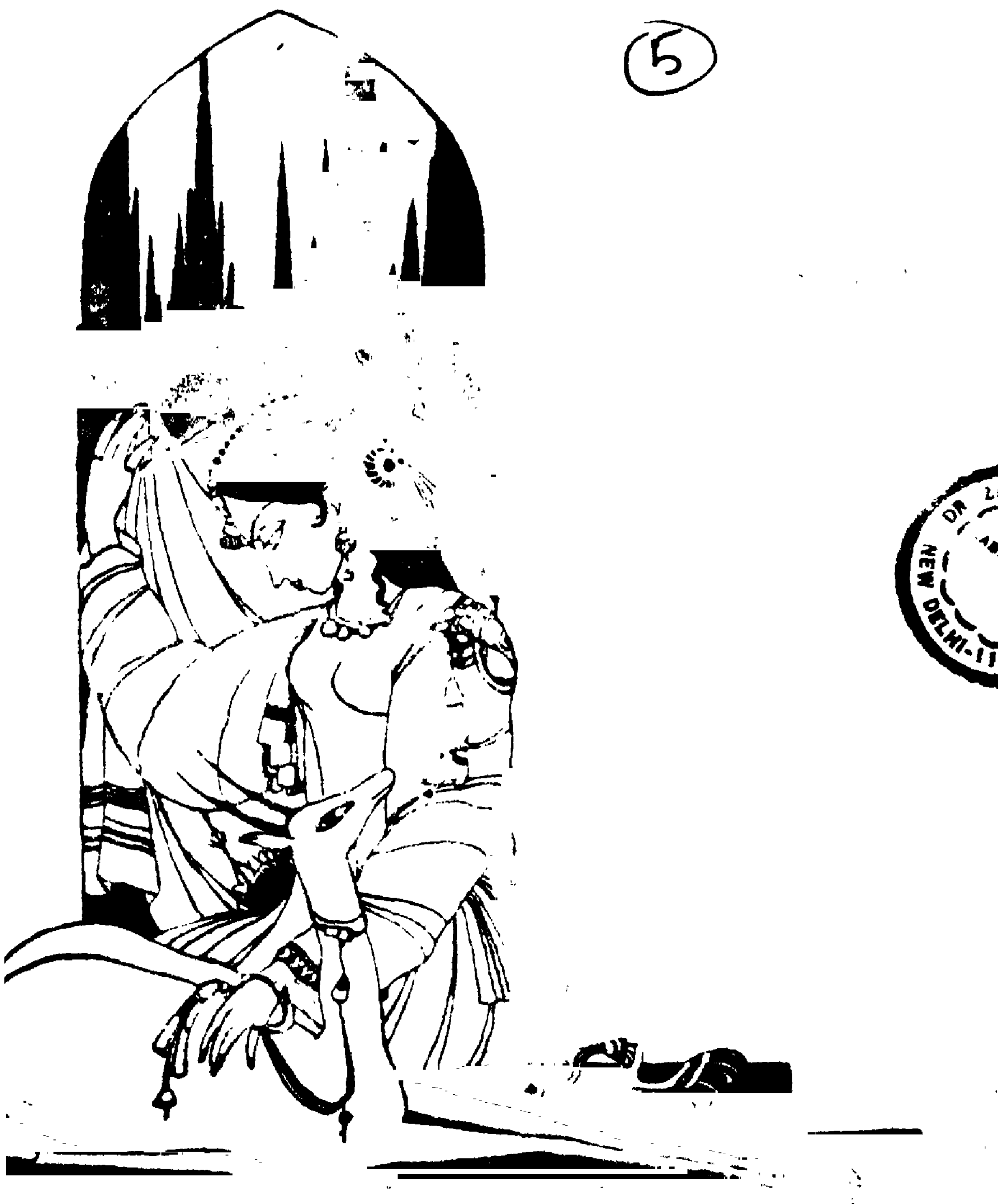
JANUARY -APRIL 1980

R. N. 1892
[illegible]

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of [illegible] A. P





سنِ اجرا : ۱۹۳۸ء

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۳ مئی ۱۹۸۰ء شمارہ ۵

مدیر اعزازی ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل

ادارۂ ادبیاتِ اردو ● پنجہ گٹہ ● حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

زرِ سالانہ

معمولی ڈاک سے
۲۰/- روپے

رجسٹری سے
۴۵/- روپے

بیرونی ملکوں سے
مشرقِ وسطیٰ ۱۰ ڈالر، امریکہ ۱۲ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر

کتب خانوں اور اداروں سے
۲۵/- روپے

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲

ترتیب

باتیں	مغنی تبسم	۲
عزیز احمد ـــ ایک جائزہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	۴
سائنس اور ریھانس (نظم)	کشور ناہید	۱۱
زندگی (نظم)	شاذ تمکنت	۱۱
	کشور ناہید	۱۲
غزل	امجد اسلام امجد	۱۲
غزل	شاہدہ حسن	۱۲
شو (کہانی)	انتظار حسین	۱۳
طرابلس سے چند نظمیں	علی ظہیر	۱۹
دکنی ادب میں ہندوستانی عناصر	ڈاکٹر ہاشم علی	۲۰
بانسری کا خواب (کہانی)	ہرمن ہیس	۲۲
ایک نظم	مظہر مہدی	۲۵
نظمیں	اختر عادل	۲۵
دشینت کمار کی غزلیں	خالد قادری	۳۱
غزل	غیاث متین	۳۳
غزل	علی الدین نوید	۳۴
نئی کتابوں پر تبصرے	مغنی تبسم	۳۵
ـ (اس دو ماہ) ـــ		
ادبی سرگرمیاں	وقار خلیل	۳۷

مغنی تبسم

باتیں

اردو زبان و ادب کے کسی نہ کسی موضوع پر آئے دن کانفرنسیں اور سمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بے شمار مقامی اور کل ہند سمیناروں کے علاوہ چند ہند پاک اور بین الاقوامی سمینار بھی شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئے لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ بہت کم سمینار اور کانفرنسیں اپنے انعقاد کے مقاصد کو پورا کر سکیں۔ ضروری ہے کہ اس بہانے چند ایک اچھے مقالے ضبطِ تحریر میں آجاتے ہیں لیکن یہ کام تو ادبی رسالے بھی خوش اسلوبی سے کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس کے لیے سمینار منعقد کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے بیشتر سمینار ناکام ہوتے ہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر سمینار رواروی اور عجلت میں منعقد کئے جاتے ہیں اور ان کی منصوبہ بندی ٹھیک نہیں ہوتی۔ پہلے تو سمینار کے عنوانات کا انتخاب سرسری طور پر کر لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے موضوع کے لیے اور اچھوتے پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ پھر مقالہ نگاروں کو اتنی تاخیر سے اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ کم وقت میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔ ان میں نئی اور کام کی باتیں کم ہوتی ہیں۔ بعض مقالہ نگار گلہ ٹالنے کی غرض سے اسی موضوع پر اپنے کسی پرانے مضمون کو ذرا سے ردّ و بدل کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ سمینار کے اجلاسوں میں وقت کی گنجائش کے اعتبار سے نہ تو مقالوں کی تعداد متعین کی جاتی ہے اور نہ ان کی طوالت پر کوئی حد لگائی جاتی ہے اور جب وقت کی تنگی کا احساس ہوتا ہے تو مقالہ نگاروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مقالوں کے چند اقتباسات پیش کر دیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے مقالوں پر اطمینان بخش طریقے سے بحث بھی نہیں کی جا سکتی۔

سیمناروں کے مباحث بھی غیر منظم ہوتے ہیں۔ ان کا معیار بھی علمی سطح سے گرا ہوا ہوتا ہے۔ سامعین میں سے جس کسی کا جی چاہتا ہے اسٹیج پر چلا آتا ہے اور لمبی چوڑی تقریر کرنے لگتا ہے جس میں کم ہی باتیں اصل موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔ جو اصحاب اپنے اظہار خیال سے مباحث کو معنی خیز بنا سکتے ہیں انھیں یا تو اس کا موقع نہیں ملتا یا وہ سیمنار کی ہڑبونگ سے گھبرا کر خاموش رہنے ہی میں اپنی عافیت دیکھتے ہیں۔ مقالوں میں اٹھائے گئے بنیادی مسائل پر بات نہیں ہونے پاتی اور بحث جزوی یا غیر متعلقہ امور میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ بعض اشخاص شخصی یا گروہی اختلافات کے اظہار کے لیے مباحثے کی آڑ لیتے ہیں اور سیمنار کسی دنگل کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔

ہونا یہ چاہیے کہ سیمنار کی تیاری کم از کم چار پانچ ماہ پہلے شروع کی جائے سب سے پہلے ایک موضوعاتی کمیٹی بنائی جائے جو سیمنار کے مختلف اجلاسوں کے لیے موضوعات اور ذیلی عنوانات کا تعین کرے۔ عنوانات منتخب اور محدود ہوں تو ان پر سیر حاصل گفتگو کی جا سکتی ہے مقالہ نگاروں کو بھی سیمنار کی اطلاع بہت پہلے دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر پوری توجہ اور اطمینان کے ساتھ مقالہ لکھ سکیں۔ مقالہ نگاروں کو پابند کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک ماہ قبل اپنا مقالہ لکھ کر بھیج دیں۔ ان سے یہ درخواست بھی کی جائے کہ مقالے طویل نہ ہوں اور کسی وجہ سے مقالہ طویل ہو جائے تو اس کا خلاصہ بھی لکھ بھیجیں۔ ایک ایسی کمیٹی ہونی چاہیے جو ایک ہی موضوع یا عنوان سے متعلق مقالوں کے اہم نکات کو مرتب کرکے WORKING PAPER تیار کرے۔ پھر ان کی نقلیں سائیکلو اسٹائل کرکے سیمنار سے قبل مقالہ نگاروں اور مباحث میں حصہ لینے والوں کے پاس بھیج دے تاکہ وہ انھیں پڑھ کر پوری تیاری کے ساتھ شریک ہوں۔ مقالہ نگاروں کے علاوہ سیمنار کے مباحث میں حصہ لینے والوں کے نام بھی پہلے ہی سے طے کر لیے جائیں۔ سامعین کو صرف اتنی اجازت دی جائے کہ وہ اپنی تشفی کے لیے تحریری سوالات پیش کریں اور مقالہ نگار ضروری اور مناسب سوالوں کے جواب دے۔ اجلاسوں کے صدور کو چاہیے کہ وہ غیر متعلق گفتگو اور شخصی حملوں کی اجازت نہ دیں اور اپنی بروقت مداخلت اور مشوروں سے مباحث کو ایک سمت عطا کریں۔ سیمنار کے بجٹ کا ایک حصہ مقالوں کی اشاعت کے لیے مختص کر دینا چاہیے۔ مقالوں کے ساتھ متعلقہ مباحث کی روداد بھی شایع کی جائے تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ ان تجاویز پر عمل پیرا ہوں تو ہمارے سیمنار زبان و ادب کی ترقی میں اہم رول انجام دیں گے اور یہ صورت نہیں ہوگی کہ نشستند و گفتند و برخاستند۔

——— ادارۂ ادبیات اردو میں حاضر ہو کر اندازہ ہوا کہ شیفتگان اردو نے کس محنت و جانکاہی کے ساتھ زبان اردو کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ نادر مخطوطات اور ذخیرہ کتب و رسائل قدیمی کو یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنا قیمتی سرمایہ کس جذب و شوق سے محفوظ کیا گیا ہے۔ میرا سر فخر سے بلند ہے دعاگو ہوں کہ یہ سرمایہ مزید بڑھتا رہے اور ہمارے تاریخی رشتے زندہ و سلامت رہیں۔

۱۲ / اپریل ۱۹۸۰ء　　　　نیر احمد شیخ

سفارت خانہ پاکستان - دہلی

ڈاکٹر جمیل جالبی

عزیز احمد ــــ ایک جائزہ

۱۹۷۸ء ادیبوں پر بہت بھاری گزرا۔ بہت سے نام ور ادیب دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے جدا ہوگئے۔ ابتدا پروفیسر محمد حسن عسکری کی وفات سے ہوئی تھی ــــ یہ جنوری کا مہینہ تھا، اور اس کا ڈراپ سین پروفیسر عزیز احمد کی وفات پر ہوا ــــ یہ دسمبر ۱۹۷۸ء کا مہینہ تھا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ عزیز احمد کی وفات کی خبر کراچی کے صرف ایک اخبار میں چھپی اور وہ بھی اتنی مختصر تھی کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اُس شخص کی وفات کی خبر ہو سکتی ہے جس نے تقریباً چالیس سال نہایت سنجیدگی کے ساتھ، ادب و علم کی خدمت میں گزارے اور اپنی سدا بہار تخلیقات و تصنیفات سے زبان و ادب کو مالا مال کیا اور اردو ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبیات کی سطح پر لانے کے لیے وہ کام لیا جو تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ عزیز احمد اردو کے اُن چند ادیبوں میں سے ایک تھے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اور جن کی تحریریں دنیا بھر کے علمی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

تعلقاتِ عامہ اور اشتہار بازی کا دور ہے۔ اشتہار کے سہارے جس طرح صنعت کار اپنی گھٹیا مصنوعات بھی بازار میں فروخت کر سکتا ہے اور خریدنے والا، اشتہار کے جادو کے اثر سے، اسے اعلیٰ اور مثالی چیز سمجھتا ہے، اسی طرح ادب و فن میں بھی اب اشتہار بازی نے اچھے اور بُرے، اعلیٰ و ادنیٰ، حقیقی و غیر حقیقی، اصلی اور نقلی کا امتیاز مٹا دیا ہے۔ میں نے کئی لکھنے والوں کو کہتے سنا ہے کہ صاحب مرنے کے بعد ہماری تحریروں کا کیا ہوگا۔ اس سے ہمیں کیا واسطہ۔ ہمیں تو اس سے مطلب ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارے لکھے ہوئے الفاظ کیسے بکتے ہیں؟ یہ وہ دوکاندارانہ ذہنیت ہے جس نے تخلیق اور علم و ادب کو اس کے منصب سے ہٹا دیا ہے۔ اسی لیے آج ہمارا ادب اخباروں کے صفحات پر "تخلیق" ہو رہا ہے۔ اس میں بھی کوئی برائی نہیں تھی اگر لکھنے والا نامی دوکان دار بن کر صرف بکری بڑھانے کی ذہنیت کا شکار نہ ہوتا۔ اسی لیے آج کی زہر آلود فضا میں ادیب، دانشور، عالم اور بظاہر ادیب، بظاہر دانشور اور بظاہر عالم میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ایذرا پاؤنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "غیر سنجیدہ فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سنجیدہ و غیر سنجیدہ فن کار میں تمیز نہ ہونے دے۔" اسی ذہنی منظر نے سنجیدہ و حقیقی فن کار عزیز احمد کی عظمت کو ہماری نظروں سے اوجھل رکھا اور جیسا کہ فتح محمد ملک صاحب نے بتایا ہے کہ ایک سابق پروفیسر اور حال بیوروکریٹ نے زعمِ کرسی میں آکر یہ کہہ دیا کہ وہ "جاہل آدمی" تھے۔ فتح محمد ملک نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ عزیز احمد کی معرکۃ الآرا تصنیف "اقبال ــــ ایک نئی تشکیل" کو ایم۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جس نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی، فکری اور تخلیقی فضا کو زہر آلود

کر رکھا ہے۔ سنجیدہ فن کار قدر شناسی سے اسی طرح بے نیاز ہوتا ہے جس طرح قدر شناس ... عزیز احمد نے کبھی نام و نمود یا اشتہار بازی کے ذریعے شہرت بٹورنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ایک سنجیدہ فن کار کی طرح ہمیشہ کام کو اہمیت دی اور جب تک زندہ رہے کام اور صرف کام کرتے رہے۔ میرے اور عزیز احمد کے تعلقات کی تاریخ بائیس تیئیس سال پر پھیلی ہوی ہے۔ اس تمام عرصے میں میں نے انھیں اپنے بارے میں کبھی دون کی لیتے نہیں دیکھا۔ اگر کبھی ان کے فن یا ذات کے بارے میں کوئی گفتگو میں کرتا تو ان کے چہرے پر نئی نویلی دلہن کی طرح حیا کی سرخی دوڑ جاتی۔ ان میں ایک سچے فن کار اور بڑے ادیب کا ایسا انکسار تھا جو اس دور میں خال خال نظر آتا ہے۔

عزیز احمد ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوے۔ ۱۹۳۴ء میں جامعۂ عثمانیہ سے اور ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز کیا اور اسی سال جامعۂ عثمانیہ میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوے جہاں ترقی کر کے کچھ عرصہ کے بعد ریڈر اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں عزیز احمد پاکستان آ گئے اور حکومت پاکستان کے فلم و مطبوعات کے محکمے کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اس محکمے سے وہ ۱۹۵۷ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ لندن یونیورسٹی کے اورینٹل اور افریقن اسٹڈیز کے سکول میں اردو اور ہندی اسلام کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوے جہاں وہ ۱۹۶۲ء تک رہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو کر ٹورانٹو یونیورسٹی (کناڈا) کے شعبۂ اسلامیات سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں پروفیسر بنا دیا گیا جس پر وہ تا مرگ فائز رہے۔ وہاں ان کے کام کی اہمیت و وقعت کے پیش نظر انھیں رائل سوسائٹی آف کناڈا کا فیلو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف لندن نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ عزیز احمد پہلے پاکستانی تھے جنھیں یہ اعزاز ملے۔ یہ اعزاز عزیز احمد کے لیے ہی باعث فخر نہیں تھا بلکہ خود پاکستان کے لیے بھی باعث افتخار تھا لیکن کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے اور کتنے ہیں جو علم و ادب کے اس مرتبے پر پہنچے ہیں اور اپنی تصانیف سے ہمارے ادب و ذہن پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

عزیز احمد کئی زبانیں جانتے تھے۔ فرانسیسی اور جرمنی کے علاوہ انگریزی ان کے لیے اظہار کی زبان تھی۔ ان سب زبانوں پر وہ بہت اچھی قدرت رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۹ء میں وہ لندن سے ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کیلیے فرینکفرٹ آئے تھے اور میں پاکستان سے گیا تھا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے حکومت ہند کے نائب صدر مشہور فلسفی رادھا کرشنن آئے تھے شام کو ایک دعوت میں جو صدر جرمنی کی طرف سے سارے مندوبین کو دی گئی تھی مسٹر رادھا کرشنن ایک نہایت حسین نوجوان ایرانی لڑکی سے بہت دیر سے اور بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسرت دیدنی تھی۔ اس شمع محفل کو ہر وقت سے پروانوں نے بھی گھیر رکھا تھا۔ وہ فارسی اور فرانسیسی جانتی تھی۔ عزیز احمد صاحب نے فارسی میں اس کا نام پوچھا۔ اس نے منیژہ بتایا۔ میں نے نام سن کر فردوسی کا مصرع پڑھا۔ ع: "منیژہ منم دخت افراسیاب۔" وہ ہنسنے لگی۔ اس کے فوراً بعد عزیز احمد پہلے فارسی میں اور پھر فرانسیسی میں اس سے بڑی روانی سے باتیں کرتے رہے اور وہ باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ کچھ ہی دیر بعد عزیز احمد شمع بن گئے اور وہ پروانہ۔ اُس دن عزیز احمد نے بے شمار فارسی اشعار سنائے۔ خیر یہ جملۂ معترضہ تھا۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مرحوم کو جتنی زبانیں آتی تھیں ان پر انھیں مکمل قدرت تھی۔

عزیز احمد کی شخصیت اتنی گوناگوں ہے کہ اس کے تعارف کے لیے ایک طویل مقالے کی ہی نہیں بلکہ پوری کتاب کی ضرورت

ہے۔ عزیز احمد نے اپنی قلم کاری کا آغاز فکشن اور تراجم سے کیا۔ ان کے دو ناول "ہوس" اور "مرمر اور خون" ۱۹۳۳ء تک شائع ہو چکے تھے۔ اسی سال انھوں نے ابسن کے ڈرامے "گریٹ بلڈر" کا "معمارِ اعظم" کے نام سے ترجمہ کیا اور ایک منظوم ڈرامہ "عمر خیام" بھی لکھا۔ ارسطو کی "بوطیقا" اور دانتے کی "DIVINE COMEDY" کا ترجمہ "طربیۂ خداوندی" کے نام سے کیا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اپنا تیسرا ناول "گریز" لکھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا جس کا ہیرو نعیم آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کر کے تربیت کے لیے لندن جاتا ہے۔ یہ کردار جب بین الاقوامی پس منظر میں زندگی گزارتا ہے تو کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے یہی اس ناول کا موضوع ہے۔ نعیم کے کردار میں اس دور کے نوجوانوں کے تمام رجحانات و میلانات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ناول کے اعتبار سے یہ اردو کا ایک کامیاب ناول ہے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے اپنا ناول "آگ" لکھا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کشمیری معاشرے کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا وہ ناول شائع ہوا جسے آج ہم اردو زبان کے بہترین ناولوں میں شمار کرتے ہیں اور جسے ہم سب "ایسی بلندی ایسی پستی" کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں اس ناول کا ترجمہ پروفیسر رالف رسل نے انگریزی میں کیا جسے یونیسکو نے شائع کیا۔ ۱۹۵۰ء میں عزیز احمد کا آخری ناول "شبنم" شائع ہوا۔ ان سب ناولوں میں عزیز احمد نے اپنے دور کی روح کو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اُس وقت خود عزیز احمد جوان تھے اور ان کی عمر ۳۷ سال تھی۔ عزیز احمد کی ناول نگاری نے اردو ناول کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان ناولوں کے بغیر ہم اس دور کی معاشرت و رجحانات، اس کے تضاد اور کشاکش کا عرفان حاصل نہیں کر سکتے۔ اردو ادب میں یہ دور روایت شکنی کا دور تھا اور پرانی اقدار اور رسوم کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب تھا جو نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں موجزن تھا۔ فرائیڈ کے نظریۂ جنس میں انسانی جبلت کے نئے امکانات نظر آ رہے تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس منٹو کا بھی ہیرو تھا اور عزیز احمد کا بھی۔ منٹو نے افسانوں کے ذریعے اور عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں انسان کی اس جبلت کو موضوع بنایا۔ ان ناولوں پر فرانسیسی حقیقت نگاری کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان سب ناولوں میں "فرد" اہم ہے لیکن "ایسی بلندی ایسی پستی" میں ان کا زاویۂ نظر بدل جاتا ہے اور وہ فرد کے مطالعے سے جاگیردارانہ معاشرے کی ہیئتِ اجتماعی کا اتنی فن کاری سے مطالعہ کرتے ہیں کہ اس ناول میں فرد کا المیہ ایک تہذیب کا المیہ بن جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے سہ ماہی "اردو ادب" لاہور میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔ اس دور میں جاگیردار امراء کی تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ سارے برصغیر میں یہی صورتِ حال تھی۔ یہی صورت ہمیں ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول "شامِ اودھ" میں نظر آتی ہے۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" میں حیدرآباد دکن کا طبقۂ امراء موضوع بنا ہے اور "شامِ اودھ" میں لکھنؤ کا یہی طبقہ موضوع ہے۔ دونوں ناولوں میں انفرادی کردار ایک مخصوص تہذیب کے ذہن، فکر اور نظام کے اجتماعی کرداروں کی کہانی سناتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول "شبنم" میں پھر تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں وہ عشق کو "گریز" کے انداز سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں رومانیت بھی اب اپنی شکل بدل رہی ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد نے کوئی ناول نہیں لکھا البتہ ایک تاریخی ناول "تیمور" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی کے ساتھ تاریخ ان کے یہاں

طویل افسانوں کا موضوع بننے لگی اور قدیم تاریخ جدید شعور کی ترجمانی کرنے لگی۔ "زرّیں تاج"، "خدنگِ جستہ" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" ان کی وہ لازوال کہانیاں ہیں جنھوں نے اردو ادب کی میراث کو بیش بہا بنا دیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے جب عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کو دوبارہ شائع کیا تو ۱۸ نومبر ۱۹۷۶ء کو ایک خط میں مجھے لکھا کہ "ان سے ارشاد فرمائیں کہ تین جلدیں مجھے روانہ کردیں، میں بہت ممنوں ہوں گا۔ اُن سے یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ میری جو اردو کتابیں وہ چاہیں دوبارہ شائع فرماسکتی ہیں۔ خاص طور پر میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے آخری تحریری دور کے طویل افسانے جو زیادہ تر "نیا دور" میں شائع ہوچکے ہیں، وہ ایک جلد میں جمع کرکے شائع فرمائیں اور اگر آپ خود اس جلد کا "دیباچہ" لکھیں تو میری بڑی عزت افزائی ہوگی۔" پھر یہ ہوا کہ جمیلہ ہاشمی بیمار ہوگئیں اور اس کے ساتھ ان کا اشاعتی منصوبہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک اور خط میں عزیز احمد نے مجھے لکھا کہ وہ حصہ جو "نیا دور" میں میرے متعلق ہوگا اس میں "تصویرِ شیخ" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" ضرور شامل کیجئے گا۔" یہ دونوں کہانیاں "نیا دور" کے اگلے شمارے میں شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں عزیز احمد نے فن کی بلندیوں کو چھولیا ہے۔

عزیز احمد نے اپنے مختصر اور طویل افسانوں میں روایت، اساطیر اور تاریخی شخصیات کو موضوع بنا کر ان کے گرد ایسے افسانوی تار و پود بُنے جن سے وہ شخصیتیں ایک نئے رنگ میں زندہ ہوکر ہمارے جدید شعور کا حصہ بن گئیں۔ یہ افسانے تہذیبی و روایتی سرمائے کو جدید زمانے سے ہم آہنگ کرنے کا بہترین اظہار ہیں۔ جدید دور ماضی میں خود کو کیسے تلاش کرسکتا ہے، اس تخلیقی عمل کی یہ افسانے خوب صورت اور بہترین مثالیں ہیں۔ زرّیں تاج، تصویرِ شیخ، مدن سینا اور صدیاں، آبِ حیات، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں اور خدنگِ جستہ کو اردو ادب میں اتنا بڑا مرتبہ حاصل ہے کہ آج تک ایسے افسانے اردو میں کوئی اور نہیں لکھ سکا۔ یہ افسانے اپنے فنی حسن، کمالِ اختصار اور طرزِ ادا کے لحاظ سے دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ عزیز احمد کا اصل فن یہ ہے کہ وہ موجود شخصیات یا تاریخی کردار اور علامات کو اپنے زمانے کے جذبات و احساسات کے ساتھ اپنی فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ روایت کا سلسلہ در سلسلہ، اس کی گہرائیاں اور اس کی وسعت سمٹ کر زمانۂ حال میں آجاتی ہیں۔ عزیز احمد نے ان افسانوں میں کلاسیکی حُسن کو چھولیا ہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے: "رقصِ ناتمام" اور "بیکار دن، بیکار راتیں" شائع ہوچکے ہیں۔ اگر عزیز احمد کچھ اور نہ بھی کرتے تو ان ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے اردو ادب میں زندہ رہتے لیکن ایک بڑے ذہن کی طرح ان کا ذہنی سفر جاری رہا۔ وہ کسی منزل پر تھک کر نہیں بیٹھے بلکہ ہر منزل سے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اب ان کی تخلیقی، علمی و ادبی زندگی کے لیے سفر کا آغاز ہوا ہے۔

عزیز احمد کی تنقیدی تصنیف "ترقی پسند ادب" نے اپنے دور میں وہ کام کیا جو بہت کم کتابیں کرتی ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب نئے خیالات، میلانات اور رویّوں کا سیلاب آیا ہوا تھا اور اس سیلاب میں تعصبات کا کوڑا کرکٹ اور پارٹی لائن کا ریت خاصی مقدار میں بہہ کر آگیا تھا، عزیز احمد نے معروضی انداز سے اس دور کے میلانات کا تجزیہ کیا۔ اس کتاب نے اس دور کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو پھر سے غور کرنے اور مسائل و رجحانات کا جائزہ لینے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے

ماضی اور روایت کی اہمیت پر زور دیا۔ تخلیق کے لیے فن، ہیئت اور بیان کی اہمیت واضح کی، ادب اور پروپگنڈا کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔ اس تصنیف میں انھوں نے حقیقت نگاری اور انقلاب کے لیے رجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے فن کو سیاست و تعصب کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ عزیز احمد کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک معروضی ذہن اور دماغ رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا بلکہ اسے ایک اکائی کے طور پر دیکھا جو ہر دم رواں دواں آگے بڑھتی رہتی ہے اور جس میں حال کی طرح ماضی بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کو بھی انھوں نے کھلے ذہن سے دیکھا ہے اور "اقبال ـــــ ایک نئی تشکیل" میں جس طرح اقبال کا مطالعہ کیا ہے، جس طرح اقبال کے ذہن سے متعلق ان تمام مباحث کو سمیٹا ہے، جس طرح اقبال کے فن اور پیغام کی وضاحت کی ہے، آج بھی یہ کتاب اقبال پر ہزاروں لاکھوں صفحات لکھے جانے کے باوجود ایک ایسی اہم کتاب ہے جس کے بغیر اقبال کا مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ہمارے دور میں اقبال کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ان کا مطالعہ ایک مجاور کی حیثیت سے کیا ہے، اور اس طرح اس فکر کو، جسے اقبال نے تشکیل دے کر آگے بڑھایا تھا، ہم نے بند باندھ کر وہیں روک دیا ہے۔ فکر انسانی تنقیدی نظر سے ابھرتی ہے، تجزیے سے نشو و نما پاتی ہے، اختلاف و تضاد کے تصادم سے آگے بڑھتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں صرف سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے ذہن سے نہیں بلکہ خود اقبال کی طرح کھلے ذہن سے زندگی اور فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ جب تک ہم اپنے موجودہ رویّے کو نہیں بدلیں گے، ہمارا معاشرہ اسی طرح خود غرضیوں، انسانی پستیوں، ذہنی فریب، ہر قسم کے تعصبات اور بے سروپا جذبات کی دلدل میں دھنسا رہے گا۔ یہی کھلا ذہن عزیز احمد کو فکر و تحقیق کی طرف لے گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ برصغیر ذہن انسان دوستی کے حوالے سے انھیں اپنے عظیم تمدن اور تہذیب کے ورثے سے نہ صرف باخبر کیا تھا بلکہ عہد حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک نظام فکر کو تشکیل دینے کے لیے بے شمار مسائل اٹھائے تھے۔ ان مسائل کا جواب اور حل کی تلاش ہمارا فریضہ تھا۔ ہم یہ فریضہ کھلے ذہن سے پورا کر سکتے تھے لیکن مجاوروں نے ہماری نسل کے ذہن کو خوف سے گندا کر دیا اور فکر اقبال کے ارتقا کو روک دیا۔ کیا فکری سطح پر یہ ہمارا قومی المیہ نہیں ہے؟

۱۹۵۰ء کے بعد عزیز احمد نے خصوصاً مسلمانوں کی تہذیب اور فکر کا مطالعہ شروع کیا۔ اب وہ ادب سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ ان کا آخری افسانہ "تیری دلبری کا بھرم" "نیا دور" کراچی کے شمارہ نمبر ۲۵، ۲۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھی۔ اب انھوں نے انگریزی زبان میں مضامین اور تصانیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا جن کا موضوع مسلمانوں اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ تھا۔ جب ان کی پہلی کتاب (STUDIES IN ISLAMIC CULTURE AND THE INDIAN ENVIROMMENT شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب (ISLAMIC MODERNISM IN INDIA AND PAKISTAN شائع ہوئی اور پھر شائع ہوئی تو بین الاقوامی حلقوں میں ان کی علمی و تحقیقی حیثیت مسلّم ہوگئی۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے جو بین الاقوامی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ان کی دو اور قابلِ ذکر تصانیف HISTORY OF ISLAMIC SICILY اور AN INTELECTUAL HISTORY OF ISLAM IN INDIA

بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اٹلی کی حکومت نے آخر الذکر کتاب پر انھیں انعام دیا۔ عزیز احمد کی یہ خواہش تھی کہ میں STUDIES IN ISLAMIC CULTURE اور ISLAMIC MODERNISM IN INDIA AND PAKISTAN کا اردو میں ترجمہ کردوں۔ وہ جس محبّت سے مجھے خط لکھتے تھے اس محبت کا جواب میں نے کبھی انکار سے نہیں دیا اور وعدہ کرلیا۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ "اسلامک موڈرنزم" کا ترجمہ میں نے بہت پہلے مکمل کرلیا تھا اور "اسلامک کلچر" کا تقریباً ایک تہائی ترجمہ ہوچکا ہے۔ جب تک عزیز احمد زندہ تھے، مجھے چھاپنے چھپوانے کی جلدی نہیں تھی لیکن اب جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، میں اپنی پہلی فرصت میں اس فریضے سے سبکدوش ہوجانا چاہتا ہوں۔ عزیز احمد کی یہ وہ تصانیف ہیں جن میں انھوں نے مطالعۂ تاریخ اور اس کے تجزیے کے ذریعے جدید اسلامی فکر کا سراغ لگانے میں وہ کام کیا ہے جس کا آغاز سرسید نے کیا تھا اور جس کو اقبال نے ایک خاص نقطے تک پہنچایا تھا۔ جب تک ہم اپنی جڑیں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی حقیقی فکر میں تلاش نہیں کریں گے ہم کسی ایسے صحت مند معاشرے کو جنم نہیں دے سکتے جہاں ایک طرف دولت کی مساوی تقسیم سے معاشرہ خوش حال ہوجائے اور جہاں عدل و انصاف سب کے لیے یکساں ہو اور دوسری طرف جہاں علم و ادب، فکر و تہذیب کی روشنی سے معاشرے کا ذہن منور ہوسکے۔ عزیز احمد کی کتابیں ہمارے فکری راستے کو بہت دور تک طے کرادیتی ہیں۔

۱۶ ڈسمبر ۱۹۷۶ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا "دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی اور گلشنِ عشق بھیجنے کا شکریہ نہ ادا کرسکا۔ فروری سے سرطان میں مبتلا ہوں۔ تین آپریشن ہوچکے ہیں۔ آخری آپریشن ہوا کہ جس کے ذریعے سرطان کو نکال دیا گیا اور اب یونیورسٹی میں پھر سے پڑھا رہا ہوں لیکن مرض کے دوبارہ عود کر آنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے ــــ جب ہسپتال میں تھا دو غزلیں لکھیں جو ذرا قنوطی ہیں۔ فارسی غزل کا دوسرا شعر ملحدانہ بھی ہے اور عارفانہ بھی۔ معلوم نہیں اس کی اشاعت سے پاکستان میں ہنگامہ برپا ہوگا یا نہیں۔" وہ شعر انھوں نے اپنے قلم سے کاٹ دیا تھا اور "نیا دور" میں شائع نہیں ہوا۔ آج آپ بھی وہ شعر سن لیجئے:

او کہ برجاست بیک خانہ نخواہد گنجید
شُد ز اصنام تہی، کعبہ چہ ویراں افتاد

مظہر جانجاناں، میر درد، بھلّے شاہ اور اقبال ہوتے تو یہ شعر سن کر عزیز احمد کو سینے سے لگا لیتے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۷۶ء کے خط میں لکھا "جتنی محبت اور اخلاق سے آپ پیش آتے رہے ہیں اس کی میں مرتے دم تک قدر کرتا رہوں گا۔ فی الحال تو کام کررہا ہوں اور اگر خدا نے چاہا اور سرطان دوبارہ عود نہ کرنے پایا تو شاید کچھ دن زندہ رہوں۔ ویسے نہ زندگی کی کوئی خاص خواہش ہے نہ مرنے کا کوئی خاص ڈر۔ جب اللہ کی مرضی ہو، میں راضی برضا ہوں۔" ۱۵ اگسٹ ۱۹۷۸ء کے خط میں لکھا "میں بدستور زندگی اور موت کے درمیان معلّق ہوں۔ جب تک چل رہا ہوں چل رہا ہوں۔ آپ جیسے مخلص دوست بہت یاد آتے ہیں۔ ایک نئی غزل ہوئی ہے جو "نیا دور" کے لیے بھیج رہا ہوں۔" اس غیر مطبوعہ غزل کے چار شعر آپ بھی سن لیجئے۔ دیکھیے عزیز احمد ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

گھبرا کے ہم تو عرصۂ جاں سے نکل گئے
بزمِ جہاں، طلسمِ جناں نکل گئے

کب سے تھے ہم اسیرِ شب روز و ماہ و سال
قیدِ زمان و بندِ مکاں سے نکل گئے
تھا جنبشِ زبان و قلم کا یہ ماحصل
ناگفتہ حرف تھے کہ زباں سے نکل گئے
یاروں کو بزمِ لالہ رُخاں ہی میں چھوڑ کر
ہم خاک بن کے کوئے بتاں سے نکل گئے

ادھر کئی مہینے سے ان کا خط نہیں آیا تھا۔ میں بھی مصروف تھا۔ دسمبر میں میں نے انھیں خط لکھا۔ خیریت دریافت کی اور پاکستان آنے کا پروگرام پوچھا۔ وہ خاموش تھے اور دعا مانگ رہے تھے:

ہے یہ دعا کہ تم کو ابد تک رہیں نصیب
علم و ادب کے افسر و اورنگ دوستو

لیکن مجھے تو اپنے خط کے جواب کا آج تک انتظار ہے۔

ماہ لقا

(عزیز احمد کی کتاب "ماہ لقا اور دوسری نظمیں" مطبوعہ ادارۂ ادبیات اردو کی ایک نظم)

یوں تو دیکھا تھا لڑکپن میں کئی بار اُسے ؛ پردۂ غنچۂ نورس میں نہاں گُل جیسے
جس طرح عشرۂ اوّل میں مہِ نو کا جمال ؛ جو کوشش ہو ملے بدرِ منور کا کمال
جس طرح ذہنِ مصوّر میں نہاں ہو تصویر ؛ اور پھر صفحۂ قرطاس پہ ڈھونڈے تعبیر
جس طرح جمدۂ انگور میں سیلائے شراب ؛ اس کے بچپن میں نہاں تھا تبِ طناز شراب
اس کو دیکھا تو نگہ تک مری مخمور سی ہے ؛ نفسِ تیز کی حالت دل مجبور سی ہے
میں نے پوچھا تری صورت تو ہے پہچانی سی ؛ کیوں تجھے دیکھ کے ہے قلب کو حیرانی سی
کس مصوّر کی تصاویر میں دیکھا ہے تجھے ؛ کس صحیفے کی تفاسیر میں دیکھا ہے تجھے
کسی صنّاع کی صنعت کا تماشا تھی تو ؛ کسی شاعر کے تخیّل کی تمنا تھی تو
وہ تو کچھ چین بہ جبیں ہی سی رہی اور خاموش ؛ حسنِ کامل کو مگر اس پہ ذرا آیا جوش

ساری دنیا میں تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں۔
لوگ مشرق میں تجھے ماہ لقا کہتے ہیں۔

کشور ناہید

سانس اور پھانس

مرنے والے کے اعزاز میں
دو منٹ کی خاموشی
اس کی عزت و احترام کا اظہار ہے'
مگر جیتے جی
ایک ہی گھر اور ایک ہی چھت کے تلے
عمر بھر کی خاموشی
کسی کی تکریم کا نشان بنتی ہے
ماچس کی تیلیوں کی طرح
آتش گیر مادّے کے باوصف
آپس میں بے چوں وچرا منسلک
تعلقے باہمی، کولڈ وار، ڈپلومیسی
بارش سے بیٹھ جانے والی قبر
اور ہونٹوں سے جھڑ جانے والی بات میں
کوئی خاص فرق تو نہیں ہوتا ہے
زیادہ دیر سوؤ تو خواب بھی
ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
پانیوں میں چھپے غیر آباد
جزیروں کی خبر کون لائے گا
اندھیروں نے تو دماغوں، گھروں
اور شہروں پر ایسے تسلط جمایا ہے
کہ روشنی کی کمر بھی دوہری ہو گئی ہے
روشنی اپنے آپ کو کہاں کہاں تقسیم کرے۔

شاذ تمکنت

زندگی

کہاں ہے زندگی
کیا روپ تھا!
کیا ناک نقشہ تھا!
بھلا کیسے بتاؤں گا
کہ میں اُس کا سراپا جانتا کب ہوں
اگر وہ سامنے آئے
تو میں پہچانتا کب ہوں
جو تم کہتے ہو تارے بالیاں ہیں
چاند جوشن کہکشاں لچکا
شفق ہے مانگ کا جھومر تو سورج آئینہ اُس کا
تمہاری بات سچ ہوگی
مری روداد اتنی ہے
چرن چھوتا رہا ہوں میں
کوئی پاؤں کا زیور ہو تو دکھلانا

غزلیں

کشور ناہید

عمر میں اس سے بڑی تھی لیکن پہلے ٹوٹ کے بکھری میں
ساحل ساحل جذبے تھے اور دریا دریا پہنچی میں
شہر کے اس کے نام کے جتنے شخص تھے سب ہی اچھے لگے
صبحِ سفر تو دھند بہت تھی، دھوپیں بن کر نکلی میں
اس کی ہتھیلی کے دامن میں سارے موسم سمٹے تھے
اس کے ہاتھ میں جاگی میں اور اس کے ہاتھ سے اجلی میں
اک ننھی تاریکی میں تھا، اک مٹھی سے بھر کر پیار
لمس کے جگنو پلو باندھے، زینہ زینہ اتری میں
اس کے آنگن میں کھلتا تھا، شہرِ مراد کا دروازہ
کنویں کے پاس خالی گاگر، ہاتھ میں لے کر بیٹھی میں
میں نے جو سوچا تھا یوں تو اس نے بھی وہی سوچا تھا
دن نکلا تو وہ بھی نہیں تھا اور موجود نہیں تھی میں
لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی، قطرہ قطرہ تب ہوگی
اپنے ہاتھ لرزتے دیکھے، اپنے آپ ہی سنبھلی میں

امجد اسلام امجد

سایے ڈھلنے، چراغ جلنے لگے
لوگ اپنے گھروں کو چلنے لگے
اتنی پُر پیچ ہے بھنور کی گرہ
جیسے نفرت دلوں میں پلنے لگے
دُور ہونے لگی جرس کی صدا
کارواں، راستے بدلنے لگے
اُس کے لہجے میں برف تھی لیکن
چھو کے دیکھا تو ہاتھ جلنے لگے
اُس کے بندِ قبا کے جادو سے
سانپ سے انگلیوں میں چلنے لگے
راہ گم کردہ طائروں کی طرح
پھر ستارے سفر پہ چلنے لگے
پھر نگاہوں میں دھول اڑتی ہے
عکس پھر آئینے بدلنے لگے

شاہدہ حسن

سانحہ ہو کے رہا چشم کا مرجھا جانا
خواب لگتا ہے ترا خواب میں بھی آ جانا
آنکھ تا دیر رہی موجۂ غم تاک میں تر
حسن کا کھیل تھا آئینے کو چمکا جانا
تو سرِ بام ہوا بن کے گزرتا کیوں ہے
میرے ملبوس کی عادت نہیں لہرا جانا
دشت کے لب پہ ہے اس قطرۂ نیساں کا مزہ
تو کہاں جان سکا، میں نے تجھے کیا جانا
تخم بوتا ہے کوئی ہاتھ مری مٹی میں
مجھ کو آساں ہے بہت چھاؤں کا پھیلا جانا

انتظار حسین

شور

"کیا خیال ہے، اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مثلاً"

"مثلاً!" وہ سوچ میں پڑ گیا "یار بہت ہے۔" پھر وہ چُپ ہو گیا اور چائے پینے لگا۔

میں بھی چُپ رہا اور چائے پیتا رہا۔ پھر باہر سے کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔ میں نے کان کھڑے کیے، غور سے سنا اور اُٹھ کھڑا ہوا "ضمیمہ آگیا۔" باہر جا کر ضمیمہ خریدا۔ واپس آکر ضمیمہ کھولا اور ہم دونوں نے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

پڑھ چکنے کے بعد "اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یار اتنی ہی خبر ہے۔ کوئی نئی تفصیل تو ہے نہیں۔"

"پھر بھی کیا خیال ہے تمہارا، اب کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہوگا؟" سوچ میں پڑ گیا "یار ٹیڑھا سوال ہے۔"

"پھر بھی؟"

سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال یہ ہے ——" مگر ارد گرد دیکھ کر پھر چُپ ہو گیا "یار یہاں شور بہت ہے۔"

میں نے آس پاس کی میزوں پر نظر ڈالی۔ آس پاس کی سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ چائے پینے والے چائے کم پی رہے، باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ ہماری میز کے بالکل برابر کی میز سب سے زیادہ پُرشور تھی۔ پیالیاں کم نفری زیادہ۔ اتنی اونچی آوازیں بول رہے تھے کہ اُن کے ہوتے ہوئے آس پاس کی کسی میز پر اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں تعجب کیا۔ تھوڑا غصّہ بھی آیا۔ کیا بے فکرے لوگ ہیں۔ ایسے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

دُور کی میزوں کا جائزہ لیا۔ کچن کے برابر کے گوشے میں کئی میزیں خالی نظر آئیں۔

"چلو ادھر چلتے ہیں۔"

ہم دونوں اٹھ کر کچن کے برابر والے گوشے میں جا بیٹھے۔ یہ گوشہ واقعی پُرامن تھا۔ بات اطمینان سے ہو سکتی تھی۔ چائے کا نیا آرڈر دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا "یہاں بات ہو سکتی ہے۔"

"ہاں یہاں بات اطمینان سے ہو سکتی ہے۔" اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"پھر کیا خیال ہے تمہارا اب کیا ہوگا؟"
اسی گھڑی دو شخص داخل ہوئے اور ہمارے پاس کی میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ایک کی نظر ہماری میز پر رکھے ضمیمے پر پڑی "اچھا۔ ضمیمہ شایع ہوگیا ہے!" اُٹھ کر قریب آیا "ذرا دیکھ سکتا ہوں؟"
"ضرور" یہ کہتے کہتے میں نے وہ یک ورقی اخبار اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔
ضمیمہ لے کر وہ اپنی میز پر جا بیٹھا اور سامنے پھیلا کر پڑھنے لگا۔ تھوڑے فاصلے کی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ضمیمے کو تاڑا "اچھا ضمیمہ آگیا۔" یہ کہتے ہوئے اٹھا اور قریب آکر اس پھیلے ہوئے ورق پر جھک گیا۔ اس نے یہ بات کسی قدر اونچی آواز میں کہی تھی۔ آس پاس کی کئی میزوں پر جہاں جہاں یہ بات کہی گئی، کان کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک اٹھ کر آئے اور اس میز کے گرد کھڑے ہو گئے۔ "کیا لکھا ہے ضمیمہ ؟"
استفسارات، تبصرے۔ کوئی تائیدی آواز، کوئی اختلافی نوٹ۔ کوئی تاسف بھرا کلمہ، بحث۔ لہجہ تند و تیز ہوتا گیا۔ آوازیں اونچی ہوتی چلی گئیں۔
ہم دونوں چپ ادھر دیکھتے رہے۔ پھر وہ بے چینی سے بولا "یار، بہت شور ہے۔ یہاں بیٹھ کے تو بات کرنا بہت مشکل ہے۔"
"تو پھر نکلیں یہاں سے۔"
وہاں سے نکل کر کھڑے ہوئے۔ سوچا کہ کیفے ڈی پیلس میں فضا پُرسکون ہوگی، مگر وہاں قدم رکھا تو لگا کہ شور کے سمندر میں اُتر گئے ہیں۔ پھر مختلف چائے خانوں میں جھانکا۔ ہر جگہ رش، ہر جگہ شور۔ "یار بہت شور ہے۔"
"سمجھ میں نہیں آتا کہ آج اتنا شور کیوں ہے۔" میں نے کہا
"اور رش دیکھو۔ لگتا ہے کہ شہر سارا چائے پینے اور گپیں مارنے کے لیے نکلا ہوا ہے۔ لوگ کتنے بے فکرے ہیں۔"
"اتنا شور، اتنا رش! اس شہر میں تو ہمارے لیے سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔" میں نے اس کی تائید میں کہا۔
"یار یہ شہر کتنا خاموش ہوا کرتا تھا۔ ہم کتنے اطمینان سے اس سڑک پر چلا کرتے تھے۔"
میں نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی۔ بسیں، موٹریں، ٹیکسیاں، رکشائیں اور سب سے بڑھ کر سکوٹر، ایک طوفان اُٹھا ہوا تھا۔ شور الٰہی توبہ! بس اس ساعت میں جب ہم ایک خاموش گوشے کی تلاش میں تھے، اچانک ہمیں احساس ہوا کہ شہر میں کتنا ہجوم ہوگیا ہے اور شور کتنا بڑھ گیا ہے۔
اب شاید اس کے یہاں بھی بات کرنے کی خواہش زور پکڑ گئی تھی۔ خاموش گوشے کی تلاش میں جتنا میں سرگرم، اتنا ہی وہ سرگرم تھا۔ کہاں کہاں پہنچے اور کہاں کہاں سے مایوس پھرے۔ اور بات کرنے کی طلب تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جیسے ہمیں بہت اہم مسائل پر گفتگو کرنی ہو۔
"ریستوران سب بھرے ہوئے ہیں۔ آؤ چلو، کمپنی باغ چلتے ہیں۔"
ہم اس پُرشور شاہ راہ سے گزر کر ایک خاموش راستے پر پڑ گئے۔ چار قدم چل کر کمپنی باغ کی فضا میں کتنا سکون؛

کتنی آسودگی تھی۔ جہاں تہاں اکا دکا آدمی۔ کوئی کسی روش پر چہل قدمی کرتا ہوا، کوئی خاموش کسی بنچ پر بیٹھا ہوا۔ ہم بھی ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ شور کا سمندر پار کر کے آئے تھے، سستا رہے تھے، قریب سے ایک جوڑا گزرا۔ تھوڑا آگے چل کر نوجوان نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں درختوں کے سائے میں چلتے چلتے ایک گھنے پیڑ کی اوٹ میں گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"تفصیلات کا پتا نہیں چل رہا۔ بہت　　ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ دور سے آواز آئی:

"پانی رے پانی ترا رنگ کیسا"

آواز قریب آ گئی۔ ایک نوجوان ٹرانسسٹر ہاتھ میں لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس کے تختے پر بیٹھ، ٹرانسسٹر ایک طرف رکھ، جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔ گانے نے ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کان لگا کر سنتے رہے، سنتے رہے۔

"یہ لتا تھی؟"

"ہاں! اور ساتھ میں کشور کمار۔" میں نے کہا۔

مگر اس کے بعد ٹرانسسٹر کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی۔ لتا کا ایک گانا، دوسرا گانا، تیسرا گانا۔ پھر گشت کرتے چند نوجوان آ گئے۔ قریب ہی گھاس کے ایک تختے پر انھوں نے ڈیرا ڈال دیا۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر تھا۔ انھوں نے اپنی پسند کے گانے سننے شروع کر دیے تھے۔

"یار یہ تو بہت بوریت ہے۔"

"اور ان کی پسند کتنی بیہودہ ہے ——　　"۔ مجھے اس ٹولی پر غصہ آ رہا تھا۔

"ہمیں اس شہر میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"پتہ نہیں لوگ گانا اتنی اونچی آواز میں کیوں سنتے ہیں۔"

"دیکھیے سُر غیر موثر ہو چکے ہیں۔ شور اتنا ہے کہ کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی۔ ایسے میں آدمی کیا بات کرے۔"

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ ایک طرف سے ٹرانسسٹر، دوسری طرف سے ٹیپ ریکارڈر۔ دائیں شور۔ بائیں شور۔ ہم بیزار ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف روشوں پر چہل قدمی کی۔ شام ہو چکی تھی، باغ میں سیلانیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم باغ سے باہر نکل آئے۔

"تم نے بی بی سی سنا تھا؟" چلتے چلتے اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"بی بی سی سننا چاہیے۔" یہ کہتے کہتے وہ شروع ہو گیا۔ آخر دماغ میں تو وہی بات اٹکی ہوئی تھی، بلکہ کانٹا کھٹک رہا تھا۔ جب تک کانٹا نہ نکل جاتا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو چین نہیں آ سکتا تھا۔ کانٹا اب نکلنے لگا تھا۔ مگر اسی دم پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ پیچھے چلنے والا تیز تیز قدم چل رہا تھا۔ ہم نے اپنی رفتار سست کر دی۔ جلد ہی وہ آگے نکل گیا۔ اب اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔ مگر یہ سڑک ایسی تھی کہ شام بڑے لوگ چہل قدمی کرتے ادھر آتے تھے اور اب جو صاحب ہمارے پیچھے آ رہے تھے وہ اتنے اطمینان سے چل رہے تھے کہ ہماری رفتار میں سستی آ جانے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ پیدا نہیں ہو سکا۔

"چلو پھر گھر چلتے ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"تم تو اکیلے ہی رہتے ہو۔"

"اور کیا؟"

"پھر چلتے ہیں۔ وہاں اطمینان سے بات کریں گے۔"

ہم پلٹ لیے۔ گھر جا کر اپنا کمرہ کھولا "بیٹھو۔"

بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر اردگرد پر ڈالی "یار تمھارے پاس ریڈیو نہیں ہے؟"

"ریڈیو نہ ٹرانسسٹر۔"

"ہوتا تو اس وقت بی بی سی سنتے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ بی بی سی کچھ بتائے گا؟"

"بالکل بتائے گا۔ ویسے آج اپنا ریڈیو بھی سننا چاہیے۔ مگر تم نے تو یہ کھڑاگ رکھا ہی نہیں ہے۔ نہ ریڈیو نہ ٹی وی۔"

"ایسے کھڑاگ بیویاں اکٹھا کیا کرتی ہیں۔" میں نے کہا

"اور بیوی بجائے خود ایک کھڑاگ ہے۔"

"اسی لیے تو پالا نہیں۔"

"اچھا کیا۔ سکون سے ہو۔" رُک کر بولا "مجھے لگتا ہے کہ تمھارے ہمسائے بھی سب چھڑے ہیں۔"

"کیسے جانا؟"

"یار یہاں خاموشی بہت ہے۔"

"یہ محلہ نہیں ہے۔ فلیٹ ہیں۔ فلیٹ میں رہنے والوں کا پتہ نہیں چلتا ورنہ میرے دائیں بائیں جتنے فلیٹ ہیں ان میں پورے پورے خاندان آباد ہیں۔"

میں نے سوچا کہ پہلے کچھ چائے کا اہتمام کر لینا چاہیے۔ چائے سامنے رکھی ہو تو بات اطمینان سے ہوتی ہے۔ دودھ دیکھا تو موجود تھا۔ چائے کی پتی اور چینی تو رہتی ہی ہے۔ کیتلی میں پانی بھرا اور ہیٹر پہ رکھ دیا۔

"یار تمہارے پڑوس میں کوئی بچہ بھی نہیں ہے؟"

"ارے یار بہت ہیں۔"

"آواز تو کوئی آ نہیں رہی۔ کسی قسم کی کوئی آواز ہی نہیں ہے۔"

"میں نے کہا نہ کہ یہ فلیٹ ہیں۔ تم محلہ کے حساب سے مت سوچو" میرے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا۔ تھوڑا چپ رہ کر پھر بولا یار بہت سناٹا ہے۔ لگتا ہے کہ جنگل میں آ گئے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دھیان سنسناتے پانی کی طرف تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"چائے بنا رہا ہوں۔ ابھی تیار ہوتی ہے پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

"چھوڑو یار، وہیں اپنے ٹھکانے پر چل کر چائے پیتے ہیں۔" وہ ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا "یہاں تو مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا "یہاں اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر — " اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: "یہاں بیٹھ گئے تو خبروں کا وقت نکل جائے گا اپنے ٹھکانوں پر چلتے ہیں۔ وہاں ریڈیو ہے۔ خبریں بھی سنی جاسکیں گی۔" رکا، بولا "یہاں تو لگتا ہے کہ دنیا سے کٹے بیٹھے ہیں۔" واقعی۔ اس کمرے میں بند ہو کر تو دنیا سے میرا رشتہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اصل میں اس کمرے میں کوئی دریچہ نہیں جہاں سے آسمان نظر آتا ہو۔ آسمان نظر نہ آئے تو یہی لگتا ہے کہ دنیا سے ہر رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

ہم نکل کھڑے ہوئے۔ سڑک خالی خالی تھی۔

"کیا بج گیا؟" اس نے تھوڑا چونک کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "کمال ہے یار، آج اتنی جلدی سناٹا ہو گیا!"

واقعی سناٹا تھا۔ کوئی کوئی رکشا گزرتی تو تھوڑا شور ہوتا مگر اس کے گزر جانے کے بعد خاموشی اور گہری ہو جاتی۔ ہمیں اپنے قدموں کی چاپ اونچی سنائی دے رہی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چلنے لگے لیکن قدموں کی چاپ اب بھی اونچی تھی۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ آج رستوران اتنی جلدی خالی ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسے بھرا چھوڑ کر گئے تھے۔ اس وقت شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اور اب اتنی خاموشی! ایک گوشے میں دو شخص بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی رخصت ہو گئے اب صرف ہم دو تھے۔ چائے کا آرڈر دیا۔

"آج ابھی سے یہاں اُلّو بولنے لگے ہیں۔" وہ بولا

"اچھا ہی ہے۔ ہجوم میں تو بات نہیں بھی ہو سکتی۔"

"ہاں اچھا ہی ہے۔" پھر سوچ کر بولا "یار CONFUSION بہت ہے۔" CONFUSION پہلے نہیں تھا؟"

"ٹھیک کہتے ہو۔ CONFUSION پہلے بھی تھا۔" پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر زبان کھولی "اس کے پیچھے کیا ہے، یہ تو ابھی پوری طرح واضح نہیں۔ مگر میرا خیال ہے — " وہ چل پڑا تھا کہ اتنے میں چائے آگئی اور وہ چپ ہو گیا اور چائے بنانی شروع کر دی۔

چائے بناتے بناتے بولا "یار وہ لڑکی اچھی تھی۔"

"لڑکی کون سی لڑکی؟"

"وہی لڑکی جو کمپنی باغ میں نظر آئی تھی۔"

"اچھا وہ" اور وہ لڑکی اپنی ہری بھری گات اور شاداب سراپے کے ساتھ تصور میں پھر گئی "ہاں اچھی تھی۔" جیسے ہوا رکی ہوئی ہو اور اچانک ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آجائے، مجھے تو ایسا ہی لگا۔ وہ بھی بشاش نظر آ رہا تھا۔ پھر ہم نے اس خوشگوار جسم کی جملہ تفصیلات پر غور کیا اور طے کیا کہ لڑکی واقعی اچھی تھی۔

"یار!" وہ سوچتے ہوئے بولا "لڑکی تو ہماری زندگی سے نکل ہی گئی۔"

میں ہنس پڑا "آئی کب تھی؟"

"پھر بھی۔" وہ سنجیدگی سے بولا "آگے کم از کم اتنی ویرانی تو نہیں تھی۔"

میں پھر ہنس دیا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔

سوچ کر بولا "وہ کہیں دکھائی دی؟"

میں چکرایا "کون؟"

"وہی!"

اب میری سمجھ میں آیا کہ کسے پوچھ رہا ہے۔ طبیعت افسردہ ہوگئی "نہیں یار!"

"اس کے بعد سے نظر ہی نہیں آئی؟"

"نہیں"

"تعجب ہے!"

میں نے خود اس بات پر اس وقت کتنا تعجب کیا تھا۔ تعجب اور افسوس کر کے فارغ ہو لیا تھا۔ اب جو اس نے اظہار تعجب کیا تو مجھے پھر ایک مرتبہ تعجب ہوا کہ واقعی ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی۔

"یار تمہارے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا تھا"

"اور جو ہر شریف آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

ہم دونوں ہی افسردہ ہوگئے۔ پھر نہ اس نے کوئی بات کی، نہ میرا بات کرنے کو جی چاہا۔ چپ بیٹھے رہے اور چائے پیتے رہے۔ بی بی سی کی خبروں کا وقت آیا اور نکل گیا۔ ریڈیو پاکستان، پھر آل انڈیا ریڈیو۔ سب خبروں کے وقت نکل گئے۔

"چلیں یار۔"

"ہاں چلنا چاہیے۔"

ہم چل کھڑے ہوئے، وہ اپنے گھر کی طرف میں اپنے گھر کی طرف۔

سلسلہ ۲۹

دوشیزہ میرے لیے خواب، خیال بن کر رہ گئے ہیں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرا دل غم آلود ہو چکا ہے اور میں ازل ہی سے اس سیاہ رات میں دریا کا سفر کر رہا ہوں۔ میں یہ بات بھی خوب اچھی طرح سمجھ گیا کہ اب بوڑھے کو پکارنا مناسب نہ ہوگا۔ اس حقیقت کے انکشاف سے میرا دل بالکل سرد پڑ گیا۔ جو کچھ میں اس وقت اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا اسے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے میں نے اپنی گردن باہر نکال کر جھکائی اور لالٹین کی روشنی میں دریا کے سرمئی پانی پر ایک نگاہ ڈالی۔ دریا کے اندر مجھے نمایاں طور پر ایک سنجیدہ چہرہ نظر آیا جو اپنی غلیظ آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک بوڑھے دانش مند کی صورت تھی اور یہ میرے اپنے ہی چہرے کا انعکاس تھا۔

اب کوئی راستہ بھی واپس نہیں جاتا اس لیے میں نے اس تاریک رات میں دریا کا سفر جاری رکھا۔

علی ظہیر

طرابلس سے چند نظمیں

ایک

کنارے کنارے
"وہی آسماں" ہے۔
فلک سے فلک تک جو پھیلا ہوا ہے
زمیں مختصر
وقت کے انتروں پر
کبھی شادماں اور کبھی بدگماں ہے
زمیں پر ہے کیا؟
اک سمندر،
ریت، مٹی، پہاڑ
کچھ درخت
سبزہ زار
اور کچھ جانور
اور پرندے ــ "خلاص"
اور "وہی آسماں" پر
"وہی آسماں" کے
نمونے ہزار
تمہیں کیا پسند ہے؟
"وہی آسماں" کے نمونے ہزار
یا سمندر، سمندر
پہاڑ اور پہاڑ

دو

سمندر کے کنارے پر اکیلے
مچھلیوں کی طرح پانی کو ترستے
آدمی کا روپ دھارے
جانور کی شکل کرتے
دل تو کہتا ہے
خدا کے آسرے پر
اس کی امید و وفا پر
سچا بننے
سیدھا چلنے
پیار کرنے
دل تو کہتا ہے۔

تین

میڈی ٹرینئین کا سینہ
کبھی نیلا... کبھی ہلکا کبھی گہرا ہرا
مری آنکھوں کے آگے
اس طرح منظر کھلا
افق پر آسماں
اور آسماں پر اک افق
دور سے نزدیک کا عالم کھلا
شاید اس میں
نیل کا پانی ملا

ڈاکٹر محمد ہاشم علی

دکنی ادب میں ہندوستانی عناصر[۱]

اردو ادب پر اکثر و بیشتر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں عموماً ہندوستانی عناصر کا فقدان ہے اس میں صرف بلبل کی نغمہ سرائی، لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، وامق و عذرا کے بدیسی تذکروں کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ ادب رام و لکشمن، سیتا و ساوتری کے تذکروں سے خالی ہے۔ پپیہے کی ہوک اور کویل کی کوک سے اس ادب کے نغمے ناآشنا ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک شمالی ہند کی اردو پر منطبق ہوتی ہے لیکن اس کا انطباق اُس قدیم ادب پر نہیں کیا جا سکتا جس کی صبح صادق سرزمین دکن کے مطلع پر شاہانِ بیجاپور اور گولکنڈہ کے عہد میں نمودار ہوی۔ اردو کا یہ قدیم دور جسے دکنی سے تعبیر کیا گیا ہے وہ ایک ایسا گنجینہ ہے جس میں عرب و شام کے سوتی بھی ہیں ترکستان و ایران کے لعل و جواہر بھی اور خالص بحیرۂ ہند کے گوہر شہوار بھی۔ اس کے وسیع مرقع میں گنگا و جمنا کے ساتھ ساتھ دجلہ و فرات کا جلال بھی شامل ہے اور اس ادب میں جیجوں و سیحون کی نہیں بلکہ آب کرشنا و گوداوری کی سبک خرامی کے نظارے بھی ملتے ہیں۔ اس میں لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد کے نالہ ہائے عشق کے ساتھ ساتھ نل دمن چندر بدن و مہیار قطب و مشتری، منوہر و مدمالتی اور دوسرے ہندوستانی عشاق کے جاں گداز نالے بھی سنائی دیتے ہیں۔

دکنی ادب کا بڑا حصہ مسلسل نظموں اور مثنویوں پر مشتمل ہے۔ یہ مثنویاں رزمیہ بھی ہیں اور بزمیہ بھی۔ اور ان سب میں بزم و رزم کے جو نقشے، خلوت و جلوت کے جو خاکے، رہن سہن کے جو طریقے ملتے ہیں وہ خالص ہندوستانی ہیں اور حد یہ ہے کہ کرداروں کی نفسیات اور ان کے طرزِ تفکر میں بدیسی رنگ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ یہ بات ان مثنویوں میں بھی ملتی ہے جن میں سلوک و معرفت کے نکات اور روحانی کیفیات اور واردات بیان کیے گئے ہیں۔ ان مثنویوں میں احوالِ نفس اور وارداتِ قلب کو عورتوں کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر حفیظ قتیل "ایسی نظموں کا مقصد عورتوں کو ان ہی کی زبان میں اسرارِ معرفت سمجھانا ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ اسی نوع کی شاعری کے مطالعے سے تصوف کا خاص نقطۂ نظر کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ زندگی میں غالب و مغلوب، محتاج

۱۔ یہ مضمون ۲۵ر فروری ۱۹۸۰ء کو یوم قلی قطب شاہ کے موقع پر "ایوان اردو" منعقدہ ادبی اجلاس میں پڑھا گیا۔

ومحتاج الیہ، عامل و معمول، صانع و مصنوع اور مرد و عورت میں جو فاعل منفعل کی نسبت ہے کچھ ایسی ہی نسبت مُرید کو شیخ کے ساتھ اور بندے کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہندی فلسفہ میں اس نسبت کو منش اور پراکرتی کی نسبت سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی لیے میراں بائی نے بنارس کے برہمنوں سے کہا تھا کہ مرد تو صرف ایک کرشن ہے اور باقی سب عورتیں ہیں یعنی دینے والا صرف کرشن ہے جس میں فاعلیت ہے اور لینے والا مرد ہو یا عورت اس میں انفعال ہے اس لیے وہ عورت ہے مرید کی شیخ کے ساتھ اور بندے کی اللہ کے ساتھ اسی نسبت کے پیشِ نظر دکن کے صوفی شعرا نے عورت کی زبان اختیار کی ہے۔" یہ انداز میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم کے پاس ہی نہیں بلکہ ولی کے ہم عصر ایک دکنی بزرگ سید محمد قادری خاکی کے پاس بھی ملتا ہے۔ ان کے دو شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

رہوں کیوں ابتدا میں میں دسے جب انتہا مجھ کو ÷ فنا فی الشیخ ہو کر میں بقا باللہ ہوتی ہوں
مدد سوں شاہزادے کی ترقی پاکے اے خاکی ÷ کبھی وحدت کے دریا میں سراہیں بن ڈبوتی ہوں

ان صوفی شعرا کے ہاں زبان میں ہندوستانی رنگ کافی نمایاں ہے وہ عربی و فارسی کے بوجھل الفاظ کے بجائے ہندی کے سبک و شیریں الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ تدبھو اور تتسم الفاظ کا نہایت بلا تکلف استعمال سنسکرت سے ان کی واقفیت کی غمازی کرتا ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کے میراں جی شمس العشاق کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہوا میانے جیتا روپ تیتا پسلا تن ÷ دوجا تن سو پیر ہوا کی جس گھٹ برتے من
تیجا تن غیب جس آکہیں جو تھا گیان سپورا ÷ ست گروہ سیویں یہ گرباہیں بن گروہ فہم ادھورا

ان صوفی شعرا نے کمال یہ کیا کہ عورتوں کی زبان میں شعر کہنے کی روایت کو بھی برتنا شروع کیا۔ اس کا مقصد اصلاحی اور تبلیغی تھا۔ عورتوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے ان ہی کی زبان میں چکی نامے، چرخہ نامے، شادی نامے اور مختلف تقریبوں کے لیے گیت لکھنے شروع کیے۔ ان نظموں اور گیتوں میں چکی نامے کو مستقل صنفِ سخن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بندہ نواز سے منسوب چکی نامے میں چکی کے استعارے میں معرفت کے رموز سمجھائے گئے ہیں اور چکی کی یہ تفصیل بھی خالص ہندوستانی عناصر سے پُر ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

آٹا پیسو پورنیا بھرو، بہشتی میوہ شکر دھرو ÷ ساتوں صفتاں کا پورن بھرو کہیاں م اللہ ھو اللہ

ان چکی ناموں کی خصوصیت ہے کہ ان میں سے بعض میں مقامی ریت، رسم، اور روایات کے پس منظر میں عرفان و گیان کی باتیں اس خوش اسلوبی سے نظم کی گئی ہیں کہ زبان، اظہار، ترنم اور ایمائیت کی وجہ سے ان میں دلکشی و جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً شاہ کمال کے چکی نامے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اقرار کا ہے یہ کھونٹا تصدیق کی ہے بھانی ÷ نفی کے ہاتھوں سوں اثبات چکی چلانی
عینیت، غیریت چکی کے دو پاٹاں ÷ اللہ ہور نبی سوں ملنے کے او باٹاں
چکی کا پھرانا ارشاد کے قوت سوں ÷ ہو ہو آواز اس میں آتا ہے قدرت سوں
پیسنا اس چکی کا انبیائے کو نئیں آتا ÷ سہاگن کے ہاتھوں چکسا پیسے جاتا
اوّل کو یہ چکی دو لانے پھراتا ÷ تس پیچھے دلہن کو پھرانے سکاتا

بعد از ساری پی دیاں دلہن کوں سکے ہیں ؛ زباں پو رکھے ہیں دلاں میں لکھے ہیں

صوفیائے کرام کی یہ شعری روایت دکن میں ایسی چل پڑی کہ تمام شعرا بھی عورتوں کی زبان میں عشق و عاشقی کی باتیں کرنے لگے ۔ محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ شاہی کے دواوین اور وجہی کی مثنوی قطب مشتری میں اس اسلوب کی متعدد غزلیں ملتی ہیں ۔ لیکن ان غزلوں میں ریختی کی صرف یہی ایک خصوصیت ہے کہ افعال، اسماء اور صفات مونث استعمال کیے گئے ہیں ۔ ان غزلوں میں نہ نسوانی زبان کی کوئی خصوصیت نظر آتی ہے نہ نسوانی جذبات و خیالات کی انفرادیت دکھائی دیتی ہے ۔ ایسی غزلیں ریختی کے ارتقا کی کڑی ضرور ہیں لیکن انھیں ریختی نہیں کہا جا سکتا ۔ ہاشمی بیجاپوری پہلا شاعر ہے جس نے اس صنف سخن کا ایک دیوان مرتب کیا ۔ ہاشمی کی ریختی گیارھویں صدی ہجری میں دکن کی نسوانی زندگی کا ایسا مرقع ہے جس میں اس عہد کی عورتوں کی زبان، ان کی تہذیب، طرز فکر، جنسی زندگی کی نفسیات اور معاملات اور اس دور کے لباس، زیور، پکوان، آرائش کے ساز و سامان، ساز و موسیقی کی تفصیلات محفوظ ہو گئی ہیں ۔ اس طرح یہ دیوان دکن کی مستورات کی گھریلو زبان، محاوروں اور کہاوتوں کا گنجینہ نہیں ہے بلکہ عادل شاہی دور کی تہذیب کا خزانہ بھی ہے ۔ اس کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں زنانہ لباس ساڑی، چولی، اوڑھنی، چوبنگی، کرگی، پشواز، زر کی چادر، بند پشواز، گھونگٹ وغیرہ تھا اور مردانہ لباس شال، پٹکا، شلوار، جھمکا وغیرہ ۔ اور زیور میں گلسر، بالیاں، جھمکیاں، موتیاں کی جالی، کنٹھمالا، چومالا، کڑے، بازوبند، گوٹھاں، ہت سر، انگوٹھی، بنگڑی، زرکمر وغیرہ اور آرائش میں کاجل، مسی، عنبر، صندل، سوئے بند (موباف)، دودھاری وغیرہ اور پکوان میں شکر پارے، ناریل کی روٹی، چوبگے، سیخ کے کباب، بتاشے وغیرہ اور سازمیں تنبورا، سارنگی، دف وغیرہ اور موسیقی میں جھند گیند (گیت) خیال، دھرپد وغیرہ کی تفصیلات ملتی ہیں ۔ اس طرح اس شاعری کے ذریعہ مقامی رنگ اور مقامی تہذیب، مقامی روایات اور رسم و ریت کی جزئیات کا علم ہوتا ہے اور ہندوستانی عناصر کی بالعموم اور دکنی روایات کی بالخصوص جلوہ گری اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہوتی ہے ۔

اردو میں اصطلاحات کے وضع کرنے اور ترکیبوں کے تراشنے میں عربی اور فارسی کا سہارا لیا جاتا ہے اور ہندی میں سنسکرت سے خوشہ چینی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے زبان بوجھل، مصنوعی اور غیر فطری ہو جاتی ہے ۔ عوام سے اس کا رشتہ کٹ جاتا ہے لیکن دکنی میں نہ صرف ترکیبوں کے تراشنے، الفاظ کے ڈھالنے اور اصطلاحات کے وضع کرنے میں نہ صرف دکنی سے مدد لی گئی بلکہ فارسی اور ہندی کی گنگا جمنی ترکیبیں رائج کی گئیں ۔ جیسا کے اوپر بیان کیا گیا تدبھو اور تتسم کثرت سے مستعمل ہونے لگے ۔ ہندی الفاظ ملا جھلک استعمال کیے جانے لگے ۔ مثلاً ست گردہ (سچا مرشد) سیویں (خدمت کریں) دردفام (درد جاننے والا) پھلا را دگل فروش) بسن ہارا (آباد) میٹھا بول (شیریں کلام) شاہ مارگ (شاہ راہ) وغیرہ کا استعمال عام ہو گیا ۔ اس طرح دکنی کو نہ اردو کی طرح فارسی آمیز بنایا گیا اور نہ ہندی کی طرح سنسکرت سے بوجھل ۔ چنانچہ دکنی کی اس خصوصیت کا ذکر ایک شاعر نے اس طرح کیا ہے ۔

رکھیا کم سنسکرت کے اس میں بول ؛ ادک بولنے سے رکھیا ہوں امول
جسے فارسی کا نہ کچھ گیان ہے ؛ سو دکنی زبان اس کو آسان ہے

سواس میں سنسکرت کا ہے مراد ؛ کیا اس سے آسانگی کا سواد
کیا اس تے دکنی میں آسان کر ؛ جو ظاہر دسیں اس میں کئی کئی ہنر

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اردو شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عام طور پر اس میں رام، لکشمن، سیتا اور رادھا کے تذکرے نہیں ملتے۔ لیکن دکنی شاعری میں ایسے بیسیوں اشعار ملتے ہیں جو ان تذکروں سے پُر ہیں مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہر ایک گوپنی ستھ کی جوں ماہ ہے ؛ کہ اس دور کا کرشن اوشاہ ہے
ہندو میں کہاں اور ترک توں کہاں ؛ کہاں رام سیتا، مورک تو کہاں
سہاتی ہے دمن شاہ خوش نام سوں ؛ کہ گمتی ہے سیتا مگر رام سوں

حتیٰ کہ دورِ حاضر میں بھی جن شعرا نے دکنی میں خامہ فرسائی کی ہے ان کے پاس بھی ان تذکروں کا یہ دلکش اور حسین انداز حد درجہ متاثر کن ہے جیسے

موٹ کا پانی پایل باجے ؛ رادھا جیسے چھم چھم ناچے
مست اکڑ کو کرشن سر کا ؛ مرلی بجانا ہمنالی ساجے

"ندی" عنوان کے تحت ایک نظم کے یہ اشعار اور ان کے تشبیہات کی یہ ندرت ملاحظہ ہو۔

او نچے نیچے سخت چٹاناں ہور یہ نازک بدن ؛ جیسے سیتا پھر رہی ہو رام کی لے کو لگن
بھری جوانی میں بھی تری کیتی اونچی ناک ہے ؛ تو تو سا وتری بنے ترا پلو پاک ہے

دکنی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف سنبل و ریحان، سرو و شمشاد، لالہ و یاسمن، کنول دنسترن ہی نہیں بلکہ خالص ہندوستانی پھولوں چنپا، چنبیلی، دونا، مروا، دن کا راجہ، رات کی رانی، سیوتی اور کیوڑے کا ذکر بھی ملتا ہے اور اس میں بلبل کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے پرندوں۔ کویل۔ بگلا۔ قاز۔ مینا۔ پپیہا۔ مور وغیرہ کا تذکرہ بھی کثرت سے ہوتا ہے۔ دکنی شعرا سمرقند و بخارا اور کنار آب رکن آباد ہی کے تذکرے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ گوالیر، سورت، کشمیر، بنگالہ، تلنگانہ اور کرناٹک کے بھی گن گاتے ہیں اور دکنی شاعری کی ایک اور بے حد نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شعرا غزل گوئی میں اردو شاعری کی طرح محبوب کو مذکر نہیں باندھتے۔ ہندی شاعری کی طرح اس میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور عورت محبوب کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے۔ یہ دونوں حالتیں فطری ہیں بعد کے دور میں فارسی کی پیروی میں محبوب کو مذکر باندھنے کا جو غیر فطری رواج چل پڑا، وہ دکنی ادب میں نہیں ملتا۔ اس طرح دکنی غزلوں میں محبوب ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس کوئی بے باک، لڑاکا اور خونخوار ترک نہیں، ہندوستانی لباس، ہندوستانی سنگھار اور ہندوستانی گہنوں سے آراستہ شرمیلی الھڑ ہندوستانی نازنین ہے۔ افسوس ہے کہ بعد میں چل کر ان ہندوستانی عناصر کو گھٹا دیا گیا اور فارسی کی پیروی میں ایرانی عوامل اور عناصر کا پلّہ اونچا کر دیا گیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دکنی ادب کو سامنے رکھ کر اس کی اس صحت مند روایت کو پھر سے زندہ کریں اور اپنے ادب سے مناسب حد تک بیرونی عناصر کو ہٹا دیں۔

ہرمن ہیس

ترجمہ: محمد اسحاق میر

بانسری کا خواب

"یہ لو" میرے والد نے مجھے ہڈی کی ایک چھوٹی سی بانسری دیتے ہوئے کہا "اسے اپنے پاس رکھو اور جب تم دُور دراز ملکوں میں جاکر لوگوں کو اس بانسری کے نغموں سے محظوظ کرنے لگو تو اپنے والد کو بھول نہ جانا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم دنیا کی سیر کرکے کچھ سیکھو۔ میں نے تمہارے لیے یہ بانسری بنوائی ہے کیوں کہ تمہیں سوائے گیت گانے کے کوئی بھی دوسرا کام نہیں بھاتا۔ ہاں! ایک اور بات بھی کبھی نہ بھولنا، تمہیں لوگوں کو صرف اچھے اور پیارے گیت ہی سنانے چاہییں اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یہ خدا کی نعمت کا کفران ہوگا۔"

میرے شفیق والد کو موسیقی سے کوئی لگاؤ نہ تھا وہ محض ایک عالم فاضل انسان تھے اور ان کا خیال تھا کہ جیسے ہی میں اس بانسری میں پھونک ماروں گا سارے مرحلے خود بخود طے ہوجائیں گے۔ یہ ان کی خوش فہمی تھی، مگر مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں انھیں اس بارے میں مایوس کروں، لہٰذا میں نے بانسری اپنی جیب میں ڈالی اور اپنے والد کو الوداع کہہ کر میں اپنے سفر پر روانہ ہوا۔

وادی کی بڑی پون چکی تک کا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہوا تھا اور اس کے پرے میرے لیے دنیا آباد تھی۔ جب میں نے دنیا کو پہلی بار دیکھا تو مجھے وہ بہت پسند آئی۔ راستے میں ایک مکھی، جو اڑتے اڑتے تھک چکی تھی، دم لینے کے لیے میری آستین پر بیٹھ گئی۔ اب میں اسے بھی اپنے ساتھ لیے چلتا رہا تھا۔ میں نے سوچا، جب میں کہیں سستانے کے لیے بیٹھوں گا تو یہ مکھی میرا پیامبر بن کر اہلِ وطن کو میرا سلامِ شوق پہنچادے گی۔

میری راہ کے ساتھ ساتھ جنگل اور سبزہ زاروں کا سلسلہ چل رہا تھا اور ایک دریا بھی میرے ساتھ تیزی سے رواں دواں تھا۔ میں نے دیکھا کہ دنیا میرے وطن سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ یہاں بھی درخت، پھول، گندم کی بالیاں اور پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیاں مجھ سے ہم کلام تھیں۔ میں ان کے گیت گا رہا تھا اور وہ میرے گیتوں کی داد دے رہے تھے، بالکل اسی طرح جیسے اس سے پہلے وطن میں میرا معمول تھا۔ اسی اثنا میں میری آستین پر سوئی مکھی بیدار ہوگئی۔ وہ رینگ کر میرے کاندھے پر چڑھ گئی، اور پھر پر تول کر فضا میں اڑنے لگی۔ اس نے گہری سُروں میں بھنبھناتے ہوئے میرے گرد دو چکر کاٹے اور پھر

اپنی سمت متعین کرکے وہ میرے وطن کی جانب اُڑ گئی۔

اچانک جنگل سے ایک نوجوان دوشیزہ نمودار ہوئی۔ اس کے بازو سے ایک ٹوکری لٹکی ہوئی تھی اور اس کے بھورے بالوں پر ایک جوڑا اساطیر دار سٹرا ہیٹ تھا۔

"آداب" میں نے اُسے مخاطب کرکے کہا "سواری کدھر جا رہی ہے؟"

"فصل کاٹنے والوں کے لیے کھانا لے جا رہی ہوں" اس نے جواب دیا۔ اور پھر میرے بالکل قریب آکر وہ بولی "لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں دنیا کی سیر پر نکلا ہوں۔ اس سفر پر مجھے میرے والد نے بھیجا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں لوگوں کو بانسری کے نغمے سناؤں لیکن حال یہ ہے کہ مجھے ابھی بانسری بجانی تک نہیں آتی اور یہ فن مجھے ابھی سیکھنا ہے۔"

"اچھا! لیکن تم نے کچھ نہ کچھ تو ضرور سیکھا ہوگا؟"

"کوئی خاص چیز نہیں سیکھی، میں صرف گیت گا سکتا ہوں۔"

"لیکن کیسے گیت؟"

"ہر قسم کے گیت، صبح اور شام کے گیت، جانوروں اور پھولوں کے گیت اور اگر تم پسند کرو تو میں تمھیں مثال کے طور پر ابھی ابھی ایک ایسی دوشیزہ کا گیت بھی سنا سکتا ہوں جو ابھی جنگل سے نمودار ہوئی ہے اور فصل کاٹنے والوں کے لیے کھیتوں میں کھانا لے جا رہی ہے۔"

"سچ! تو پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"مگر پہلے اپنا نام تو بتاؤ۔"

"مجھے لوگ برِگٹ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد حسین برِگٹ کو گیت سنانا شروع کیا، جس نے سٹرا ہیٹ پہن رکھا ہے اور جس کی ٹوکری میں فصل کاٹنے والوں کے لیے کھانا ہے۔ جب وہ چلتی ہے تو پھول اُسے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں اور باغوں کی تیلی ہوا اس کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے یہ گیت بڑی توجہ سے سُنا اور گیت کے خاتمے پر مجھے جی کھول کر داد دی۔ جب اُسے باتوں باتوں میں یہ معلوم ہوا کہ میں بھوکا ہوں تو اس نے جھٹ اپنی ٹوکری کا ڈھکن اٹھایا اور اس میں سے ایک روٹی نکال کر میرے حوالے کی۔ جب میں نے دانتوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹا اور نوالہ چبانے ہوئے وہاں سے لمبی لمبی ڈگیں بھرتے ہوئے چل پڑا تو دوشیزہ نے کہا "چلتے ہوئے روٹی کھانا بڑی معیوب بات ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ایک کام ختم کرنے کے بعد دوسرا شروع کرے۔" چنانچہ ہم دونوں گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں روٹی کھاتا رہا اور وہ اپنے بھورے ہاتھ سے گھٹنوں کو تھامے مجھے غور سے دیکھتی رہی۔

جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو اس نے کہا "کوئی اور گیت بھی سناؤ گے؟"

"بسر و چشم! مگر کیسا گیت؟"

"ایک ایسی دوشیزہ کا گیت جس کا محبوب اُسے چھوڑ کر پردیس چلا گیا ہے اور وہ اب جدائی کے صدمے سے نڈھال بیٹھی ہے۔"

"نہیں میں تمھیں ایسا گیت نہیں سنا سکتا۔ مجھے ایسی باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں۔ ویسے بھی رنج اور غم مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں تو تمھیں صرف اچھے اور پیارے گیت ہی سنا سکتا ہوں اور میرے والد کی خواہش بھی یہی تھی۔ البتہ اگر تم چاہو تو میں تمھیں کوئل یا تتلی کا گیت سنا سکتا ہوں"

"ارے! تم ابھی تک محبت نا آشنا ہو؟"

"محبت، محبت تو میرے نزدیک دنیا کی حسین ترین شے ہے۔"

میں نے اپنے گیت کا آغاز کیا۔ پہلے میں نے سورج کی شعاعوں اور سُرخ پھولوں کی محبت کا ذکر کیا۔ کس طرح شعاعیں ان سُرخ پھولوں سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے مارے خوشی کے پھولی نہیں سماتیں۔ میں نے اس چڑیا کا تذکرہ بھی کیا، جو اپنے نر کے انتظار میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی ہے لیکن جب اُس کا نر آتا ہے تو وہ پُھر سے اُڑ کر دور جا بیٹھتی ہے اور محض دکھاوے کے لیے اپنے آپ پر خوف طاری کر لیتی ہے۔ اس کے بعد میں نے بھوری آنکھوں والی دوشیزہ اور سیاح نوجوان کی داستان شروع کی۔ کس طرح یہ نوجوان اس دوشیزہ سے ملتا ہے۔ وہ اس دوشیزہ کو ایک گیت سناتا ہے اور دوشیزہ خوش ہوکر اسے ایک روٹی دیتی ہے۔ لیکن اب کی بار یہ نوجوان روٹی کا تحفہ قبول نہ کرے گا بلکہ وہ اس دوشیزہ سے اس مرتبہ بوسے کا سوال کرے گا۔ وہ دوشیزہ کی بھوری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہی رہے گا۔ وہ اپنا گیت گاتا ہی رہے گا، اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوگا جب تک کہ یہ دوشیزہ بے اختیار ہوکر مسکرا نہ پڑے اور جب تک یہ دوشیزہ اپنے ہونٹوں سے اُس کا منہ بند نہیں کر دیتی۔

یہ سنتے ہی دوشیزہ میری جانب جھکی اور اس نے میرے منہ کو اپنے ہونٹوں سے مقفل کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جب اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اُس کی پلکوں پر دو سنہری ستارے تھے، جن میں میرا اور وادی کے چند سپید پھولوں کا انعکاس تھا۔

"اُف! دنیا کتنی حسین ہے" میں نے بے اختیار ہوکر کہا "میرے والد ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اب تمہاری ٹوکری میں اٹھاؤں گا اور ہم دونوں مل کر کھیتوں کی طرف جائیں گے۔"

میں نے ٹوکری اٹھائی اور ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔ اس کا قدم میرے قدم سے ہم آہنگ تھا اور اس کی خوشی میری مسرت کی ہم نوا بن چکی تھی اور پہاڑ کے اوپر سے آنے والی جنگل کی خوش گوار خنکی زبانِ حال سے بول رہی تھی۔ مجھے آج تک سیر کرتے ہوئے اس قدر فرحت محسوس نہ ہوئی تھی۔ میں مسرت کے عالم میں کافی دیر تک گیت گاتا رہا لیکن جب میرا دل جذبات سے لبریز ہوگیا تو میں خود بخود خاموش ہوگیا۔ جو راگ اس وقت وادی، پہاڑ، گھاس اور ہریالی کی سرسراہٹ کی دھن پر گا اور سنا رہے تھے، اُسے سن کر میری روح بے قرار ہو چکی تھی۔

میں نے سوچا، کاش میں کائنات کے ان ہزاروں گیتوں کو سننے اور سمجھنے کے بعد انھیں خود بھی گا سکتا ——— ہریالی کے گیت، پھولوں کے گیت، انسانوں کے گیت اور ہر قسم کے دوسرے گیت بھی۔ بادلوں کے گیت، پت جھڑ اور سدا بہار جنگلوں اور تمام جانوروں کے گیت۔ اس کے علاوہ دُور افتادہ سمندروں اور پہاڑوں کے گیت، چاند اور ستاروں کے گیت ——— اگر یہ سارے کے سارے گیت بیک وقت میری روح کی گہرائیوں میں گنگنانے لگیں اور میں انھیں گا بھی سکوں تو پھر میں بھی پرماتما

بن جاؤں گا اور میرا ہر گیت بھی ستارہ بن کر آسمان پر چمکنے لگے گا۔

میں انہیں خیالات میں مستغرق تھا۔ مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی لیکن دوشیزہ چلتے چلتے اچانک رُک گئی اور اُس نے اپنی ٹوکری کو، جسے میں اٹھائے ہوئے تھا، پکڑ کر کہا۔

اب یہاں سے مجھے پہاڑ کے اوپر چڑھنا پڑے گا۔ ہاں اوپر، میرے رشتہ دار کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ لیکن تم اب کہاں جاؤ گے؟ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو گے نا؟

"نہیں، میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، مجھے دنیا کی سیر کرنی ہے۔ بہر کیف روٹی کا شکریہ اور بوسے کے لیے بھی میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تمہیں بھول جانا اب میرے بس کی بات نہیں رہی۔"

دوشیزہ نے اپنی ٹوکری واپس لے لی۔ اس ٹوکری کی دوسری جانب سے اس کی نگاہیں میری جانب جھکیں اور اس کا منہ میرے ہونٹوں سے معلق ہو کر رہ گیا۔ اس کا بوسہ اتنا لطیف اور شیریں تھا کہ میں مسرت کی شدت کے باعث مغموم ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر میں نے فوراً الوداع کہی اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔۔۔

دوشیزہ بادلِ نخواستہ پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ لیکن جنگل کے کنارے پر سایہ دار درختوں کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ اُس نے پلٹ کر نیچے دیکھا اور اُس کی نگاہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ میں نے اُسے گردن سے اشارہ کیا اور اپنے ہیٹ کو اُتار کر فضا میں ہلایا۔ اُس نے بھی دوبارہ گردن ہلائی اور اس کے بعد یہ حسن کی تصویر درختوں کے سائے میں غائب ہو گئی۔

میں اب اطمینان سے اپنے راستے پر چل رہا تھا۔ اور میں ابھی تک اپنی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے سامنے ایک بہت بڑا موڑ آگیا۔

یہاں مجھے ایک پن چکی نظر آئی جس کے قریب ہی دریا میں ایک کشتی کھڑی تھی۔ اس کشتی پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا کیوں کہ جیسے ہی میں نے ہیٹ اتار کر کشتی پر قدم رکھا وہ فوراً حرکت میں آکر دریا کے رُخ پر چلنے لگی۔ میں کشتی کے درمیان اور بوڑھا پتوار کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ یہ کشتی ہمیں کہاں لے جا رہی ہے، تو اس نے پہلے اپنی مندی ہوئی مغموم آنکھیں نیم وا کر کے مجھے اور پھر وہ دبی آواز میں بولا۔

"جہاں بھی تم جانا چاہو، دریا کے ساتھ ساتھ سمندر میں، یا بڑے شہروں کی جانب۔ تم اپنی منزل کا خود انتخاب کر سکتے ہو، کیوں کہ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔"

"سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے؟ پھر تو تم ضرور کوئی بادشاہ ہو؟"

شاید بوڑھے نے کہا "لیکن تم تو مجھے شاعر معلوم ہوتے ہو، ٹھیک ہے نا؟ کیا تم کوئی سفر کا گیت سنانا پسند کرو گے؟"

یہ بات سُن کر میں ٹھٹک گیا اور اس سنجیدہ قسم کے سفید ریش انسان سے خائف ہو گیا۔ ہماری کشتی خاموشی سے دریا کے ساتھ ساتھ پوری رفتار کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ میں نے دریا کا ایک گیت گایا: "یہ دریا کشتیوں کو اپنی پشت پر اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔ سورج کی شعاعیں اُس کے وجود میں منعکس ہوتی ہیں۔ جب وہ چٹانوں کے درمیان سے گزرتا ہے تو اُس کے شور میں گھن گرج پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح ہنستے کھیلتے یہ دریا بالآخر اپنے سفر کے انجام تک پہنچ جاتا ہے۔"

یہ گیت سنتے ہوئے بوڑھے کے چہرے پر کسی قسم کا تغیر نمایاں نہ ہوا۔ جب میرا گیت ختم ہوا تو اُس نے مفکرانہ انداز میں خاموشی سے سر ہلایا اور جب اس کے معاً بعد اُس نے اپنا گیت گانا شروع کر دیا تو میں دنگ رہ گیا۔ اُس کے گیت کا موضوع بھی دریا تھا۔ اس کا دریا بھی وادیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اُس کا گیت میرے گیت سے کہیں زیادہ حسین اور جان دار تھا مگر اُس کے گیت کا انداز بالکل انوکھا تھا۔

اُس کے گیت کا دریا موت کا دیوتا تھا جو مست ہاتھی کی طرح جھومتے جھامتے پہاڑوں سے نیچے اترتا ہے۔ وہ مہیب اور وحشی ہے۔ اگر راستے میں کوئی پن چکی اسے پابند سلاسل کرے یا کوئی پُل اُس کے اوپر سایہ فگن ہو تو وہ غصے میں آکر دانت پیسنے لگتا ہے۔ وہ کشتیوں کے خون کا پیاسا ہے اور وہ ان کا بوجھ طوعاً و کرہاً برداشت کرتا ہے۔ جب اُس کی موجیں اور اُس کی تہ میں اُگے ہوئے آبی پودے ڈوبے ہوئے انسانوں کی سفید لاشوں کو لوریاں دیتے ہیں تو وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

یہ باتیں میری طبیعت پر بہت گراں گزریں۔ اگرچہ بوڑھے کا گیت بہت خوبصورت تھا اور اُس کا لحن بھی بڑا پُر اسرار تھا۔ مگر اس گیت کو سن کر میں پریشان اور غمگین ہو گیا اور میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے سوچا اگر وہ ساری باتیں صحیح ہیں جو اس دانا انسان اور بوڑھے مغنی نے مجھے اپنی دبی آواز میں گا کر سنائی ہیں، تو پھر میرے سامنے گیت محض حماقت اور بچوں کا ایک عامیانہ کھیل ہیں۔ پھر دنیا بھی درحقیقت خدا کے نور اور محبت کا پرتو نہیں، بلکہ وہ تاریکی، ظلم، بدی اور گمراہی کا مظہر ہے۔ اور جب جنگل کے درخت سرسراتے ہیں تو ان کی سرسراہٹ نعرۂ مسرت نہیں بلکہ نالۂ غم ہوتا ہے۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ سائے دراز ہونے لگے۔ جب بھی میں کوئی نیا گیت شروع کرتا میرا لحن اور بھی ماند پڑ جاتا اور میری آواز پہلے سے زیادہ دھیمی ہو جاتی۔ جب میرا گیت ختم ہوتا تو یہ اجنبی مغنی جواباً اپنا گیت سناتا۔ اس طرح اُس کے گیت سن سن کر دنیا میرے لیے اور بھی زیادہ پیچیدہ اور پُر حزن ہوتی چلی گئی۔ اور میرا دل بھی بتدریج پریشان اور غمگین ہوتا چلا گیا۔ میری روح عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ میں اپنے کیے پر سخت نادم ہوا۔ کاش میں زمین سے ناطہ نہ توڑتا، کاش میں پھولوں سے منہ نہ موڑتا، کاش میں اپنی محبوبہ کا ساتھ نہ چھوڑتا۔ بڑھتے ہوئے جھٹ پٹے میں اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے میں نے بلند آواز میں گانا شروع کر دیا اور جب تک افق پر شفق کی سرخی چھائی رہی، میں اپنی محبوبہ اور اس کے بوسوں کے گیت ہی گاتا رہا۔

جب اندھیرا چھایا اور میں خاموش ہو گیا تو بوڑھے نے پتوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنا گیت گانا شروع کر دیا۔ اُس کے گیت میں بھی محبت، محبت کی رعنائیوں، بھوری آنکھوں، نیلی آنکھوں اور سرخ رسیلے ہونٹوں کا تذکرہ تھا۔ اس بوڑھے نے تاریکی میں ڈوبتے ہوئے دریا کے درمیان جو گیت اپنے حزنیہ انداز میں گایا وہ بے شک بہت حسین اور پُر تاثیر تھا لیکن جو محبت اس کے گیت نے پیش کی وہ تاریک، مہیب اور ایک ایسا مہلک راز تھا جس کی خاطر گمراہ اور خستہ حال انسان، اپنی مصیبت اور ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ناک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ اسی محبت کی خاطر وہ ایک دوسرے پر ظلم ڈھاتے ہیں اور اسی محبت کے لیے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔

یہ گیت سننے کے بعد میں سخت بیزار اور غمگین ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں سالہا سال سے اس سفر کو طے کرتا چلا آرہا ہوں اور میں نے راستے میں دکھ اور مصیبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں دیکھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس اجنبی بوڑھے کے وجود

سے حزن و ملال کا ایک سوتا پھوٹ پڑا ہے جو بہہ کر میرے اندر سما جا رہا ہے۔

بالآخر میں نے بے تاب ہو کر کہا "اگر زندگی کے بجائے موت ہی دنیا میں سب سے اعلیٰ اور حسین شئے ہے تو پھر میں حزن و ملال کے بادشاہ سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے موت کا بھی گیت سنائے۔"

بوڑھے نے اب موت کا گیت شروع کیا۔ ایسی رسیلی لے میں نے آج تک نہ سنی تھی لیکن یہ گیت سننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ موت بھی دنیا کی اعلیٰ اور حسین شئے نہیں۔ مجھے موت کا دامن بھی تسکین سے خالی نظر آیا۔ دراصل موت زندگی اور زندگی موت ہے اور یہ دونوں محبت کی رزم اور خوں ریز جنگ میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر ایک جان دو قالب ہو چکی ہیں۔ یہی سنگم زندگی کا منتہا و مقصود ہے۔ یہیں سے وہ کرن پھوٹی ہے جو دکھ اور غم کو چار چاند لگا دیتی ہے، اور یہیں سے وہ سایہ پھیلا ہے جو مسرت اور حسن کو اپنی تاریکی سے ڈھانپ دیتا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں مسرت اور بھی واضح ہو کر چمکتی ہے اور اس اندھیری رات میں محبت کا انگارہ اور بھی سرخ ہو کر دہکتا ہے۔

یہ گیت سن کر مجھ پر سکوت طاری ہو گیا۔ میری ذاتی قوت ارادی سلب ہو کر رہ گئی اور اس اجنبی کی رضا میرا ارادہ بن گئی۔ بوڑھے کی سنجیدہ اور غم و محبت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر مرتکز تھیں اور اس کی آنکھوں میں سارے زمانے کا درد اور ساری دنیا کا حسن سمایا ہوا تھا۔ جب وہ ایک بار مسکرایا تو میری ہمت بندھ گئی اور میں نے بیزار ہو کر کہا: "خدا کے لیے اب مجھے واپس لے چلو۔ اس سیاہ رات میں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں یہاں سے لوٹ کر اپنی محبوبہ کو ڈھونڈوں گا اور اگر وہ مجھے نہ ملی تو پھر اپنے وطن چلا جاؤں گا۔"

بوڑھا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر رات کی تاریکی کی طرف اشارہ کیا۔ لالٹین کی روشنی میں اُس کے خد و خال مجھے نمایاں طور پر نظر آنے لگے: "کوئی راستہ بھی واپس نہیں جاتا" اُس نے متین اور درد بھرے انداز میں کہا "اگر تم دنیا کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہارا ہر قدم آگے کی جانب ہی بڑھنا چاہیے۔ بھوری آنکھوں والی دوشیزہ کے روپ میں تم نے دنیا کی سب سے اعلیٰ اور حسین شے کو دیکھ لیا ہے۔ لیکن اب تم اس دوشیزہ سے جتنی دور ہوتے جاؤ گے اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اب تمہیں اپنا سفر جاری رکھنا پڑے گا اور تم جہاں بھی جانا چاہو، جا سکتے ہو۔ میں کشتی کی پتوار اب تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

یہ سن کر میری جان غم سے نڈھال ہو گئی۔ لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ بوڑھے کا قول برحق ہے۔ میرے ذہن میں اپنی محبوبہ کی جدائی کا شدید احساس ہوا۔ مجھے وطن کی یاد نے ستایا اور مجھے وہ ساری چیزیں یاد آ گئیں جو کبھی میری تھیں یا جنھیں میں اپنی سمجھتا تھا مگر جو اب مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھن چکی تھیں۔ اب مجھے پتوار سنبھالنی پڑے گی کیوں کہ یہ بات میرے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

میں کشتی کے درمیان سے چپ چاپ اُٹھ کر پتوار کی طرف چلنے لگا۔ بوڑھا بھی میری پیشوائی کے لیے آگے بڑھا اور جب ہم دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب پہنچ کر کھڑے ہو گئے تو اُس نے ایک بار میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی لالٹین مجھے دے دی۔

جب میں پتوار کے قریب پہنچ کر بیٹھ گیا اور میں نے لالٹین نیچے رکھی تو مجھے معلوم ہوا کہ اب کشتی میں میرے سوا اور کوئی دوسرا انسان موجود نہیں۔ یہ دیکھ کر میرا بدن کانپ اٹھا لیکن بوڑھے کے دفعتاً غائب ہو جانے پر میں مطلقاً خائف نہ ہوا کیوں کہ مجھے پہلے ہی سے اس بات کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آج کا دن میرے سفر کا حسین ترین دن ہے۔ اب میرے والد اور میری

(باقی ص ۸۱ پر)

مظہر مہدی

ایک نظم

ہاتھ پاؤں کی جدوجہد
جتنی بڑھی
دھنستے گئے
اور
دھنستے گئے
اپاہج، اپاہج سے مدد
کیوں کر مانگے
اپنی سعی
کیے جاتے ہیں
خواہشوں کی خواہش
بستر مرگ کی رات
کیلنڈر کے اوراق ہم
دیاسلائی کی آگ
سرخ سرخ سچائیاں
فرش پر خون تھوکتی رہیں
زمستاں کی پتیاں
نئی کونپلیں گھورتی رہیں

اختر عادل

نظمیں

(۱)

ساحل ساحل کو چھو چھو کر کیسی لذت پاتا تھا
میں اک ایسا دریا تھا جو ساحل کے گن گاتا تھا
ساحل کرتا رہتا میری موجوں کی کیا دل داری
ساحل ساحل سیر سپاٹا ساحل ساحل سیاری
اب میں ساغر میں گھل مل کر ساگر تو بن بیٹھا ہوں
چنچل چھوٹا پن کھویا کیا بھاری من بیٹھا ہوں

---

(۲)

تمہارا حسن تو ظاہر کا ایک سرمایہ
جنونِ عشق ورائے شعور سے آیا
عروجِ حسن عروجِ بہار تک محدود
جنونِ عشق کے اللہ جانے کیا ہیں حدود
کسے خبر ہے کہ کیا لاشعور کی حد ہے
خدا ہی جانے کہاں بے ظہور کی حد ہے

خالد قادری

دُشینت کمار کی غزلیں

دُشینت کمار کا نام شاید اُردو قارئین کے لیے نیا ہو مگر ہندی شاعری کی دنیا میں یہ ایک جانا پہچانا نام ہے ان کا شمار ہندی کے موجودہ دور کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔

دُشینت کمار یکم ستمبر ۱۹۳۳ء یو پی کے بجنور ضلع میں پیدا ہوئے۔ ان کی بیشتر تعلیم الٰہ آباد میں ہوئی اور پھر ملازمت کے سلسلہ میں دہلی، اجین اور بھوپال میں قیام رہا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ان کا بھوپال میں انتقال ہوا۔ آخری دنوں میں وہ بھوپال ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔

۱۹۵۷ء میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ " سورج کا سواگت " شائع ہوا تھا جس کے ساتھ ہی ہندی شاعری میں انھیں ایک منفرد مقام دیا جانے لگا۔ اس کے بعد ان کے شاعری کے دو اور مجموعے آئے " آوازوں کے گھیرے " اور " جلتے ہوئے بن کا بسنت "۔ انھوں نے کچھ ناولیں اور ڈرامے بھی لکھے جن میں "چھوٹے چھوٹے سوال (ناول)" "دوہری زندگی (ناول)" "مسیحا مرگیا (ڈراما)" اور "من کے کونے (ڈراما)" وغیرہ ہیں۔

"سائے میں دھوپ" دُشینت کمار کی شاعری کا آخری مجموعہ ہے۔ یہ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ہندی میں غزل کے فارم کو برتنے کا پہلا کامیاب تجربہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ تجربہ اور اہم ہو جاتا ہے خاص طور پر یہ جاننے کے بعد کہ ہندی میں نرالا جیسا شاعر بھی اس میدان میں مشق آزمائی کرکے مایوس ہو چکا تھا۔ شاید دُشینت کمار کے اس کامیاب تجربہ کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہندی شاعری کے لیے غزل ایک مانوس صنف بنتی جا رہی ہے۔ ہندی کے کوی دُشینت کمار نے غزل کیوں کہنی شروع کی، اس سوال کا جواب خود ان کے الفاظ میں شاید اُردو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو:

یہاں میں صاف صاف کہہ دوں کہ غزل مجھ پر نازل نہیں ہوئی۔ میں پچھلے ۲۵ سالوں سے اسے سنتا اور پسند کرتا آیا ہوں اور میں نے کبھی کبھی چوری چھپے اس میں ہاتھ بھی آزمایا ہے لیکن غزل لکھنے یا کہنے کے پیچھے ایک تجسس تھا جو ہمیشہ مجھے بے چین کیے رہتا تھا وہ یہ کہ ہندوستان کے شاعروں میں سب سے زیادہ حساس شاعر مرزا غالب نے اپنے شاعرانہ کرب کے اظہار کے لیے غزل کے فارم کو ہی کیوں چنا؟ اور اگر اس صنف میں شاعری کے ذریعہ غالب اپنے داخلی اور نجی کرب کو اتنا مجموعی اور آفاقی بنا سکتے ہیں تو میرا دوہرا کرب جو بیک وقت نجی بھی ہے اور سماجی بھی اس صنف کے ذریعہ

قارئین کے ایک نسبتاً وسیع حلقہ تک کیوں نہیں پہنچ سکتا۔

جہاں غالب کی عظمت ہمیشہ ہی کسی قسم کے شبہات سے بالاتر رہی ہے وہیں غزل کے بے پناہ امکانات کا اعتراف شاید ہندی کے ادیبوں میں اس بھرپور انداز میں دشینت کمار نے پہلی بار کیا ہے۔ ہندی میں غزل کے فارم کو دشینت کمار نے کتنی کامیابی سے برتا ہے اس کا اندازہ ان چند غزلوں سے لگایا جا سکتا ہے جو یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

O

کھنڈر بچے ہوئے ہیں عمارت نہیں رہی
اچھا ہوا کہ سر پہ کوئی چھت نہیں رہی
کیسی مشالیں لے کے چلے تیرگی میں آپ
جو روشنی تھی وہ بھی سلامت نہیں رہی
ہم نے تمام عمر اکیلے سفر کیا ——
ہم پر کسی خدا کی عنایت نہیں رہی
ہم کو پتا نہیں تھا ہمیں اب پتا چلا
اس ملک میں ہماری حکومت نہیں رہی
کچھ دوستوں سے ویسے مراسم نہیں رہے
کچھ دشمنوں سے ویسی عداوت نہیں رہی
ہمت سے سچ کہو تو برا مانتے ہیں لوگ
رو رو کے بات کہنے کی عادت نہیں رہی
سینے میں زندگی کی علامات ہیں ابھی
گو زندگی کی کوئی ضرورت نہیں رہی

O

یہ سارا جسم جھک کر بوجھ سے دہرا ہوا ہوگا
میں سجدے میں نہیں تھا آپ کو دھوکا ہوا ہوگا
غضب یہ ہے کہ اپنی موت کی آہٹ نہیں سنتے
وہ سب کے سب پریشاں ہیں وہاں پر کیا ہوا ہوگا
کئی فاقے بتا کر مر گیا جو اس کے بارے میں
وہ سب کہتے ہیں اب ایسا نہیں ایسا ہوا ہوگا
یہاں تو صرف گونگے اور بہرے لوگ بستے ہیں
خدا جانے یہاں پر کس طرح جلسہ ہوا ہوگا
تمہارے شہر میں یہ شور سن کر تو یوں لگتا ہے
کہ انسانوں کے جنگل میں کوئی ہانکا ہوا ہوگا
چلو اب یادگاروں کی اندھیری کوٹھری کھولیں
کم از کم ایک وہ چہرا تو پہچانا ہوا ہوگا

میں جیسے اوڑھتا بچھاتا ہوں
وہ غزل آپ کو سناتا ہوں
ایک جنگل ہے تیری آنکھوں میں
میں جہاں راہ بھول جاتا ہوں
تو کسی ریل سی گذرتی ہے
میں کسی پل سا تھرتھراتا ہوں
ایک بازو اکھڑ گیا جب سے
اور زیادہ وزن اٹھاتا ہوں
ہر طرف اعتراض ہوتا ہے
میں اگر روشنی میں آتا ہوں

اس راستے کے نام لکھو ایک شام اور
یا اس میں روشنی کا کرو انتظام اور
آندھی میں صرف ہم ہی اکھڑ کر نہیں گرے
ہم سے جڑا ہوا تھا کوئی ایک نام اور
گھٹنوں پہ رکھ کے ہاتھ کھڑے تھے نماز میں
آ جا رہے تھے لوگ ذہن میں تمام اور
ہم نے بھی پہلی بار چکھی تو بری لگی
کڑوی تمہیں لگے گی مگر ایک جام اور
حیران تھے اپنے عکس پہ گھر کے تمام لوگ
شیشہ چٹخ گیا تو ہوا ایک کام اور

غیاث متین

غزل

پیڑ بن جاتے تھے جس کے واسطے اکثر چراغ
تھے سے نابینا کوہیں، اب راہ کے پتھر چراغ
کیوں کسی کو ڈھونڈتے ہو، ہاتھ میں لے کر چراغ
تم اگر سورج ہو تو آئیں گے خود چل کر چراغ
دیکھنا جس کو اگر ہے ان چراغوں کو بجھاؤ
کیسے دیکھوگے اسے تم سامنے رکھ کر چراغ
ان کی قسمت میں نہ سورج ہے نہ کوئی چاند ہے
دھول ان کے واسطے ہے آئینہ، ٹھوکر چراغ
اک انہی سے روشنی ملتی ہے مجھکو راہ بھی
ہاتھ میں میرے نہیں یہ بادہ و ساغر چراغ
اب جو لوٹا ہوں تو سب حیرت سے تکتے ہیں مجھے
جام و مینا، گنبد و محراب، بام و در چراغ
آج تو ان کی نظر کے واسطے سورنگ ہیں
کل پرندوں کے لیے ہوئے تھے، بال و پر چراغ
وہ جو سورج ہیں مگر جن کے گھروں میں رات ہے
ہنس لیا کرتے ہیں ان کے حال پر، اکثر چراغ
شب تو اندھی ہے، رہے گی عمر بھر اندھی متین
یا جلوں میں شام سے یا پھر جلیں دن بھر چراغ

علی الدین نوید

غزل

تری گرفت میں آئے نہ خود کے بس میں رہے
ہم ابر بن کے ہواؤں کی دسترس میں رہے
وہ کون لوگ تھے صحرا میں جن کو پھول ملے
چمن میں رہ کے بھی ہم لوگ خار و خس میں رہے
ہماری سادہ مزاجی ہی ہمکو لے ڈوبی
ہم آسمان تھے لیکن زمیں کے بس میں رہے
وہ قافلے جو کہیں دشت شب میں دفن ہوئے
سحر ہوئی بھی تو آوازۂ جرس میں رہے
بجھے تو کیسے بجھے پیاس جسم و جاں کی نوید
کہ چند گھونٹ ہی پیمانۂ ہوس میں رہے

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جرنل خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ (شمارہ ۱، ۲، ۳، ۴) قیمت فی شمارہ پندرہ روپے

مجلس ادارت: قاضی عبدالودود (چیرمین) سید حسن عسکری، افسرالدولہ فیاض الدین حیدر، عابد رضا بیدار (سکریٹری)

خدا بخش لائبریری پٹنہ ہمارے ملک کا ایک اہم کتب خانہ اور تحقیقی مرکز ہے۔ اس ادارے کے بانی مولوی خدا بخش بڑے عالم اور قومی رہنما تھے وہ بہار کے سرسید تھے۔ ان کا تعلق ابتدا میں محکمہ تعلیمات پھر پیشہ وکالت سے رہا۔ کچھ عرصے تک وہ حیدرآباد کی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ عالم اور محقق ہونے کے علاوہ مولوی خدا بخش شاعر بھی تھے اور جمیل تخلص کرتے تھے۔ اردو کے علاوہ انھیں انگریزی، فارسی، اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مولوی خدا بخش کتابوں کے عاشق تھے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ اسی عشق کی زندہ و پائندہ یادگار ہے۔ اس لائبریری کے قیام کی روداد یہ ہے کہ مولوی خدا بخش کے والد مولوی علی بخش کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنے شوق سے عربی، فارسی اور اردو کی بہت سی نادر کتابیں جمع کی تھیں وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کتابوں پر صرف کرتے تھے۔ انتقال کے وقت (۱۸۷۶ء) ان کے کتب خانے میں قریب چودہ سو قلمی کتابیں تھیں۔ انھوں نے اپنے فرزند کو وصیت کی تھی کہ وہ اس کتب خانے کو پبلک لائبریری بنا دیں۔ مولوی خدا بخش کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے اپنے والد کے چھوڑے ہوئے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ غدر کے بعد بہت سے نایاب اور قیمتی کتب خانے لوٹ کھسوٹ کی نذر ہوئے اور یہ کتابیں کوڑیوں کے مول بکنے لگیں اس زمانے میں رام پور کے نواب نے سپاہیوں کو لالچ دے رکھا تھا کہ وہ انھیں ہر قلمی کتاب پر ایک روپیہ پیش کریں گے۔ مولوی خدا بخش اس معاملے میں ان کے رقیب بن گئے۔ انھوں نے کتابوں کے ایک شکاری محمد مقی کو ۵۰ روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ کے علاوہ وہ اسے ہر کتاب پر کمیشن بھی دیا کرتے تھے۔ مسلسل ۱۸ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ قلمی کتابوں کے قدرداں کی حیثیت سے مولوی خدا بخش کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کسی کتب فروش کو کوئی قلمی کتاب ہم دست ہوئی تو وہ اسے سب سے پہلے مولوی خدا بخش کو دکھاتا۔ مولوی خدا بخش کا یہ دستور تھا کہ جو کتب فروش بھی قلمی کتابیں لے کر بانکی پور آتا اسے ریلوے کا دگنا کرایہ دیتے۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے اپنے کتب خانے کے لیے ایک شاندار عمارت بنوائی۔ سر چارلس لیال نے اس کتب خانے کو ترقی دینے میں خاص دلچسپی لی۔ انھیں کے ایما پر حکومت بنگال نے اس کتب خانے کی سرپرستی قبول کی۔ ۱۸۹۱ء میں سر چارلس ایلیٹ نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کا افتتاح کیا۔ اس وقت لائبریری میں مطبوعات کے علاوہ چار ہزار قلمی کتابیں تھیں۔ اس ذخیرے میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ مولوی خدا بخش نے ان کتابوں کی

بڑی خوبصورت اور پائدار جلدیں بنوائیں ۔ اس طرح یہ کتب خانہ نایاب کتابوں کے علاوہ جلد سازی کے عمدہ نمونوں کے لیے بھی شہرت رکھتا ہے ۔

خدا بخش اورینٹل لائبریری کی حیثیت اب ایک تحقیقاتی مرکز کی ہوگئی ہے ۔ اس لائبریری کی جانب سے خدا بخش میموریل لکچرز کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ علاوہ ازیں اس ادارے نے اپنا اشاعتی پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت کئی اہم عربی، فارسی اور اردو کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ گزشتہ تین سال سے ایک تحقیقاتی مجلہ "خدا بخش لائبریری جرنل" کے نام سے شائع ہونے لگا ہے جس کے چار ابتدائی شمارے ہمارے پیش نظر ہیں ۔ پہلے شمارے کے تعارف میں اس جرنل کے اجرا کے مقصد اور اس کی نوعیت کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔

خدا بخش لائبریری بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ خدا بخش لائبریری کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ "خدا بخش لائبریری جرنل" کے نام سے نکالا جائے اور اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اس کے مندرجات کا کسی نہ کسی طرح کا تعلق کتب خانۂ مذکور سے ضرور ہو ——— اس میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے مضامین ہوں گے اور ایسے مضامین یا مختصر رسالے بھی اس میں شامل ہوں گے جو پہلے کہیں اور شائع ہو چکے ہوں"

جرنل کی مجلس ادارت میں جن محققین اور عالموں کے نام شامل ہیں وہ اس جریدے کے بلند معیار کی ضمانت دینے کے لیے کافی ہیں ۔ جناب قاضی عبدالودود، ڈاکٹر سید حسن عسکری، ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے علمی اور تحقیقی کارناموں سے ساری اردو دنیا واقف ہے ۔ جناب فیاض الدین حیدر ادارۂ تحقیقات عربی، فارسی (پٹنہ) کے ڈائرکٹر ہیں ۔ اس تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں کہ چاروں شماروں کے شمولات کا جائزہ لیا جائے ۔ شمولات کی ایک منتخب فہرست یہاں پیش کی جاتی ہے جس سے جرنل کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا ۔

(۱) ڈاکٹر نذیر احمد "فارسی اور ہندوستان" (۲) فیاض الدین حیدر "غزالی مشہدی" (۳) ڈاکٹر عبدالرشید "طبقات الحنفیہ و مولفوھا" (۴) عابد رضا بیدار "باغ معانی مولفہ نقش علی" (۵) مرزا جان طپش دہلوی "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" (۶) اسکاٹ او کونر "خدا بخش لائبریری ۔ ایک تعارف" (انگریزی) (۷) عابد رضا بیدار (مرتب) "مجمع النفائس مؤلف سراج الدین علی خاں آرزو (۸) قاضی عبدالودود "دیوان حسن بیگ" (۹) مختار الدین احمد "رسالۃ الشعاعات الکندی" (۱۰) ڈاکٹر بروس لارنس "عہد سلطنت میں صوفی لٹریچر کا ایک جائزہ" (انگریزی) (۱۱) پروفیسر کلیم الدین احمد "میری تنقید ـــ ایک بازدید" (۱۲) ڈاکٹر ہاشم امیر علی "اسلامی تقویم کی بازیافت (انگریزی)

اس جرنل میں مقالوں اور رسالوں کے علاوہ بعض نوادر بھی شائع کیے گئے ہیں جیسے ابوالکلام آزاد کی خود نوشت تحریر، رابندر ناتھ ٹیگور، علی اصغر حکمت، جگدیش چندر بوس، ڈاکٹر ذاکر حسین، سی ۔ وی ۔ رامن، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی تحریروں کے عکس ۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار خاص طور پر قابل مبارک باد ہیں کہ ان کی ان تھک کاوشوں کے بغیر اس جرنل کی باضابطہ اشاعت پھر اس کے اعلیٰ معیار کی برقراری شاید ممکن نہ ہوتی ۔

مغنی تبسم

اُردو نامہ

علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

وقار خلیل

۲ ر اپریل : محفلِ خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ صالحہ الطاف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ لیئق صلاح لکچرار سیف آباد کالج نے مزاحیہ مضمون اور محترمہ قمر جمالی نے کہانی سنائی۔ خواتین شعرا نے آخر میں کلام پیش کیا۔ محترمہ مظفر النساء ناز نے شکریہ ادا کیا۔

۴ ر اپریل : اردو اکیڈیمی کی طرف سے چارمینار کے شہر میں موسومہ ایس وینکٹ رام ریڈی اردو ریسرچ سنٹر کو اردو کے نامور شعراء چندو لال شادان، مہاراجہ کشن پرشاد یا پھر بانیٔ شہر محمد قلی قطب شاہ کے نام سے موسوم کئے جانے کی تجویز رکھتے ہوئے شعری اور ادبی انجمنو ں بزم خامس، سخنستان اور اُردو سبھا کے علاوہ میقاتی جرائد کے مدیران مسز ناہید عثمانی بنواری لال شرما اور شکیل انور نے صحافتی بیانات جاری کئے۔

● اردو اکیڈیمی کے مجوزہ ریسرچ سنٹر پر ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی جناب چندر سریواستو نے اراکین اکیڈیمی، اردو قلم کاروں اور مصنفوں کو مخاطب کرتے ہوئے ریسرچ سنٹر کے افتتاحی انتظامات کے سلسلے مشاورت کرتے ہوئے بتایا کہ اردو کے پرانے شہر میں ریسرچ سنٹر، اسکالروں اور تشنگان شعر و ادب کے ذوق مطالعہ کی تکمین کا ذریعہ بنے گا۔ اس موقع پر مسٹر یم بالیا چیرمن "حدا" کی صدارت میں استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔

۸ ر اپریل : صدر اُردو اکیڈیمی جناب یم باگاریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج اور مسٹر پی گنگا ریڈی ریاستی وزیر نے ایس وینکٹ رام ریڈی اردو ریسرچ سنٹر کے انتظامات کا معائنہ کیا۔ مسٹر باگاریڈی نے بتایا کہ ریسرچ سنٹر کے دو گوشوں کو مرزا غالب ہال اور صفی ہال کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

۹ ر اپریل : عادل شاہی عہد کے ریختی گو شاعر معظم بیجا پوری کی صوفیانہ شاعری پر ڈاکٹر حسینی شاہد کی کتاب انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی۔

● ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی سٹی یونٹ کے سالانہ انتخابات میں مسٹر غوث احمد خاں ایڈیٹر فلمی تصاویر صدر، نور الحق قادری معتمد اور اراکین میں ڈاکٹر رام پرشاد، سعد حسن، یم اے قدوس اور عنایت علی راہی منتخب ہوئے۔

۱۰ ر اپریل : زندہ دلان حیدرآباد کی دو روزہ سالانہ تقاریب جشن بھارت چند کھنہ کے افتتاحی اجلاس جناب شنکر تو سوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر مسٹر رام دیو اور جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یو پی مہمان خصوصی رہے۔ پاکستان کے معروف طنز و انشاء نویس جناب میر احمد شیخ کے علاوہ جناب مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر رشید موسوی، جناب مسیح انجم، جناب پرویز یداللہ مہدی نے اپنے مضامین اور تاثرات سے نامور طنز و مزاح نویس جناب کھنہ کو خراج تحسین ادا کیا اور ان کی شرافت، سادگی اور اعلیٰ ظرفی کو شخصیت کا دوسرا نام قرار دیا۔ جناب رشید قریشی نے جلسہ کی معتمدی کی۔

۱۱ ر اپریل زندہ دلان کی طرف سے طنز و مزاح سے لبریز ادبی اجلاس پاکستانی مہمان ادیب جناب میر احمد شیخ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز مجتبیٰ حسین نریندر لوتھر، رشید قریشی، مسیح انجم، ڈاکٹر رشید ضیاء، پرویز ید اللہ مہدی اور برہان حسین کے علاوہ میر شیخ نے بھی نگارشات سے محفل کو متاثر کیا۔ جناب شیخ نے حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول کو زبردست خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ اہل دکن نے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ دونوں

دونوں ملکوں میں کتابوں، رسالوں اور ادیبوں شاعروں کے آزادانہ تبادلہ پر زور دیا اور کہا کہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہندو پاک دونوں کے باہمی اخلاص اور دوستی کی خبریں اخباروں میں نہیں چھپتی جب کہ ہماری تلخیاں شہ سرخی بن جاتی ہیں۔

● مجوزہ پیس وینکٹ رام ریڈی اردو ریسرچ سنٹر کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں چار مینار کے قریب مسٹر امجد باغی اسسٹنٹ چاری ایڈوکیٹ، پیس کے افضل الدین اور راجہ لال راجہ نے احتجاجی بھوک ہڑتال کا آغاز کیا۔

● عہد آصفی کی غزل گائیکہ شریمتی شنکرا بائی کا انتقال ہوگیا۔

۱۲ اپریل: زندہ دلان حیدرآباد کی محفل لطیفہ مسٹر پی گنگا ریڈی ریاستی وزیر کی صدارت میں قہقہہ ریز ہوئی۔ حیدرآباد کے زندہ دل ادیبوں، آرٹسٹوں کے علاوہ طنز و مزاح کے ادیبوں منیر احمد شیخ، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، رشید قریشی، مجتبیٰ حسین، اظہر افسر، محمد منظور احمد، خیرات ندیم، اسلم فرشوری، مسعود عابد نے لطائف سنا کر داد حاصل کی۔

● جناب حافظ یوسف صدر نشین مجلس عاملہ اردو اکیڈیمی نے پیس وینکٹ رام ریڈی میموریل اردو ریسرچ سنٹر کا افتتاح کیا۔ جناب یم باگا ریڈی چیرمن اکیڈیمی نے صدارت کی اور محبان اردو سے خواہش کی کہ وہ اس ریسرچ سنٹر سے بھرپور استفادہ کریں آپ نے بتایا کہ سنٹر کے کتب خانہ میں دو لاکھ روپے کی ۱۵ ہزار کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔ مسٹر باگا ریڈی نے ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کی اردو دوستی اور اردو کے مسائل کے بارے میں واضح ذہن کا ذکر کرتے ہوئے ان کے دور حکومت کو اردو کے لیے فال نیک قرار دیا اردو سنٹر کے افتتاحی جلسہ کو ڈائرکٹر و سکریٹری مسٹر چیدر سر پوا سنتو اسٹر شیوراؤ شیکر (ایم ایل اے) جناب ابراہیم خاں رکن اسمبلی، مولانا سید محمد قادری، جناب یم بالیا چیرمین مُدا اور مسٹر قدوس ایڈوکیٹ نے مخاطب کیا۔

● زندہ دلان حیدرآباد کے مہمان ادیبوں جناب منیر احمد شیخ، فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین نے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر (   ) سکریٹری ادارہ نے مہمانوں کو ادارہ، میوزیم اور کتب خانہ کی سیر کرائی اور ادارہ کی مطبوعات نذر کیں۔ اس موقع پر ادیب اور شعراء حضرات بھی ایوان اردو میں موجود تھے۔

● زندہ دلان حیدرآباد کی دو روزہ تقاریب کا اختتام طنز و مزاح پر مشتمل کل ہند مشاعرہ پر ہوا۔ مسٹر پی گنگا ریڈی نے صدارت کی۔ میزبان اور مہمان شعراء نے کلام سنایا۔ جناب مصطفیٰ علی بیگ نے کارروائی چلائی اور مسٹر طالب خوندمیری نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ اپریل۔ ایوان اردو میں ایک غیر منعقدہ محفل شعر جناب ڈاکٹر احسن رضوی کی آمد کی مسرت میں ڈاکٹر مغنی تبسم معتمد مجلس مشاورت و مدیر سب رس کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم نے ڈاکٹر احسن رضوی کی جدید شعری حیثیت کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ محفل شعر میں مسرز احسن، تبسم، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، صادق نقوی، ڈاکٹر اکبر علی بیگ اور وقار خلیل نے کلام سنایا۔

۱۵ اپریل: چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے حیدرآباد کی قدیم اور معروف درس گاہ انوار العلوم کالج کی سلور جوبلی تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ اس درس گاہ سے ۲۳ ہزار طلباء فارغ التحصیل ہوئے۔ چیف منسٹر نے سابقہ گرانٹ کی بحالی کا بر سر موقع اعلان کرتے ہوئے انوار العلوم کالج کے ڈسپلن کی تعریف کی۔ جناب خلیل اللہ حسینی پرنسپل کالج نے استقبالیہ خطبہ پڑھا اور کالج کی سیکولر روایات کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر مجیبا ریڈی نے اردو سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کسی مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔ جناب شاہ عالم خاں صدر مجلس انتظامی کالج اور جناب فصیح الدین صدر بزم طلباء نے بھی مخاطب کیا۔

۱۶ اپریل: ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے جشن اردو کا افتتاح کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو کی جانب سے چلائے جانے

والے اردو ٹیچرس کورس کو حکومت کی جانب سے تسلیم کر لینے کا اعلان کیا اور کہا کہ حکومت ریاست میں اردو کو اس کا مستحقہ مقام عطا کرنے کی خواہاں ہے اس کے علاوہ حکومت نے اردو ذریعہ تعلیم سے انٹرمیڈیٹ کرنے والوں کو جنہوں نے ۵۰٪ سے زائد نشانات حاصل کئے ہوں سرکاری وظائف دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مسٹر بی وینکٹ رام ریڈی وزیر تعلیم نے بھی اردو مسائل سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ جناب جلیل پاشاہ کنوینر اردو فیسٹول نے خیر مقدمی تقریر کی۔ مسٹر یوسف اعظمی نے جشن کی کارروائی انجام دی۔

● ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی سٹی یونٹ کی طرف سے ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، جناب شاذ تمکنت اور جناب سعد حسن نے کلام پیش کیا۔ جناب اکرام جاوید نے کہانی اور جناب برہان حسین نے تکامیہ سنایا۔ مرزا مصطفے علی بیگ نے انگلو اردو طنز و مزاح سے پر غزلیں سنائیں۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ادبی محفلوں کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا اور اکیڈیمی کو جنوبی ہند کی جامعات کی طرف سے ممکنہ تعاون کا یقین دلایا۔

● اردو ریسرچ سنٹر کے نام کو مسئلہ بنا کر شروع کردہ احتجاجی بھوک ہڑتال ملتوی کردی گئی۔ مولانا حافظ ابویوسف (اردو اکیڈیمی) مسٹر سرینواس لاہوٹی (انجمن ترقی اردو) اور مسٹر کے ایم خان (ترقی اردو بورڈ) نے متحدہ مجلس عمل محبانِ اردو سے بات چیت کر کے مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالنے کا تیقن دیا۔

۱۸ راپریل: اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام "یوم اقبال" تقاریب کا افتتاحی اجلاس مدینہ بلڈنگ میں بصدارت جناب یم باگا ریڈی ہمدر اردو اکیڈیمی منعقد ہوا اس موقعہ پر سہ ماہی اقبال ریویو کے خاص نمبر اقبالیات باقی کی رسم اجرا انجام پائی۔ جناب باگا ریڈی اور دیگر مقررین نے علامہ اقبال کے فلسفہ اور فکر و فن کو خراج عقیدت ادا کیا۔ نمائش مطبوعات اقبالیات کو اقبال شناسوں نے توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ جناب کریم رضا اور جناب ظہیر الدین احمد نے تقاریب کا شایانِ شان انتظامات کئے۔

۱۹ راپریل: یوم اقبال کے سلسلے میں ادبی سمینار ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا، ڈاکٹر مغنی تبسم نے اقبال کی غزل گوئی پر سیر حاصل اور فکر انگیز مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ریڈر یس وی یونیورسٹی تروپتی نے اقبالیات پر عالمانہ مقالہ سنایا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال نے اقبال کی طنز و مزاح کی شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ مباحث میں ڈاکٹر جین، ڈاکٹر یوسف سرمست، جناب اختر حسن، جناب سراج الدین اور ڈاکٹر یوسف کمال نے حصہ لیا۔

۲۰ راپریل: یوم اقبال کے ایک اور ادبی اجلاس کو ڈاکٹر عبدالحق ریڈر دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر مجاور حسین ریڈر حیدرآباد یونیورسٹی، ڈاکٹر یوسف سرمست، جناب مصلح الدین سعدی اور جناب محمود علی خاں اثر نے مخاطب کیا۔ اور مقالے پیش کئے۔ پروفیسر سید سراج الدین پرنسپل حیدرآباد ایوننگ کالج نے صدارت کی۔ اس شب کلام اقبال پر شعر و نغمہ کی محفل منعقد ہوئی۔ جناب عارف رؤف نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔

● ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے پہلی خاتون پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کی مسرت میں ایک خوشگوار تہنیتی تقریب ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو کی صدارت میں پوسٹ گراجویٹ کالج میں منعقد ہوئی۔ پرنسپل سراج الدین، اساتذہ اور طلباء نے ڈاکٹر رفیعہ کی تدریسی اور علمی و ادبی خدمات کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔

● جامعہ عثمانیہ نے جواں عمر اسکالر اور ادیب جناب محمد علی اثر کی شعری تخلیقات کا خوبصورت انتخاب "ملاقات" کے نام سے نظامس روڈ ٹرسٹ کی اعانت سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحبان نے اثر کی شعری صلاحیتوں پر پیش لفظ اور تعارف تحریر کیا ہے۔

۲۱ راپریل: جناب ابویوسف (ایم ایل سی) صدر مجلس عاملہ اردو اکیڈیمی نے ریاستی سرکاری زبان کمیشن کے صدر مسٹر وندے ماترم راجندر راؤ کے اس بیان کو کہ آندھرا پردیش

نیا تلگو کے سوا کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان قرار نہیں دیا جاسکتا ایک احتجاجی بیان میں غیر حقیقت پسندانہ قرار دیا اور کہا کہ حکومت نے اردو کو جو تحفظات دئے ہیں اس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔

● پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور ڈاکٹر عبدالحق نے جناب اکبرالدین صدیقی کے ہمراہ ایوان اردو کے کتب خانہ کا معائنہ کیا اور اردو کے ذخیرۂ ادب کو گراں قدر سرمایہ قرار دیا۔

● پروفیسر حبیب الرحمٰن صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے مسٹر ونکٹ سے ماترم کے بیان پر سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ قانون کے تحت اقلیتوں کی زبان کو سرکاری اغراض میں استعمال کرنے کا حق موجود ہے۔ ایسے حالات میں صدر سرکاری زبان کمیشن کا بیان معنیٰ خیز قرار پاتا ہے

۲۳ اپریل: ریاست میں سرکاری سطح پر اردو زبان کے حقوق کے تحفظ اور قانونی موقف پر عمل آوری کے لیے ایک علیحدہ منسٹری کے قیام اور دیگر مطالبات کی تکمیل کے لیے اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی طرف سے زنجیری بھوک ہڑتال شروع ہوئی جو رہی تک بھی جاری ہے۔

● مرکز خوشنویسی ادارہ ادبیات اردو زیر انتظام مرکزی ترقی بورڈ (حکومت ہند) کے نتائج شائع کئے گئے جس میں سال اول کے محمود، محمد غوث، حمیدہ تسکین، اصغر صدیقہ درجہ اول اور مزمل حسین، مسعود حسین، جمیل احمد، عظمیہ عثمان، عاصمہ اختر نظامی اور ارشاد فاطمہ درجہ دوم کامیاب قرار دے گئے۔ سال دوم میں رضی الدین اقبال، عقیلہ سلطانہ اور مشتاق احمد درجہ اول اور احمد حسین، پروین سلطانہ، سلیمہ آصف اور رشیدہ سلطانہ درجہ دوم میں کامیاب قرار پائے۔

۲۵ اپریل: اردو ریسرچ اسوسی ایشن جامعہ عثمانیہ کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر گیان چند جین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے کلاسیکی دکنی شاعری پر مقالہ سنایا اور جناب سعید شہیدی نے اپنا کلام پیش کیا۔

● ریاستی اردو اکیڈیمی کی طرف سے آندھرا پردیش کے ۴۳ کتب خانوں اور مطالعہ گھروں کو ۲۰ ہزار کی گرانٹ دی گئی جس میں ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانوں کو ۵۰۰ روپے کی کتابیں حاصل ہوئیں۔

۲۶ اپریل: ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں فرش پر کتابوں کو رکھا دیکھ کر اور کتب خانہ کی اہمیت اور ذخیرہ کی افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اردو دوست نے اسٹیل ریکس خریدنے کے لیے ایک ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ جناب اکبرالدین صدیقی معتمد ادارہ نے اس عطیہ سے ریکس خرید کر ادارہ کے حوالے کئے۔

● اترپردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۷۹ء کی اردو مطبوعات کو ادبی مقامات دینے کا اعلان کیا حیدرآباد کے مسز اقبال متین جیلانی بانو، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، راشد آذر، اسلم عمادی ڈاکٹر اکبر علی بیگ کی نئی مطبوعات کو انعام کا مستحق قرار دیا۔

۲۷ اپریل: حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس نظام اردو ٹرسٹ لائبریری میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے ڈاکٹر احمد سجاد کی کتاب "تنقید و تحریک" پر عالمانہ اور متوازن ... پیش کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے جلسہ کی کارروائی انجام دی۔

● انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے مولانا حسرت موہانی کی یاد میں علمی محفل منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے صدارت کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، جناب اختر حسن اور فکری بدایونی نے مقالے سنائے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے جلسہ کی کارروائی انجام دی اور ناصر کرنولی نے شکریہ ادا کیا۔

۲۸ اپریل: ادبی ٹرسٹ کی طرف سے حیدرآباد کے تین بزرگ اردو ادیبوں کو جن میں جناب احسن علی مرزا (صحافی) کے علاوہ راے محبوب نارائن گوڑ اور جناب ہرمز کاؤس جی شامل ہیں، علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ایک ہزار روپیے نذر کئے گئے۔

MAY—1980

R. N. 10!
Regd. H/H

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P



National Fine Printing Press, Charkaman Hyderabad—500 002. A. P.

سب رس



سن اجرا: ۱۹۳۸ء

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۳ — جون ۱۹۸۰ء — شمارہ ۶

مدیر اعزازی: ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر: وقار خلیل

ادارۂ ادبیات اردو ۔ پنجہ گٹہ ۔ حیدر آباد ۵۰۰۰۴

قیمت: ایک روپیہ پچھتر پیسے
فی رسالہ

سالانہ

معمولی ڈاک سے: ۲۰/- روپے
رجسٹری سے: ۲۵/- روپے
بیرونی ملکوں سے: مشرق وسطی ۱۰ ڈالر، امریکہ ۱۵ ڈالر، پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر
کتب خانوں اور اداروں سے: ۲۵/- روپے

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۲۰

ترتیب

باتیں وقار خلیل ۲

کچھ ژاں پال سارتر کے بارے میں خالد قادری ۳

دو غزلیں احسن رضوی
کمار پاشی ۶

اسکول آف اورنٹیل اینڈ امریکن اسٹیڈیز عبدالقادر حبیب ۷

غزلیں اسلم عمادی ۱۰
سحر سعیدی

ناہید بنام قمر (جہاں بانو نقوی کے خطوط) شاکرہ بیگم ۱۱

حیدرآباد کے شاعر
صدیقہ شبنم (حالات اور کلام) داغ ۲۲

مجھے چہرا دکھا میرا (کہانی) مسعود اشعر ۲۳

دوست کے نام (نظم) محمد مجید اللہ صدیقی ۳۲

(نقد و نظر)
نئی کتابوں پر تبصرہ وقار خلیل، لیئق صلاح ۳۳
یس جے صادق، مغنی تبسم

اردو نامہ
ادبی سرگرمیاں وقار خلیل ۳۶

وقار خلیل

باتیں

آندھرا پردیش میں اردو کے تعلیمی مسائل کی یکسو
سلسلے میں اردو کے اداروں کی طرف سے ارباب حکومت
مقتدر اصحاب کی ملاقاتیں اس امر کی شاہد کہ ریاست
اردو کے تعلیمی مسائل کا خوشگوار حل تلاش کیا جائے
انجمن ترقی اردو، طلباء اور نوجوانوں کی ایکشن کمیٹی
اراکین اپنے مطالبات کو تسلیم کرانے میں حق بجانب ہیں
وزیر تعلیم اور صدر اردو اکیڈیمی جناب یم باگا ریڈی جو وز
راج بھی ہیں، اردو دوست چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈ
مشاورت کے بعد یقین ہے ریاست میں اردو کا سرکار
قانونی موقف واضح ہو جائے گا، سرکاری دفعہ (۷
تبدیلی کی طرف توجہ بیحد ضروری ہے امید ہے ہماری ح
ملک کی سب سے بڑی لسانی اقلیت کو پوری طرح مطمئن

اس صدی کے روشن دماغ دانشور ادیب ژاں
سارتر کی رحلت دنیائے علم و ادب کے لیے بہت بڑا اص
سارتر بلاشبہ اُن دانشوروں میں سے تھے جن
اُن کا ملک، بر اعظم بلکہ خود دنیائے فکر و فن بھی فخر کر سکتی
وہ ہر نو آزاد ملک کی آزادی کے لیے کوشاں رہے۔
مقبول فلسفۂ وجودیت اُفقِ دانش پر روشن لکیر کے ما

حیدرآباد ایک بزرگ حیدرآبادی ادیب سے مح
رائے محبوب نارائن گوڑ، حیدرآبادی تہذیب، شرافت اور قومی ایکتا
تصویر تھے، عہدِ آصفی کی تاریخ کا مثبت اور صحتمند شعور رکھنے
میں رائے صاحب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی بے وقت رحلت
تہذیبی اور علمی حلقوں کے لئے ناقابل تلافی سانحہ ہے جسے حق ہو

خالد قادری

کچھ ژاں پال سارتر کے بارے میں

مشہور فرانسیسی مفکر اور ادیب ژاں پال سارتر کی موت صرف فرانس کے ادبی اور ثقافتی حلقوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے ادیبوں، دانشوروں اور باشعور انسانوں کے لیے ایک عظیم سانحے کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرانس جس کو ہمیشہ سے اپنی زبان، آرٹ اور کلچر پر فخر رہا ہے آج اچانک بڑے ناموں سے محروم ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی رولاں بارتھ کا ایک حادثہ میں انتقال ہو چکا ہے۔ رولاں بارتھ کی دنیا سارتر کے بعد کی تھی اور وہ ان کے وجودیت کے نظریہ کو رد کرکے — CREATIVISM کے حریف نظریے کو فروغ دینے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اگر آج بھی انسانی افکار کی اہمیت باقی ہے اور انہیں زندگی کی دوسری چیزوں پر فوقیت حاصل ہے تو ان دو عظیم دانشوروں کی موت ساری دنیا کے لیے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی دشوار ہوگی۔

ژاں پال سارتر ۲۱ جون ۱۹۰۵ کو پیرس میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے ایک سال کے اندر ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور پھر وہ ۱۹۱۵ تک اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانا کے گھر پر رہے جو ایک جرمن ٹیچر تھے۔ اسی دوران پیرس میں دو اور اہم ہستیاں عالم وجود میں آئیں۔ یہ تھیں سیمون دی بووار (۱۹۰۸) جو بعد کی زندگی میں سارتر کی ہم خیال اور رفیق رہیں اور البیر کامو (۱۹۱۳) جن سے سارتر کے اختلافات رہے۔

لڑکپن سے نوجوانی کے بیچ کا عرصہ سارتر کے لیے ہمیشہ تلخ اور ناخوشگوار دنوں کی یاد تازہ کر دینے والا رہا۔ یہ وہ دن تھے جب ان کی ماں نے نیوی کے ایک افسر سے دوسری شادی کر لی تھی اور وہ روشیلے نام کے ایک مقام پر اپنی ماں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان دنوں انھیں شدید جذباتی دھچکے لگے تھے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور ٹھکرایا ہوا محسوس کرتے رہے تھے۔

اس کے کچھ سال بعد ہی ان کی طالب علمی کا باقاعدہ دور شروع ہوا اور انھوں نے نفسیات اور فلسفے کا مطالعہ شروع کیا۔ یہی وہ دن تھے جب ان کی ملاقات سیمون دی بووار سے ہوئی اور دونوں کے بیچ ایک ایسا بے مثال ذہنی رشتہ استوار ہوا جو تا عمر قائم رہا۔ اس کے کچھ دنوں بعد انھوں نے فوج کی ملازمت اختیار کی جس کی مدت جب ۱۹۳۱ میں ختم ہوئی تو انھوں نے دوبارہ فلسفے کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ ۱۹۳۳ میں سارتر برلن گئے جہاں ان کی علمی دلچسپی

کا مرکز فلسفہ کی ایک مخصوص شاخ مظہریات PHENOMENOLOGY رہا جو آگے چل کر ان کے بیشتر فلسفیانہ اور ا
کی تخلیق کی بنیاد بنا۔

دوسری جنگ عظیم چھڑنے سے قبل وہ برلن سے اپنی تعلیم مکمل کر کے پیرس واپس آگئے اور پھر ۱۹۴۴ تک درس و
میں لگے رہے۔ اسی دوران ۱۹۳۸ میں انھوں نے NAUSEA شائع کی۔ ۱۹۳۹ میں INTIMACY منظر عام پر
میں سارتر حقیقی جنگ میں نہ شامل رہتے ہوئے بھی جنگی قیدی بنائے گئے۔

۱۹۴۱ میں جب وہ رہا ہوئے تو انھوں نے کاربو پونتی کے ساتھ ایک مخالف جنگ تحریک شروع کی جس م
فرانس کے دانشور طبقے کے لوگ شامل تھے اور پھر جنگ کے اختتام تک وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مختلف مخالف
میں شامل رہے۔

دوران جنگ ہی انھوں نے BEING AND NOTHINGNESS شائع کی جو بحیثیت فلسفی ان کے ز
ایک انتہائی اہم منزل کہی جاسکتی ہے۔ انہی دنوں IN CAMERA بھی اسٹیج ہوا اور ROADS TO FREEDOM
جنگ کے اختتام پر سارتر نے COBET اور LE FIGAARO کے خصوصی نامہ نگار کی حیثیت سے امریکہ کا سفر کیا
اور بھی اہم تھا کہ وہ شہرت جو انھیں یورپ میں رہ کر نہ مل سکی تھی وہ انھیں امریکہ میں ملی اور وہیں سے ان فلسفی
ادبی نظریات کی تشریح ساری دنیا میں ہوئی۔

۱۹۴۷ میں انھوں نے BOUDLAIR شائع کی اور اپنے مشہور رسالے ماڈرن ایج میں ادب
کے کچھ ابتدائی حصے پیش کئے۔

انھیں دنوں انھوں نے صیہونی تحریک کی حمایت میں یورپین یہودیوں کے لیے اسرائیل میں ہوم لینڈ کا
۱۹۵۲ میں سینٹ جینے کی اشاعت ہوئی کامو سے ان کے اختلافات بھی ان ہی دنوں منظر عام پر آئے۔
۱۹۶۰ء 'CRITIQUE OF DIALECTICAL REASON' کی اشاعت کا سال تھا
کے ساتھ کامو کی موت کا

اگلے دو سال سارتر کے لیے کافی سرگرم ثابت ہوئے کیوں کہ انہی سالوں میں انھوں نے اپنی آپ بیتی
شائع کی اور پھر نوبل پرائز لینے سے انکار کیا۔ اس طرح انھوں نے اس قسم کے اعزازات سے انکار کرنے کا
ہی نہیں دکھائی بلکہ ان ادیبوں کے حق میں آواز بھی اٹھائی جو انقلابی نظریات رکھنے کی وجہ سے ایسے اعزاز
محروم رکھے گئے تھے۔

اس کے بیچ ایک لمبا وقفہ ہے جس میں ان کی ماں کا انتقال ہوا اور پھر وہ کافی عرصے تک فلابے کا
مکمل کرنے کی ناکام کوشش میں لگے رہے۔

۱۹۷۱ تک آتے آتے بحیثیت ایک مفکر اور ادیب سارتر کا Career تکمیل کی سرحد تک گیا اور شہ
بلندیوں تک پہنچنے کے بعد اس میں کمی واقع ہوئی جب انھوں نے فلابے پر اپنی کتاب IDIOT OF THE FAMILY

ئع کیا۔ بعد کے آنے والے سالوں میں وہ اپنی بینائی رفتہ رفتہ کھوتے گئے اور پھر کچھ مدت کی مسلسل خرابی
اس سال پیرس کے ایک ہسپتال میں ان کی موت واقع ہوئی۔ سارتر اپنی زندگی میں ہی ایک روایت
بن چکے تھے ان کی باتوں اور ان کی تخلیقات نے ہمیشہ دوسروں کو سوچنے پر مجبور کیا اور بحث طلب
اہم کیے۔ شاید اسی لیے ان کے نظریوں کی سچائی یا قطعیت دوسرے فلسفیوں کے نزدیک کسی قدر مشتبہ
کے طور HELL IS OTHER PEOPLE ان کا ایک مشہور مقولہ ہے جو سوچنے اور بحث کرنے کے لیے کافی مواد
ہے۔ اس سلسلے میں بولتے ہوئے ایک بار سارتر نے کہا تھا کہ ۱۹۲ کے آس پاس پیدا ہونے والے بیشتر الجیریائی
کا یہ مقدر تھا کہ وہ تشدد اور موت کا شکار ہوں۔ یہ ان کا مقدر تھا جس پر ان کا کوئی بس نہ تھا لیکن انسان
زور آزمائی کر کے ... کو بدل بھی سکتا ہے جیسا کہ الجیریا میں بعد میں ہوا۔
کے علاوہ بہت سے مباحثوں اور تقریروں میں انھوں نے سیاست، موسیقی، آرٹ اور عورتوں کے
پر جن غیر معمولی طور پر جرأت مندانہ اور ذہانت سے بھرپور خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس صدی کا بیش قیمت
ہیں۔ کسی ادیب کی صلاحیتوں پر بولتے ہوئے انھوں نے کسی جگہ کہا تھا کہ آج کے ستائے نوجوان اپنی تحریر
ائل کی نشو و نما پر توجہ نہیں دیتے کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ ایک شخص جو کہنا چاہتا ہے اسے سیدھے سادے
کہہ دینا ہی کافی ہے۔ مگر میرے نزدیک اسٹائل اور اس کی سادگی کوئی باہر کی چیز نہیں۔ وہ تین چار باتوں
بات میں سمو لینے کا ایک ڈھنگ ہے۔ آپ کے سامنے ایک سادہ سا جملہ ہے جس کے ایک فوری یا موقتی مفہوم
معنی بھی پنہاں ہیں۔ پس اگر کوئی شخص الفاظ یا جملے کو معنی کی یہ کثرت عطا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو اس کے
ھانے کی دقت اٹھانا فضول ہوگا۔ گذشتہ چند سالوں میں سارتر کی ادبی حیثیت کچھ متاثر ہوئی تھی جب کہ
کی کتاب کے پہلے حصے پر یورپین نقادوں نے سخت تنقید کی تھی۔ اس کتاب سے وہ ایک عجیب قسم کا جی تعلق
تھے اور اُسے پورا نہ کر سکنے کی مسلسل اور شدید کوفت میں مبتلا رہتے تھے۔ ایک بات چیت کے دوران انھوں
نے پچھلے کچھ سالوں سے فلابیر پر اپنی کتاب کے آخری حصے کا لکھنا ملتوی کر رکھا تھا۔ اس کتاب پر
سال کام کیا ہے۔ اس بیچ میں دوسری چیزیں لکھتا تھا لیکن پھر ہر جگہ سے فلابیر کے کام پر واپس لوٹ آتا تھا۔
سا لگتا ہے کہ میں اُسے پورا نہ کر سکوں گا۔ لیکن میں اس بات پر بہت رنجیدہ نہیں کیوں کہ مجھے لگتا ہے کہ
وں میں میں نے اپنی بات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ مگر کیا کروں کہ یہ ادھورا فلابیر پھر بھی میرے ذہن پر
قسم کی ندامت اور پچھتاوا ہے میرے لیے۔ اب مجھے اسے حالات پر چھوڑنا پڑا ہے۔ میں اُسے پورا کرنا

کی اداکار چارلی چیپلین جب شہرت کی بلندیوں پر تھا تو اسے پیرس کے سفر کے دوران ایک لطیفہ بہت
تھا کہ اس نے پیرس میں ڈیگال سے ملنے یا الفل ٹاور خریدنے میں دلچسپی لینے کے بجائے
اپنی ہی طرح کے دو لپتہ قد انسانوں پکاسو اور سارتر سے ملنا زیادہ پسند کیا تھا۔ جہاں اس

(باقی صفحہ ۲ پر دیکھیے)

دو غزلیں

سن رضوی

○

خون آلودہ ہوئے پاؤں کے تلوے کتنے
ایسے موسم میں اُگے راہ میں کانٹے کتنے

میں کڑی دھوپ کا راہی تھا ٹھہرتا کیسے
گو کہ رستے میں ملے زلف کے سائے کتنے

کبھی نیندوں سے جگایا گیا مجھ کو اکثر
میری آنکھوں میں رہے خواب ادھورے کتنے

رات ماضی کے جھروکوں سے ہوا آتی تھی
دل کی دیوار پہ لرزاں رہے سائے کتنے

ب تو غیروں سے مراسم ہی مجھے راس آئیں
کام آتے ہیں مرے خون کے رشتے کتنے

آج اک عمر گذر جانے پہ یہ سوچتا ہوں
میں نے پورے کیے جیون کے تقاضے کتنے

دیکھنا تھا جو ۔ نہ میں دیکھ سکا آج تلک
گو کہ نظروں سے اٹھائے گئے پردے کتنے

یاد کیوں ارضِ دکن کی ہی کرے نم دیدہ
شعر احسنؔ نے تو جیون میں ہیں دیکھے کتنے

حیدرآباد

کمار پاشی

○

نشۂ غم کا اتر جانے لگا تھا
کہ دل کا زخم بھر جانے لگا تھا

بہت روکا مری آوارگی نے
میں جب کل شام گھر جانے لگا تھا

لٹا ہے قافلہ جس موڑ پر اب
وہاں میں بھی ٹھہر جانے لگا تھا

مرا ہی عکس تھا وہ آئینے میں
میں جس کو دیکھ ڈر جانے لگا تھا

حریفوں نے تجھے یکجا کیا ہے
وگرنہ میں بکھر جانے لگا تھا

جہاں پاشیؔ مرادیں بٹ رہی تھیں
میں اس در سے گزر جانے لگا تھا

عبدالقادر حبیب

اسکول آف اورینٹل اینڈ امریکن اسٹڈیز

لندن یونیورسٹی کے اس کالج کی بنیاد ۱۹۱۶ء میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت یہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے نام سے موسوم تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اسے آفریقن اسٹڈیز کا سنٹر بھی بنا دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء میں اس ادارے کو ایک مرکزی حیثیت ہوگئی۔ ادارہ کی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں ہے ٹر رپورٹ کے مطابق سوشل سائنس کے مضامین پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ اس وقت اس ادارہ کی لائبریری میں ۵ لاکھ کتابیں ہیں۔ افریقن اور ایشین اسٹڈیز کے لیے یہ دنیا میں سب سے بڑا ادارہ ہے جہاں کا صرف تدریسی اسٹاف ہی دو سو سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے۔ دنیا کی کسی اور یونیورسٹی میں ایشیائی اور آفریقی زبانوں کی تعلیم کے لیے اتنی سہولتیں مہیا نہیں ہیں جتنی اس ادارے میں پائی جاتی ہیں۔ اس ادارے کی بین الاقوامی شہرت اور نیک نامی دنیا کے ستر سے زیادہ ملکوں کے طالب علموں کو یہاں کھینچ لاتی ہے

۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء کے تعلیمی سال میں آٹھ سو طالب علموں نے فل ٹائم کورس کے لیے اپنے آپ کو رجسٹر کیا۔ تین سو طالب علموں نے پوسٹ گریجویشن کے لیے درخواستیں دیں۔ جزوقتی طالب علموں کو ملا کر تقریباً بارہ سو طلبہ اس وقت اس ادارے سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اس ادارے کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مغربی سوسائٹی اور معاشرے کو مشرقی اور افریقی زبانوں اور ان ملکوں کی لسانی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار سے روشناس کرایا جائے اور ساتھ ساتھ انھیں ترقی دینے کی کوشش کی جائے۔ ۱۹۴۱ء سے یہ اسکول لندن یونیورسٹی کی مرکزی عمارت میں واقع ہے۔ ۳۰ کے گرما میں اس اسکول کی عمارت میں شاندار توسیع کی گئی۔ اسکول کے سارے شعبے اور ان کی سرگرمیاں ایک ہی عمارت میں وقوع پذیر ہیں ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء میں کامن روم کے علاوہ مزید سہولتیں فراہم کی گئیں۔ یہ اسکول لندن کے مرکزی مقام پر واقع ہے۔ برٹش میوزیم اس کے بالکل ہی قریب ہے۔ مشہور سینما، تھیٹر، کتابوں کی بڑی دوکانیں، ٹیوب اسٹیشن اس اسکول کے آس پاس ہیں۔ کنکریٹ اور گلاس کی یہ خوبصورت عمارت بڑی جاذب ہے باہر سے عمارت پر قدامت ٹپکتی ہے اور اندر چلے جائیں تو آپ اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں پائیں گے۔ یہاں دنیا کی دو تہائی آبادی کی علمی پیاس بجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایشیا اور آفریقہ کی بہت سی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ گریجویٹ

کی سطح تک تعلیم ہوتی ہے۔ ایم اے کرنے اور پی ایچ ڈی کے مواقع بھی مہیا کئے گئے ہیں۔ مختلف زبانوں کا کورس چار سال پر مشتمل ہوتا ہے۔ زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ طالب علم پہلے ہی سے وہ زبان جانتا ہو۔ بالکل ابتداء سے تعلیم دی جاتی ہے۔ طلبہ کے معیار کو اونچا کرنے کی بڑی کوشش کی جاتی ہے اور مختلف قسم کی جدید سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ تعلیم کے ختم پر توقع یہ کی جاتی ہے کہ طالب علم نے جس زبان میں گریجویشن کیا ہو وہ اس زبان کو بولنے پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو جائے اور اپنا مافی الضمیر اس زبان میں ادا کر سکے۔ مذہبیات، قانون، لسانیات، تاریخ جغرافیہ اور متعلقہ تہذیب و ثقافت اور سوشیل سائنس کے مختلف شعبوں میں طالب علم داخلہ لے سکتے ہیں۔ اس اسکول کے گیارہ شعبے ہیں۔ ہر شعبے کے اپنے مضامین ہوتے ہیں۔ چند اہم شعبوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ آفریقی تہذیب و ثقافت اور آفریقی زبانوں کا شعبہ
۲۔ مشرق وسطیٰ کے کلچر اور وہاں کی زبانوں کا شعبہ
۳۔ جنوبی ایشیا کی جدید زبانیں اور ادب کا شعبہ
۴۔ جنوب مشرقی ایشیا کا کلچر اور وہاں کی زبانوں کا شعبہ
۵۔ مشرق بعید کا کلچر اور وہاں کی زبانوں کا محکمہ
۶۔ تاریخ کا شعبہ
۷۔ قانون کا محکمہ
۸۔ انتھراپولوجی اور سماجیات کا محکمہ
۹۔ معاشیات اور پولیٹیکل اسٹڈیز کا شعبہ
۱۰۔ اصوات اور لسانیات کا محکمہ
۱۱۔ جغرافیہ کا شعبہ

حسب ذیل مضامین میں ڈگری کورس کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔

۱۔ عربی
۲۔ سماجی انتھراپولوجی
۳۔ اراضیات یا آثار قدیمہ
۴۔ بانٹو زبانیں
۵۔ بربر
۶۔ معاشیات
۷۔ جغرافیہ
۸۔ ہاؤسا
۹۔ [illegible]
۱۰۔ [illegible]
۱۱۔ موسیقی
۱۲۔ سیاسیات
۱۳۔ مذہبیات
۱۴۔ جنوب مشرقی کلچر اور وہاں کی زبانیں
۱۵۔ برمی اسٹڈیز
۱۶۔ انڈونیشین اور ملایا اسٹڈیز
۱۷۔ تھائی اسٹڈیز
۱۸۔ ویٹ نامی اسٹڈیز

ممالک سے آکر یہاں تعلیم پانے کے لیے سالانہ تقریباً ڈھائی ہزار پونڈ کا خرچ ہوتا ہے یہ اندازہ ۱۹۸۰ اور ۱۹۸۱ء کے لیے کیا گیا ہے۔

جن مشرقی زبانوں کی یہاں پر تعلیم ہوتی ہے ان میں سنسکرت، پالی، پراکرت، تبت کی زبان، بنگالی، گجراتی، ہندی، نیپالی، اڑیہ، پنجابی، سنہالی، تامل، اردو شامل ہیں جاپانی کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش کی تاریخ بھی یہاں پڑھائی جاتی ہے۔ چین، جاپان کی تاریخ بھی یہاں کے مضامین میں شامل ہے۔ اسلامی قانون ن سنہ، افریقی قانون، ہندو قانون، عوامی قانون، قانون ملکیت، مشرقی ایشیا کا قانون، اسلام کا قانون وراثت رہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ افریقی موسیقی اور مشرق وسطیٰ کی موسیقی پر بھی گریجویشن یہاں سے کیا جا سکتا ہے۔

یہاں کے اردو ڈپارٹمنٹ میں رالف رسل ہیں، ڈیوڈ میتھوز ہیں خالد حسن قادری اور رسی شیا کل ہیں۔ ڈاکٹر زور بیگم شائستہ اکرام اللہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری یہیں سے حاصل کی تھی۔ انجمن ترقی اردو کے اجلاس یہیں ہوا کرتے تھے رالف رسل اس کے صدر تھے۔ ماہانہ اجلاس میں کئی دفعہ میری شرکت ہوتی رہی۔ اس اسکول میں جانے سے جو خوشی ہوئی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

(سلسلہ تبصرے صفحہ ۲۱ سے آگے)

گنگوا گنگامائی (کنڑ ناول) مصنف: شنکر موکاشی پنیکر مترجم: عبدالحی صفحات ۲۳۰، قیمت چودہ روپے
ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا A-5 گرین پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ہندوستان کی مختلف زبانوں کی شاہکار تصانیف کے ترجموں کا جو مفید اور اہم سلسلہ شروع کیا ہے گنگوا گنگامائی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ مشہور کنڑ ادیب شنکر موکاشی پنیکر کا تحریر کردہ معاشرتی اور گھریلو ناول ہے۔ ناول کا فارم روایتی ہے لیکن مصنف نے اپنے مخصوص اسلوب کی چھاپ لگا کر اس کو ایک منفرد رنگ عطا کر دیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس نے ناول کی مقصدیت کو اس کی ادبیت اور فنی حیثیت پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ ناول کا قصہ اپنے اندر عام ڈگر سے ہٹ کر دلچسپی کا وافر سامان رکھتا ہے۔ نفسیاتی حقیقت نگاری کے ذریعے کرداروں کو نہ صرف زندگی بخش دی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے انھیں اپنے ارادے اور عمل پر بھی قدرت عطا کر دی ہے۔ یوں تو اس ناول کے سبھی کردار گنگوا، راگھیا، شکنتلا، دیسائی وغیرہ سبھی جیتے جاگتے کردار ہیں لیکن محبوب جان کی انسانیت اور جذبہ ایثار اور وینکٹ راؤ کی شخصیت کی غیر معمولی میں ہم خاص کشش محسوس کرتے ہیں۔ ناول کے آغاز میں مصنف نے جو علامتی اسلوب اپنایا تھا اسے اگر وہ آخر تک برقرار رکھتا تو ناول کی فنی عظمت میں اضافہ ہو جاتا۔ موجودہ صورت میں یہ ایک اوسط درجہ کا دلچسپ ناول بن کر رہ گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں بی دامودر راؤ کا پیش لفظ شامل ہے جس میں انھوں نے کنڑ میں ناول نگاری کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اس ناول کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ترجمے کی زبان بہت صاف اور رواں ہے اور ناموں کی علاقائیت سے قطع نظر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔

(مغنی تبسم)

غزلیں

اسلم عمادی

ہونٹوں کو تبسم کی ادا تک نہیں آتی!
یوں خشک ہوئے ہیں کہ دعا تک نہیں آتی
تشبیہیں، علامات بہاروں کی طرح چپ
اب ان میں کبھی بادِ صبا تک نہیں آتی
سوکھے ہوئے پتوں کی طرح پنکھ گرے ہیں
سائے کی طرح سر پہ قضا تک نہیں آتی
کھڑکی سے مجھے جھانکتے ہیں چاند ستارے
جن دید کئے ان میں ضیا تک نہیں آتی
سب تشنہ شجر جذب کے عالم میں کھڑے ہیں
کئی دن ہوئے اس سمت ہوا تک نہیں آتی
اچھا ہوا اس گاؤں سے ہم بھاگ ہی آئے
اب رات کو رونے کی نوا تک نہیں آتی
سب دستکیں مٹ سی گئیں اسلم یہ ہوا کیا؟
اب پچھلے پہر اپنی صدا تک نہیں آتی

سحر سعیدی

سوچ کی سرحد سے بھی آگے سفر کرنے لگے
یوں ہنرمندی کو رسوا بے ہنر کرنے لگے
کتنے بزدل لوگ تھے جو کر گئے نقلِ مکاں
بستیوں پر طنز کچھ ٹوٹے کھنڈر کرنے لگے
چھوڑ دو ان ننھی ننھی کونپلوں کو شاخ پر
التجا اندھی ہواؤں سے شجر کرنے لگے
بڑھ گیا جب رات کو گلیوں میں سناٹوں کا شور
احتجاجاً تخلیہ دیوار و در کرنے لگے
دوستی گہری ہوئی تو رنجشیں بھی بڑھ گئیں
اس لیے اب گفتگو ہم مختصر کرنے لگے
سرپھرے ان مانجھیوں کو کون سمجھائے سحر
چھوڑ کر دریا جو صحرا کا سفر کرنے لگے

مرتبہ: شاکرہ بیگم

ناہید بنام قمر

یہ خطوط مرحومہ جہاں بانو نقوی کے ہیں جو قمر النساء عباسی بیگم صاحبہ (اللہ انھیں تا دیر سلامت رکھے) کے نام ہیں۔

جہاں بانو نقوی کلیۂ اناث عثمانیہ یونیورسٹی کی طالبہ اور پھر وہیں شعبہ اردو کی صدر عرصہ دراز تک رہیں وہ ایک صاحب طرز ادیب تھیں جو اپنے تیکھے طرزِ نگارش کی وجہ بہت پسند کی جاتی تھیں۔ ان کے خطوط کا مجموعہ "برباطِ ناہید" کے نام سے شایع ہوا تھا۔ جن کے مکتوب الیہ نہ معلوم یا پھر تخیلی تھے۔ اب برباطِ ناہید کے ایسے راگ پیش ہیں جن کا مکتوب الیہ ان کا ہم عصر ہم سر کہا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط اپنے طرزِ نگارش، اس دور کی تاریخ اور لکھنے والی کی حالات کی اہمیت کے پیشِ نظر اس قابل ہیں کہ ان کو سب رس میں محفوظ کر دیا جائے جس سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ کیوں کہ وہ ایک عہد اور ایک دور کی نمایندہ تھیں جو ان کے ساتھ ختم ہوگیا۔

قمر النساء بیگم مکتوب الیہ عرصہ تک زنانہ کالج میں فلسفہ کی صدر شعبہ تھیں اس کے بعد نظام کالج سے منعلق رہیں۔

ان خطوط میں کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے اور کچھ طرزِ ادا ہے۔ برباطِ ناہید کے تیکھے راگ۔

یہ خطوط مکتوب الیہ محترمہ قمر النساء بیگم صاحبہ کی مہربانی سے حاصل ہوئے ہیں۔ بانو آپا اور قمر آپا ہمارے لیے ہمیشہ بے غرض محسن کا روپ دھارے ہوئے تھیں۔

(۱)

اچھی قمر خوش و آباد رہو   سلام خلوص

ہم تو برابر اپنی ڈیوٹی کالج میں انجام دے رہے ہیں۔ آپ کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں لیکن آپ کے درشن کہاں ہونے۔

ا چاہتے ہیں آپ سے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔
شہاب ترسل ہے۔ بھیجتے شرم آتی ہے۔ لیکن کیا کریں بے چارے اڈیٹر کی زندگی اس کے حصول چندے پر ہے۔
لوم کی رسید بھی ملفوف ہے۔ اب جولائی میں چندہ دینا پڑے گا میری خاطر تم کتنی امداد کرتی ہو قمر۔ خدا انہیں
اجر دے جزاک اللہ ——— اور وہ تمہارا لذیذ شہد، جس کے لیے غالب نے واعظ سے کہا تھا:

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مَے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

کی خاطر شعر الگس کو باغ میں جانے نہ دیتے تھے۔ یہ مزے لے کر کھاتے ہیں اور تمہاری جان و مال کو دعا دیتے
——— بہت سمع خراشی کی۔ بچیوں کو خوب پیار کرو۔ تمکنت کا کھلونا تو آ گیا ہوگا اور تمہارا آج کل؟ خدا حافظ۔

تمہاری
جہاں بانو

صاد تھو انڈیا
۱۹۵۶ء

(۲)

اچھی قمر خوش رہو
کشمیر کے ارادے تھے مگر آ گئے۔ یہاں جہاں کا آب و دانہ ہو وہاں کھینچ لاتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں آسمان سے گرا
میں اٹکا — تو بس یہی ہمارا حال ہوا۔ ہم یہاں ۲۴ راپریل کی شام کو پہنچے۔ ہوٹل میں مقیم ہیں۔ آپ کی یاد ستانے لگی تو
لکھ دیا ہے ——— آقائے ولی نعمت سے امید تو ہے کہ جواب ضرور ملے گا ——— گئے تھے جناب بمبئی؟ کب واپس ہوئے۔
آپ کے ہومیوپیتھک مسیحانے؟ دیکھا آپ کو؟ کیا علاج ہو رہا ہے؟ اپنی اور سب کی خیریت جلد لکھو
ہم جو ۲۲ راپریل کی رات حیدرآباد سے نکلے تو اس روز سے وہاں کی خبروں کا روزہ ہے بلکہ فاقہ ہے۔ تمکنت روزے
میں اور منی بیگم کا کیا مشغلہ ہے؟ یہ مقام بہت خوبصورت ہے۔ WALKS بہت اچھے ہیں۔ لیکن ہر جگہ بلندی و
پستی کی وجہ ہم دونوں کو پیدل چلنے پھرنے آئے۔ پرسوں ہم لوگ ٹیکسی میں اوٹی گئے تھے وہ اور زیادہ سرد مقام ہے۔
منٹ گھوم گھام کر دیکھ آئے پھر عن قریب جانے کا ارادہ ہے۔ بڑی حسین جگہ ہے۔ یہ میں کلب سے بیٹھی لکھ رہی
ہوں۔ یہ برج روم میں برج کھیل رہے ہیں۔ جب سے اخبارات دیکھتی رہی۔ یہاں کلب میں کافی میگزین آتے ہیں۔
وہاں موسم کیسا ہے؟ یہاں دو تین روز سے سردی خوب ہے۔ راستہ پر سپیاری، قہوہ، چاء اور یوکلپٹس کے
درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ملتے ہیں۔ منظر بڑا حسین ہے۔ خدا کی قدرت ہنر اور حسن کو واضح اور بے نقاب دیکھنا چاہو تو

یہاں آجاؤ۔

راستہ پر یوکلپٹس کی خوشبو بکھری رہتی ہے۔ سڑک معطر رہتی ہے۔ سپیاری کے درخت خوب اونچے اونچے، دبلے دبلے جھنڈ کے جھنڈ ملتے ہیں گھنا جنگل ہے۔ چائے یہاں کی بہت با ذائقہ ہوتی ہے۔ طبیعت چاہتی ہے پیتے ہی جاؤ۔ میں خود دن میں ۸۔۱۰ پیالی پی جاتی ہوں۔ سردی کو دبانے کے لیے مفید بھی ہے۔

کچھ طیور کی زبانی، کچھ نسیم وصبا کی سرگوشیوں نے وہاں یہ خبر سنائی تھی کہ بی رفیعہ سلطانہ کا رسم ہوچکا ہے اور اب رمضان میں شادی خانہ آبادی ہے۔ تمہیں بھی کچھ معلوم ہوا؟۔ اور اردو ہال کی کیا خبریں ہیں۔ سلامت منے ملے تھے؟

وہاں عنقریب اردو کانفرنس ہونے والی ہے۔ ہم بیاباں میں رہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔ ——— یہاں تو اردو بولنے اور سننے کو ترستی ہے زبان میری۔ سب تامل بولنے والے ملتے ہیں۔ انگریزی تو مانی یا واہے جاتی کہاں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو ہم دونوں کی طرف سے آداب وسلام بچوں کو دعا پیار۔ یہ تمھیں سلام کہتے ہیں۔

تمہاری
جہاں بانو

(۳)

اچھی قمر خوش رہو۔ سلام خلوص

آپ کا ۱۲ ار کا محبت نامہ ملا۔ آپ کے القاب کافی جدت کے حامل ہوتے ہیں۔ بڑے انوکھے۔ ایک بار نہیں کئی بار پڑھنے کو طبیعت چاہتی ہے میں تو مزے لے لے کر پڑھتی رہوں۔ اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ۔

محبتیں۔ وہ ملنا ملانا تو اب خواب وخیال سا ہے قمر! کافی دور ہوگیا ہے کالج۔ دیکھئے مرکے ہم کہاں چلے جائیں۔ کچھ بھی ہو یہ مقام سہانا اور پرفضا ہے۔ ہوادار بھی۔ اور ماحول اتنا پرشور نہیں جیسے اس کم بخت لائبریری میں۔ میری حرکت میں واقعی برکت ہوئی کہ آتے ہی ہم مدینہ سے ادھر منتقل ہوگئے۔ اگرچہ یہاں بھی مستقل سکونت کا کوئی تعین نہیں۔ تاہم دم لینے کو غنیمت ہے میرا دلی جانا اچانک ہوگیا قمر۔ ورنہ آپ کو تو ضرور مطلع کرتی۔ صرف ایک دن کی مہلت ملی۔ اور میں نے سوچا کہ چلو ۸ روز کی تو بات ہے کرنا ہی کیا ہے ——— پاؤں میں موچ آگیا۔ بیمار ہوکر آئی۔ بخار رہنے لگا مگر اب ٹھیک ہوں بجلی لینے سے فائدہ ہے۔ اور خدا کے فضل سے چل پھر سکنے کے قابل ہوں۔ وہاں سے بھی صرف محماں کے نام ایک کارڈ لکھ سکی۔ صبح سے شام تک گھومنے بھٹکنے میں گذری۔ ایک رات اور دن آگرہ کی نذر ہوئے خیر زندگی کی ایک آرزو بر آئی کہ تاج دیکھ لیا مگر ابھی جی نہیں بھرا اسے دیکھ کر

تمہارے لیے ایک چیز لائی تھی۔ کہاں رکھ دی۔ یاد نہیں۔ اب تک اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ دیکھوں۔ آنے کے دن سے اتنی مصروف ہوں کہ خط کا جواب بھی اتنے دن بعد دے رہی ہوں۔

تمہارے بھجوائے ہوئے ڈبے بہت کام کے ہیں۔ بڑے بھی اور وہ چھوٹے مُنّے بھی۔ اب تو کافی سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ بھلا اردو سے مجھے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ جو میں اردو ہال جاؤں یا شبلی ڈے میں شرکت کروں۔ اتنی قابلیت ہی نہیں کہ کچھ سمجھ سکوں اس لیے تم بھلے اور اپنا آرام بھلا۔ یعنی کہ ——— فقط۔ تمہاری۔ جہاں بانو

(۴)

لکڑی کاپل
۲۷ ستمبر ۱۹۸۰ء

وہ مخاطب بھی ہیں قریب بھی ہیں
ان کو دیکھیں کہ ان سے بات کریں

سنجی کے لال ـــــ بہت پیاری قمر ہمیشہ خوش رہو۔

تم آئیں گھر تک اور مجھ سے مل کر بھی نہیں گئیں۔ عجیب بات ہے نا؟ اتنے بہت سے کپڑے۔ جوتا، دودھ۔ ان غریبوں کے گھر آج عید ہوگئی۔ اللہ پاک تمہیں اس کا اجر دے۔ اور دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو آمین بار۔ ارے بھول گئی نواسوں پھلو آمین۔ ٹھیک بھی ہے۔ انسان کس کس کی مدد کرے۔ اپنے غیر سب ہی آج کل پریشان حال ہیں۔ غالب تو بہت پہلے کہہ گیا ہے اور اس کی زبان وقت کی زبان ہے ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے بڑی سخت ندامت محسوس ہوتی ہے قمر کہ بار بار تمہاری ہی طرف خیال جاتا ہے اور تمہیں ہی تکلیف دیتی ہوں تمہارے لیے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔ انسانوں کے روپ میں دیوتا شاید تمہاری جیسی ہستیاں ہی ہوتی ہیں ـــ اللہ پاک تمہیں سدا سکھی رکھے۔ جتنی دعائیں یاد ہیں اتنی دینے لگوں تو سارا خط بھر جائے گا۔ مجھے ابھی تمہارے خط کا جواب لکھنا ہے۔ تاج الدین صاحب کی علالت کا سن کر بڑا تردد ہے۔ خدا انہیں شفائے کامل عطا کرے۔ اگر خط لکھو تو لکھنا۔ ۷ مرتبہ الحمد کا سورہ پڑھ کر مریض پر دم کریں۔ دوا جب کسی مریض کو شفا نہیں دیتی تو دعاؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ صاحب عقل و ادراک شاید اس کا مضحکہ اڑائیں مگر اسی بناء پر اقبال کہتا ہے۔ جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول ـــ!

مصور رسالے بھی پہنچے۔ بے حد شکریہ۔ کس کس چیز کا شکرا دا کروں۔ زبانِ قلم عاجز ہے۔ میں تو برابر کالج جاتی رہی۔ اب تو چھٹیاں ہیں۔ خوا شد من صاحبہ علیل ہیں۔ صبح کبھی کبھی دس کے بعد ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اور ایک بجے تک واپس۔ شام کی کیفیت یہ ہے کہ ممتا گاڑی بھیج کر بلاتی ہیں یا نہیں۔ کاش تمہارے پاس فون ہوتا کہ ہم بات تو کرسکتے۔ اکثر صالحہ بیگم فون کرتی ہیں۔

نزلے کے لیے احتیاط یہی ہے کہ بس احتیاط نہ کرو۔ اپنے کو منہ ڈھنا لو تو کوئی بیماری پاس نہیں پھٹک سکتی۔

مسلم کالج سے کوئی مراسلہ یا جواب نہیں آیا۔ ہم بھی چپ ہیں۔ جو خدا کی مرضی۔ اللہ بس باقی ہوس۔ اور میں بھی جو پڑھ رہی ہوں یہ ایک ذہنی مشغلہ کی خاطر۔

کچھ تو اے خانہ خراب اس دل کے بہلانے کی طرح ـــ

ہمارا کالج وہیں رہے گا SHIFT ہونے کی کوئی صورت نہ بنی۔ اب ان لوگوں کو گردن میں ہاتھ دے کر

بڑھانے تک فرصت ہے اور بے غیرتی سے شاید وہیں ڈٹے رہیں گے۔ جو مکان دیکھا تھا اس پر قبضہ ہوگیا۔ خیر — جو خدا کی مرضی۔

تمہاری طبیعت کیسی رہتی ہے؟ آج کل چھٹیاں ہیں خوب سوؤ اور کھاؤ پیو — تاکہ یہ طاقت تمہیں جاڑوں کا مقابلہ کرنے کے قابل رکھے — ڈاکٹر صاحب کو ہم دونوں کی طرف سے سلام خلوص۔ بچیوں کو دعا پیار۔

ہماری زبان۔ دن بدن دلچسپ ہوتا جاتا ہے۔ اکثر مضامین معیاری ہوتے ہیں۔ سلامت تو پوچھ کر تمہیں دیکھتیں شاکرہ کا خط آیا تھا۔ اور اب کیا لکھوں۔

تمہاری گرویدہ

جہاں بانو

(۵)

لکڑی کا پل

۱۳ جنوری ۵۸ء

اچھی قمر خوش و آباد رہو۔ سلام خلوص

آپ کا ۳۰ کا خط ملا۔ بے حد شکریہ۔ معاف کرنا جواب "ایک سال بعد" دے رہی ہوں۔ یعنی ۵۷ کے خط کا جواب ۵۸ء میں —

نیا سال آپ سب کو مبارک کرے۔ آمین

آپ کی ہدایات کی مشکور ہوں قمر۔ مگر یہ حضرت بڑے مغروری مزاج کے ہیں۔ کھٹے (ترشی) کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ کھٹے کا پرہیز کرے تو شاید بار بار فلو نہ ہوتا۔

یوم محمد قلی قطب شاہ تو بڑے آن بان اور شان سے منایا جا رہا ہے۔ اس نوعیت کی ہر کوشش اردو ادب کے لیے ایک مبارک فال ہے۔ سدا رہے نام اردو کا۔ میں تو صرف گھر بیٹھے ہی لطف اٹھا رہی ہوں۔ شرکت کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ حادثات زمانہ نے بے حس کر دیا ہے۔ اور آپ مجھے حساس کہتی ہیں۔ خیر آپ تو فلسفی ٹھیریں۔ فلسفی کی نگاہ گہری ہوتی ہے۔ اس نوعیت کے میٹھے میٹھے القاب زندگی کی تلخیوں کو دور نہیں کر سکتے لیکن دوسروں کو خوش کرنے کے لیے مسکرانا پڑتا ہے۔ ہندوؤں کے دیوتا شنکر نے سمندر سے نکلے ہوئے زہر کو اس خیال سے پی لیا تھا کہ یہ کہیں دنیا میں پھیل کر آفات کا باعث نہ بن جائے۔ خیر تو جانے دو یہ سب قصے کہانی کی باتیں۔

تمکنت سلمہا کے پیارے اور خوبصورت تحفہ کا گذشتہ خط میں شکر بھی نہیں لکھی۔ کتنی پگلی ہوں میں بھی کہ اس پیاری بچی کے خلوص اور پیار کا اعتراف بھی نہ کیا۔ اس کو میری دعا کہنا۔ خدا نصیب اچھے کرے اور دونوں کو اللہ پاک درازیِ عمر سے مالا مال کرے۔ آمین

تاج الدین صاحب کی علالت کا سن کر بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ حیات ہے تو طویل علالت کے بعد بھی صحت جاوداں مل سکتی ہے۔ خدا ان سب پر رحم کرے جو ان سے وابستہ ہیں۔ خدا اور مذہب کے پرخلوص تصورات ہی قلب انسان کو ناقابل بیان حد تک سکون پہنچا سکتے ہیں۔ انسان بہرحال بندہ مجبور ہے بس صبر و شکر کو وہ اپنا شیوہ بنالے۔ انیسؔ کہتے ہیں:

راحت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر کب ؟
ایذا ابھی چار دن ہو تو شکوہ نہ چاہیے!!

طویل بیماری بھی گناہوں کا کفارہ ہے۔ اللہ پاک انہیں جلد صحت یاب کرے آمین۔

میری والدہ پرسوں گر گئیں۔ پاؤں میں موچ آگئی ہے۔ گھٹنہ میں بے حد درد ہے۔ ان کی طرف سے ایک پریشانی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہڈی نہیں ٹوٹی۔

جمعہ کے دن ذرا میں فری رہتی ہوں۔ ایک سے ا½ تک پھر ا½ کو ٹھیک ریڈی کالج جانا ہوتا ہے۔ مدینہ ہال تو آپ نے دیکھی ہی نہیں جگہ بڑی سہانی ہے اور جی لگ جاتا ہے۔

امید کے سب اچھے ہوں گے۔ سلامت کیسی ہے؟ جواب جلد دینا تم لم از کم نصف ملاقات ہی سہی۔ بچوں کو دعا۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام۔

جہاں بانو

(۶)

لکڑی کا پل۔ مکان نمبر ۱۱
۱۹ جنوری ۵۹ء

اچھی قمر خوش رہو۔ بھئی واہ بھول جانا اور بے نیازی کی شان کوئی آں جناب سے سیکھے۔ ایسی بھی کیا بے رخی تم ... کا جواب تک دینا نہ ہو سکا کیا بات ہے آخر۔ خدا کرے سب مع الخیر ہوں۔ ڈاکٹر شری دیوی تو یا زآید بکنعاں، ہوگئیں۔ سب حالات لکھو تمہارے۔

شاید اکتوبر میں تم نے خط لکھا تھا۔ جس کا جواب بھی دے چکی تمکنت کہاں اور کیسی ہیں۔ امتحان ان کا قریب آگیا خدا کامیاب کرے ڈاکٹر صاحب کو ہمارا سلام کہنا۔ یہ تم دونوں کو سلام کہتے ہیں۔

اس کا بھی دیکھیں جواب آتا ہے یا نہیں۔ اکثر تم اور سلامت یاد آتے ہو۔ سلامت کو بہت بہت پوچھنا میری طرف سے۔ خدا حافظ فقط

آپ کی
جہاں بانو
کالج سے —

مس نائیڈو کے انتقال کی خبر ایک بجلی بن کر گری مجھ پر ــــ آخر اس چلتی پھرتی لاش پر موت کو پیار آہی گیا۔ اس کی اکثر باتیں یاد آتی ہیں ــ بڑے خلوص سے ملتی تھی۔
سلامت یقیناً بہت متاثر ہوگی ــــــ ہونے کی ہی بات ہے ــــ
افسوس ــــ
زکام نزلہ سے ۳-۴ دن مسلسل پریشان رہی۔
اب پھر ٹھیک ہوں ــــ
ہمارے خسر صاحب ۹ر نومبر کو اللہ کے پیارے ہوئے۔ انا للہ ــــــــ
جہاں بانو

(۷)

لکڑی کا پل
۲۲ر ستمبر ۵۹ء

اچھی قمر۔ سلام خلوص و عقیدت
ایک زمانہ ہوا کہ آپ کے پاس سے کوئی خیر خبر نہ ملی۔ تمکنت کی تصویریں رکھی ہیں۔ شوز کو فرصت نہ تھی۔ ورنہ بھیج دیتی۔ طلبہ سے بھیجنے کا سوچ رہی تھی کہ کالج بند ہوگیا۔ بڑی ندامت ہے آپ سے۔ تمکنت کے پاس سے خط تو آتے ہونگے خدا کرے آپ سب بخیر و عافیت ہوں۔ زکام نزلہ سے میری طبیعت بڑی خراب رہی یہ کل شام کی ٹرین سے والیٹر گئے ہیں۔ اسکاوٹ کانفرنس کے سلسلہ میں ہمارا ڈرئیوران کے ساتھ گیا ہے۔ گاڑی گھر پر ہے۔ بڑی چارج کرنے دیدی گئی ہے۔ اس لیے آپ کے پاس آنے جانے کا سوال ہی نہیں رہا۔ کالج کی جوانی بیاضیں دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ اب شاید آج سرکاری امتحان کے پرچے بھی آجائیں گے۔ مرے پر سو دُرّے لگنے کے مصداق۔ آپ اور آپ کا ننھا ساتھی۔ دونوں کیسے ہیں؟ تمکنت کو لکھو تو میری دعا ضرور لکھو۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام عرض کرنا۔ زبیدہ کے کالج میں آپ نہیں آئیں۔ سلامت سے ملنا ہوا تھا ــــ اچھا سا فنکشن تھا۔ کچھ لوگوں نے نظر کے تیر چلائے۔ جو دل میں اتر کر ترازو ہوگئے۔ کچھ عجیب عجیب سی باتیں۔ اس لیے بھی میں کہیں آتی جاتی نہیں۔ بس سچ عاشقاں آپ بھلے اپنا لا رام بھلا ــــ اپنے گھر میں سکون ملتا ہے۔ آنے جانے سے سوا دکھ اور رنج کے کچھ حاصل نہ ہوا۔
دنیا کسی کو کسی حال میں بھی دیکھ نہیں سکتی۔ مذاق کرنے کا بھی مذاق چاہیے ــــ فضول سی باتیں بالکل لچر بچکانی قسم کا مذاق ــــ خیر ــــ
انا للہ ــــــــ خط کا جواب دیکھنا کب ملتا ہے۔ خدا حافظ۔ ناچیز۔ جہاں بانو

(۸)

لکڑی کا پل
۲ نومبر سنہ ۶۱ء

ع نہ پوچھ اپنے بیاں کی لطافتیں مت پوچھ!!

اچھی قمر خوش رہو اور اسی خوش فہمی میں مجھے مبتلا کر دو کہ میں بھی ایک صاحب طرز ادیبہ ہوں۔ خیر ہم اس قابل ہیں کہ ہمیں یوں بنایا جائے۔ میری [illegible] تحریر کی تم اس طرح تعریف مت کرو کہ مجھے شرم آتی ہے۔ تمہارا خط پڑھ کر دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا اور اگر ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں یہ ریلوں، بسوں، موٹروں اور پٹاخوں کی سمع خراش آوازیں نہ ہوتیں تو تمھیں میرے دکھتے ہوئے دل کی دھڑکنیں ضرور سنائی دیتیں۔ میری اتنی ہمت افزائی نہ کرو۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں مغرور نہ ہو جاؤں۔ تمہاری سلجھی ہوئی تحریر اور اتنے خوبصورت جملے تلے جملے اگر میرے قلم کی ملکیت بن جائیں تو میں آج آسمان پر قدم دھرنے لگوں۔ دوست احباب اور اعزا میں میرے خطوط بتا کر میری ہنسی نہ اڑاؤ۔ مجھے یوں ہی گم نامی میں جی لینے دو کچھ دن۔ مگر تم جانتی ہو تم بعض آدمیوں کو اپنی خامیوں سے اتنا پیار ہوتا ہے وہ اس کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتے اور میں بھی ان بعض لوگوں میں سے ہوں۔ وہی مثل ہوئی میری کہ جوتی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔

اور جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک بہت بڑے فلسفی نے ہمارے خطوط اشاعت کی غرض سے جمع کرنے شروع کر دیے تو بس اکبر الہ آبادی بے اختیار یاد آنے لگے:

مجھے بھی تم چھاپ دو کہیں پر — مرا بھی ہو جائے نام صاحب

خیر تو کیا کہنے کو تھی میں کہ تم خفا نہ ہو۔ تمہاری قدر دانی کی توہین نہیں کرنی مشکور ہونا ہی پڑے گا۔ خواہ یہ شکر گزاری مجھے کتنی ہی مہنگی پڑے۔ عزیزی تمکنت کی پریشانی اور ان کے بچے کی علالت کی کیفیت سے دل بڑا متاثر ہوا۔ اتنی سی جان نے کتنے دکھ جھیلے۔ اللہ عمر دراز کرے اور پھر کبھی بیمار نہ ہو۔ دور لڑکی دینے سے اسی لیے لوگ پناہ مانگتے ہیں کہ جب جی چاہے اور دل تڑپ اٹھے دیکھ سکتے ہیں اور نہ مل سکتے ہیں۔ ایک صبر آزما اذیت دونوں طرف قائم رہتی ہے۔

۸ نومبر ——— یہاں تک لکھی تھی کہ پھر کام لگ گئے۔ اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اب آپ کی بہن زہرا کیسی ہیں؟ واقعی صحت بڑی نعمت ہے اور آج کل پوری پوری طرح تو صحت مند کوئی بھی نہیں۔ بظاہر اچھے بھلے بھی ہیں کہیں درد رکھتے ہیں۔ اور کوئی تو درخت گرنے تک بھی ہرا بھرا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ اندر سے گھن ہی لگا رہے ———
تمہارے خط سے کالج کے کچھ اچھے ہوتے حالات معلوم ہوئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ واقعی شاعر نے ٹھیک ہی کہا تھا: چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔ کالج کی فضا تو اس وقت سے ہی کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ اپنے اپنے نہ لگتے تھے۔ خلوص دھیرے دھیرے ایسے لگتا تھا کہ وہاں سے کھسک رہا ہے۔ میں یہ غور کر رہی تھی۔ حالانکہ تعمیر کرنا تم جیسے مصنفوں کا کام ہے۔ اور یہ مصرعہ تم ہی لوگوں پر صادق آتا ہے:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

لیکن ہم جیسے کھوکھلے بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ لوگوں کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا جا رہا ہے اور جی جب سے ہی اچاٹ ہونے لگا تھا۔ میں بڑی ویسی طبیعت کی ہوں تم۔ میری طبیعت والوں کی زندگی بڑی دشوار ہوتی ہے۔ جانے یہ بے چارہ مجھ سے کیسے نباہ کر رہا ہے۔ مانتی ہوں اس کے صبر اور حوصلہ کو۔ ابھی پندرہ بیس روز گزرے ان پر ہرنیا کا حملہ ہوا۔ پھر اسپتال جانے کے خیال سے کانپ کانپ اٹھا۔ آخر کب تک یہ چھریاں چلتی رہیں گی۔ ان کو تو جیسے عادت سی ہو جائے۔ آپریشن کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر پھر ڈاکٹروں کے کہنے سننے پر ذرا دم لیا ہے۔ اس سے پہلے کے خط میں تم کو نہیں لکھی۔ کہ کیا بار بار بیماریوں کا قصہ چھیڑوں ؎

ایک جان اور سیکڑوں جھگڑے
زندگی بھی عذاب ہوتی ہے

میں تو صبح جب سو کر اٹھتی ہوں تو انگ انگ میں جوڑ جوڑ میں درد رہتا ہے جی چاہتا ہے کسی اونچے سے پہاڑ پر سے خود کو گرا دوں اٹھنے کو بالکل طبیعت نہیں چاہتی۔ مگر پھر اٹھنا ہی پڑتا ہے۔ مماں کی طبیعت بھی برابر نہیں رہتی۔ شام کے چھ سے نو تک انھیں کے پاس رہتی ہوں۔ بزرگوں کا دم اس پر آشوب زمانہ میں بڑا غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا لاکھ لاکھ شکریہ تم جو دواؤں کے لیے پوچھا۔ میں نے کبھی دواؤں کی عادت نہیں ڈالی۔ ویسے درد زیادہ ہوا تو کوڈو پائرن کھا لیا۔ اس سے ذرا آرام ہوا۔ اب ٹانک وانک کیا کروں گی لے کر۔ جینا ہی کتنے روز ہے مجھے۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے چار و ناچار گزارنا ہے۔ صبر و شکر میں بڑی روحانی تسکین ہوتی ہے۔ ابھی ان کی عادت ڈال رہی ہوں۔

طیبہ نے جن بچوں کی چیزیں تمھیں دی تھیں وہ فروخت نہ ہوئیں ہوتو کوئی پرواہ کی بات نہیں۔ تم بھی کیا کرو گی۔ میں نے ہی طیبہ سے کہا تھا کہ کالج لے جائے شاید کوئی خرید لے۔ اب وہاں بال کی کھال نکالی جا رہی ہے تو کوئی مجبوری کا سودا تو نہیں ——— مرضی کی بات ہے۔

سلامت سے زیادہ بات چیت نہ ہو پائی۔ نہ اسکو ہاتے ہلا سکی صرف پان پر ٹال دینا پڑا۔ مما کو بجلی دینے نیلوفر لے جا رہی تھی اور بڑی عجلت میں اس سے بات چیت ہوی۔ تم دونوں آنے کا کوئی دن بتاؤ تو میں دیوانوں کی طرح تم لوگوں کا انتظار کروں۔ بھائی صاحب سے ہم دونوں کا بہت بہت سلام کہنا۔ منی کو ڈھیروں پیار۔ یہ آپ کو سلام کہتے ہیں ہمیشہ آپ لوگوں کا ذکر رہتا ہے۔

خدا حافظ
آپ کی ج

۲۱ راکتوبر ۱۹۶۱ء

اچھی قمر خوش رہو ——— سلام خلوص

آج کل تو تم اس قدر اطمینان سے مجھ سے بے خبر ہوگئیں کہ جیسے جہلم سے بھی فراغت کر ڈالی۔ خیر تم لوگ بھول جاؤ میرے لیے تو جیسے کل کی بات ہے۔ شاعر ہی میرے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے دیکھو یہ حسرت ہیں جو کہتے ہیں:

دلِ مایوس کو ویرانۂ مطلق نہ کہو
یادِ ماضی کی بدولت یہ کچھ آباد بھی ہے

سلامت ایک روز آ گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر ماضی آنکھوں میں گھوم گیا ——— خیر جانے دو قمر ہم لوگ ماضی کو ہی پیٹتے ہیں۔ حال ہی تو سب کچھ ہے۔ مستقبل کی خبر ہی کس کو ہے ———

چند چیزیں ایک بچی نے بنائی ہیں اگر کالج میں انھیں فروخت کروا دو تو بڑی نوازش ہوگی۔ اس کو رقم کی ضرورت ہے۔ اس کی محنت کا خیال کرتے ہوئے اس کی بتائی ہوئی رقم مل جائے تو تمہیں دعا دے گی ——— طیبہ کے ذریعہ بھیج رہی ہوں۔ پیسے بھی طیبہ کو ہی بلا کر دے دینا ——— تمکنت ان کے دولہا اور بچہ۔ سب کیسے ہیں؟ خط آتے ہوں گے وہ لوگ کب تک آئیں گے۔ مینے بیگم کو ہم دونوں کی بہت سی دعائیں اور پیار۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام کہنا ہم دونوں کا۔ کبھی کبھی خط ہی لکھ دیا کرو تو نصف ملاقات ہی ہو جائے کم از کم یہ تمہیں سلام لکھواتے ہیں۔ سلامت کو دھول دھپوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ فقط

تمہاری
جہاں بانو.

(۱۰)

۲۶ ستمبر ۶۲ء

اچھی قمر خوش رہو۔ سلام عقیدت

تمہارا ۱۷ را کا خط ملا۔ بڑی تسکین ہوئی۔ کسی کو لکھو یا نہ لکھو مجھے ضرور جلد جلد لکھا کرو۔ تمہارے خطوط بڑے سلجھے ہوئے ہوتے ہیں اور میرے اعصاب کو ان سے بڑا سکون پہنچتا ہے۔ آج کل تو بس لکھنے پڑھنے ہی میں وقت گزرتا ہے۔ مگر تم تو بہت مصروف رہتی ہو۔ کالج کا آنا جانا پھر گھر کی زندگی، یقیناً درد سر ہوتا ہوگا۔ چشمہ بدلوانا قمر۔ شاید یہی وجہ درد سر ہو ——— تمھیں بھی جا کر عینک دکھوانا ہے۔ میرے بھی درد سر رہتا ہے۔ کبھی چکر سے آتے ہیں۔ اب تو کچھ ٹانک لے رہی ہوں جس سے دم بازگشتی۔ ورنہ ایک روز تو طبیعت بیٹھتے سے اکھڑ گئی تھی سمجھی کہ بس آخری وقت آ گیا ہے۔ ان سے کہا حسن بانو کو فون کر کے بلوا لو۔ مما کو اطلاع نہ دو۔ بچاری حسن بانو آ گئی۔ اس کو بھی آنکھ میں موتیا بند ہے۔ شاید نکلوائے گی اس کی الگ فکر جان کو لگی رہتی ہے۔ آپریشن کی بڑی گھبراہٹ ہے۔ کلثوم کے پاس سے خط دیر سے آئے تو ہم لوگوں کے دلوں میں پنکھے سے لگ جاتے ہیں ——— تمکنت اب تو خدا کے فضل سے اچھی ہیں نا ———؟ دوری بھی عجب بلا ہوتی ہے۔ ہم کو بچے نہیں، لیکن ممتا تو ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔ مجھے بھی و ننھے حد یاد آتی ہے۔ خیال اسی کی طرف لگا رہتا ہے۔ بچاری مینے ——— سچ بھی اس کا جی کیسے لگتا ہوگا۔ صرف پڑھنا پڑھنا۔ اکتا جاتی ہوگی غریب ——— اللہ نصیب اچھے کرے کوئی

Reecreation بھی نہیں اور آج کل کے بچوں کو تو اتنی زبانیں سیکھنی ہوتی ہیں کہ کسی ایک میں بھی ماسٹر نہیں بن پاتے۔
زبردستی جو چیز ٹھونسی جاتی ہے اس کا نتیجہ معلوم۔ یہ ۵ مہ کو دہلی گئے ہیں۔ انشاء اللہ ۳۰ راکتوبر کو آئیں گے۔ مجھے صبح شام ہی
گھسیٹے لیے پھرتے ہیں۔ کبھی اپنے یہاں کبھی حما کے پاس۔ ہمارا ڈرائیور بھی ان کے ساتھ ہی گیا ہوا ہے اور ہماری گاڑی یہ کسی...
سے چلواتے نہیں وہ آجائے تو تمہارے لیے پان بھیجوں گی۔ حما کی بھی صحت اچھی نہیں رہتی پرسوں ہی انھیں چکر آگیا تھا۔ اکثر
لیٹی رہتی ہیں۔ زبیدہ سے سلام کہنا میرا اور سلامت سے بھی ——

یہ زور صاحب کو کیا سوجھی نہیں معلوم —— کہ بیٹھے بیٹھے چل پڑے کتنے صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ کشمیر کی آب و ہوا نے
ان کی صحت بنا دی تھی یقیناً عقبیٰ میں جنت ملی ہوگی —— دفن ہوئے تو جنت نظیر میں —— اب اپنی کیا کہ ان کے بعد پسماندگان
پر کیا گذری —— اردو بیزاری کا ماتم دنیا میں سہ نہ سکے۔ اب غالباً ان لوگوں نے جنت میں ہی کوئی اردو یونیورسٹی کی
کی ٹھانی ہے جب ہی تو ایک کے بعد ایک رواں دواں ہے مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے:

ہر ذرہ عالم پر حاوی ہیں صفات اس کے
سب کہنے کی باتیں ہیں مختاری و مجبوری!

بہت لکھ دیا قمر۔ بس اب چلوں۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام کہنا بچی کو پیار۔ حما نے بھی تمہیں دعا کہی ہے۔ میرا ۳ راگسٹ کا کارڈ تمہیں
نہیں پہنچا؟

زہرا کے بھی ایک آنکھ سے پانی بہتا ہے غرض فکر اور پریشانیاں ہر ذی روح کے لیے ناگزیر ہیں —— جی گھبرا رہا تھا
تمہیں خط لکھی تو ذرا چین ملا۔ خدا حافظ

تمہاری۔ جہاں بانو

بقیہ تبصرہ صد ۱۲ سے آگے

مذاق اڑانا چاہتے ہیں۔ کئی ایک حقیقتوں کو انھوں نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ جیسے عمر —— سبک باتھی —— آہٹ بھی نہ ہوئی
گذر گئی یا آدمی کا آنا جانا ایسا ہے جیسے۔ وہ بن بلائے کون و مکاں کی مجلس میں آدھمکے اور بلا پوچھے اٹھکر چل دیے یا جب آدمی
جاتا ہے تو اتنی جلدی میں اور اس طور سے کہ وہ اپنا عمر بھر کا جمع کیا ہوا مال و متاع ہی نہیں خود اپنا جسم بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے
تعارف، کون نشہ میں تھا۔ یہاں چھپنے کی جگہ نہیں۔ مختلف سوالات اور کئی دوسرے لطیفے انگریزی پرچوں السٹریٹڈ ویکلی اور
ایڈرس ڈائجسٹ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ سب سے اچھا مضمون شیطان سے ایک انٹرویو ہے۔ ابن طوطا کا سفرنامہ "پڑوسی ملک کیا
کرتا ہے"۔ یہی قابل اعتنا مختصر مضامین ہیں۔ ان کا انداز بیان حشو و زاید سے پاک ہے مگر اختصار کی شدت کے باعث بات
بنتی نظر نہیں آتی اردو مزاح کو ان سے امیدیں وابستہ ہیں۔ مگر انھیں بھی اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔

حیدرآباد کے شاعر

(۲۴)

صدیقہ شبنم

۱۹۶۴ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈیمی کے مطبوعہ دو تذکروں کا توسیعی سلسلہ۔

اردو بنیاد حیدرآباد کی جن خواتین نے شعر و ادب کو اعتبار بخشا ان میں کتنے ہی نئے اور پرانے نام تاریخ ادب اردو کا جز بن گئے ہیں، حیدرآباد کے علمی اور شرفاء گھرانے کی پڑھی لکھی خاتون صدیقہ شبنم جوان دنوں اپنے شوہر جناب عبدالقادر حبیب کے ساتھ زائد از بیس سال سے لندن میں مقیم ہیں، اردو شعر و ادب کا عصری ذوق رکھتی ہیں۔ صدیقہ شبنم "اردو کے نامور نقاد" کلاسیک سے عصریت تک متوازن ذہن رکھنے والے دانشور ادیب ڈاکٹر مغنی تبسم کی ہمشیر، مولوی محمد الغنی مرحوم سب جج حیدرآباد کی دختر ہی نہیں، حیدرآبادی روایات، کلچر اور اقدار کی نمائندہ سفیر کی حیثیت میں لندن میں رہ کر بھی اردو کی شمع کو روشن رکھا ہے۔ علمی و ادبی گھریلو ماحول، مطالعہ اور تجربے کی ذہانت و ذکاوت انھیں حلقہ دانشورانِ لندن میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ صدیقہ شبنم ویمنس کالج حیدرآباد کی گریجویٹ خاتون ہیں سولہ سال کی عمر سے شعر کہتی ہیں، غزل خوب کہتی ہیں اور پڑھتی بھی خوب ہیں۔ ان کی بہترین انتظامی صلاحیتوں سے بی بی سی لندن انڈین

انتخاب کلام

ویمنس اسوسی ایشن لندن اور نوٹنگھم کی تعلیمی درسگاہوں نے استفادہ کیا ہے صدیقہ نے اپنی شاعری کی داد فیض، مصطفیٰ زیدی، ساقی فاروقی اور ن م راشد ایسے دانشوروں سے لی اور حیدرآباد کے نام کو دیارِ فرنگ میں روشن رکھا ہے۔ صدیقہ شبنم کی غزلوں سے منتخبات درج کیے جاتے ہیں۔ (م خ)

حدودِ عرصہ گہہِ ذات سے گذر جائیں
خلا میں دور بہت دور تک بکھر جائیں
ہزار نغمے سرِ راہِ غم ابھر جائیں
تمہاری یاد کے لمحے جدھر جدھر جائیں
چلو کہ وقت کے جلتے ہوئے اندھیروں سے
سحر کا، پیار کی خوشبو کا ذکر کر جائیں
کبھی گذر بھی ہو شاید تو اجنبی کی طرح
تمہارے شہر سے چپ چاپ سے گذر جائیں
تلاشِ منزلِ خوشبو کی راہ میں شبنم
نہ جانے کتنی بہاروں کے خواب مر جائیں

جو دل کی بارگاہ میں تجلیاں دکھا گ
مرے حواس و ہوش پر غرور بن کے چھا
جو شخص میری ذات میں بسا ہوا تھا دو
نہ جانے مجھ سے روٹھ کر وہ کہاں چلا گیا
پھر آ کے اک ہوائے غم اداس دل کو کر
خیال تیری یاد کا نظر کو پھر بجھا گ
کبھی قدم جو تھک گئے غموں کی رہ گز
تری نظر کا نور تھا جو حوصلے بڑھا گ

شام ہے اپنی ہر سحر صبحِ وطن سے دور د
مثلِ خزاں بہار ہے ارضِ دکن سے دور د
کیا یہ نظمِ گلستاں تو ہی بتا اے باغبا!
آئی بہار ہے مگر صحنِ چمن سے دور د
میرا مقامِ شوق ہے ایسا مقامِ خاص
عیش و طرب سے بے نیاز رنج و محن سے دو
شبنمِ خوش بیان نے ڈالی بنا و طرزِ
عہدِ کہن کے پاس پاس عصرِ کہن سے دور

قصۂ حسنِ ازل کا سناتے رہے
لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے
کچھ ترے شہر کی یہ عجب ریت ہے
لوگ زخموں سے دل کو سجاتے رہ
کوئی تعبیرِ حسنِ نظر بھی نہیں
خواب پلکوں پہ ہم بھی سجاتے رہ
غم سے مایوس چہروں کو شبنم پیا
ہم بہاروں کے نغمے سناتے رہے

مسعود اشعر

مجھے چہرا دکھا میرا

اس نے کہا —— تمہارے گھر میں تمہاری بیٹی بھی تو ہے، اور جوان بیٹی ہے۔

اور دور، برگد کے گھنے پیڑ کی موٹی موٹی شاخوں پر الٹی لٹکنے والی کالی کالی چمگادڑیں کانوں اور آنکھوں کے راستے میرے سینے میں اتر گئیں، اور وہ سارا خون جو میں نے جانے کہاں کہاں سے اس کے لیے اکٹھا کیا تھا، میری آنکھوں میں اتر آیا۔

پھر میں وہاں سے بھاگا —— جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگتا ہی چلا گیا کہ اب میرے لیے یہی ایک راستہ تھا جس کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میں کہاں کا رہنے والا ہوں، مجھے نہیں معلوم —— اس وقت کہاں بیٹھا ہوں، نہیں جانتا —— ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا، ٹی ٹی آیا دھکے دے کر نیچے اتار دیا۔ کوئی اور گاڑی آئے گی اس میں سوار ہو جاؤں گا —— آگے چلا جاؤں گا یا پیچھے ہی روانہ ہو جاؤں گا —— آگے جانے یا پیچھے ہٹنے سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے —— مقصد چلتے رہنا ہے بھاگتے رہنا ہے —— ریل میں زیادہ تیزی کے ساتھ دوڑا جاتا ہے اس لیے میں ریل کا سہارا لے رہا ہوں۔

میں بھاگ رہا ہوں، —— دوڑ رہا ہوں —— جہاں تک دوڑ سکتا ہوں دوڑتا چلا جاؤں گا کہ ابھی میرے پیروں میں جان باقی ہے۔ اپنی عزت بچانے کا میرے پاس ایک ہی طریقہ تھا —— کہ اس کی توجہ دوسری طرف کر دی جائے —— اور میں نے وہی کام شروع کر دیا —— میں اپنی عزت بچانا چاہتا تھا —— اسے ان خاردار ہاتھوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا جو ہر وقت میری گردن پر جمے رہتے تھے جو سالہا سال میرے باپ کی گردن پر جمے رہے۔ اور جو شادی کے بعد سے مجھے ہر وقت خوف زدہ رکھتے تھے۔

بوڑھے برگد کی اونچی اونچی شاخوں پر سینکڑوں سال پرانی چمگادڑیں الٹی لٹکا کرتی تھیں اور ملک کا کنواں گاؤں بھر کی پیاس بجھاتا تھا کہ سارا گاؤں اور اس جیسے اور کئی گاؤں ملک کا کنواں ہی تھے۔ میرا گھر گاؤں کے ایک کونے پر تھا جہاں سے شہر کو رستہ جاتا تھا —— اور شہر سے آنے والے سارے راستے بھی میرے گھر کے قریب سے ہی گزرتے تھے —— دن بھر کی اندھی چمگادڑیں شام پڑتے ہی جب آنکھیں کھولتیں تو صدیوں پرانے درخت کی شاخوں میں جان پڑ جاتی۔ اس کے چوڑے چوڑے گہرے سبز پتے کتھئی رنگ کی کھال اوڑھ لیتے اور چوں چوں سے سارا گاؤں بھر جاتا —— اس وقت میری بھی آنکھ کھلتی اور میں بھی ملک کے لیے تازہ خون کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔

میں اپنے دادا کے متعلق کچھ نہیں جانتا، اپنے باپ کے متعلق بھی بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ اس ڈیرے کے بہت سے کمیوں میں سے ایک کمی تھا —— باپ کی طرح میری ماں بھی اسی گھر میں کام کرتی تھی۔ ہم سب نہ جانے کب سے اسی ڈیرے میں پلتے چلے آ رہے تھے —— مگر نہ جانے میرے باپ کو کیا ہوا کہ اس نے مجھے بڑے گاؤں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اور مجھے خدا جانے کیا ہوا کہ میں میٹرک تک پڑھ گیا۔

شاید یہی بات میرے لیے ساری مصیبتوں کا سبب بنی۔ مگر اس کے ساتھ میری عزت بھی ہوگئی۔ مجھے بتایا گیا کہ تم عزت دار ہوگئے ہو ــــ میرا باپ ادھر اُدھر چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ میں ملک کی جاگیروں کا حساب کتاب رکھنے لگا۔ میں ایکدم کمّی سے منشی بن گیا ــــ میرا باپ بہت خوش تھا۔ میری ماں بہت خوش تھی ــــ مجھ سے نہیں ملک سے کہ اس کی مہربانیوں سے میں نے عزت دیکھی۔ میرے باپ نے عزت دیکھی۔ میرے خاندان نے پہلی بار عزت دیکھی۔

شہر سے پیر سائیں آئے۔ انھوں نے جہاں ملک اور اس کے مزارعوں کو فصلوں میں برکت کے لیے نقش لکھ کر دیے۔ وہاں ملک کی سخاوت اور ہمدردی کی تعریف بھی کی کہ اس نے مجھ جیسے کمّی کو اپنا منشی بنا لیا۔ انھوں نے میرے باپ کو یاد دلایا کہ تو اور تیرا بیٹا ملک صاحب کی عنایتوں کے طفیل ہی زندہ ہیں۔ تم دونوں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ تھانہ دار صاحب آئے۔ انھوں نے یہی کہا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر آئے انھوں نے بھی یہی یاد دلایا۔ سب لوگ ملک کی مہربانیاں یاد دلانے آتے تھے اور میری گردن نیچی اور نیچی ہوتی جاتی تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ عزتیں گردن نیچی بھی کر دیتی ہیں۔

"اوے، کھڑا کیا دیکھ رہا ہے، مخدوم صیب کے گھٹنے پکڑ....." میرے باپ نے مجھے میری حیثیت اور بھی اچھی طرح یاد دلا دی۔

یہ ریل گاڑیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ کبھی اس طرف کبھی اس طرف۔ چوبیس گھنٹے میں شاید ایک منٹ بھی ایسا نہیں جاتا۔ جب کوئی نہ کوئی گاڑی چل نہ رہی ہو۔ میں گاؤں سے میلوں پیدل بھاگ کر اسٹیشن پہنچا تو گاڑی بالکل تیار کھڑی تھی۔ پھر میں جس اسٹیشن پر بھی گیا وہاں مجھے گاڑی تیار ہی کھڑی ملی۔ میں نے یہ سمجھا کہ سب لوگ میرے ساتھ اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ وہ سب چاہتے ہیں کہ میں بھاگتا رہوں۔ ریل گاڑی والے بھی ان کے ساتھ ہیں۔ میرے بھاگنے میں سب مدد کر رہے ہیں۔

مگر...... ملک کو تو میں نے قتل کر دیا تھا؟! ہاں مجھے خوب یاد ہے میں نے مار ڈالا تھا۔ جان سے مار ڈالا تھا۔!!

جب میں وہاں سے بھاگا تو میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ شخص جو دوسروں کے خون پر جیتا تھا کہیں اپنا خون دیکھ کر بوکھلا نہ جائے۔ کہیں وہ دوبارہ اٹھ کھڑا نہ ہو۔ میں اس پیڑ کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا جس پر اس وقت ایک بھی چمگادڑ نہیں تھیں۔ ساری چمگادڑیں کہیں دور شکار کے لیے جا چکی تھیں۔ میں اکیلا تھا اور خوش تھا کہ ساری دنیا میری مدد کر رہی ہے ــــ مگر جب میں ملک کے چار مربع والے باغ کو پار کیا اور میلوں میں پھیلے اس کے کھیتوں کے قریب پہنچا تو کھلیانوں میں پڑی گندم کی ڈھیریوں پر لہراتے پیر سائیں کے نقش میرا رستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ ان ننھے ننھے پرچموں کو دیکھ کر شک ہوا ــــ کیا سچ مچ ملک مر چکا ہے: ــــ کیا واقعی میں نے اسے مار ڈالا ہے؟ پھر میرے دل میں آیا کہ اپنا شک مٹانے کے لیے ان پرچموں کو بھی اکھاڑ کر پھینک دوں، پیر سائیں کو بھی قتل کر ڈالوں ــــ مگر میرے دل کے اندر ایک چور بھی بیٹھا تھا۔ ہزاروں برس پرانا چور ــــ اس نے کہا ــــ اگر فصل واقعی تباہ ہوگئی تو گاؤں والوں کا کیا ہوگا؟ اس گاؤں میں تیری بیوی رہتی ہے۔ تیری بیٹی رہتی ہے۔ اور ملک کہتا ہے وہ خوبصورت ہے۔ اور تیرے گھر میں رہتی ہے۔ ملک یاد دلاتا ہے کہ وہ تیرے گھر میں ہی رہتی ہے ــــ مگر اب کیا وہ میرے گھر میں رہتی ہے؟!!

میں پہلی بار ملک کے لیے جب شہر گیا تو اسکول کے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ میں ایسا گھٹیا کام کیوں کرتا ہوں۔

"اپنی عزت بچانے کے لیے"

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ــــ اس نے پھر پوچھا ــــ میں نے پھر یہی جواب دیا۔

وہ خاموش ہوگیا۔ نہ جانے اس نے کیا سمجھا۔ اس کی خاموشی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں نے کوئی بہت ہی انوکھی بات کہہ دی ہو۔ ایسی بات جس کا یقین ہی نہیں کیا جا سکتا۔

میری بیوی ملی ہے......" میں نے کہنا چاہا۔ مگر پھر سوچا کہ اب اسے سوال کرنا چاہیے۔ وہ سوال کرے گا تو میں بتاؤں گا ـــ لیکن اس نے پھر کوئی سوال ہی نہیں کیا مجھے تکتا رہا اور میں سارے جواب اپنے سینے میں ہی دبا کر رہ گیا۔

اور جب گھر پہنچا تو کسی سوال کے بغیر ہی بول پڑا۔

"دیکھو بھائی گون..... تو بہت خوبصورت ہے...... بہت ہی خوبصورت......"

وہ زور سے ہنسی اور سر جھکا لیا۔ کیوں؟ میں نے اس سے نہیں پوچھا۔ نئی دلہن سے اور بات بھی کیا کی جا سکتی ہے؟

انسان کو ڈرانے کے لیے کیا کیا چیزیں ہیں۔ چمگادڑیں بدصورت ہوتی ہیں اور یہ لڑکیاں خوبصورت..... اور دونوں ہی ڈراتی ہیں دونوں ہی خوفزدہ کرتی ہیں۔ میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تھا تو میں ڈر گیا تھا۔ اپنی زندگی میں مجھے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا جتنا اس وقت لگا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور سر سے پیر تک کانپ اٹھا ـــ یہ نہیں کہ میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ کئی بار دیکھا تھا بلکہ میں جب بھی اس کے گاؤں جاتا اسے دیکھتا ـــ مگر اس وقت اسے اپنے گھر میں دیکھ کر میں لرز گیا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی؟ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں ڈر گیا، سچ مچ ڈر گیا۔

پھر ساری دنیا کے خوف اور وسوسے ہر وقت مجھے ستانے لگے۔ میں ہر آنے جانے والے سے ڈرتا تھا۔ ہر آہٹ سے ڈرتا تھا۔ میں سوتے میں ڈرنے لگا تھا ـــ مگر..... میں سوتا ہی کب تھا! ہر وقت تو اسی فکر میں رہتا تھا ـــ ایک بار میرے دل میں آئی کہ اسے لے کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ کسی دوسرے شہر چلا جاؤں کہ وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہوگا۔ گاؤں میں تو سارے ہی جاننے والے ہیں۔

میری ماں کو بھی شاید اسی قسم کا خوف تھا۔ جب ہی تو اس نے ایک دن مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھایا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈرتے ڈرتے کہا (وہ نہ جانے کس سے ڈر رہی تھی)

"بچے..... اب تیری ذمہ داری زیادہ ہوگئی ہے۔ تیرا باپ زندہ ہوتا تو گھر میں دو بندے ہوتے۔ اب تو اکیلا ہے اور..... گھر میں دو عورتیں ہیں۔"

کسی آدمی کی پہچان کیا ہے؟ یہی نا کہ لوگ اسے اپنی پسند کے کپڑے پہنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں تم بہت اچھے لگ رہے ہو اور وہ کپڑے پہن لیتا ہے۔ وہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ اچھا لگ رہا ہے اور اسے یہی کپڑے پہننا چاہئیں۔ کپڑے پہنانے والے اس میں اپنی سہولت سمجھتے ہیں اور کپڑے پہننے والا اپنی سہولت ـــ اطمینان اور سکون کے لیے ضروری ہے کہ اسی طرح دونوں خوش رہیں۔

وہ سامنے جو آدمی جا رہا ہے۔ یہی آدمی میرے گاؤں میں رہتا ہے اور میری بیوی کے گاؤں میں بھی رہتا ہے اسے میں نے شہر میں بھی دیکھا ہے۔ ہر شہر میں دیکھا ہے۔ ملک کے ساتھ یا ملک کے لیے جب بھی میں کسی شہر گیا اسے وہاں پایا ـــ وہ بھی مجھے ضرور جانتا ہوگا ـــ میں تو اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا کہ اس نے مجھے پہچان ہی نہ لیا ہو۔ مگر وہ میری طرف اس طرح دیکھتا ہوا گزر گیا جیسے اسے وہاں بیٹھا کوئی نظر ہی نہ آیا ہو، اس نے مجھ دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے خوش ہو کر اپنے کپڑوں کو دیکھا کہ شاید وہ بدل گئے ہوں مگر افسوس ہوا کہ کپڑے تو اب بھی وہی تھے جو ملک نے مجھے دیے تھے۔ پھر کیا بات ہے؟! ـــ اس آدمی نے مجھے پریشان کر دیا۔

ایک دم میری آنکھ کھلی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ــــ آس پاس دیکھا، میری بیوی روتی پکارتی تھی اور ماں نماز پڑھ رہی تھی ــــ میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا خوف کیسے دور کروں:ــــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور میں سیدھا ملک کے ڈیرے پہنچا اور اس کے گھٹنے پکڑ لیے کہ اپنی عزت بچانے کی ترکیب میری سمجھ میں آگئی تھی۔

اب ملک کے لیے گاؤں گاؤں، شہر شہر جانا اور گھر گھر پھرنا میرا کام تھا کہ اپنے باپ دادا کی طرح ملک کو بھی نئے نئے دانے چکھنے کا شوق تھا۔ وہ شاید کوئی فلم تھی جو ملک شہر سے دیکھ کر آیا تھا۔ وہ سب کو اس کی کہانی سناتا۔ بڑے مزے لے لے کر سناتا اور کہتا بزرگوں کی باتوں میں بڑی حکمت ہوتی ہے پرانے لوگ جو کہانیاں سناتے ہیں ان میں بڑا سبق ہوتا ہے۔ بڑی کام کی باتیں ہوتی ہیں۔

"افریقہ کے کسی قبیلہ کا ایک سردار تھا کئی سو سال پرانا......"

"کئی سو سال......؟"

"ہاں کئی سو برس اس کی عمر تھی، مگر وہ جوان تھا۔ قد کاٹھ کا پورا ــــ اس کی جوانی کا راز تھا کنواری لڑکیوں کا تازہ خون ــــ ...."

"ہر سال وہاں ایک میلہ لگتا اور پہلے سے منتخب کی ہوئی ایک کنواری لڑکی کا تازہ تازہ خون اسے پلایا جاتا۔ اور وہ ایک سال کے لیے اور جوان ہو جاتا۔" یہ کہانی سنا کر ملک خوب ہنستا۔ اس کی باتوں پر ہنسنے والے لوگ تو وہاں ہر وقت ہی رہتے تھے اس لیے میں نہ ہنستا تو کسی کو احساس تک نہ ہوتا۔ مجھے ہنسی کے بجائے غصہ آتا۔ پتہ نہیں کیوں ــــ!!

اس وقت تک میں نے ریل گاڑی میں سفر نہیں کیا تھا۔ وہاں ریل گاڑی تھی ہی نہیں۔ اپنے کام سے کہیں دور جانے کے لیے لاریاں تھیں اور ملک کے کام سے جانے کے لیے ملک کی موٹر جو اب میرے ہی قبضے میں رہتی تھی۔

ملک کے لیے گاؤں اور شہر برابر تھے کہ شہر کا سارا مال گاؤں آجاتا تھا اور گاؤں کے سارے نوکر شہر پہنچ جاتے تھے۔ گاؤں میں اسکے ڈیرے بھی کوٹھیاں تھیں اور شہر میں اس کی کوٹھیاں بھی ڈیرے۔ میں نے تو ہر شہر میں اس کی ایک کوٹھی دیکھی۔ وہ کہتا تھا، دوسروں کے گھر ٹھہرنا عزت کی بات نہیں ہے اور ہوٹلوں میں سارے نوکر نہیں رہ سکتے۔ ہر جگہ اپنا گھر بناؤ اور دوسروں کو اپنے گھر بلا کر اپنا احسان مند کرو۔ ملک کے لیے اور ملک کے ساتھ میں نے کتنے گھر دیکھے! کیسے کیسے گھر دیکھے، کیسے کیسے لوگ دیکھے! وہ جو سامنے گاڑی ٹھہری ہے اس میں بیٹھے سب لوگ میرے جانے والے نظر آ رہے ہیں۔ وہ سب جانے پہچانے ہیں۔ وہ کھڑکی کے ساتھ جو لڑکی بیٹھی ہے اسے تو میں خوب جانتا ہوں اور اس کے ساتھ جو عورت بیٹھی ہے اسے بھی۔ وہ بھی مجھے ضرور جانتی ہوں گی جب ہی تو میں جب ڈبے کے اندر داخل ہونے لگا تھا تو انھوں نے دھکے دے کر مجھے باہر نکال دیا تھا اور لوگوں کو بھی جمع کر لیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور ان کو غصہ آگیا تھا ــــ اور وہ آدمی جو ابھی ابھی مجھے گھورتا ہوا گزرا ہے میں اسے بھی پہچانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں کہ وہ کون ہے اور ملک کے پاس کس کام سے آیا کرتا تھا۔

ملک نے مجھے آدمی کی پہچان خوب کرا دی ہے میں ہر آدمی کو دور سے دیکھ کر پہچان جاتا ہوں۔ مگر...... جب ملک نے ایسی ہی بات مجھ سے کی تو میں بوکھلا گیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کیا کہوں.......

اور میں نہیں جان سکا کہ اب کیا کہوں! میرا سارا منہ ننھے ننھے دانوں سے بھر گیا تھا اور زبان ہلاتے وقت ہو رہی تھی۔ میرا منہ کھلا تھا کہ اسے بند کرنے میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے سب کو جان لیا تھا مگر اپنے بارے میں سوچنے کی کبھی فرصت نہیں ملی تھی۔
پھر اس ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑ دیا جو ملک کی گاڑی کسی اور کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اسے لے کر شہر جاتا۔ یا اس لیے ملک کے پاس رہتا کہ ملک کی گاڑی سب لوگ پہچانتے تھے۔

"یار تیرا ملک تو بہت ہی بخیل ہے......"

میں نے اس کے منہ کو دیکھا — کیا کہہ رہا تھا وہ؟!

"ملک جب بھی کوئی اچھا مال لے کر شہر جاتا ہے اسے ایسا برقع میں لپیٹ کر رکھتا ہے کہ ایک جھلک بھی نہیں دیکھنے دیتا۔"

میں ہنسا کہ ملک کی بخیلی کو بھی کہاں گالی پڑی ہے، مگر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس نے میرے سینے پر پوری طاقت سے گھونسہ مارا ہو۔ میں چکرا گیا......

اب میں شہر جانے کے بجائے گاؤں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں موٹر سے بھی زیادہ تیز بھاگا جا رہا تھا۔ ملک کے ڈیرے کی طرف۔ ہانپتا کانپتا ملک کے ڈیرے پر پہنچا۔ تھوڑی دیر باہر ٹھہرا۔ سانس درست کیا۔ پھر اندر داخل ہوا۔ مگر جب میں اس کمرے کی طرف جانے لگا جہاں صرف مجھ جیسے نوکر ہی جا سکتے تو ایک لمبی لاٹھی والے جوان نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی کہ میں اسے جانتا تھا۔

"کیوں؟"

"ملک صاحب کا حکم نہیں ہے۔"

"کیوں؟!"

"تم ملک صاحب کے حکم سے اس وقت شہر میں ہو۔"

"مگر میں تو شہر سے واپس آ گیا ہوں۔"

"نہیں تم واپس نہیں آئے ہو۔"

"میں شہر سے واپس نہیں آیا ہوں......؟"

چمگادڑیں دو قسم کی ہوتی ہیں — اور بھی کئی قسم کی ہوتی ہوں گی مگر میں دو قسم کی چمگادڑوں کو جانتا ہوں — ایک تو وہ جو اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ جہاز کی جہاز نظر آتی ہیں۔ وہ بہت اونچے اور بہت بڑے شکار کرتی ہیں۔ انہیں کسی نے شکار کرتے نہیں دیکھا — دوسری وہ ہوتی ہیں جو شام کو ابابیلوں کے ساتھ اڑتی ہیں اور دور سے ابابیل ہی نظر آتی ہیں۔ یہ چمگادڑیں رات کو گھروں کے اندر گھس جاتی ہیں اور انھیں باہر نکالنے کے لیے سارے گھر میں اندھیرا کرنا پڑتا ہے — کہتے ہیں یہ کان کو چمٹ جاتی ہیں اور جب تک سارا خون نہ پی لیں جان نہیں چھوڑتیں — مگر میں تو بڑی چمگادڑ کی بات کر رہا تھا جسے شکار کرتے کسی نے نہیں دیکھا۔

میں گھر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ میری ماں بھی نہیں تھی — شاید وہ مر چکی تھی۔ اگر وہ مر نہ گئی ہوتی تو وہاں ضرور موجود ہوتی....
میں بھاگا اور پھر ملک کے ڈیرے پر پہنچا اور پھر وہاں سے بھگا دیا گیا۔ پھر کسی نے مجھے سوتے میں چارپائی سے اٹھا کر دھڑام سے نیچے پھینک دیا۔

جانتا ہے تو کون ہے —"

ایک بار تو غصے نے میری گردن اونچی کردی، اور نہ جانے میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ملک بھی لڑکھڑا گیا ہے — مگر دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو میری نظروں کا دھوکا تھا۔ لڑکھڑایا تھا۔ وہ تو اسی طرح سینہ پھیلائے کھڑا تھا۔

"جی سائیں"

"سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں۔"

"نوکر سائیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے اوپر آنکھیں اٹھائیں اور پھر حیران رہ گیا — اب وہ مسکرا رہا تھا — ملک ہنس رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے پہلے صحیح دیکھا تھا یا اب ٹھیک دیکھ رہا ہوں؟! اس کا غصہ صحیح تھا یا پیار صحیح ہے؟

مگر جب ملک نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے دونوں باتوں کا یقین آگیا۔

"دیکھ لالہ......"

ملک نے پہلی بار مجھے لالہ کہا تھا۔

"......تو ہمارا پرانا نوکر ہے۔ تو اسی ڈیرے میں پیدا ہوا ہے — تو ایسی باتیں کرتا ہے؟"

میرے پاس اس کا جواب تھا اور میں نے چاہا بھی کہ ملک کو وہ جواب دے بھی دوں مگر اُس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"...... تجھے ہماری ضرورت ہے اور ہمیں تیری — اور تو جانتا ہے کہ ہماری ضرورت تو پوری ہوتی ہی رہتی ہے — اور پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے......" اس سے آگے میں نے اور کچھ نہیں سنا۔ میری آنکھیں نیچی تھیں اور چاروں طرف سے سیلاب نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

اب میں اس ریل گاڑی سے بھی آگے نکل جاؤں گا جو نہ جانے مجھے کہاں لیے جا رہی ہے۔ اس گاڑی میں وہ سب لوگ سوار ہیں جنھیں میں جانتا ہوں — جو سب مجھے جانتے ہیں — اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز اپنی پہچان ختم کرنا ہے اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہم دوسروں کو پہچاننا ختم نہیں کردیتے — میں دوسروں کو پہچانتا ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے بھی مجھے پہچانتے ہیں۔ میری پہچان ابھی باقی ہے — اس کا یہ بھی مطلب ہوا کہ میں ابھی اپنے گھر اور گاؤں سے زیادہ دور نہیں آیا۔ یہیں کہیں آس پاس گھوم رہا ہوں۔

سچ بولنا اور سچ سننا دونوں ہی بہت مشکل کام ہیں۔ پہلے میں سچ بولتے ڈرتا تھا۔ اب سچ سننے سے بھی ڈرنے لگا۔ تنہائی میں میں بھی کبھی سچی بات نہ سوچتا کہ کہیں میرے کان نہ سن لیں۔ ملک نے ایک سچ بول کر ساری سچائیوں سے نفرت کرادی تھی۔

"اگر کوئی اپنی خوشی......"

میں نے اس بے گناہ اور معصوم شکل کی طرف دیکھا جو گھر واپس آچکی تھی اور دنیا جہاں سے بے فکر اپنے کام میں مصروف تھی۔

اس کے باپ کو اس بات کی اتنی پریشانی نہیں رہتی تھی کہ کل — آنے والے کل وہ اور اس کے بچے کیا کھائیں گے جتنا وہ اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ آج کا دن خیریت سے کیسے گزر گیا۔!!

"جس نے اتنی تکلیفیں دیکھی ہوں اس کے لیے تھوڑا سا آرام بھی بہت بڑی بات ہوتا ہے۔"

اب وہ ایسی باتیں کرنے لگی تھی اور میں بات کرنا بھی بھول چکا تھا۔

املتاس کے پھول لال ہوتے ہیں پیلے نہیں ہوتے ــــ پیپل اور برگد کی شاخوں پر اب چمگادڑیں اُگتی ہیں سبز پتے نہیں اُگتے۔ شکاری کے لیے شکار کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ جلتی دوپہر بھی ٹھنڈی کالی رات بن جاتی ہے۔

میرا شہر جانا بند ہو گیا۔ گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ سارا کام بیٹھے بیٹھے ہونے لگا ــــ اب میں تھا اور میری ننھی سی بچی۔ ایک دن میں نے اپنی آنکھوں کو اپنے سامنے رکھے دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہی تھیں اور اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے میری ناک پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں پھر ڈر گیا۔ اور اسی حالت میں اپنی بچی کو سینے سے لگا کر وہاں سے بھاگا۔ گاؤں سے بھاگا، شہر سے بھاگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ بہت دور ــــ اور جب بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو سانس لینے کے لیے ٹھہر گیا ــــ مگر سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا ــــ میں تو وہیں تھا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہی گاؤں وہی گھر وہی گھر کے سامنے گندہ نالہ اور وہی صدیوں پرانا درخت ــــ میں نے گھبرا کر اس ننھی سی جان کو اپنے سینے کے ساتھ زور سے بھینچا اور سو گیا۔

سفر میں ہر قسم کے اسٹیشن آتے ہیں۔ ہر طرح کے گاؤں اور شہر ملتے ہیں اور راستے میں موسم بھی بدلتے ہیں۔ سفر کی رفتار کے ساتھ موسم تبدیل ہونے کی رفتار بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ سفر کی رفتار سست ہوگی تو موسم بھی دیر دیر سے تبدیل ہوں گے، سفر تیز ہوگا تو موسم بھی جلد جلد بدلتے رہیں گے۔

صدیوں کے بعد اچانک محسوس ہوا کہ ہم سب تیز دوڑنے لگے ہیں اور موسم بالکل بدل رہا ہے۔ میں نے آنکھیں مل مل کر چاروں طرف دیکھا مگر صرف اتنا دیکھ سکا کہ میرے گھر اب ایک نہیں پھر دو عورتیں ہیں۔

ملک نے مجھے پھر حیران کر دیا۔ اس نے مجھے برابر لالہ کہنا شروع کر دیا تھا ــــ پہلے اس نے صرف ایک بار لالہ کہا تھا ــــ اب تو وہ مجھے "سائیں میڈا" بھی کہتا اور میں خوف سے کانپ اٹھتا۔ مگر وہ صرف میرے ساتھ ہی ایسی باتیں نہ کرتا، دوسرے کمینوں کے ساتھ بھی وہ ایسا ہی کرنے لگا تھا۔

سب لوگ مجھے مبارکباد دینے آئے۔ میں انھیں مبارک باد دینے گیا۔ یہ سامنے جو لوگ اب مجھے دیکھے بغیر گزر رہے ہیں یہ سب مجھے مبارکباد دینے آئے تھے، میں ان کے پاس نہیں گیا تھا۔

سامنے ریل کی پٹڑی پار کرنے والے آدمی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ پہچان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ کبھی ہم سب کو پہچانتے ہیں اور کبھی کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔ ان سب نے کہا ــــ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے ــــ میں نے ان کا یقین کر لیا ــــ ان سب نے کہا ہم نے اپنے دشمن کو بھی پہچان لیا ہے ــــ میں نے اس کا بھی یقین کر لیا ــــ انھوں نے کہا، اب دشمن بچ کر نہیں جائے گا ــــ میں نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

اس اسٹیشن کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ گاڑیاں واپسی کا سفر بھی کرتی ہیں ــــ جو گاڑی مجھے آگے لے جاتی ہے وہی واپس بھی لے آتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ میں اسی گاڑی میں بیٹھا رہتا ہوں۔ اس سے اترتا نہیں، اسے تبدیل نہیں کرتا۔ اور اس چکر میں گاڑیوں کی پہچان ہی بھول گیا ہوں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سی گاڑی آگے لے جائے گی اور کون سی پیچھے۔ بلکہ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کب کون سی گاڑی

میں سوار ہوا تھا اور اب کس گاڑی میں بیٹھا ہوں!! آگے جارہا ہوں یا پیچھے ——— !!

اب میرے گھر میں دو عورتیں تھیں اور دونوں کبھی گھر سے باہر نہیں جاتیں۔

بڑی نے کہا۔ یہ میرا گھر ہے اور ملک ہمارا رب نہیں ہے۔

میں نے کہا یہ بات تو میں ایک زمانے سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر تم نے کہی نہیں۔

میں تو کہہ رہا تھا کوئی سنتا بھی۔

تم اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ اپنے آپ کو سنا رہے تھے۔ کوئی اور کیسے سنتا۔

ان کی بات بھی شاید ٹھیک تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں مگر اصل میں آپ سے ہی باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور جب ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہیں تو اس وقت سب لوگ ہماری باتیں سنتے ہیں۔

میں پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگیا اور ایسا مصروف ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ میں اب بھی ملک کا احترام کرتا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ میں اُسے بالکل بھول گیا ہوں۔ میری بیوی کو بھی جیسے وہ یاد نہیں رہا تھا بلکہ سارا گاؤں ہی ملک کو بھولے بیٹھا تھا۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک چمگاڈر نہ جانے کس طرح ہمارے گھر میں گھس آئی۔ اسے باہر نکالنے کے لیے سارے گھر میں اندھیرا کیا گیا مگر پھر بھی وہ باہر نہ نکلی۔ خدا جانے کس کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی کہ تلاش کرنے پر بھی نہ ملی۔

میری بیٹی ڈر سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے سے اپنا سر اور کان پوری طرح چھپائے ہوئے تھے پھر بھی وہ کانپ رہی تھی۔

"وہ تو کب کی نکل بھی گئی" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

"نہیں میں جانتی ہوں، وہ گھر کے اندر ہی ہے" اور وہ رونے لگی۔

اب وہ عورت بھی ڈر رہی تھی جس نے گھر سے باہر قدم نکالتے ہی تمام چیزوں سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔

"صبح ہوگی تو خود ہی بھاگ جائے گی یا ہم اسے مار دیں گے"

"صبح تو پتہ نہیں کب ہوگی۔ اس وقت تک میرا تو دم نکل جائے گا"

اور ہم ساری رات جاگتے رہے کہ رات ختم ہونے میں ہی آتی تھی۔

پھر اس رات...... یا اسی قسم کی کسی اور رات کو ——— مگر راتوں کی قسمیں تو نہیں ہوتیں۔ رات تو صرف رات ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم اور ایک ہی رنگ کی...... پھر وہی بھیانک خواب سارے گھر پر وارد ہوا......

اندھیرے نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات نے ہلکی سی کنڈی ہلائی اور میں سمجھ گیا کہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ میں اٹھا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ باہر یہ دیکھ کر مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ حد نظر سے بھی بہت آگے تک پھیلے ہوئے ملک کے کھیتوں پر پھر جوانی آگئی ہے اور ہر کھیت پر پیر سائیں کے نقش ننھے ننھے پرچموں کی شکل میں لہراتے نظر آرہے ہیں ۔ میں بچپن سے جانتا تھا کہ یہ پرچم ملک کے ہیں، پیر سائیں اور مخدوم ایک ہی شخص کے نام ہیں۔

میں نے جھکی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھا کر دیکھا اور پھر جھکالیں کہ ملک پھر اپنے قد سے بھی زیادہ اونچا کھڑا تھا۔

"تیرے گھر میں بیٹی بھی ہے ــــ وہ جوان ہے اور خوبصورت بھی ہے ــــ خوبصورت بھی ہے ــــ خوبصورت ہے ــــ خوبصورت ــــ خوب خوب ــــ خوب....."

"جی سائیں...."

"نوکر سائیں......"

"....تابعدار سائیں....."

"......حاضر سائیں.....حاضر سائیں.....حاضر.....حاضر....."

میرے منہ سے خود بخود یہ الفاظ ابلنا شروع ہو گئے۔ جیسے کسی نے میرے اندر چابی بھر دی ہو ــــ جیسے میرے باپ کے اندر کسی نے چابی بھر دی تھی ــــ مگر..... مجھے یہ احساس بھی تھا کہ کس نے یہ چابی بھری ہے۔ کوئی ہے جو مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اسی لیے میں آدھا اوپر آدھا نیچے تھا۔ کبھی پیروں پر کبھی سر کے بل ــــ

پھر بوڑھے برگد کی گھنی شاخوں پر الٹی لٹکتی ہوئی کالی کالی چمگادڑیں کانوں اور آنکھوں کے راستے میرے سینے میں اتر گئیں اور وہ سارا خون جو میں نے نہ جانے کہاں کہاں سے اس کے لیے اکٹھا کیا تھا میری آنکھوں میں اتر آیا۔

اب میرے سامنے ملک نہیں تھا ــــ اور مجھے اب صرف اپنے گھر کا ہی راستہ معلوم تھا۔ باقی سارے راستے بھول چکا تھا۔

میں سیدھا اپنے گھر پہنچا بڑی عورت سے کوئی بات نہیں کی کہ اب اس سے بات کرنی فضول تھی۔ پھر اب یہ باپ بیٹی کا معاملہ تھا۔

میں نے اسے اپنے قریب بلایا۔ پیار کیا اور اپنی آنکھوں کا سارا خون اس کے حلق میں انڈیل دیا اور دونوں انگوٹھے اس کی گردن میں گاڑ دیے۔

اب میں بھاگ رہا ہوں ــــ جتنا تیز بھاگ سکتا ہوں، بھاگ رہا ہوں ــــ ریل گاڑی کے ذریعے زیادہ تیز بھاگا جا سکتا ہے اس لیے ریل کا سہارا لے رہا ہوں۔ آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کا احساس ختم ہو چکا ہے۔ اب تو صرف ایک ہی مقصد ہے۔ بھاگتے رہنا۔ دوڑتے رہنا..... تاکہ سوچنے کی فرصت نہ ملے۔

مگر میں..... اب یہ کس سے پوچھوں کہ ــــ میں نے ملک کو قتل کیا ہے ــــ یا اپنی بیٹی کو ــــ ؟!!

بقیہ ژاں پال سارتر صفحہ سے آگے

مذاق کی بنیاد ڈیگال کی لمبائی اور البغل ثاور کی بلندی کے مقابلے میں چارلی چیپلن کے پستہ قد ہوتے ہوئے بھی یہ اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتا ہے کہ چارلی چیپلن پکاسو اور سارتر کے بغیر بیسویں صدی میں آرٹ اور ادب کا تصور کچھ عجیب سا لگے گا۔

محمد مجید اللہ صدیقی

دوست کے نام

میرے خواب
دھات کے چند سکّوں سے
خریدے گئے اس حبشی غلام کی طرح ہیں
جس کی کمر میں زنجیریں باندھ کر
میلوں صحرا میں کھینچا گیا ہے ـــــ
میری آرزوئیں اور تمنائیں
ریت کے گرم بگولوں کی طرح ہیں
جن کو آوارہ ہوا نہ جانے کہاں لے جاتی ہے ـ ـ ـ

میرا وجود
درحقیقت تپتا ہوا صحرا ہے
جس کے سینے میں
چاندنی کی ٹھنڈک کبھی جذب نہیں ہوتی
اور جس کے لیے
سورج لوہار کی دھونکنی بن جاتا ہے ـــــ
پھر بھی میں مسکراتا ہوں
کہ میرے دامن میں کہیں کہیں سبزہ زار بھی ہیں
جنھیں میں بے حد پیار کرتا ہوں ـــــ
سوکھے پھولوں سے سہی
پیار کرنا سیکھو
سوکھی ڈالی کے لیے
پھول بنو پھول کا ہار بنو ـــــ ۱

یہ دنیا
جو جگمگاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ـ ـ ـ
تم بھی تنہائی میں ذرا جھانک کے دیکھو
کتنا اندھیرا ہے
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا
آنکھ بے نور سی ہے
پھر بھی زندگی یہاں ہنستی ہے قہقہے لگاتی ہے
اندھیرے کے لب مسکراتے ہیں
بچھڑے ہوئے ساتھی کسی دوراہے پر
یاد آتے ہیں
تڑپاتے ہیں
تم جس دور سے گذر رہے ہو
میرے ساتھی!
وہاں بہت سی الجھنیں ہیں
الجھنوں کے انبار ہیں
ان سے گذرو تو میری بات یاد رکھو
ہاتھ کو ہاتھ جو مل جائے
غنیمت سمجھو
غنیمت سمجھو ـــــ ۱۱

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

اب جن کے دیکھنے کو (خاکے) مصنف: رئیس قدوائی۔ قیمت ۱۲/۵۰
سائز کراؤن مجلد، صفحات (۱۲۰) اشاعت اپریل ۱۹۸۰ء
ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ادھر خاکہ نگاری کو معتبر صنف ادب کے طور پر برتا جانے لگا ہے۔ زیر نظر کتاب "اب جن کے دیکھنے کو" کا افق ۱۲ خاکوں سے عبارت ہے۔ محترمہ انیس قدوائی کے ان خاکوں کو پڑھ کر اگلے دنوں کے وضع دار، قوم پرست اور راسخ العقیدہ بزرگوں کی سیرت و کردار کے عکس اور رنگ اپنا تاثر چھوڑتے ہیں اور یہی خاکہ نگاری کے فن کا نمایاں وصف بھی ہے۔ ماضی اپنے نقوش حال اور مستقبل پر ہر عہد میں چھوڑتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنے کی روایت قومی اور تہذیبی ورثہ کو مالا مال کرتی رہی ہے انیس قدوائی نے پیش لفظ میں درست ہی لکھا ہے کہ "اگلے صفحات میں آپ جن قابل قدر ہستیوں سے روشناس ہوں گے وہ سب انیسویں صدی کی پیداوار اور بیسویں صدی کی تاریخ ساز شخصیتیں تھیں، ان کی علمی قابلیت، اخلاقی کردار، تہذیب خوش ذوقی، دنیا سے محبت بھرا لگاؤ اور دینی خوش عقیدگی موجودہ دور میں شاید عجیب معلوم ہو لیکن وہ اس وقت ہمیں آئیڈیل، موزوں اور خالص ہندوستانی پیداوار کی حیثیت سے بہت محبوب تھے"۔

انیس صاحبہ کے رواں اور شگفتہ اسلوب تحریر نے عہد ساز شخصیتوں کے خد و خال اور ظاہر و باطن کو نہایت مہارت اور خوبی سے سمیٹا ہے۔ سب سے پہلا خاکہ ولایت علی بمبوق پر ہے، جس کے مطالعہ سے اگلے زمانے کے ایک باصلاحیت قانون داں، سرسید تحریک کے شیدائی، کامریڈ اور ہمدرد کے کالم نویس، مولانا دریا بادی سے ادبی نوک جھونک اور خلافت تحریک کتنے ہی ابواب ولایت علی کے ذکر کے ساتھ روشن ہو جاتے ہیں اسی طرح رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، شفیق الرحمٰن قدوائی چودھری محمد علی ردولوی، مرزا ابو الفضل، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مردولا سارابھائی، جواہر لال نہرو، قدسیہ زیدی، حافظ جمن اور ڈاکٹر سید عابد حسین پر انیس قدوائی کے خاکے ان شخصیتوں کے مظہر روشن قومی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی کرداروں کو روشن کرتے ہیں۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جن سے انیس قدوائی کے مراسم رہے ہیں۔ مکتبہ جامعہ خاکوں کے باب میں ایک مفید کتاب شائع کرنے پر مبارک باد کا مستحق قرار پاتا ہے۔ (و خ)

"کھیل سنسار" (بچوں کے لیے نظمیں) شاعر: سطوت رسول۔ قیمت: ۴/۵۰
سائز کراؤن، پیپربیک، صفحات ۷۲، اشاعت: اپریل ۱۹۸۰ء
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

بچوں کے لیے خوبصورت، سلیس، بامعنی اور قومی و ملی شعور کی نظموں کی کمی کے پس منظر میں "کھیل سنسار" کی نظمیں خوش گوار اضافہ قرار پاتی ہیں۔ نرسری اور کنڈرگارٹن مدارس کے بچوں کے لیے یہ مجموعہ مفید تعلیمی گلدستہ کے مصداق ہے جناب سطوت رسول نے بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان نظموں کی تخلیق کی ہے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے "کھیل سنسار" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجھے نظمیں اور گیت اس لیے پسند آئے کہ اس میں نہ تو بڑوں کے احساس تفاخر، برتری، بزرگی کا عکس ہے نہ یہ کاروباری قسم کے اخلاقی مقاصد کا دستور العمل ترتیب دیتے ہیں۔" "کھیل سنسار" میں جملہ ۷۰ نظمیں شامل ہیں، موسموں، رنگوں، پھلوں، پھولوں، کھیل تماشوں اور فطرتی مناظر کے سچے عکس اور رنگ سلیس اور رواں اسلوب تحریر کے باعث بچوں کے لیے جھک لہک کر پڑھے جانے کی تاثیر رکھتے ہیں۔ بیشتر نظموں میں موسیقی ریز غنائیت کا عنصر بھی اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ کتاب بہت ستھری چھپی ہے اور قیمت بھی واجبی ہے۔ اردو میڈیم کی ابتدائی درس گاہوں کے لیے بچوں کے بین الاقوامی سال کے تحفے کے طور پر اسے خرید اجانا چاہیے —— (وقار خلیل)

جوگی (شاعر پریت (شعری مجموعہ) شاعر: ارمان شام نگری
ڈیمائی سائز پیپربیک صفحات (۶۴) قیمت ۴ روپے
ناشر: بزم ارمان۔ عبدالعزیز سائیکل اسٹور۔ نواپاڑہ۔ گرولیہ ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال) ۷۴۳۱۴۳

ارمان شام نگری نئے ذہن اور جدید لہجے کے جانے پہچانے شاعر ہیں، معیاری، غیر معیاری، ادبی، تہذیبی رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ سرزمین بنگال نے ارمان کو جوگ اور سنجوگ کا مرکب شاعر بنا دیا ہے، ان کی شاعری میں لفظوں کا دروبست نئے جادے بناتا ہے، عصری شعور اور ادراک سے ارمان کی شناسائی زرا ویسی ہی محسوس ہوئی، نظم جدید اور روایتی سے زرا الگ بھی غزلیہ شاعری کا جذب و اثر اس مجموعہ میں پیدا اپنہاں ملتا ہے۔ ۵۵ نظمیں اور ۲۱ غزلیں اس شعری انتخاب کی مشمولات ہیں۔ اظہار کی ندرت کامیاب ترسیل میں خلل اندازی کا باعث بیشتر تخلیقات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ نظموں کا سپاٹ لہجہ، موضوع کی گرفت پر قدرت نہ رکھنے کا غماز بن گیا ہے۔ ارمان شام نگری کی غزلوں میں جہاں کہیں گم شدگی کی فضا روشن نظر آتی ہے اشعار مزہ دے جاتے ہیں۔ عصری زندگی کی کروٹوں اور آہٹوں سے عبارت ارمان کی فکر سخن مغربی بنگال کی حرکیاتی زندگی کو آئینہ دکھاتی ہے ؎

پھاڑ دیتا ہے وہ تصویریں بنا کر اکثر؛ ایک انسان جو مصور نہیں، پاگل بھی نہیں

ار مان شعور و احساس کا جوگی اور ریت کا مارا شاعر ضرور ہے، ذرا سنجیدگی اور تفکر کو اپنا لے تو یہ جوگی بروگی نئی شاعری کا عصری مخنی ور بھی بن سکتا ہے۔ اور ایسی صلاحیتیں ان میں ہیں بھی، سفر روشن رہے یہی دعا ہے —— (ذوالفقار خلیل)

سسکتی چاندنی — مصنف فریدہ زین۔ قیمت (مجلد) ۱۰ روپے شالیمار پبلی کیشنز حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔
فریدہ زین نئی نسل کی ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ "سسکتی چاندنی" ان کا اولین کوشش کا نقش ہے ہندوستان کے نامی گرامی رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوئے ہیں۔ صرف چند غیر مطبوعہ ہیں، جو اس مجموعے کی زینت بنے ہیں۔

ان کے سب ہی افسانے المیہ ہیں۔ ان افسانوں میں "غم ذات" سے زیادہ "غم کائنات" کو اہمیت دی گئی ہے۔ افسانوں میں ایک اور کمی جو محسوس ہوتی ہے، وہ ہے سسپنس۔ جتنا سسپنس بڑھتا جاتا ہے، افسانے سے دلچسپی بھی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ ہیرو اور ہیروئن پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے ہیں جو بعید از قیاس ہے۔

گانوں اور اشعار کا استعمال بے موقع نہیں۔ لیکن ان کی کثرت سے افسانے کی فضا بوجھل سی ہو گئی ہے۔ بعض جگہ کتابت کی غلطیاں ہیں۔ انداز بیاں اچھا ہے۔ چند جملے اس قدر خوبصورت کہ بے اختیار داد دینے جی چاہتا ہے۔ "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" "دست حنا" "ویراں ہے میکدہ" "بے نیازی حد سے گزری" "بہار دے کے خریدے گئے ویرانے" اور "ایک شیشہ اور ٹوٹا" اچھے افسانے ہیں "ٹائٹل" زیدہ زیب اور چھپائی اچھی ہے۔ خاتون افسانہ نگاروں کے افسانوی ادب میں "سسکتی چاندنی" ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگا۔ (لیئق صلاح)

نام کتاب "زخموں کی ہنسی" (نثر) مصنف یم، احمد، صفحات (۹۶) قیمت: /۴ روپے
پتہ:- 835 - عابد بلڈنگ - بلیماران سٹریٹ - دہلی۔

یم، احمد پیشہ وکالت سے وابستگی رکھتے ہیں۔ سکونت دہلی کی ہے اب تک اردو مزاح کو پانچ کتابیں / کتابچے دے چکے ہیں۔ (ذرا مسکرا دو، پردے کے پیچھے، مسکراتے آنسو، باتیں ہنسی کی) یہ سلسلہ 1970 سے شروع ہوا ہے۔ ان کی غیر مجلد کتابوں کو پیپر بیاک کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں موجود طویل اور مختصر لطیفے خاص قسم کے معاشرتی نقطۂ نظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لطیفوں کے علاوہ انھوں نے مختصر مضامین بھی ان کتابوں میں شامل کئے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا لطیفہ کہاں ختم ہو رہا ہے اور کہاں سے مضمون کی ابتدا ہو رہی ہے۔ امریکی نٹ بٹس TIT BITS کی نقل ہیں وہ قول محال کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ پردے کے پیچھے جو بھی واقعات گزرتے ہیں ان پر یم احمد کی نظر رہتی ہے وہ منتشر جملوں میں چنگاریاں بھر دیتے ہیں۔ مگر اتحاد مضمون کا خیال رکھ کر کوئی چیز لکھنا ان کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ ان کے لطیفوں کا ماخذ ہر وہ پرچہ ہے جس میں لطیفے چھپتے ہوں۔ زخموں کی ہنسی میں حیات و ممات دونوں کا احاطہ ہے۔ زندگی سے زیادہ موت کا مذاق

(بقیہ صفحہ ۱۳۰ پر)

اردو نامہ

اردو کی علمی و ادبی اور تہذیبی خبریں

وقار خلیل

یکم مئی: اسٹیٹ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن نے اردو میں تدریسی سہولتوں میں کمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ایک یادداشت ریاستی وزیر تعلیم کو پیش کی اور ریاست کے اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی بروقت تعیناتی پر زور دیا

○ جناب کے یم خاں، رکن ترقی اردو بورڈ نے ایک بیان کے ذریعہ ریاست میں اردو کے سرکاری و قانونی موقف کے تعین کا مطالبہ کرتے ہوئے صدر سرکاری زبان کمیشن مسٹر وندے ماترم راجندر راؤ کے حالیہ بیان کو اردو والوں کے لیے لمحۂ فکر قرار دیتے ہوئے متحدہ مساعی اور قانون سرکاری زبان کی دفعہ میں ضروری ترمیم کی طرف رائے عامہ کو بیدار کرنے کے باب میں توجہ دلائی

○ ادارۂ اقلیم ادب کے سالانہ انتخابات میں مسرز غنی نعیم (صدر) رحمت یوسف زئی (معتمد) اور عبد القدیر انصاری (خازن) منتخب ہوئے

۳ مئی: ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے ۱۵ ویں سالانہ مقصدی کل ہند مشاعرہ جناب سید مکرم شاہ صدرنشین ریاستی تحصیل ٹیکسٹ بک کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر بی وینکٹ سوامی، وزیر لیبر نے ساوینر کی رسم اجرا انجام دی بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ جناب عابد علیخاں ایڈیٹر سیاست نے ادبی ٹرسٹ اور اردو تعلیمی ٹرسٹ کی فعال سرگرمیوں کا تعارف کراتے ہوئے ریاست میں اردو ماڈل اسکولوں کے قیام کو مستقبل کی اردو یونی ورسٹی کا نام دیا اور اردو کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والوں کی پرواہ کئے بغیر ٹھوس اور تعمیری کاموں کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس مشاعرہ میں کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی، شمیم جے پوری، جاوید اختر، شاذ تمکنت، گنیش بہاری طرز، فنا نظامی، ملک زادہ منظور احمد، اوج یعقوبی، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، خیرات ندیم، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، رئیس اختر، یکتا شبنم، عزیز النسا صبا، رحمان جامی، علی الدین نوید نے کلام سنایا ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے نظارت کے فرائض انجام دیے۔

○ جشن اردو کمیٹی کے ایک وفد نے مسٹر جلیل پاشاہ کنوینر کی قیادت میں سیاسی محکمہ تعلیمات کے عہدہ داروں ناظم اعلیٰ تعلیم، ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن اور سکریٹری بورڈ آف انٹرمیڈیٹ سے ملاقات کرتے ہوئے ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس اور جونیر کالجوں میں تدریسی سہولتوں کا مطالبہ کیا۔

۴ مئی: انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کی جانب سے مجوزہ اردو گھر اراضی مغلپورہ پر بصدارت نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ ایک جلسہ منعقد ہوا اس موقع پر جناب صدر نے روزنامہ "سیاست" کی دو مطبوعات "بگھی کے پیچھے چھوکرا" (مضامین مخدوم محی الدین) اور "دکن دیس" مرتبہ جناب زاہد علیخاں کی رسم اجرا انجام دی۔ ریاستی وزیر لیبر مسٹر وینکٹ سوامی جناب عابد علیخاں معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مخاطب کیا۔ جناب عابد علیخاں نے ریاست میں اردو کی جدوجہد میں انجمن ترقی اردو کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اردو گھر تعمیر فنڈ میں ایک لاکھ ۵۵ ہزار روپے محبان اردو کی طرف سے جمع ہوئے ہیں اور چند ماہ میں اردو گھر کی تعمیر کے ساتھ ہی اردو کی تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کا چارمینار کے شہر میں آغاز ہو جائے گا۔ جناب غلام صادق الدین معتمد انجمن شہر حیدرآباد اور مسٹر پیس سرینواس ریڈی نائب صدر انجمن نے بھی جلسہ کو مخاطب کیا۔

○ اقلیم ادب کے خصوصی اجلاس میں ڈاکٹر

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد لکچرر شعبہ اردو لکھنو یونیورسٹی) سے ادبی اور شعری موضوعات پر جناب مصلح الدین سعدی نے انٹرویو لیا۔ ملک زادہ منظور احمد نے بتایا کہ اردو کے شاعرے جمہور کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں اور ان سے تہذیبی قدروں کی بازیافت میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اس محفل کی صدارت کی۔ مختصر محفل شعر و سخن میں ڈاکٹر منظور احمد امان ارشد، مضطر مجاز، رحمٰن جامی اور رؤف خیر نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر حیدرآباد یونی ورسٹی نے ڈاکٹر ملک زادہ کا تعارف کرایا۔ مسز مغنی تبسم صدر اقلیم ادب نے خیر مقدمی تقریر کی اور سکریٹری رحمت یوسف زئی نے شکریہ ادا کیا۔

● فلمی دنیا کے معروف مکالمہ نویس اور جدید لہجے کے شاعر جناب جاوید اختر (بمبئی) نے لکھنو کے ڈاکٹر ملک زادہ محمد منظور احمد کے ہمراہ اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کے وفد سے بات چیت کرتے ہوئے ریاست میں اردو مسائل کے حل کے سلسلے میں ان کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے زنجیری بھوک ہڑتال کی جدوجہد کو مثالی قرار دیا۔

۵ رمئی: بزم اردو "اے جی آفس" کے زیر اہتمام محفل شعر منعقد ہوئی۔ ابتداً جناب عابد علیخاں ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی اور ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر (حیدرآباد) یونی ورسٹی نے اردو کے ادبی، تہذیبی اور تدریسی مسائل پر مخاطب کیا اور اردو دوستوں سے خواہش کی کہ وہ اردو کی ترقی میں عملی طور پر تعاون کریں۔ جناب سعید شہیدی میر مشاعرہ کے علاوہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، کیفی اعظمی، شاذ تمکنت، اوج یعقوبی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، وقار خلیل، فیض الحسن خیال اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

۶ رمئی: ہفت روزہ "شاہکار" کے زیر اہتمام بہ مقام وینکٹ راما ریڈی اردو ریسرچ سنٹر ایک محفل مشاعرہ جناب اوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مولانا ابو یوسف صدر نشین مجلس عاملہ اردو اکیڈیمی مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرہ میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، منوہر لعل بہار بشر وارثی، رفیق جعفر، صادق نقوی، عزیز بھارتی، راز عابدی، اسد انصاری، غلام جیلانی صادق، ساحر حیدرآبادی، سراج حیدرآبادی، ممتاز قادری، اور مدیر شاہکار انور ہاشمی (معتمد مشاعرہ) نے کلام سنایا۔

○ ریاستی سرکاری زبان کمیشن کے صدر پنڈت وندے ماترم راجندر راؤ نے اخباری نمایندوں کو بتلایا کہ تلگو ریاست کے نظم و نسق کی زبان ہے اور اردو کو اسکے مساوی موقف کا دیا جانا ممکن نہیں، کنڑی اور مرہٹی کی طرح اردو کو ریاست میں قانونی اور سرکاری تحفظ حاصل ہے۔

۷ رمئی: محفل خواتین کے اجلاس میں جو ڈاکٹر زینت ساجدہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ عظمت قیوم نے معروف افسانہ نویس ادیبہ محترمہ طیبہ خسرو کے افسانوی مجموعہ "سبز تر گان" کی رسم رونمائی انجام دی۔ محترمہ فاطمہ عالم، محترمہ سلطانہ شرف الدین اور صدر جلسہ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے طیبہ خسرو کے افسانوی اسٹائل اور انکی تخلیقی صلاحیتوں کو مضامین اور تقاریر کے ذریعہ خراج تحسین ادا کیا۔ محفل شعر میں مظفر النساء ناز، نسیم نیازی، بشیر موسوی، طاہر رضوی اور نور النساء تسکین نے کلام سنایا۔

○ ساوتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کے حیدرآباد یونٹ کا ایک خیر مقدمی اجلاس مسٹر کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر کی صدارت میں ہوا۔ "مالمناڈو" کے دانشور شاعر حضرت کاوش بدری کا جو اکیڈیمی کے نائب صدر بھی ہیں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ کاوش نے مدارس میں اردو کے تعلیمی اور ادبی مسائل پر روشنی ڈالی۔ جناب غوث احمد خاں ایڈیٹر فلمی تصویر اور جناب اکرام جاوید نے بھی مخاطب کیا۔ مختصر شعری محفل میں کاوش بدری، طالب خوندمیری، شاداب، بے دھڑک مدراسی اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

۹ رمئی: اردو ورلیسرچ اسوسی ایشن

جامعہ عثمانیہ کا ماہانہ علمی اجلاس پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اخلاقیات تحقیق کے موضوع پر ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے مقالہ سنایا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید نے اپنے کلام سے محفل کو مہکایا۔

۱۲ مئی: اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی ہڑتال کے ۲۰ ویں دن کمیٹی کے وفد کو ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ رام ریڈی اور وزیر پنچایت راج مسٹر یم باگا ریڈی نے اس امر کا تیقن دیا کہ ایکشن کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ مطالبات کو اطمینان بخش طریقے پر حل کردیا جائے گا ہر دو وزرا نے کمیٹی کو احتجاجی مہم ترک کردینے کا مشورہ بھی دیا۔

۱۳ مئی: مرحوم صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد کی ۷۵ ویں سالگرہ پر ایک قومی تقریب جناب طاہر علی خاں رکن اقلیتی کمیشن کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب احمد شریف وزیر اوقاف، جناب سید رحمت علی (یم پی) جناب یم بالیا چیرمن "صدا" اور مسٹر بی کرشنا پارلیمانی سکریٹری نے مخاطب کیا اور قومی استحکام میں فخرالدین علی احمد کی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ اس موقع پر محفل مشاعرہ میں مسز سعیدہ شہیدی، امیر احمد خسرو علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، مسز ہیمل بہار، عزیز النساء صبا اور معتمد شاعرہ وقار خلیل نے کلام سنایا۔ جناب عارف الدین سلیم (بھارت نیوز) اور مسز فکر حیدرآبادی وعلی احمد صدیقی (دکنو نیوز) نے بھی مخاطب کیا

۱۴ مئی: ڈاکٹر حسینی شاہد سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے مسٹر وندے ماترم راجندر راؤ صدر سرکاری زبان کمیشن کے اس بیان کو انتہائی افسوس ناک قرار دیا کہ اردو بدیشی زبان ہے اور اسے مسلمہ قرار دینے کا نتیجہ ملک کی ایک اور تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوگا ڈاکٹر شاہد نے مسٹر وندے ماترم کی لسانی عصبیت پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اردو اسی ملک کی زبان ہے اور دستور کی مسلمہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے، شمالی ہند میں عوام کی معتد تعداد اسے بولتی ہے یہ زبان نظام حیدرآباد کی زبان ہرگز نہیں ہے

۱۶ مئی: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے صدر جناب حبیب الرحمٰن اور معتمد عمومی جناب عابد علی خاں نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے واضح کیا کہ ریاست میں تلگو کو مستحقہ مقام دلانے میں اردو والوں کا بھرپور تعاون حاصل رہیگا پریس کانفرنس میں اردو قائدین نے حکومت سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ وہ اردو بولنے والوں کو دئے گئے تیقنات پر عمل آوری کرتے ہوئے اردو والوں کو مطمئن کرائے اور قانون کی دفعہ میں مناسبت ترمیم کے مطالبہ کو تسلیم کرے۔

۱۷ مئی: اردو، تلگو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی زبانوں کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کا ایک نمائندہ جلسہ میں عظیم فلسفی ژان پال سارتر کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ کنوینر جلسہ جناب قدیر زماں نے فلسفہ وجودیت اور سارتر پر تعارفی تقریر کی۔ جناب محسن علی نے انگریزی میں فلسفیانہ ادراک و شعور پر مبسوط انداز میں روشنی ڈالی۔ ہندی شاعر مسٹر وینو گوپال نے سارتر کے ادبی کارناموں کا ذکر کیا۔ مراٹھی ڈرامہ آرٹسٹ مسٹر ڈی، ڈی بندو نے سارتر کی ڈرامہ نگاری پر مخاطب کیا مسٹر خالد قادری نے سارتر پر دلچسپ خاکہ اور مسٹر یوسف اعظمی نے وجودیت، جدیدیت اور عصریت کی تثلیث میں سارتر شناشی کا ثبوت دیا۔

۱۸ مئی: ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ایک نمائندہ احتجاجی جلسہ عام صدر انجمن پروفیسر حبیب الرحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز راج بہادر گوڑ، یم بالیا چیرمن "صدا"، رام بھٹلا کرشنا سورتی ایڈیٹر اینا ڈو (تلگو) عابد علیخاں، کے یل مہندرا (یم یل سی) کیہم خان (ترقی اردو بورڈ) غلام یزدانی، تلگو شاعر اور ادیب انکوری پرشاد اور جی ملاریڈی نے اپنی تقریروں کے ذریعہ ریاست میں

اردو تلگو اتحاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ساتھ ناانصافی کو ایک تہذیب کے ساتھ ناانصافی قرار دیا اور سرکاری احکامات و تیقنات پر بھرپور عمل آوری کا مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد شریک معتمد انجمن نے شکر ادا کیا۔

○ حلقہ ارباب ذوق نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ اجلاس پروفیسر غلام عمر خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے عبدالرؤف عروج کی نئی کتاب ”بزم اقبال“ پر عالمانہ تبصرہ کیا۔ جناب محمد منظور احمد معتمد نے شکر ادا کیا۔

○ ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ رام ریڈی نے آغا خاں تعلیمی بورڈ کے سالانہ جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ بورڈ کی جانب سے اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کا قیام بھی عمل میں لایا جانا چاہیئے۔

۲۴ مئی: ادارہ ادبیات اردو کے سہ روزہ امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی اور اردو زباندانی حیدرآباد شہر کے دو مراکز کے علاوہ دہلی، عادل آباد، ورنگل، نیلور، ادونی، وقار آباد اور مکتھل پر منعقد ہوئے۔

○ ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈمی جناب یم باگا ریڈی نے اسٹوڈنس ایکشن کمیٹی کے وفد کو اس امر کا تیقن دیا کہ اردو سے متعلق مطالبات کی یکسوئی کے لیے اعلیٰ سرکاری سطح پر جائزہ لیا جا رہا ہے اور ریاست میں اردو کے تمام مسائل کی جلد یکسوئی کر دی جائے گی۔ مسٹر ریڈی نے وفد پر واضح کیا کہ چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی بھی اردو کو اس کا مستحقہ مقام دینے میں مکمل دلچسپی رکھتے ہیں

○ روزنامہ ”انگارے“ کے ۲۷ ویں تاسیس کے موقع پر ٹیلی پرنٹر کی تنصیب عمل میں آئی۔ اس موقع پر ایک تہنیتی تقریب کو ریاستی وزیر اطلاعات شریمتی سروجنی دیوی پلا ریڈی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ نے اردو زبان کو ریاست کے تہذیبی مستقبل کے لیے اہم ترین اور شاندار رول انجام دینے کا فریضہ سونپا ہے۔ اس جلسہ کو مسٹر زو نوور داؤ ہیڈ اطلاعات، یدھ ویر ایڈیٹر ملاپ، ایڈیٹر ایناڈو (تلگو) نے مخاطب کیا۔ انگارے کی طویل صحافتی خدمات پر جناب اعجاز قریشی ایڈیٹر بھارت نیوز نے ایک مبسوط مقالہ کے ذریعہ خراج تحسین ادا کیا۔

۲۵ مئی: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے صدارت کی۔ جناب ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری پر عالمانہ اور جناب صادق نقوی نے ”ادب اور تاریخ کا باہمی رشتہ“ کے زیر عنوان مضمون سنایا۔ ڈاکٹر رشید، محمد منظور احمد، وقار خلیل، عبدالمتین نیاز، صادق نقوی، ساحر حیدرآبادی اور عزیز انصاری نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

۲۷ مئی: اردو فارسی کے اسکالر بزرگ ادیب جناب رائے محبوب نراین گوڑ رحلت کر گئے۔ آنجہانی رائے محبوب نراین حیدرآبادی تہذیب اور لائبریری تحریک کے ترقی پسند فرد تھے۔ چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے رائے محبوب نراین کی وفات پر تعزیتی بیان میں کہا کہ ان کی وفات سے حیدرآباد کا ایک مہذب اور گنگا جمنی کلچر کا دانشور اٹھ گیا۔

۲۸ مئی: انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کے زیر اہتمام ریاست میں اردو کے مسائل کے سلسلہ میں اور تحفظ و ترقی اردو کی تائید میں احتجاجی جلسہ عام مسٹر کے سرینواس ریڈی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نواب میر احمد علی خاں سابق صدر ریاستی انجمن ترقی اردو اور جناب عابد علی خاں معتمد عمومی ریاستی انجمن کے علاوہ مسٹر کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر، مسٹر سرینواس لاہوٹی، مزدور لیڈر محمد غوث، انجمن شہر حیدرآباد مسٹر احمد بلیغ اور سکریٹری غلام صادق الدین نے مخاطبہ

کیا اور ریاست میں اردو کی ترقی اور تحفظ کے لئے سرکاری احکام پر عاجلانہ عمل آوری کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر رائے محبوب نارائن کی وفات پر قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

۲۹ رمئی: ترقی اردو بورڈ حکومت ہند کے زیر انتظام قایم کردہ مرکز خوش نویسی ادارہ ادبیات اردو میں خوشنویسی کی تربیت حاصل کرنے والے طلباء اور جونیر استاد کا انٹرویو لیا گیا۔ اور سال اول کے لیے ۱۵ طلباء کا انتخاب عمل میں آیا۔ جونیر استاد کی حیثیت سے معروف خوشنویس جناب محمد عبدالسلام کا تقرر بھی کمیٹی نے کیا۔ مسٹر غوث محمد خاں سینیر استاد کی حیثیت سے مرکز خوشنویسی میں کارکرد ہیں۔

۵ ادبستان دکن کے زیر اہتمام دکن کے استاد سخن حضرت صفی اورنگ آبادی کی یاد میں ادبی اجلاس جناب وقار صدیقی لکچرار عربی سٹی کالج کی صدارت میں منعقد ہوا جناب رؤف رحیم نے صفی کی شخصیت اور فن پر طویل مقالہ سنایا۔ جناب غلام یزدانی کنوینر تلنگی سل کانگریس آئی نے ریاستی انجمن ترقی اردو کی منظورہ احتجاجی قرارداد کی تائید کرتے ہوئے قانون سرکاری زبان کی دفعے میں تبدیلی پر زور دیا جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد نے حضرت صفی کی یاد میں ایک دارالمطالعہ کا افتتاح کرتے ہوئے۔ بزرگ شاعر حضرت شمس الدین تاباں کو خراج تحسین ا... کیا کہ ان کی کوششوں سے ادبستان د... نے ملک کے نامور شاعر کی حیات ا... خدمات کو نئی نسلوں سے روشناس کر... کی سعی مشکور کی ہے۔

۳۰ رمئی: ادبستان دکن... زیر اہتمام جناب خواجہ شوق کی صدار... میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ صفی کے تلا... اور قدیم مکتب سخن کے کئی شعرا... کلام سنایا۔

اردو لکھیے
اور
اردو پڑھیے اور پڑھائیے

حیدرآبادی شعراء کی نئی اور قابل مطالعہ مطبوعات

بساطِ رقص	(کلیات)	مخدوم محی الدین	۱۵ روپے
برق و آشیاں	(شاعری)	سعید شہیدی	۵ روپے
مہکتے ویرانے	(شاعری)	بانو طاہرہ سعید	۱۰ روپے
شکن در شکن	(")	صلاح الدین نیر	۱۵ روپے
آئینۂ دل	(")	رئیس اختر	۱۵ روپے
شاعری	—	وقار خلیل	۷ روپے
ڈالی ڈالی پھول	(بچوں کے لیے نظمیں)	وقار خلیل	۶ روپے

ملنے کا پتہ

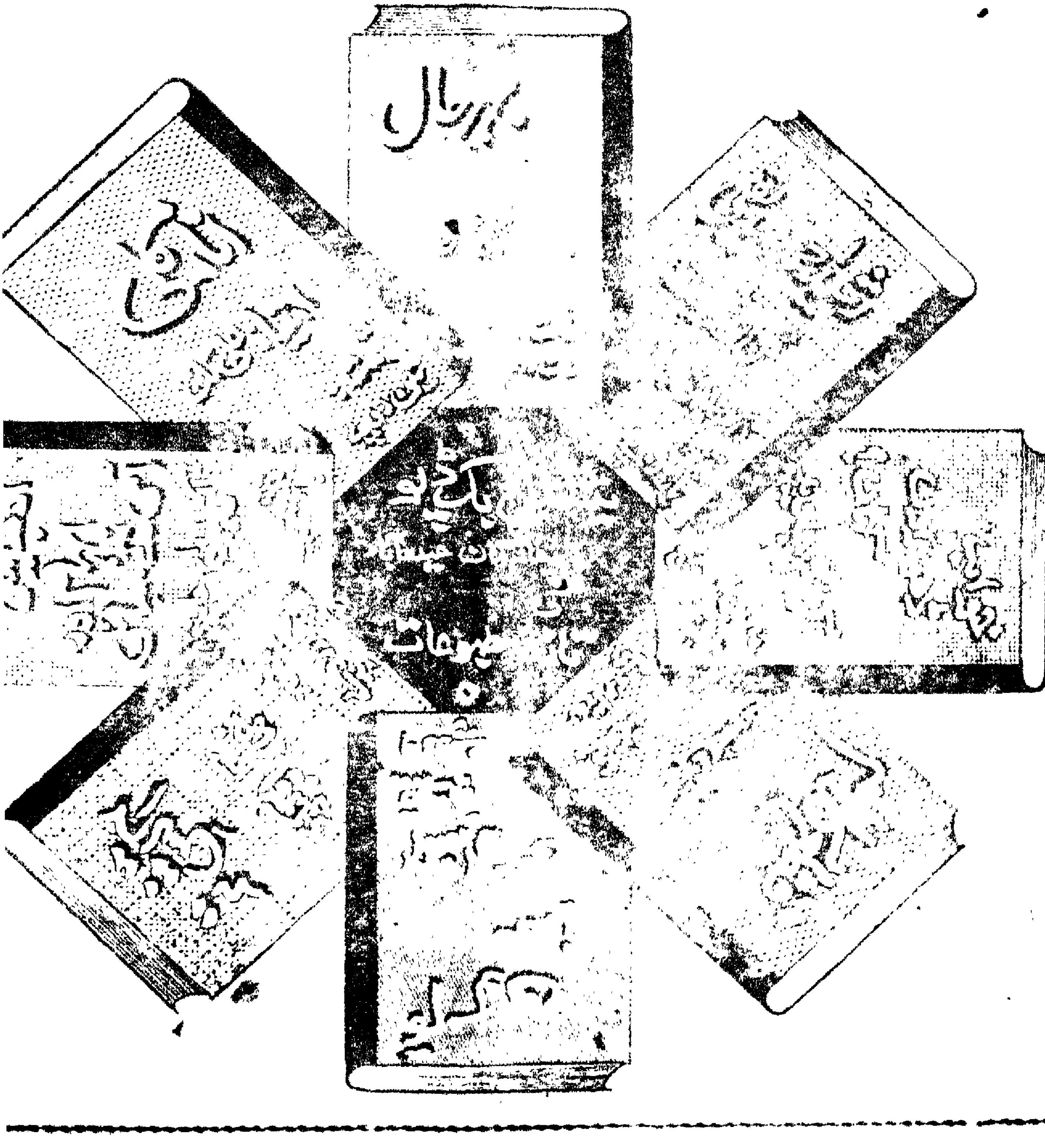
سب رس کتاب گھر۔ ایوان اردو۔ پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد

--1980

R. N. 10922/5
Regd. H/HD. 13

The "SABRAS" Urdu Monthly

rgan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P.)





7

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

فون: ۳۸۴۶۹

سن اجراء: ۱۹۳۸ء

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۳ جولائی ۱۹۸۰ء شمارہ ۷

مدیر اعزازی ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل

ادارۂ ادبیات اردو ○ پنجہ گٹہ ○ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے

سالانہ

معمولی ڈاک سے
۲۰/- روپے

رجسٹری سے
۴۵/ روپے

کتب خانوں اور اداروں سے
۲۵/- روپے

بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
امریکہ	۱۴ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد۔ ۲

فہرست

اداریہ	ڈاکٹر مغنی تبسم	۲
حالی اور تاریخ کا مادی شعور (مقالہ)	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	۴
غزل	علی احمد جلیلی	۱۲
غزل	حمدون عثمانی	۱۲
دو غزلیں	مقبول فاروقی	۱۳
بڈھا (انشائیہ)	تقی حسین خسرو	۱۴
برزخ (نظم)	یوسف اعظمی	۱۹
چاندنی کا کھنڈر (نظم)	یوسف اعظمی	۱۹
دو غزلیں	باذل عباسی	۲۰
پچھتاوا (کہانی)	عوض سعید	۲۱
دو غزلیں	رشید عبدالسمیع	۲۵
دو غزلیں	اشرف رفیع	۲۶
دکنی زبان کا ایک باکمال شاعر (مقالہ)	ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری	۲۷
غزل	ماہر لکھنوی	۳۱
غزل	جرار اکبرآبادی	۳۱
کاسمک شعاعیں (سائنسی مضمون)	سید شاہ سراج الدین	۳۲
اردو نامہ	وقار خلیل	۳۵
نقد و نظر	ناز صدیقی - یس - جے - صادق	۳۹

باتیں

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے کام میں جو ادارے سرگرم عمل ہیں ان میں ترقی اردو بورڈ بیورو نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ حکومت ہند نے ۱۹۶۹ء میں یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ ابتدا میں اس کی حیثیت ایک مشاورتی بورڈ کی تھی جس کا کام ملک میں اردو کی ترقی سے متعلق مسائل پر حکومت کو مشورے دینا تھا۔ اس کی حیثیت سنٹرل ہندی ڈائرکٹریٹ کے ایک ذیلی یونٹ کی سی تھی۔ رفتہ رفتہ بورڈ کے دائرۂ عمل میں توسیع ہوتی گئی اور حکومت کو اردو کے فروغ کے معاملات میں مشورہ دینے کے علاوہ اردو والوں میں علمی مزاج اور سائنٹیفک انداز فکر پیدا کرنا اور اردو زبان میں جدید علوم و فنون سے متعلق سائنٹیفک انداز کی علمی، معلوماتی اور حوالہ جاتی کتب شائع کرنا بھی بورڈ کے مقاصد قرار پائے۔ ۱۹۷۳ء میں بورڈ کو توسیع دی گئی اور ترقی اردو بیورو کی تنظیم عمل میں لائی گئی لیکن اس کا تعلق سنٹرل ہندی ڈائرکٹریٹ سے باقی رکھا گیا۔ ترقی اردو بیورو نے چند بنیادی کاموں سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا سب سے اہم کام اصطلاحات سازی کا تھا کہ اس کے بغیر اردو میں عصری علوم و فنون کی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمے کا کام ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک معیاری اور عصری اردو لغت، انگریزی اردو لغت، اردو لغت برائے طلبہ اور اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کا منصوبہ بنایا گیا۔ اردو کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے اشاعتی کام کو بہتر بنانے اور خطاطی کے فن کو ترقی دینے کے لیے خوش نویسی کے تربیتی

راکز کے قیام کی تجویز ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف سماجی اور طبعی علوم کی کتابیں تالیف و ترجمہ کروانے کی اسکیم بھی منظور کی گئی۔
ن تمام منصوبوں پر عمل درآمد شروع ہوا لیکن کام کی رفتار نہایت سست اور غیر تشفی بخش رہی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ
قی اردو بیورو ہر معاملے میں سندی ڈائرکٹریٹ کی نظرِ کرم کا محتاج رہتا تھا۔ اس کے کاموں میں ایسی رکاوٹیں حائل ہو
اتیں کہ وہ بالکل بے بس ہو جاتا تھا۔ شکر ہے کہ اب یہ صورتِ حال باقی نہیں رہی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں بیورو کو وزارتِ تعلیم
کومت ہند کے تحت ایک علیحدہ سبارڈینیٹ آفس کی حیثیت دی گئی۔ اس سال بیورو کے لیے ایک بااختیار ڈائرکٹر
ی جگہ قائم کی گئی جس پر ۱۴ جنوری ۱۹۸۰ء کو اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا تقرر کیا گیا۔ فاروقی
ماحب کے اس عہدے کا جائزہ لینے کے بعد بیورو کے کاموں کی رفتار میں سرعت پیدا ہو گئی ہے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا
ا کام تکمیل کے مرحلے میں پہنچ چکا ہے لیکن اس کی اشاعت معرضِ تاخیر میں پڑی ہوئی تھی اب یہ کام شروع ہو رہا ہے اور
امید ہے کہ جلد ہی اس کی تمام جلدیں شائع ہو جائیں گی۔ لغتوں کی تیاری کے کام میں بھی تیزی پیدا کر دی گئی ہے۔ بہت
ساری کتابیں جو بورڈ کی جانب سے لکھوائی یا ترجمہ کروائی گئی تھیں لیکن ان کی طباعت تعویق میں پڑی ہوئی تھی
اب چھپ کر شائع ہونے لگی ہیں۔ مراکزِ خوش نویسی بھی اب تشفی بخش طور پر کام کرنے لگے ہیں۔ پرانے منصوبوں کو آگے بڑھانے
کے علاوہ بیورو نے اس سال چند نئے منصوبے بھی بنائے ہیں جن میں اردو انگریزی لغت، مراسلاتی کورس اور اردو
کتابوں کی ببلیوگرافی کی تدوین شامل ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب جیسے ذہین فعال اور
جرأت مند ڈائرکٹر کی سرکردگی میں بیورو اپنے تمام منصوبوں کو جلد پایۂ تکمیل کو پہنچائے گا۔

ترقی اردو بورڈ کا ایک اہم فریضہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ اردو کے فروغ کے معاملات میں حکومت ہند کو مشورے
دینا بھی ہے۔ ہمارے خیال میں بورڈ کی اولیں ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حکومت پر زور دے کہ وہ گجرال کمیٹی کی سفارشات
کو فوراً روبہ عمل لائے کیوں کہ اس کے بغیر ملک میں اردو کا موقف ہنوز غیر متعین سا ہے اور اس کے حقوق کی
پامالی کا سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔

گزشتہ دو ماہ میں اردو دنیا دو بڑے سانحوں سے دوچار ہوئی۔ اردو کے منفرد مزاح نگار کنھیا لال کپور کا ۲۵ مئی
کو ۷۰ برس کی عمر میں پونا میں انتقال ہو گیا۔ کنھیا لال کپور نے اردو ادب کو مزاح نگاری کے نئے اسالیب سے آشنا کرتے
ہوئے اسے پایۂ اعتبار بخشا تھا۔ دوسرا سانحہ ل۔ احمد اکبرآبادی کی وفات کا ہے وہ ۱۶ جون ۱۹۸۰ء کو آگرے میں
انتقال کر گئے۔ اردو میں رومانوی تحریک کو فروغ دینے میں ل احمد کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ادارۂ سب رس ان مرحوم
ادیبوں کے پسماندگان سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔

مغنی تبسم

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

حالی اور تاریخ کا مادّی شعور

"ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے ———— اور ہم کو اپنے تنزل کا پختہ یقین ہو گیا ہے" ————

یہ اقتباس حالی کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔ اس اقتباس میں حالی نے اپنے عہد کی بے معنویت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بے معنویت جو ۱۸۵۷ء کے تاریخی عمل کے بعد برصغیر کے ذہن میں پیدا ہوئی لیکن یہ بے معنویت صرف ان ذہنوں میں محسوس کی جا سکتی تھی جو تاریخ کا مادی شعور رکھتے تھے۔ حالی نے اس شعور کے ادراک سے اپنے تنزل کے اعلان نامہ پر دستخط کئے ہیں۔ حالی اس کا شعور رکھتے تھے کہ کوئی نظام تاریخی اعتبار سے اس وقت تک جاری رہ سکتا جب تک کہ وہ پیداواری صلاحیتوں کو ترقی دیتا رہتا ہے۔ ان صلاحیتوں کے زوال سے نظام بھی زوال کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر زوال کے بعد بے معنویت کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے۔ حالی کے نزدیک بے معنویت کا احساس ہی معنویت پیدا کرتا ہے۔ حالی اور ان کی نسل کا پورا تخلیقی سفر بے معنویت سے معنویت کا ایک طویل سفر ہے۔ بے معنویت کے اس احساس سے برصغیر میں جدید فکر اور نظریات کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی ارتقائی صورت ہمارے اپنے عہد تک آ پہنچی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حالی کے نزدیک اس بے معنویت کو کن عوامل نے پیدا کیا۔ وہ ان عوامل کو دریافت کرتے ہوئے ان منابع تک پہنچتے ہیں جن سے اس بے معنویت کی تخلیق ہوئی۔ انھوں نے ان عوامل کا تاریخی طور پر تجزیہ کیا ہے ان کی تجزیاتی فکر ان کے لکھے ہوئے سینکڑوں صفحات پر بکھری ہوئی ہے ان کو مختصر طور پر سمیٹ کر ہم جن نتائج کو اخذ کرتے ہیں ان کا نہایت مختصر ذکر میں یہاں پیش کروں گا۔ حالی کو یہ نتائج برصغیر کے مسلمانوں کی صدیوں کی تہذیب و ثقافت، مذہب اور تاریخ کے ادراک سے حاصل ہوئے ہیں۔ حالی جن نتائج تک پہنچتے ہیں ہم آج ان کے محدود ہونے کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں بہت بہتر سماجی اور سائنسی علوم حاصل ہیں جو حالی کے زمانے میں موجود نہیں تھے، لہٰذا حالی کے اس تجزیے سے انصاف ان کے عہد کے علوم کے دائرے کو پیش نظر رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

حالی کے تجزیے کے مطابق "روایت پرستی" بے معنویت کی بنیاد ہے وہ فکری ارتکاز کے خلاف ہیں۔ وہ دنیا کو بنی بنائی چیزوں کا ایسا مرکب نہیں سمجھتے جو تبدیلیوں سے بے نیاز ہے۔ ان کے خیال میں تبدیلیوں کا ایک مسلسل

عمل ہی اشیاء اور فکر کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس عمل کے رکنے سے تہذیبی و ثقافتی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے بے معنویت جنم لیتی ہے، ان کے خیال میں کوئی نظریہ یا کوئی فن مطلق نہیں ہے۔ یہ اپنے عہد کے مخصوص رویوں سے پیدا ہوتا ہے اور ان رویوں کے بدلنے سے نظریے اور فن کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے ان کی بقا اسی صورت میں ہے کہ یہ نئے عہد کے رویوں سے ایک معنویت تلاش کرلیں۔ حالی یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا تہذیبی و ثقافتی فن صدیوں سے معنوی ارتکاز اور فکری جمود کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اسی لیے ہماری فکری تہذیبی اور مادی ترقی طویل عرصہ سے رک گئی ہے۔ ہم نے ایک مخصوص عہد کی روایات کو دوسرے عہد میں منتقل کر دیا ہے۔ جب کہ دوسرا عہد اس کا متحمل نہیں ہے۔ حالی روایت پرستی اور جمود کے خلاف لکھتے ہیں:

• جو کچھ کرنا تھا اگلے کر گئے اب اس سے زیادہ کرنا (تمہارے نزدیک) غیر ممکن ہے۔ تمہارے نزدیک جس قطع کی کشتی طوفان نوح میں بنائی گئی تھی اس سے بہتر کوئی وضع انسان کے ذہن میں نہیں آ سکتی اور جو پیشہ آج سے ہزار برس پہلے تمہارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا اس کے سوا کسی حیلے سے تم روٹی نہیں کما سکتے۔ تمہارے نزدیک تمام عقل انسانی پہلے طبقوں پر تقسیم ہو گئی اور انھوں نے تمہارے لیے کوئی موقع ایسا نہ چھوڑا جس میں تم کو اپنی انسانیت سے کچھ کام لینے کی ضرورت پڑے۔ شیخ نے "قانون" میں بدن انسان کی تشریح جو لکھ دی سو لکھ دی اور محمد حسین دکنی "برہان قاطع" میں لغات فارسی کی جو تحقیق کر گیا سو کر گیا۔ اب کون ہے جو "قانون" سے کچھ بڑھ کر لکھ سکے یا برہان میں کوئی عیب نکال سکے تم صرف انہی لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو حسن عقیدت ہے بلکہ طب میں جالینوس کی، منطق میں ارسطو کی، ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اسی قدر ضروری جانتے ہو جس قدر مذہب میں امام اعظم کی تقلید تمہارے نزدیک واجب ولازم ہے۔"

حالی نے یہاں ہمہ گیر روایت پرستی اور جمود کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ روایت پرستی، ٹیکنالوجی، معاشیات، طب، ادب، منطق، ثقافت اور مذہب پر محیط ہے۔ ان کے خیال میں تہذیبی ترقی کے یہ تمام شعبے روایتی تصورات کے جمود میں پھنسے ہوئے ہیں اور پورا معاشرہ اس کے باعث غیر تخلیقی ہو کر رہ گیا ہے۔ جس سے ہر شئے بے معنویت میں الجھی ہوئی ہے۔ حالی نے ہمارے تہذیبی بانجھ پن میں جن دیگر عوامل کو دریافت کیا ہے ان میں ایشیائی طرز حکومت قومی سلطنت کا سہارا اور برصغیر کے طبعی حالات ہیں۔ طبیعی حالات کے سلسلے میں حالی کا یہ شعر سنیے!

ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کر دیا
تو نے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا

گویا حالی تخلیقی جوہر سے محرومی کے اسباب میں ایک سبب برصغیر کی آب و ہوا کو سمجھتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ بدلتے ہوئے موسموں کی شدت پیداواری صلاحیتوں پر کسی حد تک اثر انداز ضرور ہوتی ہے مگر یہ انسانوں کو صلاحیتوں سے معرا نہیں کر سکتی۔ انسانوں کو صلاحیتوں سے معرا پیداواری وسائل کرتے ہیں لیکن حالی کا یہ تجزیہ کہ قومی زوال کا سبب ایشیائی طرز حکومت اور قومی سلطنت کا سہارا ہے درست ہے کہ حالی اپنے تجزیاتی جائزے میں بتاتے ہیں کہ ان کے عہد کے سکون و جمود کو ان کی نسل نے نہیں پیدا کیا بلکہ نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب حالی کے نزدیک

ایشیائی طرزِ حکومت ہے۔ ان کے خیال میں اس طرزِ حکومت کی اصل خرابی یہ ہے کہ اس میں عوام کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے امورِ حکومت میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ خود کو بالکل الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ وہ اجتماعی جد و جہد سے سروکار نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سکون و جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ کاہل اور سست ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا حالی کا نقطۂ نظر یہ بنتا ہے کہ جاگیرداری نظامِ حکومت میں دو ثقافتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک ثقافت جاگیردارانہ اقدار کی تخلیق ہے اور دوسری ثقافت عوام کی ہے۔ اوّل الذکر ثقافت استحصال کرنے والوں کی ہے۔ اور مؤخر الذکر ثقافت استحصال کا شکار ہونے والوں کی ــــ عوام کے استحصال کی نوعیت جاگیردار معاشرے میں کیا ہوتی ہے، یہ خود حالی کی زبانی سنیے۔

"خود مختار سلطنت میں عام اس سے کہ بادشاہ ظالم ہو یا منصف ــــ رعیت بعینہٖ ایسی ہوتی ہے جیسے غسال کے قبضہ میں میت!"

یا یہ کہ:ــــ

"کمزوروں اور مظلوموں کی اعانت کرنا یا حق داروں کے حقوق دلوانے میں کوشش کرنا یا عاملوں کے ظلم و تعدی کی شکایات کرنا خود مختار سلطنت میں ایسا ہی جرم ہوتا ہے جیسے "بغاوت"!"

ان بیانات میں حالی خود مختار سلطنت سے مراد مطلق العنان سلطنت لیتے ہیں۔ ان بیانات میں انھوں نے جاگیرداری عہد کے خلاف تاریخی شہادت دی ہے۔ یہ شہادت ماضی کی تاریخ ہی پر صادق نہیں آتی، اس کا اطلاق برطانوی کے نظامِ حکومت پر بھی ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ مصلحتاً اس کا اقرار نہیں کرتے بقول حالی جاگیرداری نظامِ حکومت میں عوامی وسائل اور صلاحیتوں کو عوامی مقاصد کے لیے بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ چوں کہ عوام شعوری طور پر سمجھتے ہیں کہ ان کے وسائل کسی اور طبقے کے مفاد میں استعمال کیے جا رہے ہیں اس لیے وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکتے اور رفتہ رفتہ صلاحیتیں ناکارہ ہوتی گئیں، بہ الفاظ حالی:ــ

"اس میں شک نہیں کہ خود مختار سلطنت رعیت کے قوائے عملیہ کو بالکل معطل اور بے حس و حرکت کر دیتی ہے۔ نہ وہ ملکی معاملات میں دخل دے سکتے ہیں، نہ مذہبی امور میں کوئی بات آزادی سے جمہور زبان پر لا سکتے ہیں۔ نہ قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں اور صرف اپنی ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا ملک کے کاموں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے ان میں صبر و تحمل اور قناعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر ہمت، دلیری، اولوالعزمی، غیرت و حمیت کم ہوتے ہوتے چند نسلوں کے بعد بالکل فنا ہو جاتی ہے۔"

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں حالی نے اس تجزیہ میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ اپنے عہد کے علم اور تاریخی تجزیہ کی بنیاد پر کہا ہے اس لیے آج کے سماجی شعور اور تجزیہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینا زیادتی ہوگا۔ تو پھر اس جائزے کے حوالے سے حالی کے سماجی شعور سے جو بات برآمد ہوتی وہ یہ ہے کہ قومی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ میں اجتماعی کوششیں ہوں، معاشرے میں حکمرانوں اور عوام میں ایک مربوط رابطہ استوار ہو، اسی رابطہ سے معاشرتی ترقی ممکن ہے۔

بے معنویت کو جنم دینے میں حالی نے قومی سلطنت کا بھی ذکر کیا ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ :—

"قومی سلطنت کے سہارے نے رہے سہے قوائے عملیہ کو معطل کر دیا۔ اور یہ حالت نسل در نسل منتقل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کاہلی، سستی، بیکاری، افسردگی، مایوسی اور بزدلی ہماری قومی خصلتیں بن گئیں اور شدہ شدہ بزرگوں کی میراث ہم تک پہنچی۔"

حالی کے خیال میں ان مختلف عناصر نے برصغیر کے مسلمانوں میں بے معنویت پیدا کی ہے۔ جس کے باعث وہ غیر تخلیقی ہو کر بے عمل ہو گئے ہیں اور اسی بے عملی نے ان کے زوال کی تکمیل کر دی ہے۔ اس بے عملی کو جن عناصر نے پیدا کیا ہے۔ ان کی طرف میں یہاں صرف اشارہ کروں گا (ان کا ذکر آگے آئے گا) ان عناصر میں اول مسلمان زمینداروں کا زمینوں سے بے دخل کیا جانا۔ دوم شاہی اداروں کے زوال کے باعث شاہی ملازمتوں کا خاتمہ، سوم برطانوی اداروں میں مسلمانوں کا نہ لیا جانا۔ ان حالات میں مسلمانوں کی کیفیت کیا تھی اس بے عملی کا حالی نقشہ کھینچتے ہیں

"ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے لیکن کچھ کرتے نہیں۔ ہم پیاس کے مارے مرجاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چوائے۔

ہم توکل کو اس لیے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لیے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس لیے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں۔ ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔"

اب تک ہم نے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ جنھوں نے حالی کے خیال میں برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بے معنی بنا دیا تھا۔ یہ عوامل بقول حالی خود ان کی نسل نے پیدا نہیں کیے ہیں۔ بلکہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آئے ہیں ۱۸۵۷ء کی تاریخی تبدیلی کے بعد برصغیر کی تہذیبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور اسی دور نے نئے نئے علوم و فنون کی روشنی میں نئے نظریات اور نئے مسائل پیدا کیے جن سے زندگی کا ایک نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ ایک طرف برصغیر کے جاگیردارانہ عہد کے جامد تصورات اور روایات تھیں اور دوسری طرف مغرب کا جدید فلسفہ اور سائنس تھی۔ اس جدید فلسفہ اور سائنس کا تصادم اس زوال کے ان عوامل سے ہوا جن کی طرف ہم حالی کا تجزیہ پیش کر چکے ہیں ——————— اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حالی اور ان کی نسل جس دور میں پروان چڑھتی وہ زبردست ثقافتی بحران کا دور ہے۔ اس دور میں قدیم و جدید میں پہلی بار اتنا زبردست تصادم ہو رہا تھا۔ اس بحرانی دور میں دھماکہ خیز تصادمات وسیع پیمانے پر اور

فیصلہ کن انداز میں برصغیر میں ہو رہے تھے۔ تصادمات اور بے معنویت کے اس شدید بحران میں کسی واضح اوصاف اور قطعی وژن کا تلاش کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ منتے ہوئے نظام کا تجزیہ کرنے والوں کے ان عوامل کو تلاش کرنا جو ثقافتی پسماندگی اور پھر مکمل زوال اور بے معنویت کا باعث بنے تھے۔ نئے علوم و فنون ہی کی روشنی میں ممکن تھا اور پھر عوامل کے تجزیہ اور تلاش کے بعد سماج کو نئے جو اصولوں سے مربوط کرکے ایک معنی خیز تفتیش پیدا کرنا بہت مشکل ہے اس کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں۔ حالی کی بنیادی کوشش اس عہد کے تصادمات میں امتزاجی نظریہ کو تلاش کرنا ہے۔ جہاں معاشرتی عمل اور ردِ عمل سے کوئی امتزاجی صورت پیدا ہو سکے۔ قدیم و جدید کے تصادمات میں مذہب، پرانی تہذیب و ثقافت، پرانے علوم و فنون اور پرانے ذرائع پیداوار شامل تھے۔ جن کا تصادم سائنس، مذہب، نئی ثقافت اور تہذیب اور طبیعی علوم سے ہو رہا تھا۔ سائنس کا مذہب سے زبردست ٹکراؤ ہوا۔ اور قدیم و جدید کی ایک لامتناہی جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زبردست ثقافتی اور تہذیبی بحران میں بالخصوص دو مسئلے پیدا ہوئے اول یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کو بے معنویت سے معنویت کی طرف لانے کے لیے کونسا تہذیبی نسخہ استعمال کیا جائے اور دوم یہ کہ جدید و قدیم کے تصادمات کو اعتدال پر کیسے لایا جائے۔ عہد حالی کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس صورت حال میں برصغیر کے ممتاز ادیبوں نے کیا ردِ عمل ظاہر کیا اس دور کی ممتاز شخصیات میں سے ہم یہاں شبلی۔ اکبر اور سرسید کا ذکر کریں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ ان کے مقابلے میں حالی کا نقطۂ نظر اپنے عہد کے بارے میں کیا ہے۔ اور وہ کس حد تک اپنے عہد کے پیچیدہ مسائل اور ایک غیر ملکی حکومت کے اثرات کو سمجھ سکے ہیں۔

شبلی اپنے دور کی قابل شخصیت ہیں۔ اسلامی علوم و فنون میں ان جیسے عالم اور محقق کا مقام سب سے اعلیٰ ہے شبلی پہلے علی گڑھ سے منسلک تھے پھر وہ ندوہ سے وابستہ ہو گئے۔ علی گڑھ سے علیحدگی کا بڑا سبب یہاں کی جدیدیت تھی۔ جس سے شبلی ہم آہنگ نہ ہو سکے تھے۔ اپنے خیالات کے اعتبار سے وہ قدیم تعلیم کو جدید تعلیم پر فوقیت دیتے تھے۔ اور وہ اس طرح نئی تہذیب و ثقافت اور علوم سے کوئی رابطہ پیدا نہ کر سکے۔ سائنسی علوم اور جدید فلسفہ کے دور میں وہ علماء سے توقع رکھتے تھے کہ وہ قوم کی رہنمائی کریں گے وہ کہتے ہیں:۔

"علما جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات قوم کے دل و دماغ، قوم کی
معاشرت، قوم کا تمدن غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں
کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی"

شبلی تاریخ کے بدلتے ہوئے مادی تصورات کو نظر انداز کر جاتے تھے انھوں نے جاگیرداری نظام کے زوال کو شعوری طور پر محسوس نہ کیا۔ وہ سائنس ٹیکنالوجی اور سرمایہ کے عمل اور اثرات کو بدلتی ہوئی قدروں کے حوالے سے نہ سمجھ سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے علماء زندگی کے کسی بھی شعبہ کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لے سکے۔

حالی کے معاصرین میں اکبر ممتاز شاعر ہیں۔ وہ قدیم نظام کا احیا چاہتے تھے۔ وہ نظام جس میں بقول حالی رعایا کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے غسال کے قبضہ میں میت ——— اکبر نئے عہد سے کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ

قدیم نظام ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ نئے عہد کے علوم اور مادی قدروں کی تبدیلی کو یکسر رد کرتے ہیں۔ جدید نظریات کو رد کر کے وہ کوئی مثبت نظریہ تخلیق نہ کر سکے۔ نیا عہد ان کے لیے ایک زبردست ثقافتی صدمہ تھا اور وہ ایک کمزور مریض کی طرح سے پرانی ثقافت کی موت سے خائف رہتے تھے۔ وہ تاریخ کے اس مادی تصور کو نہ سمجھ سکے جس کے مطابق ایک عرصہ تک پیداواری قوتیں اس طرح ترقی کرتی رہتی ہیں کہ وہ متعین تعلقات پیداوار کے جوہر پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعین تعلقات پیداوار اس وقت تک نہیں بدلتے جب تک کہ تعلقات پیداوار پیداواری قوتوں کو بڑھنے کے لیے کافی گنجائش فراہم نہیں کرتے۔ اس کی مثال اس بچے سے دی جا سکتی ہے جو اپنے کپڑے اس وقت تک پہنتا ہے جب تک کہ اسکے لیے تنگ نہیں ہو جاتے۔ اکبر کی مثال اس بچے کی سی ہے جس کے کپڑے بہت تنگ ہو چکے ہوں اور پھر وہ بھی انھیں زبردستی پہننے کی کوشش کر رہا ہے۔

سرسید اس دور کی عہد ساز اور سب سے بڑی قد آور شخصیت ہیں۔ وہ نئے نظام فکر اور نئی تہذیب و تمدن کے اولین اور زبردست حامی تھے۔ وہ مسلمانوں کی قومی ترقی کے سب سے پرجوش اور سرگرم رہنما تھے۔ سرسید کی تحریک دراصل ایک تاریخی متحدہ محاذ ہے ان کی تحریک کے پس منظر کے لیے ہمیں تاریخ کا کچھ سفر طے کرنا ہوگا۔

۱۷۶۵ء میں بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی کے حقوق شاہ عالم ثانی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام منتقل کر دیے۔ دیوانی کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ کمپنی اسلامی نظام عدالت کو قائم رکھے گی۔ مگر ہوا یہ کہ کمپنی نے اپنے وسیع تر سماجی اور ملکی مسائل کے لیے اسلامی نظام عدالت کی برطانوی نظام عدالت نافذ کر دیا۔ کمپنی کے اس اقدام کی زد میں مسلمانوں کا متوسط طبقہ آ گیا۔ اسلامی عدالتوں میں تمام قاضی مسلمان ہوتے تھے۔ یہ طبقہ نئے عدالتی نظام کی آمد سے اپنے صدیوں پرانے وسیلے سے محروم ہو گیا۔ ۱۸ ویں صدی کے اسی زمانے میں جبکہ حکومت کا نظام انتشار کا شکار ہوا تو درمیانہ درجہ کے بے شمار گروہ شاہی ملازمتوں سے محروم ہو گئے۔ شاہی اداروں کی شکست و ریخت اور اقتصادی تباہی سے صدیوں پرانے موروثی ملازم بے روزگار ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک طے شدہ حکمت عملی کے تحت مسلمان جاگیرداروں کو دیوانی کے معاہدے کے بعد زمینوں سے بے دخل کر کے ہندو زمینداروں کو زمین کے ٹھیکے پر دینے لگی اور ۱۷۹۳ء کے دوامی بندوبست کے تحت کمپنی نے ان زمینداروں کو موروثی حقوق دے دیے۔ اس پالیسی کے اثرات مسلمان جاگیرداروں پر پڑے تو ان کی صدیوں پرانی شان و شوکت، عسکری قوت اور تہذیبی عظمت پارہ پارہ ہو گئی۔ جاگیرداری روایات میں تجارت کو کمتر اور حقیر پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کامیابیوں کو دیکھنے کے باوجود یہ گروہ اپنی طبقاتی روایات کے باعث اس طرف نہ آ سکا۔ لہٰذا رفتہ رفتہ زوال کی طرف بڑھنے لگا۔ انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت اس لیے بڑھی کہ ان کا طبقاتی اور تہذیبی وقار مجروح ہو گیا تھا۔ اگر ان لوگوں کو زمینوں کے حقوق حاصل رہتے تو یہ لوگ کمپنی کے ساتھ متحدہ محاذ بنائے رکھتے۔ یہ لوگ قومی آزادی کے تصور سے محروم تھے جب انھیں زمینوں سے محروم کر دیا گیا تو یہ کمپنی کے خلاف ردعمل کا اظہار کرنے لگے۔ یہ وہ بورژوا طبقات تھے جو مسلمان تہذیب و ثقافت کے نشان سمجھے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جن کی رہنمائی یہی طبقات کر رہے تھے ان کا مستقبل ہمیشہ کے لیے تاریک ہو گیا۔ ان حالات میں سرسید احمد خاں کا ظہور ہوا وہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات سے تعلق

رکھتے تھے۔ اور اپنے اس طبقاتی احساس سے انھوں نے ان طبقات کی ازسرِ نو بحالی کی تحریک شروع کی۔ میں نے اس تحریک کو جاگیرداروں اور شاہی ملازمتوں کے طبقات کے متحدہ محاذ کا نام دیا ہے اور سرسید اس متحدہ محاذ کے رہنما تھے ان کی تحریک کا مقصد ان طبقات کے تہذیبی وقار اور ان کی خوشحالی کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا تھا۔ سرسید نے جو نیا تعلیمی ڈھانچہ مرتب کیا تھا اس کے ذریعے اعلیٰ اور درمیانہ درجے کے لوگوں کی تعلیم ممکن تھی اور اس تعلیم کے بعد ان لوگوں کو سرکاری نوکریاں ملنے لگیں سرسید کے اس عمل سے بورژوا اشرافیہ حال طبقات کی بحالی تو تیزی سے ہونے لگی مگر قوم کا پرولتاریہ صدیوں پرانی محکومی میں جکڑا رہا۔

اس تاریخی جائزے کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ اس صورتِ حال میں حالی کا رویہ کیا تھا؟ ۱۹ صدی کے ربع آخر کی ذہنی تاریخ دیکھیے تو صرف حالی ہی ایک ایسی شخصیت نظر آتے ہیں جو عہد کے محدود تقاضوں میں ایک مثبت رویہ رکھتے ہیں۔ وہ سرسید احمد خاں کی طرح قوم کے لیے نئی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ مذہب کو مادی ترقی میں حائل نہیں سمجھتے لیکن حالی قوم کا تصور سرسید احمد خاں کی طرح محض اعلیٰ و درمیانہ درجے کے طبقات تک محدود نہیں کرتے۔ وہ سرسید اور ان کے عہد کے دیگر ادیبوں سے زیادہ ترقی پسندانہ سماجی شعور رکھتے ہیں۔ حالی قومی طبقات پر یقین رکھتے ہیں ان کے ہاں غیر طبقاتی معاشرے کا تصور نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کے عہد تک تاریخ میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کا رویہ ترقی پسندانہ ہے۔ سرسید احمد خاں کی تحریک میں تو جاگیردار، زمیندار، نوکر شاہی کے نمائندے اور متوسط درجے کے گروہ شامل تھے حالی، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد پہلے ادیب ہیں جن کے ہاں ابھرتے ہوئے متوسط درجے کا تصور ملتا ہے۔ یہ وہ طبقہ تھا جو نوکریوں اور مسلمانوں کی بچی کھچی میراث سے پیدا ہو رہا تھا۔ تاریخی طور پر ہم اس عہد کے اس طبقے کے کردار کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ حالی کے نزدیک ان کے عہد میں تین طبقات تھے۔ اعلیٰ درجہ، متوسط طبقہ اور ادنیٰ طبقہ، حالی ان طبقات کی خود وضاحت بھی فرماتے ہیں۔

> "اعلیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اسی حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سیف ہلپ سے دولت، عزت نیک نامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہم سروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر بڑھ نہیں سکتے۔"

حالی کے خیال میں اعلیٰ درجہ اور ادنیٰ درجہ نئے معاشرتی تناظر میں نئی پیداواری قوتوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے لیکن متوسط طبقے نے معاشرتی ترقی کے نئے جوہر سے سمجھوتہ کرکے، نئے معاشرتی ڈھانچے کو قبول کرلیا ہے۔ اس لیے موجودہ ہندوستانی معاشرے میں متوسط طبقہ ہی ایک ایسا طبقہ ہے جو جدید عہد میں نئی معاشرتی ضروریات کا ساتھ دے کر خود کو ایک نئی ابھرتی ہوئی ترقی پسند قوت بنا رہا ہے۔ حالی خود اسی نئے ابھرتے ہوئے طبقے کے فرد تھے لیکن طبقاتی طور

• اسی طبقے کی معاشرتی ترقی تک خود کو محدود نہیں کرتے۔ معاشرتی ترقی، ان کے نزدیک تمام طبقات کی ترقی ہے وہ قوم کے بالائی طبقات ہی کی نہیں بلکہ پوری قوم کی اجتماعی ترقی پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں جب تک تمام قومی طبقات میں علم، تعلیم اور خوش حالی نہیں پھیلتی۔ اسے ہم قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔ جب کہ سرسید کے ہاں قومی ترقی عملی طور پر صرف بالائی طبقات تک محدود ہو گئی ہے۔ حالی کہتے ہیں:-

"جب تک قوم کسی نہ کسی قدر عزت کا استحقاق حاصل نہیں کرتی۔ اس قوم کے چند آدمی اصل عزت کے مستحق نہیں ہو سکتے، جب تک تمام قوم میں علم کی روشنی نہیں پھیلتی علم کا سلسلہ کسی خاندان میں قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک تمام مرفہ الحال نہیں کوئی شخص دولت وحشمت سے اصلی خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔"

اس جائزے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ میں حالی کا قد سرسید سے زیادہ اونچا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک سرسید اپنے عہد میں سب سے قدآور ترقی پسند ادیب تھے اور موجودہ صدی کے ارتقا میں ان کے افکار و اعمال کا اہم حصہ ہے اور خود حالی ان کے مقلد ہیں۔ لیکن بعض قومی معاملات ایسے ہیں جن میں حالی کا رویہ ان کے عہد کے ادیبوں سے زیادہ ترقی پسندانہ ہے۔ وہ شبلی، اکبر اور سرسید سے بہتر فکر سوچ رکھتے تھے برطانوی حکومت کی مکمل اطاعت سرسید کا ایمان تھا۔ اس لیے سامراجی استحصال کے خلاف کچھ نہیں کہتے لیکن حالی برصغیر کے استحصالی نظام پر نظر رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ برصغیر کو برطانوی سامراج نے اپنی منڈی بنا کر رکھ دیا ہے خام مال نہایت کمتر شرائط پر جہاز کرنا ایسا عمل تھا کہ جس سے برصغیر کی دولت ہندوستان میں کھنچی چلی گئی۔ حالی کے عہد میں سودیشی تحریک چل رہی تھی۔ انھوں نے اس تحریک کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جو کچھ کہا اس سے حالی کی بصیرت ظاہر ہوتی ہے۔ حالی فرماتے ہیں:

"اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے جس کے راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے۔"

حالی کے دور بین نگاہیں یہ بھی جانتی تھیں کہ اس سرنگ کا راستہ بند کرنا آسان کام نہیں ان کا خیال تھا کہ:

"اس راستے کا بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس کے لیے جلدی کرنا پتھر سے مقابلہ کرنا ہے۔ اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اس کو بہت جلد کامیابی ہوئی۔"

ہندوستان کے اقتصادی ذرائع، ذرائع پیداوار اور استحصالی نظام کا جائزہ لے کر حالی نے جو کچھ کہا وہ آج پون صدی گزرنے کے باوجود صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ حالی سامراج کے ملبے ہاتھوں سے واقف تھے۔ حالی یہ بات بھی جانتے تھے کہ دو بعید ملکوں میں قتل و غارت سے لوٹ مار کا طریقہ بدل گیا ہے۔ اب یہ لوٹ کھسوٹ تجارت کے استحصالی نظام کے ذریعے ہو رہی ہے۔ جس سے ایک ملک کی دولت کھنچ کھنچ کر دوسرے ملک میں سمٹتی چلی جاتی ہے۔

(باقی سلسلہ ص ۲۴ پر)

غزل

علی احمد جلیلی

میکدہ آ کے حیران ہم ہو گئے
تشنگی بڑھ گئی جام کم ہو گئے

تیرے ہر نقش پر میرا سر جھک گیا
نقش جتنے تھے نقشِ قدم ہو گئے

دل کے ٹکڑے نہ بیکار اپنے گئے
دیر کچھ بن گئے کچھ حرم ہو گئے

قتل کر کے بھی وہ پارسا ہی رہا
بات کر کے گنہگار ہم ہو گئے

اک ترے غم سے کیا آشنائی ہوی
جتنے غم تھے غمِ محترم ہو گئے

پیار کی راہیں، راہیں صلیبوں کی ہیں
آپ کیا سوچ کر ہم قدم ہو گئے

وقت نے ساتھ چلنا سکھایا ہمیں
شاخِ گل بن کے تلوار ہم ہو گئے

درد کا رشتہ لوگو بڑی چیز ہے
وار اُن پر ہوا قتل ہم ہو گئے

کتنے دامن گناہوں سے بچ کر علی
پارسائی کی شبنم سے نم ہو گئے

حمدون عثمانی

غزل

دوزخ ہو یا کہ صحنِ چمن چاہیے مجھے
میں ہوں بھٹکتی روح بدن چاہیے مجھے

آخر چھپیں گے کیسے عیوب خود آگہی
ایک مشتِ خاکِ ارضِ وطن چاہیے مجھے

تسکینِ ذاتِ طبعِ پراگندہ کے لیے
اک جامِ صد حصار شکن چاہیے مجھے

حالات نے اتار لیے سب مرے لباس
ڈھکنے کو جسم اب تو کفن چاہیے مجھے

اس تیرگی میں اپنی وضاحت تو کر سکوں
اشکوں کی یا لہو کی کرن چاہیے مجھے

لفظوں کی آنچ سے کہیں چہرے جھلس نہ جائیں
اپنی طرف ہی روئے سخن چاہیے مجھے

مقبول فاروقی

دو غزلیں

○

دستِ جہلا میں ہے قوموں کی عناں
فلسفہ علم و ادب سب رائیگاں

رس نہیں رنگت نہیں خوشبو نہیں
تم کو اے بیتی رُتو ڈھونڈوں کہاں

جسم و جاں اپنی جگہ کچھ بھی نہیں
ہے قیامت اتحادِ جسم و جاں

لُٹ رہی ہے کب سے ناموسِ زمیں
دُور سے بس دیکھتا ہے آسماں

گھر سے مت نکلو کہ باہر دھند ہے
کوئی رستہ ہے نہ سمتوں کے نشاں

○

چلا نہ تھا تو پریشاں میں گھر میں کتنا تھا
کھلا کہ خوف و خطر بھی سفر میں کتنا تھا

عجب سفر تھا کہیں سایۂ شجر نہ ملا
عذاب دھوپ کا اس رہ گذر میں کتنا تھا

کچھ ایسے ٹوٹ کے بکھرے ہیں اب کہ کیا سمیٹیں
مقام اپنا خود اپنی نظر میں کتنا تھا

ہمارا کاتبِ تقدیر بھی اناڑی تھا
نہ سمجھا فرق بھی زیر و زبر میں کتنا تھا

ہوئے کچھ اور سبک دوستوں کی نظروں میں
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں کتنا تھا

تقی حسین خسرو

بُڈھا

بڈھوں سے میری دلچسپی خود میرے لیے بھی حیران کن رہی ہے۔ لیکن آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا کے مصداق میں آپ بڈھوں میں دلچسپی لیتا رہا اور آپ ہی حیران ہوتا رہا۔ اس عالمِ تمثیل میں عمل ردِ عمل ناگزیر بھی ہے۔ چنانچہ میری اس دلچسپی کے نتیجے میں بڑی عمر کے لوگ یعنی بڈھے مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ میری اس دلچسپی کی وجہ یقیناً میری ذہنی پختگی ہے جس نے مجھے ہمیشہ اپنے ہم عمر ساتھیوں سے ہراساں رکھا۔ یہ پختگی مجھے کیوں اور کیسے حاصل ہوئی اس کا تجزیہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی کرسکتا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میری زندگی میں بہت سے کام اپنے وقت سے پہلے ہوئے ہیں۔ میری ماں کا انتقال اس وقت ہوا جب میں صرف دس گیارہ برس کا تھا۔ چنانچہ وقت سے پہلے میری ماں مجھ سے چھین لی گئی۔ میرے باپ نے کچھ ہی دنوں کے بعد دوسری شادی کرلی۔ چناں چہ وقت سے پہلے محبت اور نفرت کے بے ہنگم ملاپ کا نہ صرف تماشا دیکھا بلکہ خود اس کا شکار بھی رہا۔ انٹرسائنس میں مسلسل تین دفعہ فیل ہوا اور اس کے بعد دل برداشتہ ہوکر ایرفورس میں نوکر کرلی۔ چناں چہ وقت سے پہلے تعلیم ادھوری چھوڑکر روزگار کی فکر میں مبتلا ہوا۔ نوکری لگنے کے صرف دو سال بعد میری سوتیلی ماں نے اپنے بھائی کی لڑکی سے میری شادی کردی۔ چناں چہ میں وقت سے پہلے بے رحم ازدواجی رشتے میں باندھ دیا گیا۔ بے رحم اس لیے کہ اس میں ایک دوسرے سے نجات صرف مرکر ہی حاصل کی جاسکتی ہے پھر وقت سے بہت پہلے ناگزیر طور پر باپ بھی بنا۔ ایک دو بار نہیں مسلسل چار بار۔ چنانچہ ان سب باتوں کی طرح میرے ذہن میں پختگی بھی کچھ وقت سے پہلے ہی پیدا ہوگئی تھی۔ بچپن میں مجھے خاں صاحب کے پاس بیٹھنا اور ان کے ایک دم سفید سراپا کو دیکھنا اچھا لگتا۔ نہ صرف ان کے سر کے تقریباً غائب بال، بی۔ آئی۔ اے شیور کے انڈوں کے چھلکے کی طرح سفید تھے بلکہ ان کی پلکیں اور ان کے بازوؤں اور ٹانگوں پر اُگے ہوئے ننھے ننھے بال بھی سفید پڑگئے تھے یہ سفیدی ویسی ہی تھی جیسے دن میں آسمان پر لٹکتے چاند میں نظر آتی ہے۔ لیکن خاں صاحب کے اس سفید سراپا کو دیکھ کر مجھ میں نہ تو کسی قسم کا کوئی تحیر پیدا ہوتا تھا اور نہ مجھے کوئی عبرت کا احساس ہی ہوتا تھا۔ میں نے خاں صاحب کو اسی حالت میں دیکھا تھا اور میرے ذہن نے انھیں اسی حالت میں قبول کرلیا تھا۔ خاں صاحب کی آنکھیں بے نور تھیں۔ وہ آنکھوں کا کام اپنے ڈنڈے سے لیا کرتے تھے۔ پڑوس میں چار گھر چھوڑکے ایک قدیم مکان میں باہر کی طرف موجود ایک چھوٹی، بند اور تاریک کوٹھڑی میں وہ رہتے تھے۔ جسم پر تہبند اور نیم آستین ہوتی۔ ان کے کمرے میں سیلی سیلی سی بو بسی رہتی تھی

لیکن ان سب باتوں سے نہ تو مجھے گھن ہی آتی تھی اور نہ ڈر ہی لگتا تھا۔ جب کہ میرے ساتھی خاں صاحب کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ میں دن میں ایک آدھ بار ضرور ان کی کوٹھڑی میں جھانک لیتا اور وہ ڈنڈا ہلا رہے ہوتے تو میں سمجھ جاتا کہ خاں صاحب جاگ رہے ہیں۔ پھر میں ان کی کوٹھڑی کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا۔ انھیں چلا کر سلام کرتا۔ وہ جواب دیتے تو پوچھتا۔ "خاں صاحب آپ کے زمانے میں مرغی کتنے کی ملتی تھی؟" سوال بھی ظاہر ہے میں بہت اونچی آواز میں کرتا تھا۔

وہ جواب دیتے:
"مرغی! دو پیسے کی ملتی تھی۔"
میں چلاتا:
"اور انڈا"

وہ جواب دیتے:
"انڈا! وہ تو لوگ یوں ہی دے دیتے تھے۔"

یہ سوال میں ان سے ہزار بار کر چکا تھا۔ لیکن ان کا جواب سن کر مجھ میں جو حیرت پیدا ہوتی تھی وہ ختم نہ ہوتی تھی۔ کیسا زمانہ ہوگا وہ جب لوگ مرغی دو پیسے کی اور انڈا یوں ہی دے دیتے ہوں گے! آج مرغی اور انڈے کو کتنی اہمیت حاصل ہے! آج لوگ مرغی اور انڈے پر کتنے جھگڑے کرتے ہیں! میں سوچتا یا تو مرغی اور انڈا وہ نہیں رہے یا پھر لوگ بدل گئے۔
لیکن میری اور خاں صاحب کی دوستی زیادہ دن قائم نہیں رہی تھی۔ ان کی وہ چھوٹی بند اور تاریک کوٹھڑی میرے بچپن میں ہی خالی ہوگئی تھی۔ اور اس کے کواڑ بند کر کے کسی نے ایک بڑا سا قفل لگا دیا تھا۔

مدرسے میں ایک بڈھا چپراسی تھا۔ لگتا تھا جیسے بے چارے کا کوئی نہ ہو۔ وہ چوبیس گھنٹے مدرسے میں رہتا۔ جماعتوں کی صفائی کرتا۔ پودوں کو پانی دیتا اور پھر مدرسے کے وقت میں وردی پہن کر گھنٹے کے پاس بیٹھ جاتا اور وقت دیکھ دیکھ کر زور زور سے گھنٹہ بجاتا۔ میں اسے سلام کرتا تو وہ خوش ہو کر مجھے دعائیں دیتا۔ جب کہ دوسرے لڑکے اس کے سینچے ہوئے پودوں کے پھول اور پتے توڑ کر انھیں نقصان پہنچاتے۔ میں وقفے میں اپنے مدرسے کے بڈھے چپراسی کے لیے مدرسے کے باہر سے بیڑیاں لا دیتا۔ جب کہ دوسرے لڑکے مدرسے کے احاطے میں موجود درخت سے املی گرانے کی کوشش میں پتھر چلاتے تو وہ سخت جھنجھلاتا۔ انھیں سختی سے منع کرتا اور کبھی کوسنے دیتا۔ مجھے خود بھی اپنے ساتھیوں کی یہ حرکتیں مذموم معلوم ہوتیں۔ میں کبھی استادوں کی نظر بچا کے اس کی جگہ خود گھنٹہ لگا دیتا تو وہ مجھ سے کہتا۔
"میاں تم بڑے ہو کر ضرور بڑے آدمی بنو گے۔"
"میں اس وقت خود کو واقعی بڑا آدمی محسوس کرتا۔ لیکن میں پھر بھی اس سے پوچھ لیتا۔"
"یہ تم کیسے کہتے ہو ہدایت علی؟"
وہ جواب دیتا:

یہ تمہارا سر چھوٹا ہے۔ سر بڑا سردار کا!"

مجھے اس وقت واقعی اپنا سر سردار کا لگتا اور میں اپنے سر پر رکھی ترکی ٹوپی ذرا ٹیڑھی کر کے، شیروانی کے بٹن اوپر تک لگا کے گردن اونچی کیے ہوئے اپنی جماعت میں چلا جاتا۔

ہدایت علی مہینے بھر کی چھٹی پر اپنے گاؤں گیا تھا۔ پھر وہ وہاں سے واپس نہیں آیا۔ میں اُس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا تھا۔

اس کے علاوہ راستے پر، بس پر اور تقاریب میں جہاں کہیں بڑی عمر کے لوگ یعنی بڈھے مجھے نظر آتے تو میں قدرتی طور پر ان کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ بس پر فوراً ہی اُٹھ کر انھیں اپنی سیٹ پیش کرتا۔ راستے پر ان کا ہاتھ تھام کر سڑک عبور کرا دیتا اور محفلوں میں یہ کوشش کرتا کہ ان کے آس پاس بیٹھا رہوں۔ اور ان کی حکایتیں سنتا رہوں۔

اب تو بس میں بڈھے لوگوں کا کیا کام۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ جو مجھ سے عمر میں بڑے ہیں ان کی موجودگی میرے لیے تسکین کا باعث ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر بلاتے ہیں۔ شفقت اور مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ گھنٹوں رہ کر بھی بور نہیں ہوتا۔ جب کہ میرے ہم عمر ساتھی اُن کے ساتھ بات چیت میں بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں اپنے ہم عمر ساتھیوں سے مل کر کچھ ویسا ہی محسوس کرتا ہوں، جیسا وہ آدمی محسوس کرتا ہے جو پانی میں ڈوب کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ یہ دیکھتا ہے کہ اصل پانی محض اُس کے ٹخنوں تک ہی پہنچ پاتا ہے۔ میرے بڑی عمر کے ساتھی خود بھی اپنی محفلوں میں میری موجودگی کو سوئے ادب نہیں سمجھتے۔ میں ان کے سر کے کھچڑی بالوں کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ کتنے ہمت والے ہیں یہ لوگ کہ اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں اور آج بھی ان کے حوصلے بلند ہیں۔ ان کے آگے مجھے اپنی پست ہمتی پر شرم آتی ہے۔ پھر ان کے پاس مجھے سنانے کے لیے بے شمار حکایتیں! جن کے سننے سے مجھے ایک عجیب روشنی سی ملتی ہے۔

چنانچہ بڑی عمر کے لوگوں سے میری اس ذہنی وابستگی نے ہی مجھے وہ بصیرت عطا کی جس کی روشنی میں میں اس بڈھے کو پہچان سکا جس کا ذکر میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ چچا کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ وہ نہ صرف ایک معزز اور انسان دوست خاندان کے فرد تھے بلکہ خود بھی شروع ہی سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ اور اس طرح انھوں نے بے شمار افراد کی مدد کی تھی۔ عجیب خوش قسمت آدمی تھے چچا! اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ وہ دراصل میرے رشتے کے چچا تھے۔ اپنے باپ کی لاکھوں روپے کی جائیداد کے اکیلے وارث! شکل و صورت میں بھی گویا یوسفِ ثانی تھے۔ وہ سب باتیں جن کو لوگ خوش قسمتی سے تعبیر کرتے ہیں وہ چچا میں جمع ہو گئی تھیں۔ والد کہتے تھے، سلیم الدین سے زیادہ خوش قسمت آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ چچا کا گھر کیا تھا ایک محل تھا کوٹھی تھی جس میں ایک طرف اصطبل تھا۔ اصطبل کے ساتھ ان کے والد کے وقت کی یادگار بگھی کھڑی رہتی تھی۔ اُلٹے ہاتھ پر گیراج تھا جس میں ان کی کریم کلر کی 'اوپل' OPEL کھڑی رہتی تھی۔ پھر نوکروں کے کمرے، کم از کم درجن بھر نوکر ان کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ وہ کونسی نعمت تھی جو انھیں حاصل نہیں تھی۔ عزیز و اقارب اور جاننے والے انھیں اپنی آنکھوں پر بٹھاتے۔

اس کی وجہ جہاں ان کی خاندانی وجاہت تھی وہاں ان کے مزاج میں موجود وہ انسانی ہمدردی بھی تھی جس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا تھا۔ رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کا تو وہ خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ بہن ڈور کے رشتے

کی ہی کیوں نہ ہو وہ اس کے گھر ضرور جاتے۔ اس کی خبرگیری کا خصوصیت سے خیال رکھتے۔ سردیوں میں کمبل اور گرمیوں میں سوتی ساڑھیاں بھیجتے۔ ان کی کوٹھی پر صبح سے شام تک غرض مندوں، حاجت مندوں اور ملنے والوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا۔ اتفاق سے چچی بھی ہر اعتبار سے ان کی بیوی کہلانے کی مستحق تھیں۔ خاندان والے دونوں کو چاند سورج کی جوڑی کہتے اور دعائیں دیتے کہ یہ جوڑی ہمیشہ سلامت رہے۔ چچا کے بچے بھی صرف دو تھے۔ اور ان بچوں میں بھی یہ توازن تھا کہ ان میں سے ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکا۔ خاندان والے اسے بھی ان کی خوش قسمتی بتاتے۔ لڑکی، لڑکے سے بڑی تھی۔ انتہائی مشرقی ماحول میں لڑکی کی پرورش ہوئی تھی لیکن وہی لڑکی جب یونیورسٹی میں پہنچی تو ابتدائی تعلیم و تربیت کا اثر پوری طرح زائل ہو چکا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بچپن میں مشرقیت پر ضرورت سے زیادہ زور کا ردِ عمل رہا ہو۔ اب یونیورسٹی سے متعلق ہر فرد اس کے نام سے واقف تھا۔

یونیورسٹی میں کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ہوتا اس کا نام ضرور اس سے متعلق ہوتا اور یہی اس فنکشن کی کامیابی کی دلیل بھی سمجھا جاتا۔ یوں بھی سوشل لڑکیوں کو پڑھے لکھے حلقوں میں قدر و تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ پھر جب لڑکی نے یونیورسٹی سے باہر قدم رکھا تو وہ امریکہ جا رہی تھی۔ اور امریکہ پہنچ کر تو اس نے پھر سے اس ماحول میں واپس آنے سے صاف انکار کر دیا جس میں اس کی واپسی کے اس کے ماں باپ منتظر تھے۔ چچی نے دو تین قسم کا زیور اور درجنوں بیش قیمت جوڑے جمع کیے تھے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے۔ لیکن دونوں میاں بیوی نہیں معلوم کس مٹی کے بنے تھے۔ انھوں نے اُف تک نہ کی اپنی لڑکی کی اس حرکت پر۔ ایسے ہو گئے جیسے ان کی کبھی کوئی لڑکی رہی ہی نہ ہو۔ لیکن انسان بہرحال انسان ہوتا ہے چچا بھی آخر انسان تھے۔ انھوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور رفتہ رفتہ گوشہ نشین ہو گئے۔ اب وہ چچا ہی نہیں رہے تھے۔ وہ بڑی کوٹھی چھوڑ دی۔ اس میں لڑکیوں کا ہائی اسکول آ گیا تھا۔ اور نسبتاً ایک چھوٹے مکان میں رہنے لگے۔ اب ان کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے کسی نے دن میں چراغ جلا دیا ہو۔ دن کی روشنی میں چراغ کتنا اکیلا اور بے وطن لگتا ہے! لیکن بہرحال ابھی ان کا لڑکا موجود تھا جو اب بلا شرکتِ غیرے ان کا نورِ نظر تھا۔ لیکن اس نے بھی آرکیٹیکچر کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اور پھر وہ بھی مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ جس کے بعد چچا اور چچی بالکل تنہا رہ گئے۔ اب چچا کے رہن سہن اور لباس میں بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ نفیس سوٹ اور خوش رنگ ٹائی شرٹ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اب اگر کبھی دنوں میں وہ اپنے گھر سے باہر نکلتے تو ان کے جسم پر سفید ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا اور کسی قدر تنگ پاجامہ ہوتا۔ سر پر سفید ہی گول ٹوپی ہوتی اور کندھے پر بھی رومال۔ یہ قلندرانہ لباس بھی چچا پر اچھا لگتا۔ وہ بڑا سا سگار جو وہ بڑے چاؤ سے پیا کرتے تھے وہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر کے کسی گوشے میں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے نظر آتے اور دھوئیں کے دل بادل ان کے آس پاس پھیل پھیل کر ان کے اور دنیا کے بیچ ایک پردہ سا بن کر حائل ہو جاتے۔ ایسے میں چچا کو دیکھ کر ایک دھچکا سا لگتا۔ ایک بار میں نے چچا کو پبلک بس پر دیکھا تھا اور سوچا تھا کیا چچا کی وہ کریم کلر کی اوپل جو ان کے نفیس لباس اور سگار کی طرح ان کی شخصیت کا حصہ تھی، وہ بھی ان کے پاس نہیں رہی۔ جس لڑکے نے پورے احترام کے ساتھ فوراً کھڑے ہو کر انھیں اپنی سیٹ پیش کی تھی۔ چچا نے مجھے مسکرا کر دیکھا تھا اور میری نشست تجویز کر دی تھی۔

مجھے افسوس رہے گا کہ میں چچا کی عیادت کے لیے نہ جا سکا۔ وہ زیادہ دن بیمار بھی تو نہیں رہے تھے۔ انھیں شاید کوئی دل کی بیماری ہو گئی تھی۔

ان کے جنازے میں اچھے خاصے لوگ تھے۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر بڑھ کر کندھا دیا تھا۔ بس میں نے وہیں اس بڈھے کو دیکھا تھا۔ لیکن اسے بڈھا کون کہہ سکتا ہے؟ شاید میری بڈھوں سے ذہنی وابستگی نے ہی اسے بڈھے کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ کبھی جنازے کو آگے سے کندھا دیتا اور کبھی پیچھے سے اور کبھی ایسا لگتا جیسے جنازہ بس اسی کے کندھے پر معلق ہو۔ عجیب بڈھا تھا! کبھی اس کی آنکھوں میں ماں کا سا دکھ تعلق اور شفقت نظر آتی۔ اور کبھی دنیا والوں کی سی بے تعلقی اور سفّاکی۔ قبرستان پہنچ کر تو جیسے وہ بڈھا چاروں طرف چھا گیا تھا۔ قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر وہی چڑھا بیٹھا تھا۔ پرانی اور شکستہ قبروں پر بھی اسی کا سایہ تھا۔ گورکن کی کدال اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اور پھولوں کی چادر کی چنگیر، عرقِ گلاب کی بوتل اور عبیر کا پیکٹ بھی وہی اٹھائے ہوئے تھا۔ پھر جب چچا کے بے جان جسم کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا تو وہی ان کی قبر کی مٹی برابر کر رہا تھا۔ اب وہ جیسے چچا کی مزار کا سنگِ مزار بن گیا تھا۔ اب وہ اسی طرح ساکت کھڑا رہے گا ETERNITY تک اسی طرح کھڑا رہے گا۔ میں نے ایک عجیب خوف سا محسوس کیا۔ لیکن جب میں نے اپنی نظروں کو پھیر کر دوسری طرف دیکھا تو وہاں بھی وہی موجود تھا۔ ہر مزار کا سنگِ مزار وہی تھا۔ اس دوران میں مغرب ہو گئی۔ اب وہ بڈھا سیاہی مائل لباس پہن کر اپنے گراں بار وجود میں جیسے عریاں ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا یہ چوبیس گھنٹوں میں کتنے لباس تبدیل کرتا ہے۔ اس کے یہ لباس ہی تو اس کو تشخیص عطا کرتے ہیں۔ لیکن نہیں معلوم کیوں یہ بار بار اپنے صبح و شام کے روپ میں جلوہ گر ہونے پر اصرار کرتا ہے کیا یہ صبح اور شام کے سوا کبھی اور روپ میں نہیں آسکتا؟ یہ تھک کر کسی پیڑ کے سائے میں بیٹھ کیوں نہیں جاتا؟ کب سے یہ اپنے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں گامزن ہے! ہمارے باپ آدم سے بھی ہزاروں صدیوں پہلے سے۔ پھر اسی نے صبح اور شام کی تکرار سے آدم کی زندگی کے سفر کا تعین کیا تھا۔ اور اس کے بعد سے آج تک یہ اپنے اسی صبح اور شام کے روپ میں آدم کی اولاد کی زندگیوں کا احاطہ کرتا آیا ہے۔ اسی کے بدلتے روپ نے چچا کی زندگی کا احاطہ کیا تھا۔ یوں تو یہ اپنی گریز پائی سے ہر ذی نفس کی زندگی کے کینوس پر اپنے انمٹ نقش چھوڑ جاتا ہے لیکن بعض لوگوں کی زندگیوں میں یہ اس کی انانیت کے نقش کچھ اتنے زیادہ واضح ہوتے ہیں کہ آدمی گھبرا اٹھتا ہے۔ چچا ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

قبرستان کی ٹھہری زار خاموشی میں سیاہی مائل وقت کی سیاہی کچھ اور بھی ہولناک لگ رہی تھی۔ میں نے ایک وداعی نظر چچا کی قبر پر ڈالی اور سب کے ساتھ وزنی قدم اٹھاتا چلنے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اپنے بے آواز قدموں سے میرے ساتھ چل رہا ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا تھا۔ یہ وہی بڈھا تھا جو اپنے سیاہی مائل لباس میں میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا میرے آگے بھی وہی تھا اور میرے پیچھے بھی وہی۔ میں نے دفعتاً خود کو

(باقی ص ۲۴ پر)

یوسف اعظمی

برزخ

کاغذ کے کالے شہروں میں
اندھی صبحیں رینگ رہی ہیں
ہاتھوں کی سونی ریکھائیں
قبروں ہی کا سناٹا ہے
چہروں کی بنجر دھرتی میں
آنکھیں برزخ دیکھ رہی ہیں
گہری رات کی تاریکی میں
آئینوں کا عکس دھواں ہے
شہرِ نو کی ساری چیخیں
صدیوں کی معصوم تھکن جب پی جاتی ہیں
رات کی اُجلی خاموشی سے
چاند اتر کر
سورج کو سجدہ کرتا ہے

چاندنی کا کھنڈر

آنکھ اور ذہن کے درمیان
نُور کی ڈور ٹوٹی ہوی
ایک سائے کی زنجیر ہے
ذہن میں گونج کا جھاگ ہے
دھندلی پرچھائیاں جل گئی ہیں
یاد ۔ اک نئے بدن آسماں کا وجودِ محض ہے
خلا کے سمندر میں
ایک طائرِ بے نوا پھڑپھڑاتا ہوا
خواب کا پتھرائی ستوں ڈھونڈتا ہے
نُور کی انگلیاں، خواب کا جسم اب کہاں چھو سکیں گی؟
آرزو ـــــ جیسے کینسر کی کچی کلی
لمس ـــــ فالج زدہ پھول
احساس ـــــ ہے سرسراتی صبا
شہرِ دل ـــــ نُور کے ہاتھ میں برف کی قاش ہے
حادثہ ـــــ بِکے لمحات کا اجنبی اتصال
زندگی ـــــ پردۂ عکس پر دودھیائی بدن کی رفاقت کا نام

باذل عباسی

دو غزلیں

○

کھلی فضا تھی ہواؤں میں پیار تھا کتنا
تمہارے شہر میں پھر بھی غبار تھا کتنا

شعورِ خواب تھا احساس کی فضاؤں میں
شجر دعاؤں کا بے برگ و بار تھا کتنا

وہ رت عجیب تھی زخموں کے پھول پہنے تھے
ہمیں بھی دیدہ وری کا خمار تھا کتنا

ہزیمتوں کا سمندر رواں تھا سڑکوں پر
جراحتوں کا ہمیں اعتبار تھا کتنا

ہر ایک چہرے پہ خوابوں کی دھوپ پھیلی تھی
حقیقتوں میں مگر انتشار تھا کتنا

قدم قدم پہ کواکب تھے بات کا موضوع
مرا لباس اتنا تار تار تھا کتنا

ہر ایک چہرہ ملا تھا بکھر بکھر مجھ سے
شکستگی کا مری اشتہار تھا کتنا

میں اپنی ذات سے باہر نکل تو سکتا تھا
مگر ہر ایک طرف سے حصار تھا کتنا

جس ایک شب کے لیے میں نے تم کو چھوڑ دیا
اس ایک شب کا مجھے انتظار تھا کتنا

فریب خوردہ مسافر تھا جس کی تھی پناہ
اسے دماغِ شبِ سنگبار تھا کتنا

ملی تھی لفظوں کی دولت جو رائیگاں ہوئی
مگر معانی کا غم بے دیار تھا کتنا

○

ایک اک منظر ہوائے دلبراں لے جائے گی
مجھ کو لیکن شہر کی یہ شب کہاں لے جائے گی

سلسلہ ہے دور تک اک کرب کی دیوار کا
داستاں در داستاں سعیِ فغاں لے جائے گی

گردشیں مجھ سے پریشانی کا مانگیں گی لباس
زندگی مجھ سے مزاجِ امتحاں لے جائے گی

میری خاموشی نہ دے میری طبیعت کا پتہ
فکر اس کی صرف فہمِ بدگماں لے جائے گی

حوصلہ خوش فہمیوں کا تھا نہ میرے ظرف میں
کیوں نہ میری ذات سے خوش فہمیاں لے جائے گی

دیدۂ احساس میں منظر بہ منظر تیرگی
روشنی ہم سے حسابِ رائیگاں لے جائے گی

کچھ نہیں اس کے لہو کی آگ میں جذبوں کی آنچ
گفتگو اس کی نظر کی داستاں لے جائے گی

تشنگی معصوم ہے سمجھے نہ اعجازِ سراب
حرمتِ تشنہ لبی دیکھیں کہاں لے جائے گی

عوض سعید

پچھتاوا

شام ڈھل چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرینا بیچ کے اطراف و اکناف بسنے والے مچھیرے اپنے کندھوں پر لیٹے ہوئے جال کو سنبھالے کوئی پرانا لوک گیت گاتے ہوئے خوشی خوشی گھر لوٹ رہے تھے۔ سامنے ایک ناٹے قد کا بوڑھا آدمی تھا جس کے پیچھے نوجوانوں کی کئی ٹولیاں تھیں دور سمندر کے بیچوں بیچ دو ایک کشتیاں تیزی سے ساحل کی طرف آرہی تھیں۔

بوڑھے کی نظریں جوں ہی مجھ سے چار ہوئیں وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا اور اس کے ساتھ ہی سارے مچھیرے چپ چاپ کھڑے ہوگئے

"اجنبی معلوم ہوتے ہو بابو"

"ہاں بڑے میاں"

"مگر یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوگیا ہے؟"

"چوٹ آگئی تھی اس لیے پٹی باندھ رکھی ہے"

"کہاں گر پڑے تھے؟"

"ایگمور کے قریب"

"اس وقت کوئی ساتھ تھا تمہارے"

"ساتھ سب ہی تھے مگر میں پھر بھی تنہا تھا"

وہ میرے اس جواب پر ایک لمحہ کے لیے مسکرایا۔ اس کے ہونٹوں کی محراب سے اس کے ٹوٹے ہوئے دانت جھانک رہے تھے۔ بوڑھے کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کے تمام ساتھی کھلکھلا کر ہنسنے لگے جیسے میں نے کوئی زوردار لطیفہ انھیں سنایا ہو۔

پھر اچانک ایک گورے گٹھے رنگ کا دراز قد نوجوان جس کے منہ میں سگار تھا کار سے اتر کر بوڑھے کے قریب آیا "چودھری یوں بتیسی نکالے کیا ہنس رہا ہے۔ ایک ہفتے سے پیسے نہیں پہنچائے، کیا تمہارا باپ ڈالوں پر

مچھلیاں بھر کر باہر بھجوائے گا۔ اور وہ سیراتیم کا بچہ کہاں ہے۔ صورت چھپاتا پھرتا ہے کمبخت۔"

"کل صبح سیراتیم کو لے آکر آجاؤں گا مالک۔"

"صبح کا بچہ۔" یہ کہہ کر وہ نوجوان تو چلا گیا لیکن بوڑھے کے چہرے پر اداسی کی ایک گہری لکیر کھینچ گئی۔

"بڑے میاں یہ آدمی یوں اکڑ رہا تھا جیسے سمندر پر بھی اس کی حکمرانی ہو۔"

"وہ جو دور ساحل پر کشتیاں کھڑی ہیں نا۔ یہ اس کی ملکیت ہیں ہم تو خادم ٹھیرے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے ادھورے گیت کو پھر سے الاپتا ہوا شام کی دھندلاہٹوں میں غائب ہوگیا۔

اب میں ساحل کے قریب بیٹھا اپنی انگلیوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھ رہا ہوں جس کے کناروں پر راکھ جمی ہوئی ہے۔ جس میں کوئی چنگاری تہہ در تہہ سلگ رہی ہے۔ بوڑھے مچھیرے کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔

ایک ایسی ہی سلگتی ہوئی شام تھی جب میں پہلی بار اسی ساحل پر فردوس سے ملا تھا۔ عجیب ملاقات تھی۔ میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ آج میں جس لڑکی سے ہمکلام ہوں۔ کل میں اسے چاہنے بھی لگوں گا۔ اس بار بھی اسی طرح اپنے اپنے گھر کو لوٹ رہے تھے۔ شام کی سیاہی پھیل چکی تھی اور آسمانی کلس پر چاند تارے ٹمٹما رہے تھے میں نرم ریت پر پڑا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے پکارا "شوکت صاحب۔ کیا آپ نے مجھے پہچانا؟" میرے سامنے ایک اونچے قد کی خوبصورت لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔

"معاف کیجئے گا۔ میرا نام شوکت نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی ابھی ساحل کے قریب ریت میں میرے پاؤں بے طرح پھنس گئے تھے ریت سے لگے پتھر سے ٹکرا گئی دیکھئے نا میرے پاؤں میں زخم آگئے ہیں کیا آپ میرے لیے ٹیکسی لادیں گے اس عالم میں چورا ہے جانا بھی میرے لیے دوبھر ہے۔"

میں اس کی اس بے تکلفانہ گفتگو پر حیران سا ہو کر رہ گیا، عام زندگی اس میں اس قسم کی لڑکیوں سے ملا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، ہاں فلموں میں، میں نے ایسی بے شمار لڑکیاں دیکھی تھیں۔ میں وقتی طور پر یہ بھی بھول گیا کہ اس کے چوٹ آئی ہے۔

میں نے آگے چل کر چورا ہے سے ٹیکسی لادی اور وہ تھینکس کہتی ہوئی موٹر میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی وہ چلی گئی تو میں پھر ایک بار سوچ کی گہری وادیوں میں کھو سا گیا۔

پھر ایک دن ایک اجنبی نے جو وضع قطع سے ایک معمولی سا آدمی لگتا تھا میرے ہاتھ میں ایک چٹھی تھمادی۔ آپ سے نہ ملے صدیاں بیت گئیں اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ میں پچھلے اتوار کے روز پر میں آپ سے ترش سے پیش آئی تھی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ پرسوں میں آپ کے گھر بھی آئی تھی لیکن دروازہ پر تالا پڑا اب آپ ہی بتائیے کب اور کہاں ملیں گے۔ ڈیڈی بھی آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ ہاں میں نے "آہنگ" میں آ

نظم "بغاوت" پڑھی تھی۔ بڑی پیاری نظمیں لکھتے ہیں آپ۔
میں تحریر میں کچھ ایسا ڈوب گیا جیسے دراصل میں ہی شوکت ہوں۔ مجھے اچانک خیال آیا کہیں یہ میری نیا بیچ والی لڑکی تو نہیں ہے مگر یہ مکان تو میں نے راناصاحب سے لے رکھا تھا۔ شاید فردوس راناصاحب ہی کی لڑکی ہو۔
"ارے بھئی دیکھنا" میں نے اس اجنبی کو آواز دی۔ مگر میری آواز دیوار سے ٹکرا کر رہ گئی۔ وہ تو جا چکا تھا۔ میں سوچنے لگا یہ آخر شوکت کون ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس نام کا کوئی شاعر میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔
پھر ایک دن راناصاحب نے راستہ میں مجھے آواز دی "شوکت صاحب" میں پھر ایک بار حیران سا ہو کر رہ گیا آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ گو میں نے کرایہ نامہ پر اپنا نام ممتاز درج کروایا تھا۔ لیکن ممتاز سے چھلانگ لگا کر میں نے کب شوکت کا روپ دھار لیا تھا خود میں اس سے لاعلم تھا۔ ابھی میں تردید کرنے ہی والا تھا کہ راناصاحب نے کہا "بھئی فردوس تمہاری نظموں کی بڑی دیوانی ہے کہتی تھی شوکت بڑے اچھے شاعر ہیں۔ کسی وقت مجھے بھی ادب، شاعری سے لگاؤ تھا لیکن زندگی کی مصروفیتیں کچھ اتنی بڑھ گئی ہیں کہ رسائل پڑھنا تو دور کی بات ہے میں کسی مشاعرہ یا ادبی محفل میں بھی جا نہیں سکتا۔ بھائی شوکت برا ہو میرے حافظہ کا کوئی بات بھی ٹھیک سے یاد نہیں رہتی اب یہی دیکھیے نا کل فردوس کا برتھ ڈے ہے مجھے اور بہت سی جگہ بھی جانا ہے مگر مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ بہرحال تم ضرور آنا۔ فردوس نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں تمہیں ضرور اپنے ساتھ لے آؤں۔ آؤ گے نا؟"
"ہاں ضرور آؤں گا" کہنے کو تو میں نے حامی بھر لی۔ لیکن دل کسی طرح بھی نہیں مانتا تھا۔ پھر میرے اندر کے انسان نے جیسے مجھے شہ دی اور دوسرے دن راناصاحب کی خوبصورت حویلی کے پھاٹک پر میں کھڑا تھا۔ مہمانوں کی کثرت سے حویلی میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ برقی قمقموں کی جگمگاہٹ سے یوں لگتا تھا جیسے کسی بڑے رئیس کی شادی ہو رہی ہو۔ ہر چیز قرینہ سے رکھی ہوئی تھی خاص طور پر حویلی کا درمیانی ہال جہاں فردوس کی سہیلیاں براجمان تھیں، سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فردوس آج ضرورت سے زیادہ خوش دکھائی دے رہی تھی اس نے سلک کی فیروزی رنگ کی ساری اور میچ بلوز پہن رکھا تھا۔ گلے میں سونے کی ایک خوبصورت سی مالا تھی۔ کان میں مخروطی وضع کے آویزے۔ اُسے ایک نظر دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا جیسے سارے جہاں کا حسن اُس کی شخصیت میں سما گیا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ وہ تھینکس کہتی ہوئی والہانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر تازہ پھولوں کی سی مسکان تھی۔ اپنا تحفہ تو میں نے راناصاحب ہی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا جو تحائف کے ڈھیر میں پتہ نہیں کہاں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ شام ڈھلنے پر جب میں وہاں سے لوٹ آیا تو میرا ذہن بوجھل بوجھل سا تھا۔
صبح جب میں بستر سے اٹھا تو میری آنکھیں سوجی سوجی سی تھیں۔ میرے ذہن پر ابھی تک فردوس چھائی تھی۔ میرے اندر کے انسان نے مجھ سے کہا۔ "ممتاز تم دونوں سے شادی رچالو۔ تمہاری زندگی بہت حسین بن جائے گی۔ تم ٹھیک کہتے ہو میرے دوست۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں میرا ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر ہو اور میں چپکے سے فردوس کو بیاہ

کر لے آؤں۔ مگر یہ خواب ہی تو ہے۔ یہ خواب تو شوکت کو دیکھنا چاہیئے جو فردوس کی زلفوں کا اسیر ہے۔ فردوس جو شوکت کے دل کے قریب ہے۔"

"مگر میں تو ممتاز ہوں"

پھر جیسے اندر کے انسان نے مجھے ورغلایا۔

"پاگل نہ بنو۔ تم ہی شوکت ہو۔ ممتاز کے بدن پہ چمٹے ہوئے لبادے کو تار تار کر دو۔ تم اب شوکت ہو۔ فردوس اگر تمہیں نہ ملے تو یہ بہت بڑا المیہ ہوگا۔ بہت بڑا۔"

صبح جب میں نیند سے بیزار ہوا تو میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ساری رات میں نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری تھی۔ میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ لوگ سوتے میں خواب دیکھا کرتے ہیں۔ میں نے بیداری میں خواب دیکھے تھے۔ خوبصورت سنہری خواب جن کے تانے بانے میں میری روح جیسے کھل کر رہ گئی تھی۔

میں نے غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ فردوس کار سے اتر کر میرے گھر کی طرف آ رہی تھی۔ میں اپنی خوش بختی پر نازاں تھا۔ کنواں آج خود چل کر پیاسے کے پاس آ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کرسیوں کو سلیقہ سے جمایا۔ ٹیبل پر کی گرد جھاڑی اور آرام کرسی پر بیٹھ کر فردوس کے قدموں کی چاپ کو گننے لگا۔ پانچ منٹ گزر گئے اور جب پندرہ منٹ گزر گئے وہ نہ آئی تو میرے ذہن میں عجیب وغریب گمان پرورش پانے لگے۔ پھر میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ فردوس ایک خوبصورت نوجوان کے ساتھ بازو والے مکان کی سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت کتاب تھی۔ شاید یہی شوکت تھا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ!

(سلسلہ ص ۱۲: حالی اور تاریخ کا مادی شعور)

عہد حالی کے اس مختصر جائزے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ان کے عہد کے مسائل کیا تھے اور ان مسائل کو دیکھنے میں حالی کے معاصرین نے کس بصیرت سے کام لیا ہے اور پھر حالی نے ان مسائل کو اپنی بصیرت کے انفرادی جوہر کے کن پہلوؤں سے دیکھا ہے اور اس عمل میں وہ اپنے معاصرین سے کس حد تک مختلف ہیں۔

(سلسلہ ص ۱۸: بڈھا)

اس کے گھیرے میں محسوس کیا۔ اور میری گھبراہٹ کچھ اور بھی بڑھ گئی۔ لیکن بہت جلد میری بڈھوں سے دلچسپی نے میری گھبراہٹ کو خوشی اور اطمینان میں تبدیل کر دیا۔ میں نے سوچا میں خواہ مخواہ کبھی خاں صاحب، کبھی ہدایت علی اور کبھی راستے پر، بس پر اور تقاریب میں ملنے والے بڈھوں کا اور کبھی اپنے دفتر کے معمر ساتھیوں کا مرہون منت رہا۔ بڈھا تو ہمیشہ سے میرے ساتھ رہا ہے! اس نے اپنی خاموش زبان سے مجھے کتنی بے شمار حکایتیں سنائی ہیں۔ میں نے اسی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ پھر اس نے میرے جسم کو توانائی اور صحت بخشی۔ یہی میری صبحوں کے روپ میں بے قرار یہی ایک دن مجھے اپنی طرح بڈھا بھی کر دے گا۔ اور پھر میرے مزار کا سنگ مزار بھی یہی بن جائے گا! ہو سکتا ہے یہ مجھے اتنی فرصت ہی نہ دے۔

رشید عبدالسمیع جلیل

دو غزلیں

○

اک شے کہیں پہ ٹوٹ کے بکھری ہوئی سی ہے
یہ زندگی ابھی تو کہاں زندگی سی ہے

آ آ کے قتل ہوتے ہیں منظر نگاہ میں
قاتل چھپا ہوا ہے جہاں سنسنی سی ہے

ٹوٹے ہوئے ہیں ذہن میں یادوں کے سلسلے
دل کے دریچے بند ہیں افسردگی سی ہے

پایاب سا لگے ہے سمندر کبھی مگر
ہر موج کی پناہ میں اک بے بسی سی ہے

تنہائی تیرے روپ کی تفسیر ہے کوئی
تیرے بغیر بھی مجھے خود رفتگی سی ہے

الفاظ میں رچی ہے ترے پیرہن کی بو
آواز کے بدن میں مگر خامشی سی ہے

تیرے بغیر تجھ سے پرے بے کلی سی تھی
تو پاس آ گیا تو بڑی تشنگی سی ہے

پل پل گذرتا عکس ہے میرے وجود کا
آئینہ دیکھتا ہوں تو بے چہرگی سی ہے

لمحوں کی راکھ میں نہیں کوئی شرر جلیل
کچھ آہٹوں کی آگ ہے اور روشنی سی ہے

○

فشارِ ذات کے لمحے بڑے عذاب کے تھے
زوالِ مہر کے لمحے بھی احتساب کے تھے

یہ تار ٹوٹ کے کچھ اور نغمہ بار ہوئے
مرے وجود کے تھے یا تری نقاب کے تھے

ورق ورق کو ہوا لے اڑی کہاں سے کہاں
کسے ہے یاد کہ کل تک مری کتاب کے تھے

اسی گمان میں دنیا و آخرت سے گئے
بہت سے کام جو ہم نے کیے ثواب کے تھے

طیورِ وقت تھے اڑ اڑ کے آسماں پہ گئے
نہ سوچ میرے یہ اشعار عہدِ خواب کے تھے

نہ جانے آخری لمحوں میں دل پہ کیا گذری
تری نگاہ کے سب رنگ اجتناب کے تھے

کتابِ جاں تھی کہ آئینۂ وجود جلیل
نثار ہم تو ترے حسنِ انتساب کے تھے

اشرف رفیع

دو غزلیں

بات ہے آپ کی غضب کی بات
کاش فرماتے کوئی ڈھب کی بات

مختلف ہے زبانِ دشمن و دوست
ایک ہوتی نہیں ہے سب کی بات

آشیانہ کہاں؟ کہاں یہ قفس
اب کسے یاد ہوگی جب کی بات

دل نے آخر نگاہ کو ٹوکا
بے ادب کہہ گیا ادب کی بات

دردِ دل پوچھ درد والوں سے
جاں بلب جانے جاں بلب کی بات

سب کے لب پر ہیں تذکرے کل کے
کوئی کہتا نہیں ہے اب کی بات

شمع روشن ہوئی ہے آخرِ شب
کب تمھیں یاد آئی کب کی بات

دل کو بھائی بس ان کی بات اشرف
یوں تو سننے کو سُن لی سب کی بات

کچھ وفاؤں کو تفاہم کو وشواس
خیر سے وہ بھی اب نہ آئیں راس

ربط ہی سے بڑھی ہے بے ربطی
دوستی اب ہے دشمنی کی اساس

نہ تھے تنہائی میں بھی ہم تنہا
دُور رہ کر بھی تھے وہ اتنے پاس

اُن کی محفل سے لے کے آئے ہیں
بیکلی دل میں اور نظر میں پیاس

جب سے محروم دید ہیں آنکھیں
ہو چکا سلب نور کا احساس

جانے کس سمت کی ہے موجِ ہوا
دیدہ و دل جھلک رہیں بہر سپاس

تم جو آئے تو آنکھ بھر آئی
آج نکلی ہے دردِ دل کی بھڑاس

مادّیت کی چیرہ دستی سے
روحِ انسانیت کا ہے افلاس

پوچھتے ہو تو سُن لو اشرف سے
زندگی کیا ہے صرف آس ہی آس

ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری

دکنی زبان کا ایک باکمال شاعر
وجدی

سرزمینِ دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو نظم و نثر کے اولین ادبی کارنامے اسی خطہ کی پیداوار ہیں۔ اردو زبان میں ادب کے آغاز کے بعد سے عرصۂ دراز تک دکن ہی کو اولیت حاصل رہی کہ یہاں کے فنکار اپنی ادبی نگارشات سے اردو زبان کو مالامال کرتے رہے ہیں۔ دکنی شاعری میں جہاں ہم بڑے فخر سے قلی قطب، وجہی، غواصی، نصرتی اور ابنِ نشاطی وغیرہ کے نام لیتے ہیں وہیں بعد کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ان نامی گرامی شعراء کے معاصرین اور متاخرین میں اور بھی ایسے شعراء موجود رہے ہیں، جن کے ادبی جواہر پارے، اپنے اونچے ادبی معیار کے اعتبار سے، کچھ کم وقیع نہیں ہیں لیکن ان پر وقت کی گرد کی تہہ اس طرح جمی رہی کہ زمانہ کی نظر، ان کے فنکارانہ ادب پاروں تک نہیں پہنچ پائی۔ ان میں ایک مشہور اور بلند قامت ادبی شخصیت وجدی کی ہے، جس نے اپنی تین ضخیم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں اور جو اپنے اعلیٰ ادبی معیار کی بدولت، قدیم اردو شاعری کے ذخیرے میں اہم حیثیت کی حامل ہیں، اگرچہ کہ ان کی ادبی قدر و قیمت کا خاطر خواہ جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا ہے۔

وجدی، دکن کے پہلے ادبی دور کے آخری عہد کے شاعر ہیں۔ ان کے ہم عصر شعراء میں عاجز، بحری، محبوب عالم، ولی ویلوری، داؤد، اشرف، قادر، ذوقی، عمر، مشرقی، ولی اور سراج جیسے باکمال شعراء کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ قدیم اردو شعراء کے حالاتِ زندگی ہمیں مختلف تذکروں ہی سے معلوم ہوتے ہیں، ان میں نکات الشعراء، تذکرۂ ریختہ گویاں، گلشنِ بے خار، ایسی تصانیف ہیں، جن کے لکھنے والے شمالی ہند کے ہیں اور انھیں جنوبی ہند کے شعراء کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں، اس کے علاوہ ان تذکروں میں زیادہ تر فارسی گو شعراء کا حال مختصراً بیان ہوا ہے۔ بعد کے تذکروں جیسے مخزنِ نکات، گلزارِ ابراہیم، تذکرۂ ہندی، گلشنِ ہند، آبِ حیات اور گلِ رعنا میں بھی دکنی شعراء مثلاً وجہی، غواصی، نصرتی، عاجز، عزلت، داؤد، ولی اور سراج وغیرہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

بعض دکنی تذکرہ نویسوں مثلاً لالہ لچھمی نارائن شفیق، خواجہ خاں حمید، اسد علی خاں تمنا اور عبدالجبار خاں

ملکاپوری نے اکثر اہم شعراء جیسے ابن نشاطی، بحری، شاہ میراں جی، امین الدین اعلیٰ، حاتم اور وجدی کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ حال میں جو اردو و ادب کے تذکرے شائع ہوئے ہیں، جن میں قابل ذکر اردوئے قدیم، اور دکن میں اردو ہیں، ان تصانیف میں بھی بعض دکنی شعرا کے بارے میں کچھ سرسری معلومات مل جاتی ہیں۔

ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری نے بہت سارے دکنی شعرا کو اردو دنیا سے روشناس کرایا ہے، لیکن وجدی جیسے صاحب طرز اور باکمال شاعر کی زندگی اور کلام سے کسی نے بھی وثوق کے ساتھ بحث نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ حد تک ہم، خود وجدی کو بھی اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ اپنے مزاج کے انکسار، سادگی اور حلم کی وجہ سے، اپنے کلام میں، اپنے متعلق کہیں کوئی اشارہ تک نہیں کیا ہے جب کہ ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض شعراء بہت کم گو ہونے کے باوجود بھی اپنی شہرت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، چہ جائے کہ وجدی نے تین طویل مثنویاں لکھی ہیں اور جن کے اشعار کی تعداد بیدرہ ہزار کے لگ بھگ ہے، وہ اس دنیا سے خاموش ہی گذر جاتے ہیں۔

وجدی کے بارے میں جو سرسری معلومات دستیاب ہوتی ہیں وہ نہ صرف غیر تشفی بخش بلکہ متضاد بھی ہیں۔ اردوئے قدیم کے ایک نسخہ میں ان کا نام شیخ وجیہ الدین اور وطن کرنول لکھا ہے لیکن اس کتاب کے ایک اور نسخہ میں ان کا نام ہدایت اللہ خاں اور وطن کیچ بتایا گیا ہے جو اس زمانے میں صوبہ اورنگ آباد کی سرکار دھارور کا ایک قصبہ تھا۔ مسٹر بلوم ہارٹ نے وجیہ الدین کا تخلص ضعیف قرار دیا ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ان کی تصنیف "پنچھی بھاشا" کے یہ شعر پیش کیے ہیں:

جو موافق فہم اپنے کے ضعیف　　؎　　اس کتاب خاص کا نظم شریف
قصد کر دکنی زبان میں لے کے آؤں　　؎　　تا رہے دنیا منے میرا بھی ناؤں

یہاں عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ضعیف بطور صنعت کے استعمال ہوا ہے نہ کہ بطور تخلص۔ اس کے علاوہ وجدی نے اپنی دیگر مثنویوں میں کئی جگہ اپنا تخلص صاف اور واضح طور پر اس طرح پیش کیا ہے:

ارے وجدی سخن کو مختصر کر　　؎　　دعا دل جان سوں کر نیت دھنی پر
دعا وجدی کی کر یارب اجابت　　؎　　عنایت کر، عنایت کر عنایت
شکر کر وجدی کہ بر وجہ صواب　　؎　　ختم ہوئی توفیق حق سوں یہ کتاب

وجدی کا پورا نام ابوالبرکات وجیہ الدین تھا۔ وجدی کے والد شہاب الدین کرنول کے باشندے تھے جن کا پیشہ آہنگری تھا اور کرنول کے محلہ کمر مکل پورہ میں رہتے تھے۔ انہیں آہنگری کے علاوہ کیمیا گری کا بھی ذوق تھا۔ ان کے چار لڑکے تھے جن میں وجدی ان کی تیسری نرینہ اولاد تھے۔ وجدی کو اپنے والد کے پیشے سے کوئی دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ اپنی ذہانت اور طباعی سے ان کا شمار کرنول کے نواب اسمٰعیل خاں پنی کے قریبی رفیقوں اور مصاحبوں میں ہونے لگا۔ "مثنوی مخزن عشق" جو ۴۹ اشعار پر مشتمل ہیں ایک قصیدہ بھی ملتا ہے جو نواب موصوف کی مدح میں موجود ہے۔ نواب نے کرنول کے جنوب مغربی جانب ہینڈری ندی کے کنارے واقع قصبہ زوراں پور (زہراپور) میں زمین کا قابل لحاظ حصہ وجدی کو عطا کیا تھا

کہا جاتا ہے کہ وجدی کو فنِ طب سے بھی لگاؤ تھا۔ روایت ہے کہ عرصۂ دراز کی مصاحبت کے بعد ایک دفعہ نواب ممدوح سے وجدی کی کچھ اَن بَن ہوگئی اور بات اس حد تک بڑھ گئی کہ وجدی ترکِ وطن کرکے قمرنگر (کرنول) سے نکل پڑے اور پھر کرنول کا رُخ نہیں کیا۔

ہمیں وجدی کی تین مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں جن میں ہر ایک بلند پایہ اور اعلیٰ ادبی اقدار کی حامل ہے اور جن میں شاعر کی فنکارانہ چابکدستی اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ وجدی کی تصانیف کے سنِ تصنیف کے بارے میں بھی محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ نے اپنے ایک تحقیقی مقالے "وجدی کی شاعری" رسالہ آندھرا پردیش، جلد ۱۲، شمارہ ۲۵، دسمبر ۱۹۶۷ء میں تحریر کیا ہے ــــ

"...... ۱۷۱۰ء میں پیدا ہوئے .... تین مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ پہلی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" ہے جس کا ایک اور نام "گل و ہرمز" کتب خانۂ سالار جنگ کے قلمی نسخہ میں درج ہے۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس کی تصنیف ۱۱۱۵ ہجری میں ہوئی........ تیسری مثنوی "باغِ جانفزا" کے نام سے موسوم ہے جو ۱۱۴۵ ہجری میں لکھی گئی"

ڈاکٹر صفدر نے وجدی کا سنۂ پیدائش ۱۷۱۰ عیسوی بتایا ہے، سنِ ہجری میں اس کا معادل ۱۱۲۲ ہوگا۔ موصوف نے "تحفۂ عاشقاں" کو وجدی کی پہلی تصنیف قرار دیتے ہوئے اس کا سنۂ تصنیف ۱۱۱۵ ہجری بتایا ہے۔ سنِ عیسوی میں اس کا معادل سن ۱۷۰۲ عیسوی ہوگا۔ صاحبِ موصوف نے "پنچھی باچھا" کو وجدی کی دوسری مثنوی قرار دے کر اس کا سنِ تصنیف ۱۱۲۱ ہجری لکھا ہے، سنِ عیسوی میں اس کا معادل ۱۷۰۸ عیسوی ہوگا۔ اسی طرح تیسری تصنیف "باغِ جانفزا" کو قرار دے کر اس کا سنِ تصنیف ۱۱۴۵ ہجری بتایا گیا ہے۔ سنِ عیسوی میں اس کا معادل ۱۷۳۲ عیسوی ہوگا۔ ڈاکٹر موصوف نے ان سنین کا ماخذ نہیں بتایا ہے۔ اگر ان سارے سنین کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وجدی نے پہلی مثنوی اپنی پیدائش سے آٹھ سال قبل، دوسری مثنوی اپنی ولادت سے دو سال پہلے اور تیسری مثنوی بائیس برس کی عمر میں لکھی۔ بجز اس کے کہ ان میں صرف "باغِ جانفزاء" کا سنِ تصنیف صحیح ہے۔ باقی سارے سنین موصوف کی ذہنی اختراع قرار پاتے ہیں۔

اب ہم ان تصانیف کے سنین کے تعین کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔ وجدی ۱۰۹۸ ہجری مطابق ۱۶۸۵ء کو کرنول میں پیدا ہوئے، ان کے نام اور وطن سے وجدی کا سنِ پیدائش واضح ہوتا ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

ابوالبرکات	وجیہ الدین	کرنولی	
۶۶۳ +	۱۱۹ +	۳۱۶	= ۱۰۹۸

وجدی نے اپنی ہر تصنیف کے اختتام پر ان کے سنینِ تصنیف بالالتزام واضح کیے ہیں۔ "مثنوی مخزنِ عشق" یا "باغِ جانفزا" میں وجدی نے اس کے سنِ تصنیف کی وضاحت حسبِ ذیل اشعار میں کی ہے:

اگر تاریخ کا ہے دل منے عشق ؛ کر ابجد سوں حسابِ "مخزنِ عشق"
نکال اُس نے عدد وجدی کے تیویس ؛ رہیں گے تب اگیارہ سو چوالیس

حروف ابجد کے اعداد کی رُو سے "مخزنِ عشق" کے اعداد ۱۱۶۷ ہوتے ہیں اور اگر اس سے وجدی کے ۲۳ کا تخرجہ کیا جائے تو اس کا سنِ تصنیف ۱۱۴۴ ہجری مطابق ۱۷۳۱ عیسوی قرار پاتا ہے۔ اس مثنوی کے آخری باب کے اختتامیہ شعر میں وجدی نے اس مثنوی کی تکمیل کا سنہ بھی اس طرح واضح کیا ہے:

یو ہے بیان خاتمہ جے شکر سوں بولیا ہوں میں
تاریخ جس کی ختم کا آیا ہے "باغِ جانفزا"

باغِ جانفزا کے اعداد ۱۱۴۵ ہوتے ہیں جو اس مثنوی کی تکمیل کا سنہ ہے۔
وجدی نے "مثنوی تحفۂ عاشقان" کے خاتمہ پر بھی اس کے سنہِ تصنیف کو بھی حسبِ ذیل شعر سے واضح کیا ہے:

دسے اس کی تاریخ مجھ کو عیاں ؛ پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں
۱۱۵۳ ہجری

اپنی تیسری مثنوی "پنچھی باچھا" کے اختتام پر بھی وجدی نے اس کے سنہ تصنیف کی وضاحت مندرجۂ ذیل شعر سے کی ہے:

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب ؛ تب ہوا میزاں میں "کیا خاصی کتاب"
۱۱۵۵ ہجری

غرض اس تفصیلی بحث کے بعد ہم وجدی کی تینوں مثنویوں کو ان کے سنہِ تصنیف کے تعین کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں۔

نمبر ۱ :۔ مخزنِ عشق یا باغِ جانفزا ۔ ۱۱۴۵ھ ہجری م ۱۷۳۲ء
نمبر ۲ :۔ تحفۂ عاشقان یا گل و ہرمز ۔ ۱۱۵۳ھ ہجری م ۱۷۴۰ء
نمبر ۳ :۔ پنچھی باچھا ۔ ۱۱۵۵ھ ہجری م ۱۷۴۲ء

وجدی کی مثنویوں کے مطالعہ سے اُن کی پُرگوئی، قادرالکلامی اور فنِ شعر پر مہارتِ تامہ ہر پڑھنے والے پر صاف واضح ہوتی ہے۔ وہ ایک صوفی منش شاعر ضرور تھے لیکن زاہدِ خشک نہیں تھے۔ دنیوی لوازم بھی رکھتے تھے۔ زمانے اور زندگی کا بڑی گہری نظر اور بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ فطرت کی نیرنگیوں، جوانی کی رنگینیوں، دربار کی ہنگامہ آرائیوں اور محفلِ سرور و انبساط کی رنگ رلیوں سے وہ خوب واقف تھے، تب ہی تو وجدی کے فن میں اپنے دور کی تہذیبی زندگی کا عکس جگہ جگہ جھلکتا ہے۔ غرض اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کا یہ شاعر دکنی زبان و ادب کی نسبتاً ترقی یافتہ اور منجھی ہوئی زبان کو اس خوبصورتی سے برتتا ہوا اپنی ہر مثنوی میں باوصفِ کثرتِ اشعار پایا گیا ہے کہ قاری اس کے کمالِ فن کا اعتراف کرنے پر مجبور رہے۔

ماہر لکھنوی

غزل

ساحلوں سے کوئی پوچھے کہ کدھر جائینگے
ہم تو دریا ہیں سمندر میں اُتر جائینگے

ہم بھی رکھتے ہیں نزاکت میں مزاجِ شبنم
اُن کی نظروں سے گرینگے تو بکھر جائینگے

عمرِ شبنم کی کہانی نہ کہو گلشن میں
رنگ ہنستے ہوئے پھولوں کے اتر جائینگے

ہم مسافر ہیں بنالیں گے کہیں بھی منزل
جس جگہ چھاؤں گھنی ہوگی ٹھہر جائینگے

دوش سے اُن کے ہوا لے کے اُٹھے ہیں بادل
بجلیاں خوب گرائینگے جدھر جائینگے

پھر اُسی بزم میں آئے تھے جہاں سے روتے
ہم سے جایا نہیں جائیگا مگر جائینگے

جرّار اکبرآبادی

غزل

پتھر مرے لیے جو اٹھائے ہوئے ہیں لوگ
دشمن نہیں کسی کے سکھائے ہوئے ہیں لوگ

دل ان کا جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں
آنکھیں اسی لیے تو جھکائے ہوئے ہیں لوگ

ہاتھوں میں پھول دیکھ کے دھوکا نہ کھائیے
خنجر بھی آستیں میں چھپائے ہوئے ہیں لوگ

پانی یہاں برس کے کرے بھی تو کیا کرے
اس شہر میں لہو سے نہائے ہوئے ہیں لوگ

اب میرے پاس کیا ہے جو لٹنے کا خوف ہے
آنکھوں کی نیند بھی تو چرائے ہوئے ہیں لوگ

شاید نہیں بجھی ہے ابھی خنجروں کی پیاس
پھر دوستی کا ہاتھ بڑھائے ہوئے ہیں لوگ

جرّار دل کے زخم دکھاؤ نہ اس طرح
آنکھوں میں آنسوؤں کو چھپائے ہوئے ہیں لوگ

سید شاہ سراج الدین

کاسمک شعاعیں

کاسمک شعاعوں کی تحقیق آج کے دور کی ایک اہم ترین دریافت ہے۔ کیوں کہ یہی وہ شعاعیں ہیں جو بیرونی خلا سے کائنات کے درمیان ایک رابطہ قایم کررہی ہیں اور ان شعاعوں کی افادیت پر سائنس دانوں اور ماہرین فلکیات کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ یہ نظریہ غالباً غلط ثابت نہ ہوگا کہ یہ شعاعیں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک اہم کردار ادا کرنے لگیں گی اور ان شعاعوں سے یقیناً ہماری آنے والی نسلیں نہ صرف مستفید ہوسکیں گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ سائنسی میدان میں ان شعاعوں کی وجہ سے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہوگا۔

اس صدی کی ابتدا میں ایک دلچسپ سائنسی مشاہدے نے فطرت کے اس راز سے پردہ ہٹایا کہ خلا سے توانائی کے بڑے بڑے ذرات سفر کرتے ہوئے ہماری زمین پر پہنچ رہے ہیں۔ ان مشاہدات کی روشنی میں جو نتائج برآمد ہوئے اس کی بنیاد پر یہ نظریہ قایم کیا گیا کہ دراصل توانائی کے یہ ذرات کچھ اور نہیں ہیں بلکہ "کاسمک شعاعیں" ہیں۔ تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ان شعاعوں کے ذرات وزنی ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ذرے کا وزن کم سے کم ہائیڈروجن کے جوہر کے برابر ہوتا ہے (ہائیڈروجن کا جوہر تمام عناصر میں سب سے ہلکا ہوتا ہے جس کا وزن جوہر ایک ہے) یا پھر ان شعاعوں کے ذروں کا وزن زیادہ سے زیادہ تھوریم کے جوہر (وزن جوہر ۹۵) یا یورانیم کے جوہر (وزن جوہر ۹۲) کے برابر ہوتا ہے۔ گویا یہ بات طے ہے کہ ان شعاعوں کا ہر ذرہ وزنی ہوتا ہے۔

اس تحقیق سے ابتدا میں یہ سمجھا جارہا تھا کہ غالباً تابکاری عناصر جیسے یورانیم اور تھوریم وغیرہ خلا میں موجود ہیں جن کی تابکاری کی وجہ سے ان شعاعوں کا اخراج ہورہا ہے لیکن بظاہر یہ بات اتنی درست ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ مزید تحقیقات سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ یہ شعاعیں (IONS) یا روئیں کی صورت میں خارج ہورہی ہیں اور بیرونی خلا سے یہ ہم تک پہنچ رہی ہیں۔

اس تحقیق میں (VICTOY HESS) کے تجربے کو بھی بڑا دخل ہے جس نے ایک غبارے میں بیٹھ کر آلات کے ہمراہ خلائی سفر کیا اور ان شعاعوں کی تحقیق میں بہت مدد دی۔ اس سائنس داں کی مشاہدوں کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جو شعاعیں خارج ہورہی ہیں وہ روانیت یا IONIZATION کی ذمہ دار ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دراصل

یہ شعاعیں خلا سے نکل کر ہم تک پہنچ رہی ہیں۔ اس لیے انھیں (COSMIC RAYS) کا نام دیا گیا۔ اس تجربے اور مشاہدے نے سائنسی دنیا میں ایک ہلچل برپا کر دیا چنانچہ وکٹور ہیس کو (1936) میں نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ ان شعاعوں کی دریافت نے انسانی عقل و فراست کے لیے نئی راہیں کھول دیں اور ذہین سائنس دانوں نے ان شعاعوں کی ماہیت اور خصوصیت معلوم کرنے کے لیے نئے نئے تجربے شروع کر دیئے۔ اور آج بھی ان تجربات کا سلسلہ پورے اعتماد سے جاری ہے۔ ابتدا میں ان شعاعوں کو گاما شعاعوں کی طرح سمجھا جاتا رہا جو تابکاری کے دوران خارج ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ گاما شعاعوں میں کسی قسم کا چارج (مثبت یا منفی) نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ تصور کیا جانے لگا کہ کاسمک شعاعیں بھی گاما شعاعوں کی طرح ہیں جن میں کوئی چارج نہیں ہوتا۔ بعد میں یہ بھی سمجھا گیا کہ ان میں الکٹرانوں کی طرح منفیت ہوتی ہے اور شاید یہ بہت زیادہ توانائی رکھنے والے الکٹران کی طرح ہیں۔ لیکن یہ قیاس (EAST-WEST ASYMMETRY) کے تجربے کی روشنی میں غلط ثابت ہوا اور پتہ چلا کہ ان میں منفیت نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف مثبت چارج موجود ہوتا ہے اور یہ شعاعیں پروٹانوں کی طرح ہیں (جن میں مثبت چارج موجود ہوتا ہے اور یہ ہر جوہر میں مرکزہ کے اندر موجود ہوتے ہیں)

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ان شعاعوں کے خصوصیات نئے نئے تجربات اور مشاہدات کی وجہ بدلتے رہے ہیں اور ان میں مختلف ترمیمات ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ MILLIKAN (جس نے ان شعاعوں کا نام سب سے پہلے تجویز کیا تھا) نے بھی ان شعاعوں کے مختلف نتائج اور مشاہدات کو بدلتے ہوئے دیکھ کر لکھا ہے:

"کاسمک شعاعوں کے بارے میں کس سائنس داں نے غلط بیانات نہیں دیئے؟ بہرحال یہ ذہین سائنس دانوں کی جانفشانی ہی تو تھی کہ اس مشکل ترین تحقیق کے نتائج کو رفتہ رفتہ سمجھا جانے لگا اور انسان کی بے پناہ صلاحیتوں نے وہم اور شبہات کے اس سراب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیا جس سراب کے پیچھے بعض ذہن دوڑ رہے تھے۔ آج کاسمک شعاعوں کا مطلب طاقتور توانائی والے پروٹان ہیں جن میں مثبت چارج پایا جاتا ہے لیکن بعد کے نتائج یہ بتلاتے ہیں کہ ان میں الکٹرانس اور POSITRONS (تقریباً ایک فی صد) بھی موجود ہوتے ہیں۔ موجودہ تحقیق یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ کیا ان شعاعوں میں مقناطیسیت بھی موجود ہے؟ ان شعاعوں کی توانائی کی مقدار ایک اندازے کے مطابق (1 MEGAELECTRON VOLT) ہوتی ہے (جو تقریباً 10^{6} الکٹران وولٹس کے مساوی ہے)۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اسکائی لیب (خلائی لیباریٹری) کی بیرونی سطح پر ان شعاعوں کا پتہ چلایا گیا۔ اسی طرح راکٹ، غبارے اور سیٹلائٹس پر مختلف تجربات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کا خلا میں موجود ہونا یقینی ہے اور تب ہی ان شعاعوں کا وجود ان سب کی بیرونی سطح پر معلوم کیا گیا۔ اسی طرح شہاب ثاقب اور چاند سے لائے ہوئے نمونے میں بھی ان شعاعوں کا عکس موجود ہے۔ شہاب ثاقب پر ایک تابکار آئی سوٹوپ کے تجربے نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہزاروں برسوں سے ان شعاعوں کی شدت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں

ہوی ہے۔ البتہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جو کچھ بھی ان شعاعوں کی حدت میں فرق ہو رہا ہے وہ دراصل زمین اور سورج کی مقناطیسی میدان کی قوت میں تبدیلی کا نتیجہ ہے کم توانائی والی ایسی شعاعوں پر ہو سکتا ہے کہ سورج کی اندرونی حدت اثر انداز ہو جیسے (SOLAR ACTIVITY) کہتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہوی ہے کہ شمسی توانائی کی تیزی سے ان شعاعوں کی حدت بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جب شمسی توانائی سُست ہوتی ہے تو پھر ان شعاعوں کی حدت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح اکثر سائنس دانوں نے یہ قیاس کرنا شروع کر دیا کہ ان شعاعوں کا مبدا غالباً سورج ہے۔ لیکن جب ان شعاعوں کی سمت کا تعین کیا گیا تو یہ نظریہ اس خیال کی نفی کرتا ہے۔ مزید یہ بات معلوم ہوی کہ سورج سے نکلنے والی شعاعیں یا تو کاسمک شعاعوں سے کم توانائی رکھتی ہیں یا پھر ان کی توانائی کاسمک شعاعوں سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ غلط ثابت ہوا کہ کاسمک شعاعوں کا مبدا سورج ہو سکتا ہے۔

تازہ ترین تحقیق جو نسبتاً درست معلوم ہوتی ہے کہ غالباً تاروں کے ٹوٹنے سے بہت زیادہ توانائی خارج ہوتی ہے اور شاید کاسمک شعاعیں اسی توانائی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح تاروں نے اعاظ میں جیسے ہم ( ) کہتے ہیں ان شعاعوں کا پیدا ہونا زیادہ ممکن ہے شاید یہاں پر کم توانائی والی کاسمک شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ البتہ ستاروں کے دھماکوں کی صورت میں ان کی توانائی تیز ہوتی ہے اور اس کا انحصار ان دھماکوں کی حدت اور شدت پر ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان شعاعوں کی توانائی تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور یہ خلا کا طویل سفر کرتے ہوے اس کائنات کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں جہاں انسان ان شعاعوں کی توانائی کو بروئے کار لانے کے لیے بے چین ہیں چنانچہ (SPACE SHUTTLE) یعنی خلائی تجربات کے مراکز جو U.S کے نیشنل ایرو ناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن یا NASA کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان شعاعوں پر بے شمار تجربات کر رہا ہے۔ اسکائی لیب ان تجربات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس تعلق سے ہم ہندوستانی بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں چنانچہ کاسمک شعاعوں پر مشین تمبر ۲ کا آغاز ہو چکا ہے جس کے اہم محققین پروفیسر یس بسواس ہیں جن کے ساتھ پروفیسر ڈی لال بحیثیت (PRINCIPAL INVESTIGATOR) اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر R-COWSIK بھی قابل ذکر ہیں۔ اس مشین میں کئی انجینیر اور تکنالوجسٹ بھی شامل ہیں جو اپنی بہترین توانائیوں کے ذریعہ ان شعاعوں کی ماہیت اور خصوصیات دریافت کرنے کے لیے نئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی ادارے جن میں بمبئی کا ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ اور احمد آباد کی فزیکل ریسرچ لیباریٹری اور بنگلور کی انڈین سیٹلائٹ ریسرچ آرگنائزیشن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بہرحال یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ان شعاعوں کی تحقیق ہمارے لیے نہ صرف اہم ثابت ہوگی بلکہ ہماری آنے والی نسلیں ان شعاعوں سے ترقی اور کامرانی کا ایک ایسا نیا چراغ روشن کریں گی کہ جس کی تابناکی سے تمام کائنات منور ہو سکے گی۔

اردو نامہ

اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

وقار خلیل

یکم جون :- مرکز خوشنویسی ادارۂ ادبیات اردو زیر انتظام ترقی اردو بورڈ حکومت ہند کی دو سالہ تعلیمی میقات کا ایوانِ اردو میں آغاز ہوا۔ اس مرکز میں طالبات اور طلبہ کو اردو خطاطی اور خوشنویسی سکھائی جاتی ہے اور انھیں ماہانہ الاؤنس بھی ملتا ہے۔

۲ جون :- حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس نظام اردو ٹرسٹ لائبریری میں جناب اختر حسن مدد گار معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ریڈر شعبہ اردو ایس وی یونیورسٹی تروپتی نے خواجہ احمد عباس کے ناول "انقلاب" پر مبسوط تبصرہ سنایا۔ محفل شعر میں اختر حسن، محمد منظور احمد، بانو طاہرہ سعید، عبدالحلیم اور وقار خلیل نے کلام سنایا۔ احمد اللہ حسینی احمد نے حضور نظام نواب میر عثمان علی خان کی نعت پیش کی۔ راشے محبوب نارائن کی وفات پر تعزیتی قرارداد بھی منظور کی گئی۔ جناب منظور احمد معتمد حلقہ ارباب ذوق نے نظارت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

◆ ریاستی محکمہ برقی کی بزم اردو کے سالانہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر مرو جنی پلا ریڈی ریاستی وزیر اطلاعات نے کہا کہ حکومت اردو کے مسائل کا خوشگوار حل تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ اردو کو ہندوستانی زبان قرار دیتے ہوئے مسز پلا ریڈی نے دفاتر میں اردو کی انجمنوں کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا۔ جناب سید ملک شاہ صدرنشین قانون ساز کونسل نے بزم کے سالانہ ترجمان "ضیائے ادب" کی رسم اجرا انجام دی۔ مسٹر کے تاتاراؤ ڈائرکٹر برقی بورڈ نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب میر کمال الدین علی خان صدر بزم نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے بزم اردو کی علمی، ادبی اور کلچرل سرگرمیوں کا ذکر کیا۔

◆ تلگو اردو متحدہ محاذ سے تعلق رکھنے والے .. طالب علموں نے ریاستی سکریٹریٹ کے روبرو مظاہرہ کیا اور اردو کو ریاست کی دوسری زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

◆ بھارت گن ودھک سنستھا کے تعزیتی جلسہ میں سنستھا کے بانی راشے محبوب نارائن کی ادبی اور تہذیبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ راشے صاحب کے انتقال سے حیدرآباد کی تاریخ کا ایک روشن باب ختم ہوا۔ مسز ڈاکٹر سری رام شرما، کونڈا لکشمن باپوجی سابق وزیر اور عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے مخاطب کیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے صدارت کی۔

۳ جون :- سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے زیر اہتمام ادبی اجلاس اور مشاعرہ، جناب رائے پنج بہاری لال سابق چیرمین سروس رولس کمیشن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب یم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج نے شمع روشن کی اور ریاست میں اردو کے موقف اور دفاتر معتمدین کی بزم اردو کی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا۔ مہمان خصوصی جناب پی گنگا ریڈی وزیر سیول سپلائز نے اردو کی ادبی و شعری سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی کابینہ میں نصف درجن سے زیادہ وزرا اردو جاننے پڑھنے والے ہیں جنھیں بزم اردو کے جلسوں میں مدعو کرنا چاہیے۔ ابتداءً بزم اردو

سکریٹریٹ کے معتمد عمومی جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ ادبی اجلاس میں جناب حسن الدین احمد، جناب صادق انجم نے مقالے اور جناب بھارت چند کھنہ اور جناب رشید قریشی نے فکاہی نثر پارے سنائے۔ جناب قادر جاوید نے نظارت کے فرائض انجام دیئے۔ محفل شعر میں سرور شہید سعیدی، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، غیاث متین، محمد منظور احمد، وقار خلیل، رئیس اختر، صادق نقوی، فیض الحسن خیال کے علاوہ سکریٹریٹ کے شعرا صلاح الدین نیر، کشن کمار کرن، نیر الزمان نیر اور معتمد مشاعرہ بشیر الدین نے کلام سنایا۔

۴ر جون :- ریاستی وزیر پنچایت راج مسٹر یم باگا ریڈی اور وزیر تعلیم مسٹر بی وینکٹ رام ریڈی نے ریاست میں اردو کے موقف کی سرکاری طور پر وضاحت کرتے ہوئے مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ اردو کو تلگو کے بعد علاقائی سرکاری زبان کا قانونی موقف حاصل ہے اور چیف منسٹر کی سرکردگی میں حکومت اردو کے سوال پر بہت سنجیدگی اور وسیع النظر رویہ رکھتی ہے۔ ہر دو وزرا نے مسٹر وندے ماترم رام چندر راؤ صدر نشین سرکاری زبان کمیشن کے حالیہ بیان کو شخصی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ بیان اردو کی پالیسی کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے۔ ہر دو وزرا نے اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی جانب سے پیش کردہ ۔ نکاتی منشور مطالبات کی یکسوئی کے سلسلے میں حکومتی سطح پر مشاورت کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر رام چندر سرپوا سٹیبوا ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے صحافت کو بتایا ہے کہ اردو میڈیم کے معیار تعلیم میں اصلاح اور ڈگری کالجوں میں اردو کی متوازی تعلیم کے سلسلے میں موثر اور کامیاب نمائندگی کی گئی ہے۔

◆ محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس بیگم رائے کنج بہاری لال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ ناز صدیقی لکچرار ویمنس کالج نے مقالہ اور محترمہ مظفر النساء ناز نے کہانی سنائی۔ خواتین شعراء نے کلام بھی پیش کیا۔

۵ر جون :- پروفیسر حبیب الرحمن صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے اردو سے متعلق وزیر تعلیم اور وزیر پنچایت راج کے مشترکہ بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے باختیار سرکاری وضاحت پر اطمینان ظاہر کیا ہے اور توقع کی ہے کہ اس بیان میں جو وعدہ کیا گیا ہے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے گا اور اردو والوں کی دیرینہ بے اطمینانی کا ازالہ کر دیا جائے گا۔

۶ر جون :- مسٹر بی وینکٹ رام ریڈی وزیر تعلیم نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے اردو تعلیم کے انتظام پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس خواہش کا اعادہ کیا کہ انجمن کی طرف سے اگر انھیں اردو سکھانے کا انتظام کیا جا سکے تو وہ اردو سیکھنے میں فخر محسوس کریں گے اس طرح ان کی ایک دیرینہ آرزو بھی پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔ مسٹر ریڈی نے بتایا کہ ریاست میں تلگو کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو ہی ہے جسے بلالحاظ مذہب و ملت سبھی بولتے اور سمجھتے ہیں۔

◆ ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کی اطلاع کے بموجب سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر پریم گوپال متل کی مرتبہ کتاب کو ایم اے کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

۷ر جون :- متحدہ مجلس عمل محبان اردو کے ایک وفد نے اردو اکیڈیمی کے مسائل اور اردو ریسرچ سنٹر کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں یادداشت پیش کی۔

۸ر جون :- ماہنامہ پونم کے خصوصی نمبر "آندھرا پردیش کے منتخب افسانے" کی جناب یم باگا ریڈی نے رسم اجرا انجام دی اور اردو افسانے کے تدریجی ارتقاء اور پونم کے خاص نمبر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آپ نے اردو والوں سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ اردو زبان کے تحفظ، ترقی اور اشاعت میں اپنی

مہ داریوں کو محسوس کریں۔ جناب ندر سری نواس ستیونڈ ائرکٹر اردو اکیڈمی نے صدارت کی۔ جناب ابو الفیض سحر رد گار ناظم ترقی اردو بورڈ حکومت ہند نے "یونم" کی ادبی خدمات اور خاص نمبر پر اپنے فاضلانہ خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر مدعو افسانہ نویسوں کی گلپوشی کی گئی۔ آخر میں جناب ناصر کرنولی ایڈیٹر "یونم" نے شکریہ ادا کیا۔

۱۲ر جون:۔ ناتن آرٹس انٹرنیشنل کی طرف سے اردو، فارسی اور انگریزی کی شاعرہ محترمہ بانو طاہرہ سعید کی کتاب "مثبت و منفی" (برطانوی شاعر ملٹن کی انگریزی نظموں کا ترجمہ) کی رسم اجرا محترمہ سروجنی پلا ریڈی ڈائرکٹر اطلاعات نے انجام دی۔ مسٹر ونود راؤ مشیر محکمہ اطلاعات نے جلسہ کی صدارت کی۔ مسٹر ... صدیق آرکیٹکٹ نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے بانو کی ادبی و شعری خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ مسٹر جیلانی بیراک نے جلسہ کی کارروائی انجام دی اور مسٹر اکرام اللہ خاں نے شکریہ ادا کیا۔

◆ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے پر حکومت بہار کو مبارک باد دیتے ہوئے مولانا ابو یوسف (رحم علی سیتی) صدر مجلس انتظامی اردو اکیڈمی نے کہا ہے کہ اس مستحسن اقدام سے دوسری ریاستیں بھی روشنی حاصل کریں گی۔ مولانا نے قومی ایکتا اور تحریک آزادی کی جد و جہد میں اردو کے عہد ساز کردار کو بھی اپنے بیان میں خراج ادا کیا۔

۱۳ر جون:۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کا مخدوم ادبی ایوارڈ۔ جو ہندوستان میں دیا جانے والا سب سے بڑا اردو ادبی انعام ہے۔ اس سال اردو کے نامور ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری (بمبئی) کو دیا گیا ہے۔ اردو اکیڈمی نے اس ایوارڈ کے لیے ملک بھر کے نقادوں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی کثرت رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے جناب جعفری کے نام کا فیصلہ کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ انعام صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی کے ہاتھوں ایک خوش گوار تقریب میں جعفری کو دیا جائے گا۔ مسٹر چندر سری نواسن ڈائرکٹر و سکریٹری اردو اکیڈمی نے بتایا کہ اکیڈمی کی طرف سے اس سال مصنفوں کو ۵ ہزار روپے کے انعامات ان کی تصانیف پر دیے جائیں گے جس کے لیے ریاستی مصنفوں کی ۸۰ اور بیرون ریاست سے ۲۷ کتابیں وصول ہوئی ہیں۔ اسی سال اردو اکیڈمی نے ریاست کے ۳۴ کتب خانوں کو ۲۰ ہزار روپے کی کتابیں بطور امداد دی ہیں۔

۱۴ر جون:۔ تلگو کے ملک الشعراء ڈاکٹر داسرتھی نے جناب سردار جعفری کو مخدوم ایوارڈ دیے جانے کی اطلاع پر مبارکباد دیتے ہوئے اس اقدام کے لیے اردو اکیڈمی کے طریقہ کار کی ستائش کی اور مخدوم کی ادبی و قومی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔

◆ ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا اجلاس جناب حبیب الرحمن صدر انجمن کی صدارت میں بمقام "اردو ہال" منعقد ہوا جس میں اردو کے مطالبات کی تائید میں سیکولر اور جمہوری طاقتوں کے تعاون و اشتراک پر شکر گزاری کا اظہار کیا گیا اور طے پایا کہ اردو کے تمام مسائل کے بارے میں انجمن چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی سے ملاقات کرے۔ مسٹر عابد علی خاں معتمد عمومی نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس جلسہ میں انجمن کے ترجمان "ترقی اردو" کی دوبارہ اشاعت کے بارے میں بھی غور کیا گیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور مسٹر سری نواس لاہوٹی شریک معتمدین نے بھی مباحث میں حصہ لیا۔

۱۵ر جون:۔ حضرت امیر مینائی کی یاد میں دو روزہ ادبی تقاریب منعقد ہوئیں۔ ایک نعتیہ مشاعرہ مولانا محمد عثمان مینائی بہشتی کی نگرانی میں ہوا۔ قدم کتب فکر کے شعراء نے بارگاہ رسالت میں نذرانہ

سخن ادا کیا۔

۱۸؍جون:۔ جناب سید کشتر شاہ صدر نشین قانون ساز کونسل نے اردو کے مطالبات کی تکمیل میں طلباء اور نوجوانوں کی مجلس عمل کی بھوک ہڑتال کی تائید کرتے ہوئے ان کے واجبی مطالبات کی عاجلانہ تکمیل پر زور دیا۔

◆ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی مرتبہ کتاب "مکاتیب رشید احمد صدیقی" جس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے نیشنل بک ڈپو حیدرآباد۔ ۲ سے شایع ہو کر منظر عام پر آگئی ہے۔

۲۱؍جون:۔ مرکزی وزیر لیبر مسٹر ٹی انجیا نے اردو کے مطالبات پر طلباء اور نوجوانوں کی ایکشن کمیٹی کی جدوجہد سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بھوک ہڑتال کیمپ پر کہا کہ وہ ہمیشہ ہی اردو کے واجبی مطالبات کے حامی رہے ہیں۔

◆ ڈاکٹر قیوم صادق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج بیدر کی تحقیقی کتاب "بیجاپور کی اردو مثنویاں (۱۴۵۰ء تا ۱۷۰۰ء) جس پر انھیں بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب ادبی مرکز اعجاز پریس حیدرآباد۔ ۲ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۲۷؍جون:۔ عثمانیہ یونیورسٹی اردو ریسرچ اسوسی ایشن کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری نے اردو کی پہلی خاتون شاعرہ لطف النساء امتیاز پر مقالہ سنایا جناب علی احمد جلیلی نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔ محمد منظور احمد شریک معتمد کے شکریہ پر محفل اختتام کو پہنچی۔

◆ مسٹر یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی نے اپنے اجلاس پر اردو کے مسائل کے تعلق سے ریاستی وزیر تعلیم، وزارت تعلیم کے اعلیٰ عہدہ داروں اور ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی کی موجودگی میں اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی جانب سے پیش کردہ ۔ انکاتی منشور مطالبات کی یکسوئی کے لیے چند اہم فیصلے کیے ہر دو وزراء نے بتایا کہ حکومت نے کالجوں میں اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کے قیام سے اتفاق کر لیا ہے اور ظہیر کے سٹی کالج اور بیگم پیٹھ ویمنس کالج میں اسی تعلیمی سال سے اردو میڈیم کی متوازی ڈگری جماعتوں میں تعلیم کا آغاز بھی ہوگا یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اردو اکیڈیمی کو بقایا دو لاکھ روپے کی گرانٹ بھی جاری کردی گئی ہے۔

۲۹؍جون:۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے اردو ہال میں جناب طیب انصاری صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج گلبرگہ کی نئی کتاب "حیدرآباد میں اردو صحافت" کی رسم اجرا انجام دی

نقد و نظر

کائنات (مجموعہ کلام) مصنف: بہار کوٹی سن اشاعت: ۱۹۷۷ء
محمد اظہار الاسلام انجینئر کراچی یونیورسٹی ضخامت: ۱۷۶ صفحے قیمت: پندرہ روپے

ار کوٹی نے شعر گوئی کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب حسرت، فانی، شاد، یگانہ اور اصغر اپنے تازہ سے اردو غزل کو ایک نئی زندگی بخش رہے تھے۔ بہار نے ان اساتذہ سے اکتساب ہنر کیا۔ ونڈی سے زیادہ متاثر ہوتے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف اصغر کی قائم کردہ روایت ام تھا بلکہ اس اساس پر اپنے تجربات و مشاہدات اور فکر و جذبات کی مدد سے شاعری کا ایک نیا قصر تعمیر کیا۔ جو تھی دہائی میں بہار کا کلام اردو کے اکثر معیاری رسالوں میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کے باوجود ان کی مخصوص حلقے تک محدود رہی۔ اس کی ایک وجہ ان کی شاعری کی طرف سے نقادانِ شعر کی بے اعتنائی ری دہائی میں ابھرنے والی نئی ادبی تحریکیں بھی اس طرز شاعری کو نامقبول بنانے کا باعث ہوئیں۔ کلاسیکی اور فنی پختگی کے علاوہ بہار کوٹی کی شاعری کا وہ حصہ جس میں منفرد تجربات کا فن کارانہ اظہار ہوا ہے۔ ل قدر ہے اور اردو غزل کے سرمائے میں انھوں نے جو اضافہ کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
ار کوٹی کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ محمد اظہار الاسلام صاحب انجینئر کراچی یونیورسٹی نے ”ذات و کائنات“ ے ان کے کلام کی باقیات کا یہ مجموعہ نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں بہار کوٹی کی اور فن پر پروفیسر منظور حسین شور اور احسان دانش کے مضامین کے علاوہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر نقی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی گراں قدر آرا بھی شامل ہیں۔ بہار کوٹی کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو کے کلیات کی شکل میں شائع کیا جانا چاہیے تاکہ اردو شاعری کے قارئین اس سے بہرہ ور ہو سکیں۔ کلیات کی ت کے ذریعے بہار کوٹی کا مجموعی کارنامہ سامنے آ سکے گا تو ان کی قدر شناسی میں بھی سہولت ہوگی۔

معراج نظارہ ہے تری دید کا ارماں — جس نے تجھے دیکھا ہے وہ تشنہ بھی ہوا ہے
جلووں کی خبر لو، مرے گھر کی نہ کرو فکر — اکثر یہ اندھیروں میں منور بھی ہوا ہے
غرق ہونا تو مقدر ہے مگر — کوئی آواز تو ساحل سے اٹھے
اسی عالم کو شاید عالم تصویر کہتے ہیں — عیاں ہو کر بھی محتاج بیاں معلوم ہوتا ہے
نگہ شوق پہ مشکل سے یقیں آتا ہے — وہ حجابات بھی حائل ہیں جو حائل نہ رہے

صرف آرائش داماں و گریباں ہے بہار
جس لہو سے تھی امید چمن آرائی بھی

اب انھیں مقصد آغاز سفر یاد نہیں
رہ گئے ہیں جو رفیقانِ چمن تھوڑے سے

اہلِ چمن یہ غایتِ پرواز کھل نہ جائے
مرغِ شکستہ پر کو چمن سے نکال دے

[نازصدیقی]

زخموں کی ہنسی (فکاہیے) مصنف: ایم احمد صفحات: ۹۶ قیمت چار روپے

ایم احمد پیشۂ وکالت سے وابستگی رکھتے ہیں۔ سکونت دہلی کی ہے اب تک اردو مزاح کو پانچ کتابیں/کتابچے دے چکے ہیں (ذرا مسکرا دو، پردے کے پیچھے، مسکراتے آنسو، باتیں ہنسی کی) یہ سلسلہ ۱۹۷۶ء سے شروع ہوا ہے۔ ان کی غیر مجلد کتابوں کو پیپر بیک کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں موجود طویل اور مختصر لطیفے خاص قسم کے معاشرتی نقطۂ نظر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لطیفوں کے علاوہ انھوں نے مختصر مضامین بھی ان کتابوں میں شامل کئے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا لطیفہ کہاں ختم ہو رہا ہے اور کہاں سے مضمون کی ابتدا ہو رہی ہے۔ امریکی ٹٹ بٹس TIT BITS کی نقل میں وہ قول محال کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ پردے کے پیچھے جو بھی واقعات گزرتے ہیں ان پر ایم احمد کی نظر رہتی ہے۔ وہ منتشر جملوں میں چنگاریاں بھر دیتے ہیں۔ مگر اتحاد مضمون کا خیال رکھ کر کوئی چیز لکھنا ان کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ ان کے لطیفوں کا ماخذ ہر وہ پرچہ ہے جس میں لطیفے چھپتے ہوں۔ زخموں کی ہنسی میں حیات و ممات دونوں کا احاطہ ہے۔ زندگی سے زیادہ موت کا مذاق اڑانا چاہتے ہیں۔ کئی ایک حقیقتوں کو انھوں نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ جیسے عمر ـــــ بہت تنگ یا تھی ـــــ آہٹ بھی نہ ہوئی گذر گئی یا آدمی کا آنا جانا ایسا ہے جیسے وہ بن بلائے کوئی مہمان کی مجلس میں آ جھکے اور بلا پوچھے اٹھ کر چل دے یا جب آدمی جاتا ہے تو اتنی جلدی میں اور اس طور سے کہ وہ اپنا عمر بھر کا جمع کیا ہوا مال و متاع ہی نہیں خود اپنا جسم بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

تعارف، کون نشہ میں تھا، یہاں چھینکنے کی جگہ نہیں، مختلف سوالات، وغیرہ دوسرے لطیفے انگریزی پرچوں السٹریٹڈ ویکلی اور ریڈرس ڈائجسٹ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ سب سے اچھا مضمون "شیطان سے ایک انٹرویو" ہے۔ "ابن طوطا کا سفرنامہ" "پڑوسی ملک کیا کرتا ہے" بھی قابل اعتنا مختصر مضامین ہیں۔ ان کا انداز بیان حشو و زوائد سے پاک ہے۔ مگر اختصار کی شدت کے باعث بات بنتی نظر نہیں آتی۔ اردو مزاح کو ان سے امیدیں وابستہ ہیں۔ مگر انھیں بھی اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔

(یس جے۔ صادق)

چند نئے شعری مجموعے

زینہ زینہ راکھ (غیاث متین) قیمت: دس روپے

اجنبی پرندے (اسلم عمادی) قیمت: دس روپے

نصابِ دل (رشید عبدالسمیع) قیمت: بارہ روپے

صدف تمام ریت ریت (علی الدین نوید) قیمت: بارہ روپے

ملنے کا پتہ: ۱۱-۱-۳۱۱ / ۲۲ / ۳، شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

1980

R. N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

in of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P.)





سن اجرا: ۱۹۳۸ء

۱

فون : ۳۸۴۶۹

بیاد گار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۳ اگست ۱۹۸۰ء شمارہ ۸

مدیر اعزازی ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل

ادارۂ ادبیات اردو ○ پنجہ گٹہ ○ حیدر آباد ۵۰۰۰۰۴

قیمت: ایک روپیہ پچھتر پیسے

سالانہ

معمولی ڈاک سے ۲۰/- روپے

کتب خانوں و اداروں سے ۲۵/- روپے

رجسٹری سے ۴۵/- روپے

بیرونی ملکوں سے

مشرق وسطی ۱۰ ڈالر، امریکہ ۱۲ ڈالر

پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر

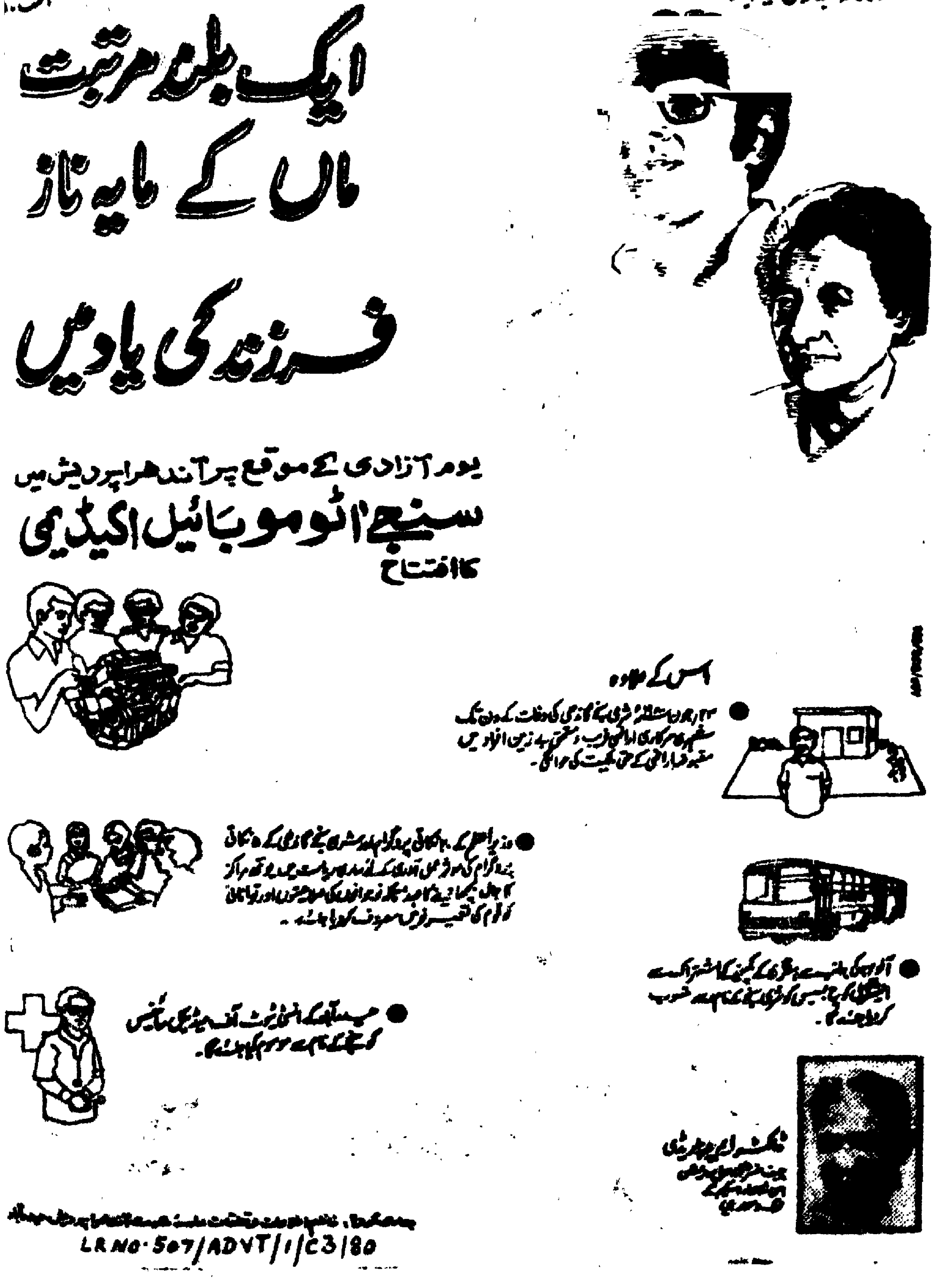
انگلستان ۷ پونڈ

(ہوائی ڈاک سے)

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدر آباد - ۲

ترتیب

باتیں	وقار خلیل	۳
ایک نظم	سروجنی نائیڈو	۴
غزلیں	مغنی تبسم، محمود سعیدی	
	قطب سرشار	۵
(قند مکرر)		
مرحوم کنھیا لال کپور	کنھیا لال کپور	۶
غزل	عمر انصاری	۹
خوش درخشید ولے (نظم)	و۔ خ	
غزلیں	وقار واثقی	۱۰
ہند و پاک اردو افسانہ سیمینار رپورٹ	ڈاکٹر محمد ذاکر، ڈاکٹر مظفر حنفی، حنیف کیفی	۱۱
اردو نامہ	و۔ خ	۳۸



ایک بلند مرتبت
ماں کے مایۂ ناز
فرزند کی یاد میں
یوم آزادی کے موقع پر آندھرا پردیش میں
سنجے آٹوموبائیل اکیڈیمی
کا افتتاح
اس کے علاوہ
LR NO. 507/ADVT/1/C3/80

وقار خلیل

باتیں

اس بار سب رس میں ہم "ہند، پاک اردو افسانہ" پر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک سمینار کی مبسوط روداد شائع کر رہے ہیں، اس کے مطالعہ سے اردو افسانہ کے کردار اور اس کی عصریت سے فکشن پر نظر رکھنے والوں کو بہتر معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق رپورٹ نے کئی صفحات کا احاطہ ضرور کیا ہے۔

دیگر شمولات میں "قند مکرر" کے تحت گیور مرحوم کا مضمون ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور دسمبر ۱۹۵۵ء سے ڈائجسٹ کیا گیا ہے۔ شعری حصہ اپنی رنگارنگی اور فکر و اظہار کے ابلاغ کی نمائندگی کرتا ہے۔ "اردو نامہ" کے کالم حیدرآباد کی ادبی اور علمی مصروفیات کو آئینہ دکھاتے ہیں۔

□ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے اردو دنیا کا سب سے اہم ایوارڈ "مخدوم ادبی ایوارڈ" معروف ترقی پسند شاعر اور دانشور علی سردار جعفری کو دیا گیا۔ اس طرح محنت اور محبت کے شاعر اور ترقی پسند رہنما مخدوم کی یاد میں ان کے معاصر نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔ "حق بہ حقدار رسید" کے مصداق ہم جعفری اور اکیڈیمی کو مبارکباد دیتے ہیں۔

□ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی ایوارڈ سب کمیٹی نے ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء کے لیے صف اول کے چھ اردو کے مصنفوں کو فی کس ۵ ہزار روپئے نقد، ایک تمغہ اور سند کا مستحق قرار دیا ہے جن میں ارض دکن کی ہند و پاک شہرت رکھنے والی افسانہ نویس ادیبہ محترمہ جیلانی بانو، ملک کے نامور غزل گو شاعر جناب مجروح سلطان پوری، صف اول کے فکشن لکھنے والے ادیب جناب راجندر سنگھ بیدی، ترقی پسندی سے عصری جدیدیت تک نقد و نظر کے حامل سخنور اور نقاد خلیل الرحمان اعظمی مرحوم، مشہور نقاد اور محقق جناب رشید حسن خاں اور ادبیات فارسی کے استاد پروفیسر امیر حسن عابدی شامل ہیں، ہم تمام اصحاب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

□ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ریاست کے (۴۴) مصنفوں کو ان کی تخلیقات پر ۷۹-۱۹۷۸ء کے ادبی انعامات کا اعلان کیا ہے۔ بیرون ریاست کے (۱۴) مصنفوں کو بھی یہ انعام پہلی بار ملا ہے۔ ادارہ سب رس تمام انعام یافتگان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

□ جناب علی جواد زیدی کو اتر پردیش اردو اکیڈیمی کا چیرمن نامزد کئے جانے پر ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں خوشگوار ردعمل کا اظہار کیا جا رہا ہے جناب زیدی صف اول کے دانشور، اہل قلم، سخنور، نقاد اور ادب و تہذیب کی گنگا جمنی قدروں کے علمبردار رہے ہیں۔ ہم زیدی صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے متوقع ہیں کہ وہ یوپی میں اردو زبان، تعلیم اور ادب و ثقافت کو عوامی موڑ دینے میں اپنی بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے اور اب تک اردو سے جو ناانصافیاں اُدھر ہوتی رہی ہیں ان کے تدارک کے لیے ایک مجاہد آزادی کا کام آگے بڑھیں گے۔

□ تازہ اطلاعات کے بموجب پروفیسر کلیم الدین احمد ایسے دانشور نقاد کو بہار اردو اکیڈیمی کا ریاستی گورنر نے نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا ہے یہ امر اردو دنیا اور بہار کے محبان اردو کے لیے قرار واقعی فال نیک ہے۔

■ انعامات، اعزازات اور اکیڈیمیوں میں خوشگوار تبدیلیوں سے جہاں اردو کو مسرتوں سے ہمکنار ہونا پڑا وہیں اس زبان کو اپنی مثال آپ خدمتگزاروں کی وفیات سے نم دیدہ بھی ہونا پڑا۔ علامہ جمیل مظہری ایسے قادر الکلام استاد ۲۳ جولائی کو رحلت کر گئے، ۲۶ جولائی کو بمبئی میں ڈاکٹر صفدر آہ ایسے محقق شاعر اور خسرو شناس نے زندگی کی آخری سانس لی، اور اسی دن کراچی میں مقبول عام ناول نویس ابن صفی اللہ کو پیارے ہو گئے، ان "اصحاب ثلاثہ" کی وفیات دنیائے اردو کیلئے سانحہ ہے، ادارہ سب رس مرحومین کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

سروجنی نائیڈو

ترجمہ : مغنی تبسم

ایک نظم

بھری ہوی ہے گاگر میری
دور اسے لے جانا ہے
لمبا اور تنہا رستہ ہے
آہ میں اتنی دیر یہاں کیوں ٹھیر گئی تھی
مانجھی کے اس گیت نے مجھ کو کیوں بہلایا
رات کے سائے تیزی سے بڑھتے آتے ہیں
ارے سنو تو
یہ کیسی آواز ہے
شاید یہ بگلے کی صدا ہے
یا جنگل میں الو کوئی چیخ رہا ہے ؟
چندا کی نازک کرنیں بھی ہوتی تو کچھ راہ سلجھاتیں
میں ڈرتی ہوں
اندھیارے میں ناگ نہ کوئی ڈس لے مجھ کو
یا کوئی آسیب ہی میرا رستہ روکے
رام رے میں تو مرجاؤں گی،

میرا بھیا کڑھتا ہوگا
کتنی دیر لگادی اس نے

ماں بھی رستہ دیکھ کے میرا رو رو کر یہ کہتی ہوگی
"ہے بھگوان مری بچی کو اپنی حفاظت میں پہنچادو"
جمنا کا پانی گہرا ہے
جمنا کے پانی کی لہریں کیسا ٹھاٹھیں مار رہی ہیں
شام کے گہرے سائے یوں منڈلانے لگے ہیں
جیسے گگن پر کالے پرندوں کا جمگھٹ ہو
ایسے میں طوفان اگر آئے تو کیا ہو
ایسے میں گر بجلی چمکے
خود کو کہاں لے جا کے چھپاؤں
جب تک تم رستہ نہ دکھاؤ
اور نہ دو قدموں کا سہارا
رام رے میں تو مرجاؤں گی

۵

محمود سعیدی

○

ں ہوی دنیا کی مثالوں میں نہیں ہیں
ود ہم اپنے ہی حوالوں میں نہیں ہیں
ہ ہم کو ہمارے سحر و شام میں بھی جی!
زندہ فقط اپنے خیالوں میں نہیں ہیں
ے دیدہ ورو! ایسی بھی اب کم نگہی کیا
ے کچھ اندھیرے اِن اجالوں میں نہیں ہیں
ں ثبت جو کرتا ہے سر صفحۂ احساس
نقش کتابوں میں، رسالوں میں نہیں ہیں
ے صبح جہاں تاب! ذرا دیکھ ہمیں بھی
تیری طرف دیکھنے والوں میں نہیں ہیں
ں کر نہ خدا جو میرے خوابوں میں رہے ہوں
ہ بت میری یادوں کے شوالوں میں نہیں ہیں
بیٹھے ہیں کچھ اس طرح سنبھالے ہوئے خود کو
م جیسے ترے چاہنے والوں میں نہیں ہیں
محمود! جو تم ڈھونڈ رہے ہو وہ ادائیں
اس شہر کے رنگین جیالوں میں نہیں ہیں

(زیر طبع کتاب "واحد متکلم" کا ایک ورق)

قطب سرشار

○

اک پگھلتا ہوا ڈھیر تھا، گھر نہ تھا
برف کی سِل تھی وہ، سنگ مرمر نہ تھا
خوشنما سے پرندے تھے احساس کے
عہد رفتہ حقیقت کا خوگر نہ تھا
کیا جذبات کا سیل تھا وہ بھلا
ڈوب کر جس سے نکلا بدن تر نہ تھا
ذہن کا سنتری جاگتا ہی رہا
"قید سینہ" میں دل ہے کہ اکثر نہ تھا
نیل گوں وسعتیں، سیم گوں چاندنی
راغبِ جسم و جاں کوئی منظر نہ تھا
دوستوں نے یہ سمجھا کہ قد گھٹ گیا
میرا سایہ جو میرے برابر نہ تھا
خوں بہا کس سے سرشار جاہو گئے تم
وقت کے ہاتھ میں کوئی خنجر نہ تھا

پروفیسر کنہیا لال کپور مرحوم

تذکرہ

مرحوم کنہیا لال کپور

آج ۲۰ رجون ۱۹۶۰ء کو مشہور طنز نگار کنہیا لال کپور اس دنیا سے گزر گئے۔

"خدا بخشے بہت سی" خامیاں "نخیں مرنے والے میں" روحانی طور پر تو ان کی وفات اسی دن واقعہ ہو گئی تھی جب آج سے تیرہ برس پہلے انہیں لاہور چھوڑنا پڑا تھا۔ لیکن جسمانی طور پر وہ آج انتقال کر گئے غالباً دنیا کے وہ پہلے ادیب جو پیدا ایک بار ہوئے لیکن مرے دو بار، بیمہ کمپنی والوں کے علاوہ شاید بہت کم لوگوں کو ان کی موت کا افسوس ہوا ہو گا۔ دوستوں، ڈاکٹروں اور خود اپنے اندازے کے مطابق انہوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ اپنے خاندانی ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق انہیں آج سے کم از کم بیس برس پہلے مر جانا چاہیے تھا۔

اردو کے اس مشہور طنز نگار کی موت دل کے صدمہ سے ہوئی۔ کل تک بالکل تندرست تھے۔ شام کو آل انڈیا ریڈیو پر انہوں نے ایک وزیر کی تقریر سنی اور یہ تقریر سنتے ہی ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اس تقریر کے جن لفظوں سے انہیں صدمہ پہنچا درج ذیل ہیں۔

"اگر پروفیسر لوگ بھوکے مر رہے ہیں، اگر انہیں اپنی تنخواہوں میں اضافہ ہونے کی کوئی امید نہیں، اگر ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ ہر ماہ امریکن پاکٹ سیریز کی دو چار سستی کتابیں خرید سکیں، اگر بناسپتی گھی کھا کھا کر ان کے گلے خراب ہو گئے ہیں۔ تو انہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اناج اگائیں ——"

پروفیسر کنہیا لال کپور بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، انہیں دیکھ کر بیک وقت ابراہیم لنکن، قائد اعظم محمد علی جناح اور آر ایل اسٹیونسن کا خیال آ جاتا تھا وہ حد سے زیادہ لمبے اور دبلے تھے جب بیٹھے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ کھڑے ہیں اور جب کھڑے ہوتے تو ایسا لگتا کہ کھڑے نہیں ہیں بلکہ گر پڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ خدا نے انہیں ایک ایسا چہرہ عطا فرمایا تھا جس میں شنکر جیسا کارٹونسٹ تو دلچسپی لے سکتا تھا لیکن چغتائی جیسا مصور دیکھ کر ناک بھوں چڑھا لیتا۔

کرشن چندر کے قول کے مطابق انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ دنیا میں کسی نے ان کو محبت کرنے کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس لحاظ سے وہ صرف نام ہی کے کنہیا تھے حیرت اس بات پہ نہیں کہ انہیں عمر بھر کوئی "رادھا" نہیں ملی۔ بلکہ اس پر ہے کہ انہیں کبھی کوئی "سداما" بھی نہیں ملا۔

جن چیزوں کے پیچھے ایک عام آدمی بھاگتا ہے مثلاً عورت، دولت، قوت وغیرہ ان کا انہوں نے کبھی پیچھا نہیں کیا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے کیوں کہ خدا نے انہیں کافی لمبی لمبی ٹانگیں دی تھیں۔ جہاں تک عادتوں کا تعلق ہے ان کی کوئی عادت مشکل ہی سے سراہی جا سکتی ہے۔ آج کا کام کل کے بجائے ہمیشہ پرسوں کیا کرتے تھے۔ پرہیز کے مقابلے میں علاج کو بہتر سمجھتے

تے کہتے تھے پرہیز تو ہر روز کرنا پڑتا ہے لیکن علاج صرف ان دنوں میں کرایا جاتا ہے جب آدمی بیمار ہو۔ دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے جب تک خط اتنا دلچسپ نہ ہو کہ خواہ مخواہ جواب دینے کو جی چاہے جواب نہیں دینا چاہیے بہت کم لکھا کرتے تھے۔ زیادہ لکھنے سے اس لیے گھبراتے تھے کہ زیادہ لکھنے سے آدمی گنجا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کی مثالیں دیتے تھے۔ ساتھ ہی کہتے تھے کہ گنجا ہونے کی وجہ سے یہ پریشانی اٹھانا پڑتی ہے کہ دوست احباب چہرے کے بجائے ہمیشہ سر کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ سست اس درجہ تھے کہ اگرچہ عمر بھر سگریٹ پیتے رہے لیکن کبھی اس کی توفیق نہ ہوئی کہ ایک ایش ٹرے ہی خرید لیں۔

معمولی سے معمولی خطرے میں بھی پڑنے سے ڈرتے تھے ایک دفعہ ہوائی جہاز میں محض اس لیے سوار ہونے سے انکار کر دیا کہ "میں اونچائی پر سے گر کر مرنے کے بجائے چارپائی پر پڑے پڑے مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں" صحت ان کی ہمیشہ خراب رہتی تھی لیکن وہ اس طرف بالکل توجہ نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے صحت تو خراب ہے ہی، اگر اس کا [illegible] بھی خراب ہو جائے گا۔" ان کی صحت کی فکر ان سے زیادہ ان کے دوستوں کو رہتی تھی۔

ایک بار کچھ دوست گھیر گھار کر انھیں کشمیر لے گئے۔ کشمیر کے متعلق مشہور ہے کہ اگر گنجا ہوا مرغ بھی اس سرزمین میں ہو تو اس کے بال و پر دوبارہ نکل آتے ہیں لیکن ان پر کشمیر کی آب و ہوا کا اثر یہ ہوا کہ سر کے آدھے سے زیادہ بال جھڑ گئے یعنی گنجے ہونے سے بال بال بچے اس واقعہ کے بعد انھوں نے کبھی کشمیر کا رخ نہیں کیا۔

۱۹۴۲ء میں انھوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون "غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں" لکھا اور — اردو کی ساری ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بائرن کی طرح ایک صبح اٹھے اور انھوں نے اپنے کو مشہور پایا لیکن یہ ٹھیک ہے کہ انھیں مشہور ہونے کے لیے شدید انتظار کرنا پڑا۔ یہ شہرت ان کے حق میں زہر ثابت ہوئی۔ کیوں کہ بہت جلد انھوں نے محنت سے لکھنا ترک کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح شیریڈن اپنی صرف ایک تقریر کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے انھیں بھی ایک اچھے مضمون کے مصنف ہونے کی حیثیت سے دنیا یاد رکھے۔ یوں تو انھوں نے بہت سے مضمون لکھے جو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں مزاح نگار نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے ہر اس چیز کا جو زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہے مذاق اڑایا ادیبوں کا، رہنماؤں کا، فلمیں بنانے والوں کا، فلمیں دیکھنے والوں کا، غلامی کا، آزادی کا، لیکن انھوں نے ڈکنس یا وڈہاؤس کی طرح کا مزاحیہ کردار اردو ادب میں نہیں چھوڑا۔ ان کے مضامین میں کسی "مکابر" یا "مجیوز" کو ڈھونڈنا فضول ہے۔ اصل میں وہ مزاح نگاری سے زیادہ طنز میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ بھارت کو مزاح کی نہیں بلکہ طنز کی ضرورت ہے۔

لکھنے کو تو انھوں نے اردو میں چار چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں جن کے نام اتنے مشکل نہیں کہ کسی کو آسانی سے یاد نہیں رہ سکتے (یعنی "سنگ و خشت"، "شیشہ و تیشہ"، "چنگ و رباب" اور "نوک نشتر") لیکن ان کتابوں میں بہت کم مضمون کام کے ہیں۔ کچھ مضمون تو اتنے مختصر ہیں کہ انھیں پڑھ کر مصنف پر ترس آتا ہے، زندگی کے آخری دنوں میں ان کے مضمون بے حد مختصر اور بے کیف ہو گئے تھے۔ ایک بار راجندر سنگھ بیدی نے ان سے شکایت کی تھی کہ آپ کی تحریروں میں اب وہ مزا نہیں جو پہلے ہوتا تھا اس پر انھوں نے ہنس کر جواب دیا کہ میں تو وہی ہوں لیکن پڑھنے والے اب پہلے سے زیادہ چالاک ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرنے سے ایک منٹ

پہلے انھوں نے اپنے چاروں مجموعوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا "میں بھی کتنا احمق ہوں کہ میں نے یہ کتابیں لکھیں"

یہ بات بہت افسوس ناک ہے کہ وہ بڑے ادیب نہیں بن سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح افیون کھانے کی عادت نے کالرج کی قوتِ تحریر کو تیس برس کی عمر میں تباہ کر ڈالا تھا اسی طرح کالج کے نوٹس لکھنے کی عادت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا انھوں نے پچاس برس کی عمر میں اتنے نوٹس لکھے کہ ان سب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے ایک بڑی ٹرک کی ضرورت ہوگی جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آپ یہ ذلیل کام کیوں کرتے ہیں تو رو رو کر کہا کرتے "سب پیٹ کی خاطر" اور عجیب بات تو یہ ہے کہ اس ذلیل کام سے بھی زیادہ روپیہ نہ کما سکے۔ کیوں کہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کا بنک میں بیلنس صفر تھا۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ ذلیل کام نہ کرتے تو اچھے ادیب بن سکتے تھے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ پروفیسری چھوڑ کر سارا وقت ادب کی خدمت میں لگا دیتے تو امر ہو جاتے۔ خود کہتے تھے کہ اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو بہت اچھے رہتے۔ بہرحال ان میں سے کوئی بات بھی ٹھیک ہو ان کو ایک ایسی کلی سے نسبت دی جا سکتی ہے جو کبھی چٹک کر پھول نہ ہو سکی یا اس آگ سے جو بھڑک کر شعلہ نہ بن سکی۔ وہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ، ایک بجھتا ہوا شعلہ، اور ایک جھلملاتا ہوا ستارا تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ جگنوں کی طرح ایک آدھ بار چمک کر وہ ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ خدا کرے کہ ان کی روح کو کبھی سکون ملے۔

عمر انصاری

○

خیال ذہن میں یوں کروٹیں بدلنے لگے — کہ جیسے شام ہوئی اور چراغ جلنے لگے
عجب وہ خواب کا عالم عجب سی بیداری — ہنسے جو پھول، ستارے بھی آنکھ ملنے لگے
کوئی لطیف سی خوشبو کچھ اس طرح پھیلی — شراب جیسے کہیں ساغروں میں ڈھلنے لگے
وہ طرفگی، کہ نہ کچھ جس کی حد نہ جس کا حساب — وہ نغمگی جو گلوں کے بھی دل مسلنے لگے
نظر کچھ ایسے بھی آئے ہوا میں اڑتے پہاڑ — قدم زمیں پہ جو رکھ دیں زمیں مچلنے لگے
کچھ ایسے تیر چلے جو کھنچی کمانوں سے — کچھ ایسے تیر جو خود ترکشوں پہ چلنے لگے
ہر ایک بات اس اک بھاگتے ہرن کی طرح — جو زخم کھا کے گرے اور پھر سنبھلنے لگے
ہر ایک لفظ وہ اک طفلِ شیر خوار جسے — نہ لے کوئی گود میں جب تک وہیں مچلنے لگے
زمیں پہ آ کے گرے آسماں سے تارے کچھ — کچھ آبشار سرِ کوہ سے اُبلنے لگے
ہزاروں در تھے جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا — اک ایک در سے ہزاروں حسیں نکلنے لگے
بنے ہوئے تھے مضامیں جو راہ کے پتھر — کسی غریب کے دل کی طرح پگھلنے لگے
وہ قافلے تھے جو خود اپنی گردِ راہ میں گم — قدم ملا کے مرے ساتھ ساتھ چلنے لگے
وہ سانپ ہاتھ لگاتے بھی جن کو ڈرتا تھا — مری جناب میں آ آ کے من اگلنے لگے

ہوئی نمودِ سخن اس طرح کہیں جیسے
زمیں کو چیر کے چشمے کوئی ابلنے لگے

وقار خلیل

خوش درخشید ولے

○

نہا کے بال سکھاتے ہوئے جو ہنستی ہو
قسم خدا کی
تم اک اپسرا سی لگتی ہو
تو اس نے
بان بڑھاتے ہوئے لٹک سے کہا:
اجی! جب ایسا ہے
دفتر سے گھر کو آتے ہوئے
میرے لیے وہی نکلس خرید لاؤ نا
بس اتنی بات
میں کہتے ہوئے جھجکتی تھی:
مجھے کچھ ایسا لگا:
میں زمیں پہ ہوں کہ نہیں ○○

ایک نظم

وہ ایک ساعتِ خوش کُن
کہ سیپ میں موتی
پہنچ کے بنتا ہے جب دُرِ شاہوارِ حیات
اسی کو کہتے ہیں
ہم لوگ احترامِ وصال

وقار واثقی

○

وانے یہ اللہ عجب وقت پڑا ہے
ایک سے کہتا ہے کہ تو میرا خدا ہے
رت سے ہر اک شخص کو وہ دیکھ رہا ہے
نا ہے، یہ جینے کا سبب بھول گیا ہے
ب جستجوئے نقطۂ موہوم کی خاطر
ں کس جگہ جانا پڑا کس کس سے ملا ہے
ں اپنا نظر آتا ہے ہر چیز میں اُس کو
ش ہے کہ زمانہ بھی اُسے دیکھ رہا ہے
د ساختہ تہذیب و تمدن میں الجھ کر
ینے کو جھنجلا کے وہ اب توڑ رہا ہے
ے ہیں اسے مصلحت و وقت شناسی
ڑھے ہوئے وہ آج بزرگی کی ردا ہے
نا ہے وفا اس کا بھرم کھلنے نہ پائے
نہ اسے معلوم ہے وہ کون ہے کیا ہے

○

چوری چھپے برائیاں مت کر
کھل کے ماحول سے بغاوت کر
جے پکار آج کے زمانے کی
بڑھ کے انکار آدمیت کر
بے تعلق نہ رہ زمانے سے
گر محبت نہیں تو نفرت کر
دوستی کیا ہے، خود سمجھ لے گا
دوستوں سے بہت محبت کر
یار، یہ ہر کسی کا کام نہیں
تجھ سے کس نے کہا محبت کر
یہ ہے توہین خود شناسی کی
اعترافِ شکست تو مت کر
مل گئی ہے نجات ہر غم سے؟
آج پھر دوستوں کی دعوت کر

ہند و پاک اردو افسانہ

[شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقد کردہ سیمینار (۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء) کی مختصر روداد]

مرتبین: ڈاکٹر محمد ذاکر۔ حنیف کیفی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی۔ ڈاکٹر سید فرحت حسین۔ شمس الحق عثمانی

جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو میں سنجیدہ علمی و ادبی سیمیناروں کی روایت خاصی راسخ ہو چکی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں انیس سیمینار، ۱۹۷۶ء میں "جدید اردو ادب میں زبان کا تخلیقی استعمال" سیمینار، ۱۹۷۷ء میں اقبال سیمینار، ۱۹۷۸ء میں لغت نویسی سیمینار، فروری ۱۹۸۰ء میں عابد حسین سیمینار اور پھر مارچ ۱۹۸۰ء میں "ہند و پاک اردو افسانہ" سیمینار۔ لیکن یہ سیمینار کئی لحاظ سے جداگانہ نوعیت کا تھا۔ کہنے کو تو یہ ہند و پاک سیمینار تھا اور اس میں پاکستان کے ممتاز ادیب پہلی بار سرکاری طور پر کسی یونیورسٹی سیمینار میں شریک ہو رہے تھے مگر اس میں روس، امریکہ اور سعودی عرب سے بھی اردو فکشن کے ماہرین اور تخلیق کار شریک ہو رہے تھے، اور برطانیہ اور ناروے کی نمائندگی بھی تھی۔ اسٹیج کے سفید قالینوں کو گلے ڈی او۔ لا، اری کیریا اور کروٹن اور طرح طرح کے گھنیرے پھولوں اور پودوں نے گھیر رکھا تھا۔ بیچوں بیچ پریم چند کی تصویر نمایاں طور پر آویزاں تھی۔ منتظمین مہمانوں کے استقبال میں گرم جوشی دکھا رہے تھے۔ طلبا اور طالبات سائن کے امتیازی پھول لگانے، پروگرام نامہ دینے اور فائل تقسیم کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھیں۔ عجیب گہما گہمی اور رونق کا سماں تھا۔ اتنے میں وزیر خارجہ جناب پی وی نرسمہا راؤ کی گاڑی آکر رکی۔ وائس چانسلر جناب انور جمال قدوائی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بڑھ کر استقبال کیا اور انھیں مہمانوں اور مندوبین سے ملوایا۔ ٹھیک دس بجے یہ حضرات اسٹیج پر تشریف لے آئے۔ صدر میں جناب نرسمہا راؤ صاحب اور جناب انور جمال قدوائی صاحب ایک طرف راجندر سنگھ بیدی اور پروفیسر آل احمد سرور، ان کے ساتھ پاکستان کے ممتاز ادیب ڈاکٹر وزیر آغا، جناب انتظار حسین اور جناب احمد ہمیش اور دوسری طرف امریکہ کے ڈاکٹر محمد عمر میمن اور روس کے پروفیسر اناتولی انالیف اور آخر میں سیمینار کے ناظم اعلیٰ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ سب کے بیٹھتے ہی نارنگ صاحب نے اعلان کیا کہ پروگرام کا آغاز اقبال کے ترانۂ ہندی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے ہوگا۔ استاد جلال احمد خاں کی طالبات سفید ساڑیوں میں ملبوس فوراً آگے بڑھیں اور انھوں نے ترانۂ ہندی ایسی خوش آہنگی اور سلیقے سے پیش کیا کہ سماں بندھ گیا، اور برصغیر کی عظمت و رفعت کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ اس کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ صاحب کا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر بھی ہیں پیغام پڑھ کر سنایا جو سیمینار کے بارے میں موصول ہوا تھا۔

جناب محمد ہدایت اللہ صاحب، نائب صدر جمہوریۂ ہند:

—— مجھے یہ معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبۂ اردو ۲۹ مارچ سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک جامعہ میں "ہند و

پاک اردو افسانہ سیمینار" منعقد کر رہا ہے جس میں کئی ملکوں کے ممتاز دانشور، ادبا اور افسانہ نگار شرکت فرما رہے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ یہ سیمینار با ہمہ آب و تاب کامیاب ہو۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ:

اس کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ خطبہ کے آغاز میں انھوں ان تمام دانشوروں اور افسانہ نگاروں کا خیر مقدم کیا جو دور دراز علاقوں سے سیمینار میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ پروفیسر نارنگ نے وزیر خارجہ حکومتِ ہند جناب نرسمہاراؤ کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ وہ سنسکرت، تلگو کے عالم ہیں اور فارسی و اردو کے رسیا ہیں اور ان کی اسی ادبی حیثیت کی وجہ سے ان کو زحمت دی گئی ہے کہ وہ اس سیمینار کا افتتاح فرمائیں۔ اردو افسانے پر سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے کہا "اردو افسانے کے بارے میں شاید یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار ہے جس میں اردو افسانے کی پوری روایت، اس کا ذہنی سفر، تخلیقی رویے اور رجحانات، وسائل و مسائل یعنی سب ہی پہلو زیر بحث آئیں گے۔ اس کی ضرورت یوں ہے کہ نیا افسانہ اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔ وہ ایک ایسے آئینے کے روبرو ہے جو شکستوں سے جڑا ہے۔ اس کے ہر ٹکڑے میں کوئی نہ کوئی صورت تو دکھائی دیتی ہے۔ لیکن خود اس کی صورت کیا ہے یا ان سب چہروں سے مل کر جو چہرہ بنتا ہے وہ کیا ہے اس بات کا جواب آسان نہیں۔ آزادی کے فوراً بعد جو نسل سامنے آئی تھی، اس کے پاس بغاوت کی مقدس آگ بھی تھی اور عزم و ولولے کا وہ تیشہ بھی جو رسمیات کے بے ستون کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ادبی اجتہاد و انحراف کی جوئے شیر نکال کر ان لوگوں نے نئی بستیاں آباد کی تھیں۔ ادب کی تاریخ میں منظر نامہ تو آئے دن بدل سکتا ہے، لیکن مزاج روز روز نہیں بدلا کرتا۔ آزادی کے بعد کی نسل نے ادب کی فضا اور مزاج کو بدل کر رکھ دیا اور یہ بات معمولی نہیں۔ شاعری کی طرح افسانے میں بھی پورے آدمی کو سمجھنے، زندگی کے تمام مناظر و کوائف کو نظر میں رکھنے، اس کے سیاہ و سفید ہر پہلو کو پرکھنے، اور خارجی اور باطنی تمام تقاضوں کو سمونے اور انسان کو ایک معنوی وحدہ، ایک محشرِ خیال اور ایک جہانِ آرزو کے طور پر دیکھنے اور دکھانے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اظہار کی سطح پر بھی لفظ کی معنیاتی کائنات، اس کے تہہ در تہہ رشتوں، علامتی، تجریدی اور تمثیلی پہلوؤں اور منطقی معنی کے ساتھ ساتھ معنی کے معنی اور ان کے معنیاتی انسلاکات کے تخلیقی امکانات کو بھی بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ان تیس بتیس برسوں کے تخلیقی اور ذہنی سفر کے گوناگوں تجربات نے فکشن آرٹ کی نوعیت کے بارے میں بعض بنیادی سوال بھی پیدا کر دیے ہیں۔ یعنی نئی کہانی نہایت بے رحمی سے پرانے فرسودہ ڈھانچے کو پاش پاش کرتی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ جدید کہانی جس حد تک وہ جدید ہے، کہانی نہیں ہے، اور جس حد تک وہ کہانی ہے، وہ جدید نہیں ہے؟ میرا خیال ہے یہ ایک گرہ ہے جس کا سلجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس بات پر بھی بحث کی گنجائش ہے کہ کیا کہانی کا "کہانی پن" افسانے کے فرسودہ ڈھانچے کا وہ عنصر ہے جس کا بطلان ضروری ہے۔ کہانی خواہ وہ کتنی ہی انام، تجریدی، استعاراتی، علامتی، تمثیلی یا فنطاسیائی کیوں نہ ہو، لیکن کیا کہانی پن کے بغیر کہانی کی تخلیق ممکن ہے۔ نیز یہ کہ نئی کہانی کی جمالیات کی حدود کیا ہیں۔ شعری وسائل اور شعری اظہاریت کہانی کی تخلیقیت، تہہ داری اور معنیاتی گہرائی کے ضامن تو ہیں، لیکن اس کے باوصف کیا کہانی کا اپنے تشخص پر اصرار مستحسن ہے یا نہیں۔ نیز یہ کہ کیا کہانی اور دھرتی کا رشتہ

اس لمحے سے نہیں چلا آتا جب کہانی نے سب سے پہلے کسی گپھا میں کسی آدم کے پاس پائی تھی۔ نئی کہانی زماں و مکاں کے منطقی رشتوں کو لاشعوری سطحوں پر بدل دینے پر قادر سہی، لیکن اسے زمین و آسماں کی وسعتوں میں کہیں پر تو پیر ٹکانے ہی پڑتے ہیں اور زماں کے کسی نہ کسی لمحے میں تو سانس لینی ہی پڑتی ہے، یعنی آفاقی اور باطنی ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی خواہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ اپنے سماجی MILIEU اور اس کے مسائل سے جڑی رہتی ہے۔ یہ اور ایسے بیسیوں سوال ہیں جو اس سیمینار کے محرک ہیں اور امید ہے کہ افسانے کے تخلیقی سفر، نشانات راہ اور روایت کے تناظر میں، اردو فکشن فنکاروں کے تجزیوں اور اظہار کے مسائل پر بحثوں سے غور و فکر کی نئی راہیں کھلیں گی، سوالوں سے سوال پیدا ہوں گے اور سوچنے کے نئے امکانات سامنے آئیں گے۔

پروفیسر نارنگ نے اپنے خطبے کے دوران ذیل کے شرکا مندوبین، مقالہ نگاروں اور افسانہ نگاروں کا خیر مقدم کیا۔

پاکستان ۔ ڈاکٹر وزیر آغا، جناب انتظار حسین، جناب احمد ہمیش
روس ۔ پروفیسر اناتولی انانیف
امریکہ ۔ پروفیسر محمد عمر میمن، مسز وینیٹنک
سعودی عرب ۔ جناب صلاح الدین پرویز
ناروے ۔ جناب ہرچرن چاولہ
لندن ۔ جناب محسن شمسی

پروفیسر آل احمد سرور	کنور سین	بالراج	فضیل جعفری
بیگم صالحہ عابد حسین	شاہد پرویز	جاوید حبیب	ڈاکٹر اطہر پرویز
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	حمید سہروردی	غیاث احمد گدی	ڈاکٹر قمر رئیس
باقر مہدی	سید محمد اشرف	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	ڈاکٹر شمیم حنفی
محمد یوسف ٹینگ	طارق چھتاری	ریاست حسین فاروقی	رام لعل
وارث علوی	اقبال مسعود	علی باقر	جوگندر پال
احمد سورتی	راجندر سنگھ بیدی	عبد الصمد	سریندر پرکاش
ڈاکٹر احمد سجاد	قرۃ العین حیدر	ہاجرہ کمار	زحت احسان
قمر احسن	پروفیسر نامور سنگھ	عقیل احمد	احمد یوسف
ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی	محمود ہاشمی	محمد صابرین	ستیش بترا
کلام حیدری	پروفیسر حامدی کاشمیری	انجم عثمانی	رضوان احمد
انور عظیم	دیویندر اسر	عصمت چغتائی	ابو الکلام قاسمی
کمار پاشی	ڈاکٹر مغنی تبسم	منیر احمد شیخ	عتیق الرحمان
سید عارف	ڈاکٹر ابو ذر عثمانی	شمس الرحمان فاروقی	شمس الحق عثمانی
آمنہ ابو الحسن	مہدی جعفر	بالراج کومل	نثار صدیقی
شوکت حیات	دیویندر ستیارتھی	ڈاکٹر وحید اختر	عبید صدیقی

مندرجہ بالا مندوبین کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نیز دوسرے اداروں اور انجمنوں سے شرکت کرنے والے اساتذہ اور اسکالروں کا بھی خیر مقدم کیا گیا۔ استقبالیہ کلمات کے بعد پروفیسر نارنگ نے وزیر خارجہ حکومت ہند جناب پی وی نرسمہا راؤ کو سمینار کے افتتاح کی دعوت دی۔

جناب پی وی نرسمہا راؤ صاحب وزیر خارجہ نے اس موقع پر جو تقریر کی وہ اس لحاظ سے یادگار رہے گی کہ وہ رسمی تقریر نہ تھی بلکہ انتہائی فکر انگیز اور پر مغز تقریر تھی اور اس میں کہانی اور اس پر نقد و نظر کے کئی اہم مسائل کا احاطہ کیا گیا تھا۔ نرسمہا راؤ صاحب نے کچھ ایسے سلیقے سے کام لیا کہ تقریباً پون گھنٹے کی ان کی تقریر کو ہنسی، قہقہوں اور آنسوؤں کے درمیان سنا گیا اور سامعین نے بار بار پرجوش انداز سے تالیاں بجا کر ان کے جملوں کی داد دی۔ شری نرسمہا راؤ نے ابتدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام اور اس کے مقاصد سے سیر حاصل بحث کی اور کہا کہ جامعہ کے تجربے سے ثابت ہے کہ مذہب اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جامعہ ایک ایسی قومی یونیورسٹی ہے جہاں ابتدا سے انتہا تک اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ "مجھے جامعہ سے خاص لگاؤ اس لیے بھی ہے کہ خود میں نے ایک ایسے ادارے میں تعلیم حاصل کی ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جامعہ میں اردو کی اہمیت مسلّم ہے اور یہاں کے شعبۂ اردو نے بہت کام انجام دیے ہیں اور اس کی کارگزاریاں بڑی شاندار ہیں۔ اس شعبے کو ڈاکٹر سید عابد حسین جیسے مسلّم الثبوت ادیب اور دانشور کی سربراہی حاصل رہی ہے اور اب اس شعبے کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ ہیں جنھیں اردو دنیا میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ جامعہ کا شعبہ اردو اس سے پہلے بھی کئی بڑے بڑے سمینار کر چکا ہے اور جس کی خدمات کا ذکر پورے ملک میں پورے محبت و احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ شری نرسمہا راؤ نے اپنے بارے میں بتایا کہ خود میں نے انٹر تک تمام مضامین اردو میں پڑھے ہیں۔ اس بارے میں انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا جس پر جلسہ گاہ قہقہہ زار میں تبدیل ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ جب میں آندھرا کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے کشمیر گیا تو میں وہاں اردو ذریعہ تعلیم کے ایک اسکول میں بھی پہنچا، میں نے محسوس کیا کہ استاد بچوں کو ٹھیک نہیں پڑھا رہا۔ چناں چہ میں نے استاد سے اجازت لے کر خود کلاس سنبھال لی اور پڑھانا شروع کر دیا۔ بعد میں اس استاد نے مجھ سے کہا کہ آپ تو بہت اچھا پڑھا لیتے ہیں۔ چناں چہ مجھے یقین ہے کہ اگر وزارت مجھ سے چھین بھی گئی تو اردو پڑھانے کی نوکری مل جائے گی۔ (قہقہے اور تالیاں)

وزیروں سے افتتاح کرانے کی روایت پر انھوں نے طنزاً کہا کہ کاش مجھے اس سمینار میں حصہ لینے کے لیے بلایا جاتا۔ اگر سمینار کے تمام مقالے اور ان پر بحث کی تفصیلات مجھے بھجوائی گئیں تو میں ایک "سیاست داں کا وعدہ" کرتا ہوں کہ ان سب کو ضرور پڑھوں گا۔ (قہقہے اور تالیاں)

کہانی یا افسانہ کیا ہے شری نرسمہا راؤ کے مطابق اس کی تاریخ شاید اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان۔ بچہ لوری سن کر سوتا ہے اور جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو دادی نانی سے کہانی سننے کا تقاضا کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے نشوونما کے ہر موڑ پر کہانی اثر انداز ہوتی ہے۔ کہانی بچپن کو جوانی اور بڑھاپے سے جوڑتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بچہ جب جوانی اور بڑھاپے کو طے کرتا ہے تو کہانیوں کو جنم دینے لگتا ہے۔

طنز و مزاح کا عنصر شری نرسمہا راؤ کی پوری تقریر پر غالب تھا۔ انھوں نے کہا کہ کہانی کی ایک شکل کارٹون بھی ہے

لیکن اس ہتھیار کا استعمال آج کل صرف سیاست دانوں ہی کے خلاف ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو انھیں شیطان بنا دیا جاتا ہے۔ (تالیاں)۔ حصول آزادی سے پہلے ساہوکاروں کے کارٹون بنائے جاتے تھے شاید اسی لیے انھوں نے تمام اخباروں پر اجارہ داری قائم کر لی تھی تاکہ وہ اس وار سے بچ گئے۔ (تالیاں)

پریم چند کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے شری نرسمہا راؤ نے فرمایا کہ ادب کے سانچوں میں نیا پن ضرور آیا ہے اور زندہ ادب کے لیے یہ ناگزیر بھی ہے۔ پریم چند کا کسان آج کے کسان سے مختلف تھا۔ آج کے کسان کو جو مسائل درپیش ہیں وہ مختلف ہیں لیکن بنیادی طور پر کسان وہی ہے۔ کیا نئی کہانی کو اس کا احساس ہے۔ شری نرسمہا راؤ نے افسانہ نگاروں کو اس طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی۔ صرف یہی نہیں انھوں نے بعض نازک گوشوں کی طرف اشارے بھی کیے۔ انھوں نے کہا کہ میرا ایک ہم جماعت کانگریس میں میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو ہم دونوں نے ریڈیو کی نشریات ساتھ سنیں۔ اگلے روز ہم دونوں پرچم کشائی کی رسم میں شریک ہوئے۔ میرے دوست نے بھی تقریر کی اور وہ اس تقریر کو آج بھی دہراتا پھرتا ہے۔ انھوں نے جب اپنے دوست کے پاگل ہو جانے کا ذکر کیا تو ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انھوں نے پوچھا آزادی کے بعد ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ملا لیکن میرے دوست کو کیا ملا؟ کیا یہ کہانی کا اچھوتا موضوع نہیں ہے؟

افتتاحی تقریب میں اس وقت پاکستانی افسانہ نگاروں کے علاوہ ہندوستان میں مقیم پاکستان کے سفیر کبیر جناب عبدالستار صاحب بھی موجود تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے شری نرسمہا راؤ نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جتنے رشتے ہیں، ان میں ادب کا رشتہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی کہانی میں سرحد کہاں ہے اس سرحد کو پار کرنے کے لیے شاید ویزا کی ضرورت نہیں۔

وزیر خارجہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ دوسری زبانوں کا سرمایہ اردو میں منتقل کیا جانا چاہیے۔ تامل اور تیلگو میں کہانی کی روایت بہت وسیع ہے۔ اردو میں ان زبانوں کا سرمایہ بہت کم آیا ہے۔ بعض انسانی مسائل ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا تعلق خاص علاقوں سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ساحل پر آباد ماہی گیروں کے زندگی کے مسائل ان ہی علاقوں کی زبانوں میں ملتے ہیں۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے یہاں کی زندگی بڑی ہمہ گیر اور نت نئے مسائل کی آماجگاہ ہے۔ وزیر خارجہ نے اپنی فکر انگیز تقریر میں ایسے ایسے نکات اٹھائے اور دلنشیں پیرائے میں ایسے ایسے مسائل کا ذکر چھیڑا کہ پنڈال میں مسائل کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر یون گھنٹے تک ہمہ تن گوش رہا اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ یہ تقریر اسی طرح جاری رہے۔

افتتاح کے بعد اردو کے ممتاز ترین اور انتہائی محترم فن کار جناب راجندر سنگھ بیدی سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا خطبۂ خصوصی پیش فرمائیں۔ بیدی صاحب نے اپنی علالت اور نقاہت کے باوجود مائک پر آ کر چند جملوں میں سامعین سے خطاب کیا اور جناب باقر مہدی سے فرمائش کی وہ ان کا خطبہ پڑھ کر سنا دیں۔

راجندر سنگھ بیدی۔ جناب راجندر سنگھ بیدی کا خطبۂ افتتاحیہ "افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل" کے موضوع پر تھا۔ اس کا مرکزی مبحث یہ تھا:

"افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ افسانے میں زبان کا غزل جیسا رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا۔ غزل کا شعر کسی کھردرے پن کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن افسانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نثری نژاد ہونے کی وجہ سے اس میں کھردرا پن ہونا ہی چاہیے جس سے وہ شعر سے ممیز ہو سکے۔ افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے۔ باقی اصناف ادب جن میں ناول بھی شامل ہے، کسی طرف جزواً جزواً توجہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن افسانے میں جزو و کل کو ایک ساتھ لے کر آگے بڑھانا پڑتا ہے۔ افسانے میں ایزاد اضافے سے زیادہ ضروری ہے۔ آپ کو ان چیزوں کو قلم زد کرنا ہی ہوگا، جو بجائے خود خوبصورت ہوں اور مجموعی تاثر کو زائل کر دیں یا مرکزی خیال سے پرے لے جائیں۔ افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے محنت سے حاصل تو کیا جاتا ہے لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بدعا ہی رہتا ہے۔ اردو میں بہت عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ اگر ان کی تعداد گنی چنی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورے کرنے میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایمان ہاتھ سے جا رہا ہے یا یہ نہیں جانتے کہ ہم اپنے ہی امیج کے قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہند و پاک اردو افسانہ سمینار کے سلسلے میں اور پریم چند صدی کی رعایت سے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں "پریم چند اور اردو فکشن" نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس نمائش کا افتتاح بھی اسی اجلاس میں عمل میں آیا اس کے لیے اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے ڈائرکٹر اور اردو تنقید کے روشن ترین نام پروفیسر آل احمد سرور کو زحمت دی گئی۔ انھوں نے پریم چند کی وقیع خدمات پر روشنی ڈالی اردو افسانے پر ان کے گہرے اثرات کا ذکر کیا اور پریم چند کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس نمائش کے افتتاح کا اعلان فرمایا۔

<u>جناب انور جمال قدوائی</u>۔ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے شعبۂ اردو کو اس عظیم الشان ہند و پاک سمینار پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ وسائل کی کمی کے باوجود اس شعبے نے جو کچھ کر دکھایا ہے وہ تعریف و تحسین سے بالاتر ہے۔ اردو افسانے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ ٹیکنیک اور پیش کش کے طور طریقے بدل رہے ہیں اور انسانی حقیقت کی نئی جہات سامنے آ رہی ہیں لیکن جس کام کو پریم چند نے شروع کیا تھا وہ آج بھی ادھورا ہے۔ مثلاً سماجی استحصال کا سلسلہ آج بھی جاری ہے ہریجنوں اور بے زمین لوگوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے، عورتوں اور بچوں کے تئیں جو رویہ اپنایا جاتا ہے یا جس طرح آئے دن فرقہ وارانہ فساد اور تشدد کے واقعات ہوتے ہیں یہ کس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ نفسیاتی اور جمالیاتی تجربے کے حدود وسیع ہو رہی ہیں اور یہ مناسب ہے لیکن آئے دن کی سماجی بے انصافیوں سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔ یہ مسائل جیسے ہندوستان میں ہیں ویسے پاکستان میں ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران سفیر کبیر پاکستان سے مخاطب ہوتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ جس طرح فرانس، جرمنی، سوئزرلینڈ اور اٹلی کے درمیان "نرم سرحد" ہے اس طرح کی "نرم سرحد" ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی ہونی چاہیے۔ مغربی یوروپ میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنا پاسپورٹ اور چیک بک جیب میں ڈالیں اور سرحد پار کسی دوسرے ملک میں کسی سمینار میں شریک ہو آئیں یا کسی پارٹی میں چلے جائیں یا خرید و فروخت کر آئیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان "نرم سرحد" کا مسئلہ خواب کی بات نہیں

وجودہ سیاسی حقائق کا تقاضا ہے۔ قومی شخصیت اور جڑوں کے مسئلے کو بھی ایک حد تک اہمیت دینی چاہیے، نہ اتنی کہ دونوں
ں کے عوام ایک دوسرے سے دور ہوتے جائیں۔ یہ بات ہمارے پڑوسی ملک کو بطور خاص نظر میں رکھنی چاہیے۔

یہ افتتاحی اجلاس پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کلمات تشکر کے ساتھ اور قومی ترانہ "جن من گن" کے ساتھ جسے جامعہ
البات نے پیش کیا، تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اختتام پذیر ہوا۔ لوگ ملتے ملاتے اور چائے پینے میں مصروف ہوگئے اور
پریم چند نمائش دیکھنے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کی طرف روانہ ہوگئے۔ وقفہ چند منٹ کا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے سیمینار کا پہلا
س اسی پنڈال میں پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں شروع ہوگیا۔ اگرچہ اس سیمینار کا موضوع "اردو افسانہ: روایت
سائل" تھا، تاہم پریم چند صدی کی رعایت سے اور اردو افسانے کے اہم ترین نام کے ناتے سیمینار کا پہلا اجلاس پریم چند
لیے مخصوص کر دیا گیا۔

۲۹ مارچ ۱۹۸۰ء پہلا اجلاس: پریم چند کا ورثہ صدارت: پروفیسر آل احمد سرور

پریم چند کی ایک دیدہ زیب تصویر ڈائس پر آویزاں تھی جس کے قریب پھولوں کا گھیرا تھا اور گلینڈی اور لال کلیوں سے
ہوئی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔

پروفیسر انانیف۔ پروفیسر سرور نے سب سے پہلے روس سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹ پروفیسر اناتولی انانیف
حمت دی۔ وہ فکشن کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، وہاں کی رائٹرز یونین کے سکریٹری ہیں اور مشہور رسالہ "اکتوبر" کے
ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنی چند کتابیں پروفیسر نارنگ کو پیش کیں، ان کے لیے طلبا جامعہ کے لیے۔ پروفیسر انانیف
معہ کے ہند و پاک اردو افسانہ سیمینار میں شریک ہونے کے لیے بطور خاص روس سے تعینات کیا گیا تھا۔ انھوں نے
چند کی سماجی حقیقت نگاری کے بارے میں روسی میں اظہار خیال کیا اور مترجم ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کرتا گیا۔
فیسر انانیف نے کہا کہ پریم چند کی آواز ہندوستان کے عوام کی آواز تھی۔ انھوں نے عوام کے دکھ درد کو سمجھا اور
نئی اظہار کی سطح بخشی۔ وہ صدیوں سے کچلے اور دبے انسان کے دکھ درد کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے فن کے ذریعے
بقے طبقوں والوں کی ریاکاری اور ظلم پسندی پر بھی گہرا وار کیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس۔ اپنے مقالے "پریم چند کی روایت اور جدید افسانہ" میں ڈاکٹر قمر رئیس نے جدید اردو افسانے میں
چند کی روایت تلاش کرنے کی کوشش کی اور علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی [illegible]
سنگھ کے علاوہ آزادی کے بعد کی نسل میں انور عظیم، قاضی عبدالستار اور جیلانی بانو کو بطور خاص پریم چند کی روایت سے متاثر
ر دیا۔ انھوں نے جدید ترین افسانہ نگاروں میں رتن سنگھ اور سریندر پرکاش کو بھی اس روایت کا امین قرار دیا۔ آخر میں
ں نے جدید افسانے میں حقیقت پسندی اور سماجی معنویت کے فقدان کا شکوہ کیا اور کہا کہ نئے افسانے کی عدم مقبولیت

کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ وہ پریم چند کی عظیم روایت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی۔ اس اجلاس کا تیسرا اور آخری مقالہ ڈاکٹر شمیم حنفی کا تھا۔ انھوں نے "پریم چند کا تیسرا موڑ" کے تحت پریم چند کی حقیقت پسندی کے مضمرات سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پریم چند حقیقت کی صرف خارجی سطح کا شعور رکھتے تھے اور اس سطح کے نیچے کے آدرش واد اور رومانیت کی لہریں حقیقت کی اساس کو مسلسل کمزور کرتی رہتی تھیں چنانچہ وہ نہ تو حقیقت کا کوئی بھرپور تصور پیش کر سکے، نہ ان کی رومانیت کوئی بڑا فلسفیانہ بعد اختیار کر سکی۔ آخری چند برسوں کی کہانیاں پریم چند کے شعور کی اس جہت کا دھندلا اظہار ہیں جو انھیں آج بھی بامعنی بنا سکتی تھی۔ مگر پریم چند اس وقت تک اپنا تخلیقی سفر تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ انگشت شمار چند کہانیوں کے علاوہ کوئی بڑی اور قوی الاثر روایت وہ نہ چھوڑ سکے۔ ان کی کہانیوں کا فنی ڈھانچہ بالعموم کمزور، ناقص اور ڈھیلا ہے۔ ہم پریم چند کے اس المیے کو مغربی حقیقت پسندی کے مختلف دبستانوں کے المیے کی روشنی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے وژن کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ شر کے ادراک کی موت سے تقریباً خالی تھے۔ ان کا خیر کا تصور انھیں انسان اور اس کے متعلقات کا کوئی بسیط شعور ترتیب دینے میں ہمیشہ مانع ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر پریم چند کی اصل حیثیت صرف فکشن کی تاریخ میں ہے۔

تینوں مقالوں کے بعد دعوت مباحثہ دی گئی۔ سامعین میں سے کئی ادیبوں اور اساتذہ نے بشمول کلام حیدری، انور عظیم، ڈاکٹر مغنی تبسم، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر احمد سجاد، گوتم جوشی نے پریم چند کے فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں سوال اٹھائے جن کے جوابات مقالہ نگار حضرات نے دیے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے صدارتی کلمات میں بحث کو سمیٹا اور پریم چند کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً دو بجے پہلا اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ بعد ازاں لنچ کا اہتمام شرکائے سمینار کے لیے وائس چانسلر جناب انور جمال قدوائی کی طرف سے کیا گیا تھا۔

۲۹ مارچ ۱۹۸۰ء دوسرا اجلاس: ہمارے عظیم فن کار صدارت: قرۃ العین حیدر

دوسرا اجلاس لنچ کے وقفے کے بعد ساڑھے تین بجے قرۃ العین حیدر صاحبہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ افتتاحی اجلاس اور پہلا اجلاس بڑے شامیانے میں منعقد ہوا تھا۔ دوپہر بعد کا اجلاس کانفرنس روم میں شروع کیا گیا جسے بطور خاص بعد کے جلسوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ پورا کانفرنس روم لکشمن پائی، سنتوش، سانیال، راماچندرن، پریم جیت اور کئی دوسرے ممتاز فن کاروں کے اوریجنل شاہکار کینوسوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج کے اوپر کی دیوار پر وسط میں "ہند و پاک اردو افسانہ سمینار" کا بینر تھا اور اس کے اوپر غالب کا یہ شعر نہایت دلکش انداز میں لکھا ہوا تھا:

ہجوم سادہ لوحی پنبۂ گوش حریفاں ہے
وگرنہ خواب کی مضمر ہیں افسانے میں تعبیریں

ایک طرف پریم چند کی تصویر نمایاں طور پر آویزاں تھی اور بیچوں بیچ منٹو، ٹالسٹائی اور دستوئیفسکی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں

…س میں پانچ پرچے پڑھے جانے تھے، منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت کے فن پر۔ پہلا پرچہ ڈاکٹر عظیم الشان …نے کرشن چندر کے فن پر پڑھا۔ اس دوران سامعین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کانفرنس روم کی روشوں میں بچھے ہوئے قالینو… بیٹھ گئے اور سننے والوں کی بہت بڑی تعداد کانفرنس روم کے باہر جمع ہو گئی۔ چناں چہ پروفیسر نارنگ نے پہلے پرچے کے …ن کیا کہ سامعین کی تعداد کے پیش نظر ضروری ہے کہ سمینار باہر پنڈال ہی میں جاری رکھا جائے۔ شعبہ اردو کے متعدد …م اساتذہ و طلباء نے دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال میں دوبارہ اسٹیج کو آراستہ کر دیا۔ دوسرا پرچہ کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر …شمیری نے "کرشن چندر کا فنی شعور" پر پیش کیا۔

پروفیسر حامدی کاشمیری۔ "کرشن چندر کے فنی شعور" پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے پروفیسر حامدی کاشمیری نے کہا کہ …ندر اپنے معاصرین مثلاً منٹو، بیدی اور عصمت کی طرح اپنے عہد یا معاشرے کا گہرا شعور تو رکھتے ہیں، لیکن ان کے …وہ صرف اسی چشمۂ فیض پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وسیع تر اور متنوع موضوعات کے محرکات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ …یہاں طبقاتی نظام کی پیچیدگیوں کے علاوہ بچپن کی یادوں، فطرت پرستی، محبت، جنسی بیداریوں، فطرتِ انسانی …وں، نسوانی حسن، تیر کشمیری فسادات، ذاتی محرومیوں اور حسین زندگی کے پیدا کردہ مسائل سے نہ صرف غیر معمولی دلچسپی …بلکہ یہ ان کو تخلیقِ فنی کی تحریک بھی دیتے ہیں۔ اپنے مقالے میں پروفیسر موصوف نے کرشن چندر کے متعدد افسانوں سے …ت پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ نظریے کی بجائے تخلیق سے وفا کرتے ہیں اور ان کے افسانے حقیقت کو ماورائے …بنانے کی مثالیں ہیں اور ان میں ڈرامائی کشمکش، تناؤ اور نقطۂ عروج نے اعتباریت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

کرشن چندر پر ان دو مقالوں کے بعد سعادت حسن منٹو کے فن پر بھی دو مقالے پڑھے گئے۔ پہلا جموں کشمیر کلچرل …سکریٹری جناب محمد یوسف ٹینگ کا تھا، اور دوسرا جناب وارث علوی کا۔

محمد یوسف ٹینگ۔ ٹینگ صاحب نے منٹو کو اردو کا پہلا خلاق اور پیدائشی افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے اس کے …ں "ٹھنڈا گوشت" اور "کھول دو" کا تجزیہ کیا اور کہا کہ یہ ہیبت ناک تصویریں جنس کی نشاط کی جگہ روح کے المیوں …ہیں یہ افسانہ جنس زدگی یا فحاشی کا اشتہار نہیں، انسان کی اصلیت اور اس کی جبلت کے آئینہ دار ہیں انھوں …منٹو نے اپنے افسانوں میں جنس کو انسانی فطرت کے مسخ شدہ ضمیر کو اجاگر کرنے لیے SHOCK WAVE کی …سے استعمال کیا ہے۔ ٹینگ صاحب نے آگے چل کر منٹو کے مختلف فنی کرداروں، راج کشور، موذیل، بابو گوپی ناتھ …ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اخلاقی ضوابط سے بغاوت کرنے والے ان کرداروں کی آتمائیں بہت پرخلوص ہیں اور …بطون میں اچھے اور نیک انسان چھپے ہوئے ہیں۔ اپنے مقالے میں کرشن چندر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر …کا موازنہ کرتے ہوئے جناب محمد یوسف ٹینگ نے موخر الذکر کی فنی برتری پر اصرار کیا۔ انھوں نے آگے چل کر کہا کہ …اپنے موضوعات کی مطابقت سے ایک سنگین، پرصلابت اور راست ہیئت کا استعمال کیا جو اس کی فنی تجرید کا عمل تھا۔ …اپنے استعاروں میں شعر کی سی بلاغت پیدا کی ہے۔ آخر میں مقالہ نگار نے نتیجہ اخذ کیا کہ منٹو کا ادب اس کے زمانے …سے جتنا دور ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی اس کی معنویت اور تہ داری میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن ابھی تک اس کو

ESTABLISHMENT کی عدالت عالیہ نے غلاظت نویسی کے الزام سے بری نہیں کیا ہے اور یہ زیادتی ہے۔

<u>وارث علوی</u>۔ وارث علوی صاحب نے اپنے مضمون میں منٹو کے فن کے دو پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ منٹو نے ایک بڑے جواری کی طرح یہ بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا کہ ہر نوع کی آرائش و زیبائش سے تہی، محض کہانی اس کے تخیلی اظہار کا پورا بار اٹھائے گی کیوں کہ منٹو SENSIBILITY کی کہانیاں لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنی ذات سے نہیں گردوپیش کی دنیا اور لوگوں میں دلچسپی تھی۔ ایسے حقیقت نگاری کے ایسے طریقۂ کار کی ضرورت تھی جو لوگوں کا اور گردوپیش کی دنیا کا بیان اس طرح کر سکے کہ رومانی شعریت اور جذباتیت، نظر کو دھندلا اور نقوش کو مدھم نہ کرے۔ گویا منٹو کی پوری جدوجہد تکمیلِ فن کے لیے تھی، صحیح نقطۂ نظر یا صحیح اخلاقیات کے لیے نہیں۔ وارث علوی نے منٹو کے چند افسانوں کے تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ منٹو کے افسانوں میں ہر تفصیل کی وہی اہمیت ہے جو غنائی نظم میں لفظوں کے آہنگ، شعری پیکر اور علامتوں کی ہوتی ہے اور جو باہم مل کر معنی کی تجسیم کرتے ہیں۔ وارث علوی نے منٹو کے فن کے دوسرے پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کی تخلیقی نظر آدمی کے اخلاقی وجود سے گزر کر دل وجود کو چیر جاتی ہے اور وہاں وہ ایروز، یعنی قوتِ حیات، اور تھاناٹوز، یعنی قوتِ موت کی جبلتوں کو برسرِپیکار دیکھتا ہے۔ اس کی کہانیاں ایک طرف قوتِ حیات کی مظہر ہیں اور دوسری طرف موت کی طاقتوں کی۔ منٹو نے جرائم اور بدرزن کے جو بے شمار جنسیاتی اور غیرجنسیاتی روپ دکھائے ہیں وہ دراصل قوتِ حیات پر موت کے بڑھتے ہوئے سایوں کی علامتیں ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ منٹو موت کے مقابلے میں زندگی کا مکمل، حتمی اور غیرمفاہمانہ اثبات چاہتا تھا کہ یہ اثبات زندگی کی علمیہ صورتِ حال کے شعور کے ساتھ ہو۔ مضمون کے آخر میں اپنے خیالات کو سمیٹتے ہوئے وارث علوی نے منٹو کے حوالے سے کہا کہ بڑا فن کار وہی ہے جو وحشیانہ طاقتوں کی پیکار سے بلند ہو کر ایروز کی وادیِ شاداب کا منظر بنائے ہم جان سکیں کہ ہماری اخلاقی اور دانشورانہ شخصیت کے پیچھے کیسی جارحیت اور کرختگی چھپی ہوئی ہے اور معصوم روحوں کی دردمندی اور نشاط کی کیا شکل ہوتی ہے۔

<u>فضیل جعفری</u>۔ جناب فضیل جعفری نے عصمت چغتائی کے فن کے بارے میں مقالہ پڑھا۔ انھوں نے عصمت چغتائی کو سماجی متعلقات (SOCIAL CONCERNE) کی افسانہ نگار قرار دیا اور ان کے افسانوں کی ان جہتوں کی نشان دہی کی جو معاشرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عصمت کے افسانوں کے عمومی موضوعات کو ان کی تکنیک ممتاز بناتی ہے اور اس تکنیک میں ماحول کی تصویرکشی، لفظوں کا انتخاب، امیج کا استعمال، جملوں کی ساخت اور کردار نگاری کا سلیقہ مل جل کر حقیقی اور افسانوی دنیا میں ایک تخلیقی رابطہ پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے کرداروں نیز واقعات کے سلسلے میں قدم قدم پر فن کار کی واضح نفرت اور واضح جانب داریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے کہا کہ عصمت کا اصل کارنامہ "چوتھی کا جوڑا" "پردے کے پیچھے" اور "دو ہاتھ" جیسے افسانے ہیں جن میں انسانی زندگی کے بیچ موجود ممکنات اور ناممکنات کی کشمکش سے پیدا ہونے والے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔

<u>پروفیسر آل احمد سرور</u>۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ پروفیسر سرور کا تھا۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا: "بیدی کی افسانہ نگاری —— صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں"۔ انھوں نے فرمایا: اگر بیدی کے اہم اور معنی خیز افسانوں کی ایک

رست بنائی جائے تو ان میں بھولا، گرم کوٹ، گرہن، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، لمبی لڑکی، اور صرف ایک سگریٹ ضرور شامل ہوں گے۔ بیدی شروع سے اینٹ پر اینٹ رکھ کر افسانہ تعمیر کرتے ہیں وہ اس طبقے کو لیتے ہیں جو نچلا متوسط طبقہ کہا جا سکتا ہے اور جس سے وہ اچھی طرح واقف ہیں، ان کے یہاں شروع سے جذبات کی تندی و تیزی کے بجائے خیالات و واقعات اور تجربات کی ایک دھیمی لہر ملتی ہے جس کے پیچھے ایک گہرا فلسفیانہ احساس ہے مگر بیدی فلسفہ یا سیاست نہیں بگھارتے، چناں چہ پریم چند کی آدرشی حقیقت نگاری جو کرشن چندر کے یہاں ایک رومانی حقیقت نگاری نظر آتی ہے۔ بیدی کے یہاں ایک ایسی حقیقت نگاری بن جاتی ہے جو اسطور اور دیومالا کے سایوں کی وجہ سے حقیقت سے کچھ بڑی اور کچھ پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بیدی کی حقیقت نگاری کو میں نفسیاتی حقیقت نگاری کہوں گا۔ "صرف ایک سگریٹ" نہ صرف بیدی کے فن کی بہت اچھی نمائندگی کرتی ہے، بلکہ بیدی کی بعض ایسی خصوصیات کو نمایاں کرتی ہے جن کی طرف عام طور پڑھنے والوں اور نقادوں کی نظر نہیں گئی۔ یہ ایک بوڑھے سنت رام کی کہانی ہے۔ بیدی نے اس افسانے میں چند واقعات ہی نہیں بیان کئے ہیں بلکہ ایک خاندان کی، جو ہمارے لیے نیا نہیں ہے، ذہنی، جذباتی، اور فلسفیاتی تصویر کھینچ دی ہے۔ بیدی نے سنت رام میں اردو افسانے کو ایک لافانی کردار دیا ہے۔ ان کے یہاں جنس کے حقایق اور جسم کے اسرار کا بیان ایک سنجیدہ مقصد رکھتا ہے اور لذت کے بجائے ایک معرفت کا حامل ہے۔ بیدی کے یہاں فرد کی نفسیات کا بے مثل بیان نہیں، ان کے یہاں سماجی معنویت بھی ہے گو وہ سماجی معنویت پر لمبی چوڑی تقریریں نہیں کرتے۔ بیدی نے ان مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کا ایک نگارخانہ ہمیں دیا ہے جو فرشتے یا شیطان نہیں، انسان ہیں۔ بیدی کی زبان کہیں کہیں کھردری اور ناہموار معلوم ہوتی ہے مگر وہ ان کے خیالات کا بوجھ اٹھانے پر قادر ہے۔ وہ آج کے انسان کے عارف ہیں اور ان کی معرفت کے ذریعے سے اردو افسانہ کو گہرائی اور برگزیدگی ملی ہے۔ انھوں نے ہمیں کئی غیر فانی کردار دیے ہیں جن میں سنت رام کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔

اس اجلاس میں وقفے کے دوران "تناظر کتاب" اور کرشن موہن کے مجموعہ کلام "اداسی کے پانچ روپ" کی رسم اجرا بھی ہوئی جس کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی۔ رسم اجرا پاکستان کے ممتاز نقاد اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے انجام دی۔ شروع میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تناظر کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور بلراج ورما کی دل سوزی اور اردو سے محبت کے جذبے کو سراہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس موقع پر دونوں حضرات کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے تحسین و تہنیت کے کلمات کہے اور تالیوں کی گونج میں یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی

اس اجلاس میں پڑھے جانے والے پرچوں نے سمینار میں خاص گرمی پیدا کردی تھی۔ چناں چہ چائے کے وقفے کے بعد تمام مقالوں پر دھواں دھار بحثیں ہوئیں۔ جن میں وارث علوی، باقر مہدی، صلاح الدین، سید محمد اشرف، جاوید حبیب، فرحت احساس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم نے حصہ لیا۔ آخر میں قرۃ العین صاحبہ نے بحث کو سمیٹا اور صدارتی کلمات کہے انھوں نے فرمایا کہ پریم چند کے بعد منٹو، کرشن، بیدی اور عصمت نے اردو افسانے کی روایت کو استحکام بخشا ہے اور انسانی درد کے نئے ساحل تلاش کئے ہیں۔ اس موقع پر محمد حسن عسکری، عزیز احمد اور غلام عباس کی بھی یاد آتی ہے

ان سب حضرات نے افسانے کو نئی جہات کو آگاہ کیا اور حقیقت کے غیر رومانی پہلوؤں سے آنکھیں چار کرنا سکھایا۔ ڈاکٹر
محمد ذاکر کے شکریے کے ساتھ یہ اجلاس ختم ہوا۔

کہانیوں کی پہلی شام: (غالب اکیڈمی، نظام الدین)

اس سہ روزہ سیمینار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر روز صبح اور سہ پہر۔ مقالات کے اجلاس کے بعد ہر شام کو تخلیقی ن
کے لیے وقف کیا گیا تھا، اور افسانوں کی شام کا انتظام کیا گیا تھا تاکہ دور دور سے آئے ہوئے افسانہ نگار اپنی نگارشات
کر سکیں۔ شام افسانہ کا پہلا پروگرام غالب اکیڈمی میں منعقد ہوا جس کی صدارت پاکستان سے آئے ہوئے ممتاز افسانہ نگ
انتظار حسین صاحب نے فرمائی۔ جناب ذہین نقوی سکریٹری غالب اکیڈمی اور جناب مالک رام نے استقبالیہ کلمات کہے۔
گوپی چند نارنگ نے شام افسانہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور صدر و سرپرست غالب اکیڈمی حکیم عبدالحمید صاحب
تعاون پر ممنونیت کا اظہار کیا۔ اس شام بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنا افسانہ "وقت وقت" "رام لعل نے" "ایک ن
بچوں والی ماں" منیر احمد شیخ نے "زرد مٹی کی خوشبو" اور قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانہ "اعترافات سینٹ فلورا آ
جارجیا" پیش کیا۔ غالب اکیڈمی کا ہال ہند و پاک کے ممتاز ادیبوں، افسانہ نگاروں، نقادوں اور ادب نواز
سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آخر میں پروفیسر آل احمد سرور اور انتظار حسین نے پریم چند اور اردو افسانے کے بارے
اپنے تاثرات بیان کیے۔ حاضرین کی دلچسپی کے لیے اس موقع پر غالب اکیڈمی نے مختصر سی محفل غزل کا اہتمام بھی کیا تھا
میں بنگلہ دیش سے آئے ہوئے فن کار چندن کمار نے اپنی خوش کن آواز سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ بعد ازاں غالب
اکیڈمی کی طرف سے مندوبین سیمینار اور معزز شرکا کے اعزاز میں پرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا گیا اور اس طرح افسا
کی یہ پہلی دلکش شام اور سیمینار کا پہلا یادگار دن صبح دس بجے سے شروع ہو کر رات دس بجے اختتام پذیر ہوا۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۰ء تیسرا اجلاس: پاکستان میں اردو افسانہ صدارت: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

سیمینار کا تیسرا اجلاس صبح دس بجے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی صدارت میں شروع ہوا۔ یہ ا
"پاکستان میں اردو افسانہ" کے لیے وقف تھا۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پڑھے گئے:

ڈاکٹر وزیر آغا (پاکستان) پاکستان میں اردو افسانہ
احمد ہمیش (پاکستان) پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے بعد کی نئی اردو کہانی
شمس الرحمان فاروقی (دہلی) انور سجاد انہدام یا تعمیر نو
پروفیسر محمد عمر میمن (امریکہ) انتظار حسین حافظہ کی بازیافت اور تخلیقی شخصیت کی موت
پروفیسر گوپی چند نارنگ (جامعہ) انتظار حسین کا فن

ڈاکٹر وزیر آغا۔ ممتاز پاکستانی نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کا پرچہ "پاکستان میں اردو افسانہ" ان کے مخصوص طرزِ فکر اور اندازِ بیاں کا حامل تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کے اردو افسانے کا بنیادی تغیر یہ ہے کہ وہ ایک نفسیاتی KIRLIAN PROCESS کے ذریعے کردار کے اس حصّے کی بازیافت میں مصروف ہے جو کسی نہ کسی طرح پورے کردار سے کٹ کر معاشرے کے اجتماعی ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ کچھ ایسے انکشافات ہوئے کہ انیسویں صدی کے زوال کے ساتھ انسان کے ہاں سالمیت کا احساس پارہ پارہ ہو گیا اور انسانی شخصیت دو نیم ہو گئی اور یہ آویزش اس کے نفسیاتی کرب کا باعث بن گئی، بیسویں صدی میں نفسیات کا عروج انسان کے اس کامپلکس کو دور کرنے کے اقدامات ہی کا نتیجہ تھا۔
فاضل مقالہ نگار نے آگے چل کر کہا کہ کٹے یا بچھڑے ہوئے حصّے کی تلاش پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد شروع ہو گئی ہر چند کہ TYPES کے جمِ غفیر میں کرداروں کو نشان زد کرنے کی روش ۱۹۴۷ء سے پہلے نمودار ہو چکی تھی جس کی مثالیں پریم چند، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، غلام عباس، حسن عسکری، کرشن چندر اور منٹو کے افسانوں میں مل جاتی ہیں لیکن تقسیم کے فوراً بعد مثالی نمونوں کی ہموار سطح سے بلند ہو کر کردار کے نشیب و فراز کا جائزہ پیش کرنے کا رجحان ابھرا اور پہلی بار اردو افسانے میں حقیقی ارضیت پیدا ہوئی اور اس میں اپنی زمین کی بو باس آنے لگی۔ اس ضمن میں موصوف نے منٹو، احمد ندیم قاسمی، اجد الطاف، اشفاق احمد وغیرہ کے افسانوں کے حوالے پیش کیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بعض افسانہ نگاروں نے انسان کامل کے تصوّر کو اساس بنا کر بھی افسانے تخلیق کیے جن میں مرزا ادیب، رحمان مذنب، آغا بابر، غلام الثقلین نقوی، جمیلہ ہاشمی، فرخندہ لودھی، مستنصر حسین تارڑ، انور سجاد، صلاح الدین اکبر، خدیجہ مستور، عرشی صدیقی، سائرہ ہاشمی، منیر احمد شیخ، محمد منشا یاد، یونس جاوید، شمس نعمان، مسعود اشعر اور مرزا حامد بیگ کے متعدد کردار لائق ذکر ہیں۔ مقالے میں آگے چل کر کہا گیا تھا کہ اردو افسانے میں ذات کے اندر سفر کرنے کا رجحان بھی نمایاں رہا ہے جس کی نمائندگی انتظار حسین، رشید امجد، ذوالفقار احمد تابش، مشتاق قمر، احمد ہمیش، خالدہ اصغر، اعجاز راہی اور متعدد دوسرے افسانہ نگار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے مقالے کے اختتام پر پاکستان کے اردو افسانے میں تجریدی علامتی فضا کا بالتفصیل ذکر کیا۔

احمد ہمیش۔ "پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے بعد کی نئی اردو کہانی" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے احمد ہمیش نے کہا:
۷۱-۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۶ء تک کا عرصہ پاکستان کی ثقافت پر بہت گراں گزرا ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء کے عرصے میں مشرقی پاکستان کا انقطاع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان میں رہنے والے ہر فرد کو اپنے ذاتی اور قومی استحکام کی بہ یک وقت ضرورت تھی۔ اسی عرصے میں اردو زبان میں لکھنے والے بیشتر پاکستانی ادیبوں نے اپنے علاحدہ قومی تشخص اور علاحدہ تہذیبی کردار کی پہچان کا شدید مطالبہ کیا۔ اس مطالبے میں اردو زبان کا تحفظ بنیادی تھا۔ ۷۶-۱۹۷۰ء کے عرصے میں جب کور ذوقی کی طغیانی آئی ہوئی تھی، ایسے میں کشتیوں کا پل بنانے کے مترادف پاکستان میں چند اہم کہانیاں لکھی گئیں۔ انتظار حسین نے "شہر افسوس" اور اسی قبیل کی کئی کہانیاں لکھیں انور سجاد کا موقف انتظار حسین سے مختلف رہا۔ ان کی تحریر FOSSILIZED مہارت کی کرافٹ میں

عمیر شپ، جس کی بنا پر شمس الرحمان فاروقی نے انھیں "نئے افسانے کا معمار اعظم" کا خطاب دیا، ماجرائیت سے عاری تھی۔ انھوں نے اپنی دانست میں عرض کے تکنیکی سبب کو معروضی حقیقتوں سے جبری طور پر ملوث کرنے کی کوشش کی مگر عرض استعارہ نہ بن سکا۔ اس کے برعکس رشید احمد نے صرف ایک کہانی "ڈوبتی پہچان" معاشرے کی ہولناک بے چہرگی کے احساس سے لکھی۔ راولپنڈی گروپ کے کئی افسانہ نگاروں نے ۷۶ - ۱۹۷۱ء کے بحرانی دور ہی میں کہانیاں لکھیں مگر ملکی معاشرے کی بے چہرگی کو ہولناکی کی حد تک نمایاں کرتے ہیں اعجاز راہی کی ایک کہانی "سہیم ظلمات" قابلِ ذکر ہے۔ یہ کہانی مشرقی پاکستان کے انقطاع کے پس نظر کو دھیان میں رکھ کر لکھی گئی ۷۱ - ۱۹۷۰ء کے واقعات نے پاکستانی کہانی کاروں، خصوصاً مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے افسانہ نگاروں کو اجتماعی بے گھری و بے زمینی کے احساس سے دوچار کیا جوان افسانہ نگاروں کے یہاں ایک جذباتی انفعالیت کی تکرار بن کر نمایاں ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد پاکستان میں عصرِ حاضر کی اردو کہانی کا ٹرینڈ بدلنے میں اسد محمد خاں کی کہانی "ترلوچن" (۱۹۷۸ء) ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے —— یہ کہانی ذاتی دیو مالا کی علامتی بر فارمیس ہے اور اس میں ماجرائیت کا بالکل انوکھا ڈھنگ نظر آتا ہے۔ غلام الثقلین نقوی کئی برس سے علامتی کہانی لکھنے کی طرف مائل ہیں۔ حالیہ چند برسوں میں خالدہ اصغر کے خالدہ حسین کے روپ میں مزید اپنی تجدید کی کوشش کی ہے۔ کئی برس کے گیپ کے بعد وہ پھر تازہ دم ہو کر کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ پچھلے چار برسوں کے عرصے میں اردو نئی کہانی میں جو واضح تبدیلی آئی ہے وہ ہے بیان کی سادگی اور تہہ داری مگر طرزِ اظہار کا انوکھا پن بدستور موجود ہے۔ اب پاکستانی کہانی کار شدت سے قاری تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

<u>شمس الرحمان فاروقی</u>۔ جناب شمس الرحمان نے " انور سجاد - انہدام یا تعمیر نو " کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ افسانہ اس لحاظ سے بدنصیب صنف ہے کہ اس پر گفتگو کرتے وقت شاعری کا ذکر ناگزیر قرار دیا گیا ہے حالاں کہ دونوں میں امتیازات ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انور سجاد پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں کرافٹ بہت شدت سے نمایاں ہے۔ حالانکہ کرافٹ کوئی عیب نہیں بلکہ محض ایک صورتِ حال ہے جو افسانے کی تشخیص میں ہماری مدد کرتی ہے۔ فاروقی صاحب نے فرمایا یہ درست ہے کہ اردو افسانہ میں تیسری دنیا یا COLONIAL دنیا کے ایک بڑے حصے یعنی برصغیر ہند و پاک کے سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی احوال کی زبردست عکاسی ملتی ہے۔ جس کے ذریعہ اس معروضی حقیقت کی ایک حد تک دریافت ممکن ہے۔ جسے تیسری دنیا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کم چیزیں ایسی ہیں جنھیں فن کا درجہ دیا جا سکے۔ فاروقی صاحب نے بتایا کہ جدید افسانہ اسی کشمکش سے عبارت ہے کہ وہ اپنی تحسین فن کے حوالے سے چاہتا ہے لیکن اس کے نقاد اس کے غیر فن کی داد دینے پر مصر ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ انور سجاد کے افسانے سماجی تاریخ کے طور پر پڑھے جانے کے قابل نہیں ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں نہ وہ انسان ملتا ہے جو DOCUMENT بن سکے اور نہ وہ انسان ملتا ہے جو ALLEGORY بن سکے۔ اور نہ وہ انسان ملتا ہے جو محض نشان کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ آپ نے وضاحت کی کہ انور سجاد کے افسانے

سماجی تاریخ سے عظیم تر حقیقت اس لیے بنتے ہیں کہ ان کے ہاں انسان یعنی کردار علامت بن جاتا ہے اور وہ اپنے کرداروں کو نام دینے کے بجائے صفات کے ذریعہ تشخص کرتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے اس سلسلے میں انور سجاد کے افسانے "سازش" کا ذکر کیا جو ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو خود کو "ہم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ نے مقالے کے آخر میں فرمایا کہ انور سجاد نے اردو افسانے کو بیانیہ سے آزاد کرنے اور مکالمے کی نام نہاد "فطری" روایت سے دور لے جا کر مکالمے کو اظہار کردار سے زیادہ واقعہ کے لیے استعمال کرنے کی کوشش میں کامیابی دس سال پہلے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ان کے یہاں ایک طرح کا انتشار ملتا ہے۔ آپ نے انور سجاد کے ناول "خوشیوں کے باغ" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بیانیہ اور مکالمے کے روایتی انداز سے ہٹنے لیکن خود اپنے گزشتہ انداز سے انحراف کی ایک اور کوشش بھی ملتی ہے تفصیلات کا وہ بیان جس میں روشنی کی باریک لیکن تیز لکیر صرف انھیں پہلوؤں کو منور کرتی ہے جو واقعے اور واقعے سے متاثر ہونے والی اشیاء کی ٹھوس شیئیت کو ثابت کرے اور گفتگو کا لہجہ خود کلامی سے لے کر ڈائری تک کے انداز کو محیط ہو، انور سجاد کا خاصہ ہے۔

محمد عمر میمن۔ "حافظے کی بازیافت زوال اور تخلیقی شخصیت کی موت" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے میمن صاحب نے بتایا کہ انتظار حسین نے ۱۹۴۷ء میں رونما ہونے والی تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں ہندوستان سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی پاکستان روانگی کو "ہجرت" سے تعبیر کیا۔ "ہجرت" انتظار حسین کی تعبیر کے مطابق ایک "تخلیقی لمحہ" ہے۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ یہ تازہ "ہجرت" مسلمانوں کے لیے وہ "تخلیقی لمحہ" ثابت ہو سکے گی جو انھیں از سر نو اپنی روایت اور ثقافت کی روشنی میں اپنی شیرازہ بندی کا موقع فراہم کرے گی۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کا حادثہ یا سانحہ رونما ہوا۔ یہ وہ سال تھا جب "ہجرت" کے ذریعے قومی اور تہذیبی تشخص کا وہ خواب جو انتظار حسین دیکھ رہے تھے ٹوٹ گیا۔ میمن صاحب نے ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۷۱ء اور مابعد کے لکھے ہوئے انتظار حسین کے چھ افسانوں کا تجزیہ کیا۔ اور بتایا کہ "شہر افسوس" تک آتے آتے انفرادی شخصیت اخلاقی طور پر بھی زوال کو پہنچی ہے۔ اس اخلاقی زوال کا درجہ بہ درجہ اظہار "آخری آدمی" اور "زرد کتا" میں ہوا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے مقالے "انتظار حسین کا فن" میں بتایا کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین سرفہرست ہیں۔ انتظار حسین سے اردو افسانے میں ایک نئی اساطیری اور دیومالائی جہت کا اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے داستانوں کے اسلوب کی بازیافت کر کے اسے کچھ اس طرح برتا ہے کہ ان کا افسانہ موجودہ معاشرے کی بے زمینی اور شہری زندگی کی بے اطمینانی پر دلالت کرتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کا غالب عنصر وقت کے لگائے ہوئے زخموں کا احساس ہے۔ برصغیر کی عام بپتی، قدروں کا زوال، زندگی کی نوعیت، ماہیت اور معنویت کے بارے میں تجسس اور استفہامی کیفیت، حیات و مرگ اور دکھ سکھ کی گتھی اور صدیوں سے چلے آ رہے سوال، ان سب سے مل کر جو فضا بنتی ہے وہ انتظار حسین کے افسانوں کا حاصل ہے۔ انتظار حسین نے افسانوی نثر کو ایک نئی تخلیقی سطح سے روشناس کرایا ہے۔ ہلکی پھلکی سادہ نثر جس میں کہیں کہیں بولی ٹھولی کا پٹ

بھی ہے، اس میں معنیاتی گہرائی اور تہہ داری انتظار حسین کا خاصہ ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کا رشتہ کتھا کہانی اور داستان سے جوڑ دیا ہے۔ کتھا کہانی اور داستان کی روایت سننے سنانے کی روایت رہی ہے۔ اس کے برخلاف بیسویں صدی میں اردو افسانے کا ارتقا ایک تحریری صنف کا ارتقا ہے۔ افسانہ ایک لکھنے اور پڑھنے جانے کی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ انتظار حسین نے باصرہ کے ساتھ ساتھ سامعہ کو پھر سے بیدار کیا اور کہانی کی روایت میں سننے اور سنائے جانے کے لطف کا از سر نو اضافہ کیا۔ یہ صرف داستان یا حکایت کے اسلوب ہی کی تجدید نہیں بلکہ کتھا کہانی کی ہزاروں سال پرانی روایت کی تجدید بھی ہے۔ انتظار حسین کے مسائل وہی ہیں جو کسی بھی دور میں صوفیا، فقرا، جوگیوں اور سنتوں کے مسائل رہے ہیں۔ زندگی میں خیر و شر اور روشنی و تاریکی کے درمیان جو کشمکش جاری رہتی ہے اور زندگی جس طرح خود غرضی منافقت، مادی نفسا نفسی اور اخلاقی زوال کی لعنتوں میں گھری رہتی ہے، انتظار حسین کا فن انہی لعنتوں سے ٹکرانے اور ذات کو برقرار رکھنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ یہ آج کے انسان کے کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا فن ہے' وہ ماضی کے انبار میں یقین کو صرف اس لیے تلاش کرتے ہیں تاکہ مستقبل کا انسان اپنی آگہی حاصل کر سکے اور بامعنی طور پر زندگی بسر کر سکے

ان پانچوں پرچوں پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں جن میں بے شمار نقادوں اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں بشمول وارث علوی، انور عظیم، ڈاکٹر مغنی تبسم، قمر احسن، سید اشرف، ڈاکٹر احمد سجاد، صلاح الدین پرویز، جاوید حبیب، آل احمد سرور اور علی جاوید نے گرم جوشی سے حصہ لیا۔

خواجہ احمد فاروقی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ ہندستانی اور پاکستانی افسانوں کا پس منظر زیادہ تر ایک ہی ہے۔ دونوں میں شخصیت کا بکھراؤ اور ذات کے غائب حصے کی تلاش کا عمل ملتا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ غالب اور اقبال تقسیم نہیں ہو سکتے۔ ثقافتی روابط جتنے گہرے ہوں گے فاصلوں کی خلیج بھی کم ہوگی۔ پروفیسر فاروقی نے اس موقع پر اپنے دلچسپ انداز میں توجہ دلائی کہ نئے لکھنے والے اردو زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کے اردو پن کی وضاحت کی اور فکشن میں اردو پن کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے اس بارے میں بعض واقعات کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ کوئی بھی ادب اس وقت تک دوامی اور عالمگیر نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اپنے عہد کی آگہی کے ساتھ اپنی زبان کی روایت اور ماضی کی روح پیوست نہ ہو۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کے کلمات تشکر کے ساتھ یہ اجلاس ختم ہوا۔ بعد ازاں مہمان حضرات اور شرکا و جمنا کنارے پُر فضا فورسٹ گیسٹ ہاؤس میں تشریف لے گئے جہاں ادارۂ تیز گام کے شاہد پرویز اور ع۔ حامد کی طرف سے پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

——— ۳۰ مارچ ۱۹۸۰ء ———

چوتھا اجلاس: اردو افسانہ ہندوستان میں صدارت: ڈاکٹر وزیر آغا

چوتھا اجلاس تین بجے پاکستان کے ممتاز دانش ور ڈاکٹر وزیر آغا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ موضوع تھا: ہندوستان میں اردو افسانے کا ارتقا۔ اس میں ذیل کے چار مقالے پڑھے گئے:

۱۔ دیویندر اسر (دہلی): ہندوستان میں اردو افسانہ
۲۔ مسز لنڈا وینٹنک (امریکہ): جدیدیت کی نئی نسل میں رومانیت: اظہاراتی اسلوب
۳۔ محمود ہاشمی (دہلی): قرۃ العین حیدر: جدید افسانے کا نقطۂ آغاز
۴۔ ڈاکٹر وحید اختر (علی گڑھ): قرۃ العین حیدر کے افسانے: فکر و فن

دیویندر اسر۔ دیویندر اسر نے اپنے مقالہ "ہندوستان میں اردو افسانہ" میں ہندوستان میں اردو افسانے کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے اس پر مارکس اور فرائیڈ کے اثرات کا ذکر کیا اور کہا کہ مارکسیت کے زیر اثر سماجی حقیقت پسندی کو ترقی پسندوں کے افسانوں میں زیادہ سے زیادہ اہمیت دی گئی جن میں تقسیم ہند سے پیدا شدہ مسائل اور فسادات کے موضوعات کی کثرت تھی۔ کرشن چندر کو انھوں نے اس طرز فکر کا نمائندہ افسانہ نگار قرار دیا۔ ان کے خیال میں دوسرے رُخ کی نمائندگی، جس میں انسان کے اندرونی کرب کی عکاسی تھی، راجندر سنگھ بیدی نے کی اور تیسرا نمایاں رجحان قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا تھا جن میں تہذیب کے المیے اور جلاوطنی کے احساس کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ جدید دور میں علامتی اور تجریدی افسانوں کو تقویت ملی جس کی اکا دکا مثالیں احمد علی اور ممتاز شیریں وغیرہ کے ہاں پہلے بھی مل جاتی ہیں۔ ان علامتی افسانہ لکھنے والوں میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کا ذکر مقالہ نگار نے خاص طور پر کیا۔ انھوں نے ایسے فن کاروں کے نام گنوائے جو آزادی سے قبل لکھ رہے تھے اور تقسیم کے بعد ان کی ادبی حیثیت مستحکم ہوئیں ایسے لوگوں میں رام لال، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، اقبال متین، اور جوگندر پال کو انھوں نے خصوصی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ ان میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے ابتدائی نقوش بھی ملتے ہیں، لیکن کئی افسانہ نگار اپنی منفرد حیثیت قائم نہیں کر سکے اور بغیر کسی نظریاتی یا ادبی وابستگی کے افسانے تخلیق کرتے رہے۔ البتہ جدید دور میں بلراج مینرا، سریندر پرکاش، بلراج کومل، کمار پاشی اور بلراج کومل نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ علامتی اور تجریدی افسانے سے جدیت کو کافی تقویت ملی۔ بعد کے اکثر افسانہ نگاروں کو مقالہ نگار نے الفاظ کا اسیر قرار دیا۔ مختلف افسانہ نگاروں اور ان کے فن پاروں کا تجزیہ کر کے مقالہ نگار نے نتیجہ اخذ کیا کہ آج کے افسانے میں فروغ پانے والے نئے رجحانات نو فرائیڈ پرستی اور نو مارکسیت کے ساتھ جدید فلسفے اور سائنس اور سماجی علوم کی روشنی سے تابناک ہیں۔

مسز لنڈا وینٹنک۔ اریزونا یونی ورسٹی کی مسز لنڈا وینٹنک نے اپنے مقالہ "جدیدیت کی نئی نسل میں رومانیت" میں ساتویں دہائی کے افسانوں کا تجزیہ کیا اور اس کے اظہاراتی (EXPRESSIONISTIC) اسلوب سے بحث کی۔ مسز وینٹنک کے نزدیک ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں کے یہاں تین طرح کے رجحانات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے افسانوں کو ان کے حقیقت نگاری پر مبنی ہونے یا حقیقت نگاری پر مبنی نہ ہونے کے بنا پر، بیانیہ یا غیر بیانیہ ہونے کی بنا پر یا تخلیق میں مصنف کی موضوعی موجودگی یا اس سے معروضی فاصلہ رکھنے کی خصوصیت کی بنا پر یعنی بنیادوں پر تقسیم کیا جا سکتا

ہ۔ جس اسلوب کی شناخت غیر حقیقت نگاری، بیانیہ انداز اور تخلیق میں موضوعی موجودگی سے ہوتی ہے، اس اسلوب کو اظہاراتی
اور تاثراتی اسلوب کا نام دے سکتے ہیں۔ مسز وینٹنگ نے کئی نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تجزیہ کر کے اور مغربی افسانے
سے ان کا تقابل کر کے بتایا کہ اردو افسانہ نگاروں کی وجودیت مغربی افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔ اردو افسانہ نگاروں کی
نئی نسل ابھی خاصی رومانیت زدہ ہے۔ اردو کے صفات کی تفسیر عمومی صفات کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ مثلاً پہاڑ، سمندر،
ری، مچھلی، سانپ بار بار نظر آتے ہیں مگر ہر افسانے میں ان کی نوعیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف بیسویں صدی کے
مغربی ادب میں اشیاء کا آزادانہ وجود ملتا ہے اور جنہیں انسان خود اپنے مقصد کے مطابق نہیں بنا سکتا۔ اردو کے اظہاراتی
افسانے میں اکثر و بیشتر مصنف واحد متکلم، مونولاگ کا انداز اختیار کرتا ہے یا افسانہ ایسا مکالمہ ہے جس میں دوسرے کردار کی
ذہنی انفرادیت نہیں۔ ان افسانوں میں ایک اور نقص یہ بھی ہے کہ ان میں اکثر OBJECTIVE CORELATIVE کا استعمال
نہیں ہوتا یہ افسانے مرکزی کردار کے جذبات و خیالات کی جانب مرکوز ہوتے ہیں اور ان میں خارجی حالات کو محور نہیں بنایا جاتا جو
مرکزی کردار کے خیالات و جذبات کا باعث بنتے ہیں۔ مصنف محض کردار کے تصورات کو بیان کرتا ہے۔ جدید افسانے کی ترقی کے
لیے یہ ضروری ہے کہ مصنف اپنی تخلیق سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ معروضی فاصلے پر رکھے۔

محمود ہاشمی۔ اس اجلاس کے تیسرے مقالے "قرۃ العین حیدر کا فن" میں منفرد طرزِ فکر کے حامل نقاد محمود ہاشمی
نے کہا کہ اردو میں جدید افسانے اور جدید افسانوی اسلوب کا آغاز قرۃ العین حیدر کے پہلے ابتدائی مجموعے "ستاروں سے آگے"
سے ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے افسانے، اردو میں پہلی بار اس ریاضیاتی یا CARTESIAN منطق کو توڑتے ہیں، جو واقعات
اور کرداروں کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے پر مجبور کرتی تھی، اور جس کا مقصد بیانیہ طرز کا احوال تھا۔ ان افسانوں میں نثر کے تخلیقی
استعمال کے ابتدائی نقوش نمایاں ہوئے ہیں، اور ایسے کردار تخلیق کیے گئے ہیں، جو اپنی شخصیت کے جھروکے سے دنیا پر نظر
ڈالتے ہیں، اور ان اشیا کو ذہن اور تخلیق کا منظر نامہ بنا لیتے ہیں، جن میں الفاظ اور اشیا کے درمیان کوئی فاصلہ یا خلا
موجود نہیں ہے۔ الفاظ اور اشیا ایسے استعارے ہیں، جن کے مناظر کی خاموشی میں باطنی احساس کی آواز موجود ہے۔

"ستاروں سے آگے" جدید افسانے کے طرز و اسلوب کی نشان دہی تو ضرور کرتا ہے، لیکن افسانوی مجموعہ کی کائنات
بہت محدود ہے اس کے بعد "شیشے کا گھر" کے افسانے ہیں، جن میں "وحشت" ہے، تصادم ہے، تاریخ اور تاریخیت HISTORICITY
اور عہدِ نو کی انتہائی ژولیدہ اور بے چہرہ دنیا ہے۔ جلاوطنی اور ہجرتوں کا احوال ہے۔ انسانی رشتوں کے انہدام کا مرثیہ ہے۔
بیسویں صدی میں زوالِ آدم اور گم شدہ جنتوں کا دکھ سہتے ہوئے مرد اور عورتیں ہیں، ایک نئی زمین ہے، جس پر گزشتہ تہذیب
کی کٹی ہوئی فصل کا ویرانہ ہے۔ ایک نیا آسمان ہے جو ماضی کی دنیا پر روشنی نچھاور کرنے والے آفتاب و ماہتاب سے محروم ہے۔ اس
زمین کی تلاش ہے جو عرفانِ ذات کے لیے ضروری ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر۔ اس بھرپور اجلاس کا آخری مقالہ "قرۃ العین کے افسانے: فکر و فن" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے فلسفے کے استاد ڈاکٹر وحید اختر نے پیش کیا۔ وحید اختر صاحب نے "شیشے کے گھر" کے بعد وجود میں آنے والے افسانوں کی روشنی
میں قرۃ العین حیدر کے فکر و فن کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور کہا کہ ہر چند طویل مختصر افسانے کی ابتدائی شکلیں اردو میں پہلے بھی

نظر آجاتی ہیں لیکن اس صنف کو فنی تکمیل اور فکری بعد قرۃ العین کے قلم سے نصیب ہوا قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی اہم خصوصیت تہذیبی فضا آفرینی ہے ان کے افسانوں میں تہذیبی روایات کا وہ تاریخی تناظر ہے جو بہ یک وقت تخلیق کو گہرائی دے کر اسے ماضی سے بھی جوڑتا ہے اور وقت کے تخلیقی وحرکی تجربے کے پورے احساس کے ساتھ اس کے حال و مستقبل میں توسیع بھی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اجتماعی شعور کی بازیافت اور تازہ کاری کا فریضہ آزادی کے بعد قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے انجام دیا ہے۔ دونوں فنکاروں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ انتظار حسین کی اسطور آفرینی نے انھیں تخلیقی سطح پر وجودیت کی زبانی جبریت سے بار بار ماورا جانے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر نقطۂ متعین کی طرف واپس لوٹتی ہیں اس ضمن میں مقالہ نگار نے عینی کے افسانوں "دو سیاح" "اعترافات سینٹ فلورینیا" اور "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی" کے حوالے دیے۔ آگے چل کر مقالے میں خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اردو میں تاریخی ناول اور افسانے بہت لکھے گئے لیکن قرۃ العین حیدر کے یہاں تاریخ کے ادوار گزشتہ ہمارے حال کا جزو بن کر زندہ ہوئے ہیں۔

اس اجلاس میں پیش کردہ مقالوں پر بھی زوردار بحثیں ہوئیں جن میں باہر کے ملکوں سے آئے ہوئے شرکا کے علاوہ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر احمد سجاد، ڈاکٹر ابوذر عثمانی، کلام حیدری، وارث علوی، شاہ حسین، کرن کاشمیری، ریاست حسین فاروقی نیز علی گڑھ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اساتذہ اور ادیبوں نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ آخر میں اجلاس کے صدر ڈاکٹر وزیر آغا نے مختصر صدارتی کلمات کہے اور ڈاکٹر مظفر حنفی کے شکریے کے ساتھ یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۰ء

کہانیوں کی دوسری شام (غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب)

اس شام "ایوان غالب" کے وسیع اور حسین وجمیل آڈیٹوریم میں کہانیوں کی ایک شام سجائی گئی جس کا افتتاح ممتاز فکشن نویس اور صحافی خشونت سنگھ نے فرمایا اور صدارت مشہور ومعروف افسانہ نگار عصمت چغتائی نے فرمائی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب معین زیدی نے استقبالیہ کلمات کہے۔ اور نظامت جناب رئیس مرزا نے اپنے دلکش انداز میں کی۔ اس نشست میں انتظار حسین نے اپنا افسانہ "وہ جو کھوئے گیے" احمد ہمیش نے "کہانی مجھے لکھتی ہے" منیر احمد شیخ نے "سلام علیکم" بلراج مینرا نے "آخری کمپوزیشن" کلام حیدری نے "اٹھارہ سو ستاون" اور جوگندر پال نے "جادو" کے عنوان سے اپنے افسانے پڑھے۔ ایوان غالب کا آراستہ و پیراستہ آڈیٹوریم سامعین کے جگمگاتے ہوئے چہروں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ سامعین نے کہانیوں کو بڑی توجہ اور انہماک سے سنا اور دل کھول داد دی۔ تخلیقات کے انتخاب اور ترتیب وحاضری کے لحاظ سے کہانیوں کی یہ شام ہر اعتبار سے ایک یادگار شام تھی جو تقریباً دس بجے ختم ہوئی۔ اس کے بعد غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے مندوبین اور دیگر شرکا

کے اعزاز میں پُرتکلف دعوت عشائیہ دی گئی۔

—— ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء ——

پانچواں اجلاس: اردو افسانہ: اظہار کے مسائل صدارت: انتظار حسین

سیمنار کا پانچواں اجلاس حسبِ سابق صبح ساڑھے نو بجے پاکستان کے صاحبِ طرز افسانہ نگار جناب انتظار حسین کی صدارت میں شروع ہوا۔ یہ اجلاس "جدید اردو افسانہ میں اظہار کے مسائل" پر غور و خوض کے لیے وقف تھا۔ اس میں ذیل کے تین مقالے پڑھے گئے:

۱۔ باقر مہدی (بمبئی): جدید اردو افسانے کا ڈیلیما
۲۔ شمس الرحمان فاروقی (دہلی): افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ
۳۔ مہدی جعفر (بھوپال): نیا افسانہ: اظہار کے مسائل

باقر مہدی۔ باقر مہدی نے اپنا مقالہ "جدید اردو افسانے کا ڈیلیما" طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے سب سے پہلے پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ آج کا دور صرف بحران کی تاریخ قدم قدم پر رقم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ حادثات کو معمول بنا کر گزر رہا ہے۔ سانحات اپنی SHOCK کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ حالات کی سنگینی ہمیں بے حس اور بے ضمیر بننے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ اس کے بالمقابل آج کے دور کی سب سے بڑی حقیقت بغاوت کی آرزومندی ہے۔ انھوں نے کہا آج کے دور کی کہانی کو سمجھنے کے لیے حقیقتوں اور خواب کی آویزش اور آمیزش کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسے دور میں جب دو SUPER POWERS تقریباً ایک ہی طرح کی "حقیقت سازی" میں مصروف ہوں تو تیسری دنیا کا فن کار اپنی کہانی کہاں سے شروع کرے اور کیسے سنائے؟ اپنے دور کے ظلم، سفاکی، بے حسی، بے زاری اور بے کیفی سے نکلنے کے لیے وہ کونسی نئی کہانی لکھے یعنی جبر سے نکلنے کی کوشش فن کار کو ایک طرح کے ڈیلیما سے دوچار کرتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اردو کا جدید افسانہ اپنی پیدائش کے دن سے اس ڈیلیما کا شکار ہے۔ آج کے نئے افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "قرۃ العین کے ہاں یہ کشمکش ہے کہ مغربی افسانے کی تکنیک کو کتنا اپنائیں کتنا رد کردیں۔ انتظار حسین نے داستانی انداز کو افسانے میں حیات نو دی ہے لیکن ان کا ڈیلیما ان کی طرز فکر سے وابستہ ہے۔ باقر مہدی صاحب نے مزید فرمایا کہ جدید افسانے کا سب سے اہم نام انور سجاد کا ہے۔ جنھوں نے اپنے متنوع فن سے ایک احتجاجی امید کی کرن پیدا کی ہے۔ وہ بلاجھجک سرئلزم کی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی کہانی صرف ذہن کا ٹیپ ریکارڈ نہیں ہے۔ یہ ٹوٹتے ہوئے آدمی کی کہانی ہوتے ہوئے بھی حوصلہ مندی کی طرف ایک جرات مندانہ قدم ہے۔ شاید وہ اردو کے پہلے ریڈیکل افسانہ نگار ہیں جس نے سیاسی جبریت کو نہایت فن کارانہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔ اور انسانی معصومیت کی ترجمانی کی ہے۔

شمس الرحمان فاروقی ۔ اپنے فکر انگیز مقالے " افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ " میں صاحب فکر نقاد شمس الرحمان فاروقی نے کہا اگر کسی افسانے میں کہانی پن ہو تو کیا وہ افسانہ دل چسپ ہو جاتا ہے ؟ اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ " افسانہ " ، " کہانی پن " اور دلچسپ " ان اصطلاحات کی تعریف متعین کر لی جائے ۔ آسانی کے لیے " افسانہ " کو FICTION کے معنی میں رکھیے کیوں کہ ناول اور افسانہ تخلیقی اور اظہاری اعتبار سے ایک ہی صنف ہیں فکشن کے بارے میں سب سے آسان بات یہ ہے کہ فکشن ان تمام طرح کے افسانوں سے الگ ہوتا ہے جن کا تعلق کم و بیش زبانی بیان سے ہے ۔ فکشن وہ تحریر ہے جس میں زبانی بیان کا عنصر یا تو بالکل نہ ہو یا بہت کم ہو، جس کے ذریعہ کسی بات کو بین طور پر ثابت یا رد نہ کیا جاتا ہو اور جس کے کرداروں میں کوئی ایسی بات ہو جس کی بنا پر ہم ان سے انسانی جذبات کے دائرے میں رہ کر معاملہ کر سکیں ۔ بیانیہ وہ گاڑی ہے جس پر کردار اور واقعات سفر کرتے ہیں ۔ ہر وہ تحریر بیانیہ ہے جس میں واقعے یا کردار کے انعقاد کا امکان ہو ۔ واقعے سے مراد ہے کوئی وقوعہ، کوئی حادثہ یا کوئی سانحہ، اور کردار سے مراد ہے کوئی انسان یا کوئی بھی ہستی جسے ہم ذی روح فرض کر سکتے ہوں یا ذی روح جانتے ہوں اور جس سے دوچار ہونے میں ہم انسانی جذبات کے دائرے میں آسکیں خاص طور پر کردار سے انسانی کردار مراد لیا جاتا ہے کیوں کہ غیر انسانی کرداروں میں اتنی پیچیدگی اور بوقلمونی کا امکان نہیں کہ ان کے تعلق سے انسانی جذبات کے جس دائرے میں ہم داخل ہوں وہ کم سے کم اتنا شدید یا وسیع ہو کہ اس پر حقیقی جذباتی دائرے کا اطلاق یا احتمال ہو سکے ، کہانی عام طور پر کردار اور واقعے کے INTERACTION سے وجود میں آتی ہے لیکن کہانی کا کوئی مجرد وجود نہیں ۔ کہانی کی حد تک شروع اور ختم کی تعریف یہ ہے کہ شروع وہ ہے جس کے پہلے جو کچھ ہو وہ فنی طور پر غیر ضروری ہو اور ختم وہ ہے جس کے بعد جو کچھ ہو وہ فنی طور پر غیر ضروری ہو ۔ کہانی پن سے مراد کہانی کی وہ صفت ہے جس کے ذریعہ وہ آگے بڑھتی ہے لیکن آگے بڑھنا بھی سیدھی لکیر میں آگے بڑھنے کے مترادف نہیں ، کہانی کا آگے بڑھنا واقعے کی کثرت کے مترادف ہوتا ہے ۔ کہانی ایک سلسلے کا نام ہے جس میں زبانی ربط بھی ہو سکتا ہے اور تاثراتی بھی یا محض وہ ربط ہو سکتا ہے جو ایک یا کئی کرداروں کے ایک ہی صورت حال یا مختلف صورت حالات سے دوچار ہونے سے پیدا ہوتا ہے ۔ کہانی قاری کے ذہن اور اس کے تجربے میں بھی آگے بڑھتی ہے ۔ اگر قاری کہانی پڑھنے سے انکار کر دے تو کہانی کاغذ پر موجود ہوتے ہوئے بھی قاری کے لیے موجود نہیں ہوتی یا اگر وہ اسے پڑھ بھی ڈالے اور اس کے ذہن میں کہانی پن کی صورت نہ پیدا ہو تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے افسانہ تو پڑھا لیکن کہانی نہیں پڑھی ۔ لہٰذا افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ یہ نہیں کہ افسانہ دل چسپ یا تجسس انگیز کیوں نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہم میں انسانی لگاؤ اور فکر مندی کیوں کم ہے یا افسانہ ہمارے اس لگاؤ اور فکر مندی کو برانگیخت کیوں نہیں کرتا ۔

مہدی جعفر ۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ بھوپال کے جواں سال نقاد مہدی جعفر نے پڑھا ۔ عنوان تھا " نیا افسانہ ، اظہار کے چند مسائل " ۔ انھوں نے کہا : اظہار کا مسئلہ ترسیل کے مسئلے سے مختلف ہے ۔ ترسیل قاری کا احاطہ کرتی ہے اور اظہار فن کار سے متعلق ہے ۔ افسانہ نگار اپنے اظہار پر ترسیل کی پابندی سے بالکل چھٹکارا حاصل کرنے میں شاید حق بجانب نہیں ہے ۔ ترسیل کے سلسلے میں جو زنجیر اسے پابند کرتی ہے عموماً وہ بیانیہ کی ہے ۔ نئی نسل کا افسانہ نگار اپنی ترجیح

فصاحت کی بنا پر زیادہ پابند نہیں رہنا چاہتا۔ اب مسئلہ اظہاری تجربوں کا اتنا نہیں ہے جتنا کہ ترسیل کے تجربوں کا ہے۔ اظہار کا مسئلہ نئی زبان کے استعمال کے ساتھ افسانے کو وسیع اور موثر کینوس جو نئی پود کے ذریعہ اظہار کو طویل افسانوں، ناولوں حتیٰ کہ داستانوں تک پہنچا سکے۔ اب جب کہ فنکار نے قاری کا امتحان لے لیا ہے تو قاری فن کار کے امتحان پر آمادہ ہے کہ دیکھیں اس کا اظہار مختصر افسانوں کی تجربہ گاہ سے ایک بڑے میدان میں کیوں کر آتا ہے۔ جدید اظہار میں طویل نگارش کا حل پیش کرنے میں اولین کوششیں زیادہ تر آٹھویں دھائی کی مرہون منت ہیں حالاں کہ ساتویں دھائی میں اکا دکا افسانے نے اپنا سر ابھار چکے تھے۔ افسانہ نئے میڈیا میں اترنے یا نئے ابعاد میں پھیلنے کے لیے نیا اظہاری وسیلہ چاہتا ہے۔ طوالت کے سلسلے میں ایک نیا طرزِ اظہار ایک ہی استعارے یا علامت کے گرد کئی افسانوں کا تشکیل پاتا ہے۔ آٹھویں دھائی میں لکھے گئے اکا دکا روایتی طرز کے افسانوں میں مسئلہ نہ اظہار کا ہے نہ ترسیل کا۔ یہ افسانے زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے اور اپنے طریق اظہار کو عام واقعاتی سطح پر رکھتے ہوئے قاری کی ترسیل کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں۔ تجریدی یا علامتی افسانہ نگار اپنی دشواریوں کے باعث قاری کی ترسیل کی پروا نہیں کرتا وہ خود کو اظہار تک ہی محدود رکھتا ہے۔ علامتی افسانہ نگاروں کا مسئلہ عموماً یہ رہا ہے کہ افسانوں میں علامت کی ضروری تجسیم اور اس کے بھرپور اظہار میں فن کار کو بڑی حد تک کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ علامت ایک شدید تاثر بکھیر دیتی ہے اور قصہ ختم۔ دیکھنا یہ ہے کہ فن کار علامت کو طلوع کرنے میں کتنا انتظام اور اہتمام کرتا ہے تاکہ علامت جمالیاتی سطح پر نکھر اٹھے۔

پرچوں میں بعض چبھتے ہوئے سوال اٹھائے گئے تھے جن پر نہایت تیکھی بحث ہوئی۔ بحث میں حصہ لینے والے تھے حامدی کاشمیری، بلراج مینرا، رام لعل، احمد ہمیش، کلام حیدری، انور عظیم، مہدی جعفر، دیوندر سیتارتھی، آل احمد سرور، وحید اختر، وارث علوی، علی جاوید اور فضیل جعفری، ڈاکٹر ابوذر عثمانی، شمس الحق عثمانی۔ انتظار حسین صاحب کے دلچسپ صدارتی خطبے پر یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد دانشوروں، نقادوں، افسانہ نگاروں اور ادب نوازوں کا یہ جم غفیر جمنا کنارے کے گیسٹ ہاؤس میں تشریف لے گیا۔ ہوا میں نمی کی تاثیر تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ لنچ کا اہتمام حاجی انیس صاحب اور ان کے صاحبزادے کفیل کی طرف سے تھا۔ ادیب اور دانشور چاروں طرف ٹولیاں سی بنا کر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ ڈرائنگ روم میں خوش گپیوں میں معروف تھے۔ فضا میں چاروں طرف قہقہے اور مسرتیں ہی مسرتیں تھیں۔ دہلی کے مشہور کیمرا آرٹسٹ ایم۔ ایم خان (مشرانڈیا) سب کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف تقاضا تھا کہ تصویر یہاں کھینچی جائے، کہیں رنگین کہیں سادہ، کہیں تنہا، کہیں دو کیلی اور کہیں طرح طرح کے گروپ اور گھلتے ہوئے لوگ۔ خوش وقتی کے یہ مناظر تین بجے تک سبزہ زار میں اور گیسٹ ہوس کی عمارت کے چاروں طرف سجے رہے۔ پھر بتدریج یہ قافلہ سیمینار گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

—— ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء ——

چھٹا اجلاس :　　نیا افسانہ : نئے رویے　　صدارت : محمد عمر میمن

اس یادگار سہ روزہ سیمینار کا آخری اجلاس وسکانسن یونیورسٹی کے پروفیسر محمد عمر میمن کی صدارت میں شروع ہوا یہ اجلاس نئے افسانے کے نئے ذہنی رویوں کے لیے وقف تھا۔ اس میں ذیل کے تین مقالے پڑھے گئے:

۱۔ انتظار حسین (پاکستان) : افسانہ اور چوتھا کھونٹ

۲۔ بلراج کومل (دہلی) : شاعری اور افسانے کی ٹوٹتی حد بندیاں

۳۔ قمر احسن (دہلی) : اردو افسانہ: ارضیت اور سماجی معنویت

انتظار حسین۔ پاکستان میں نئے افسانے کے معتبر اور ممتاز فن کار انتظار حسین نے "افسانہ اور چوتھا کھونٹ" کے عنوان سے اپنا انتہائی دلچسپ مضمون پڑھتے ہوئے فرمایا: افسانہ کیا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب آج کے افسانے کی روشنی میں دینا بہت دشوار ہے۔ کیوں کہ ناقدین نے افسانے کی جو بھی تعریفیں متعین کی ہیں وہ سب کی سب آج کے افسانے کے لیے ناقص ثابت ہو چکی ہیں آج کے افسانہ نگار کی مثال کسی بادشاہ کے اس پانچویں بیٹے کی سی ہے جو باپ کی ہدایت پر عمل نہ کرتے ہوئے شکار کھیلنے کے دوران جنگل کے تینوں کھونٹ سے ہو کر چوتھے کھونٹ میں پہنچ گیا تھا اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آج کا افسانہ بھی چوتھے کھونٹ میں داخل ہو چکا ہے۔ آج کے افسانہ نگاروں کا تجسس بھی انھیں نئی نئی راہوں کی تلاش پر مجبور کرتا ہے اور اس لیے وہ اپنے لیے پریشانیوں کا سامان مہیا کر لیتے ہیں۔ تیسری اور چوتھی دہائی کے افسانوں کی فنی حد بندیاں جیسے پلاٹ، سسپنس، کلائمکس وغیرہ ٹوٹ چکی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ان حد بندیوں کے قائل نہ ہوتے ہوئے بھی ماضی اور حال کی حد بندی پر بہت مصر ہیں اور نئے پرانے میں بہت فرق کرتے ہیں آج کا افسانہ ماضی قریب کے افسانے کی بہ نسبت کتھا سرت ساگر اور انتہا نامعلوم ہوتی ہے۔ ان کہانیوں کو مشرق والوں نے بھلا دیا ہے مگر مغرب کے لوگوں نے ان سے استفادہ کر کے نئی فنی جہات پیدا کی ہیں اور ہم مشرق والے ان کے دکھائے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں اور فن کی راہوں میں انھیں اپنا مرشد جانتے ہیں۔ کتھا سرت ساگر کی کہانیاں اپنے اندر آج بھی دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں اس لیے نئی ہیں جب کہ ترقی پسند افسانہ جو ماضی قریب کی چیز ہے آج پرانا ہو چکا ہے۔ آج ناول اور مختصر افسانے کے سانچوں کو توڑ پھوڑ کر اور ان میں استعاراتی تصور حقیقت کو جھٹلا کر پرانی کہانی واپس آ گئی ہے۔

بلراج کومل۔ بلراج کومل نے اپنے مقالے "شاعری اور فکشن کی ٹوٹتی حد بندیاں" کے آغاز میں فکشن کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کے ذیل میں وہ بیانیہ نثری تحریریں آتی ہیں جن میں تخئیلی اور تخلیقی سطح پر واقعات، مناظر اور کرداروں کی مدد سے زندگی کی نمائندگی کی جاتی ہے۔ انھوں نے شعر اور نثر کا بنیادی فرق استعارے کو قرار دیا اور کہا کہ شعر کے دیگر اوصاف ایجاد، اختصار، اجمال اور آہنگ ہیں، منطق شعر سے اتنی ہی دور ہے جتنی نثر کے نزدیک۔ فکشن کی حد بندی نیتیسی کی سی فضا میں ملفوف استعارے اور علامت کی سرگرم پیش بندی نے بہت بڑی دراڑیں پیدا کی ہیں۔ فکشن کو سماجی دستاویز کے مترادف قرار دے کر منظر نگاری اور کردار نگاری پر بڑا زور دیا جاتا تھا لیکن انتظار حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش، خالدہ اصغر اور دوسرے افسانہ نگاروں نے شعری موضوعات مثلاً جوہر حیات، نوعیت حیات اور ماہیت پر زیادہ توجہ صرف کر کے افسانوں میں شاعری کے لیے جگہ نکالی ہے اپنے اس خیال کی تائید میں مقالہ نگار نے نئے کہانی کار دیں

کے چند افسانوں کا تجزیہ بھی کیا۔ آگے چل کر بلراج کومل نے اعتراف کیا کہ شعر کی حد بندیاں بھی محفوظ نہیں رہی ہیں نئی شاعری میں ٹھوس تفصیل کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے جس کی مثالیں ناصر کاظمی، ظفر اقبال، خلیل الرحمان اعظمی اور منیر نیازی کے ہاں اکثر نظر آتی ہیں اس طرح فکشن کے زیر اثر غیر ذاتی طرز تحریر و اظہار نظموں میں رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کر گیا ہے اور تفصیل نگاری، مکالمہ نگاری اور ڈرامائی طریق کار سے بھرپور استفادہ کیا جانے لگا ہے۔ شعر کی حد بندیوں پر سب سے کاری ضرب آہنگ کے تصور سے لگی ہے اس ضمن میں انھوں نے چند نثری نظموں کے اقتباسات پیش کر کے اپنی بات کو مدلل بنایا۔

قمر احسن۔ ۷۰ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتے ہوئے جواں سال قمر احسن نے اپنے مضمون "نئے اردو افسانہ میں ارضیت اور سماجی معنویت" میں کہا کہ داستانوں اور قصوں میں سبق آموزی، تحیر خیزی اور دلچسپی ہوتی ہے لیکن کسی فکشن کا تصور بغیر سماجی معنویت کے ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کہ فکشن کا پورا تعلق زبان اور بیان سے ہے اور یہ بغیر ارضیت اور سماجی رابطے کے ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن ادب اور فن پارے کا محض یہی مقصد نہیں ہے کہ وہ سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی روابط کا مظہر ہو اس لیے کہ ان سارے افادی موضوعات کا علم تو ان موضوعات کی اہم کتابوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ اس کے اظہار اور علم کے لیے افسانے یا ناول کیوں لکھے جائیں۔

اس سلسلے میں افسانے کی جو روایت نئی نسل تک پہنچی تھی اس میں ایک مخصوص طرز فکر نے ہمیشہ اس سماجی رابطے پر اصرار کیا تھا اور اسے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا اس لیے ان کے یہاں واضح سماجی معنویت ہی نمایاں تھی لیکن نئی نسل نے چونکہ اپنے لیے نئی زبان اور نئی حقیقت کی بھی تلاش کی تھی اس لیے اس پر الزامات عائد کئے گئے۔ اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ اگر کوئی تخلیق ادب یا فن ہوگی تو اس میں ان تمام روابط کا ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا نئے افسانہ میں ان صفات کے نہ ہونے کا الزام محض اس کی نئی زبان اور نئی ہیئت پر الزام تھا جسے نئے افسانہ نگار نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور افسانہ کو نئے ابعاد کے ساتھ عصر موجود کی اہم صنف بنا دیا اور اس عہد کا سارا تجربہ اس میں نمایاں ہونے لگا۔

ان پرچوں پر اظہار خیال کرنے والوں میں آل احمد سرور، وارث علوی، انور عظیم، جوگندر پال، دیوندر ستیارتھی اور احمد ہمیش بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مقالہ نگار حضرات نے بحث کا جواب دیا۔ اور میمن صاحب کی صدارتی تقریر اور ڈاکٹر صغرا مہدی کے کلمات تشکر کے ساتھ یہ اجلاس تقریباً پانچ بجے اختتام پذیر ہوا۔

چائے کے مختصر وقفے کے بعد اختتامی اجلاس کا آغاز عمل میں آیا۔ صدارت اردو کے محترم اور بزرگ ترین نقاد و دانشور پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی۔ اسٹیج پر تشریف فرما کر مندوبین مختلف ملکوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر وزیر آغا جناب انتظار حسین، پروفیسر محمد عمر میمن اور صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے مختصراً اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار ہر لحاظ سے ایک تاریخی واقعہ تھا۔ مندوبین کی عام رائے تھی کہ یہ حصول آزادی کے بعد کا سب سے بڑا اور سب سے شاندار سیمینار تھا اور اعلان کے مطابق یہ ہند و پاک تھا لیکن پروفیسر نارنگ کی لگن اور سلیقہ مندی نے اسے بین الاقوامی بنا دیا، اور اردو زبان و ادب کے لیے اس سے بہتر صورتیں پیدا ہوں گی۔ مقررین نے کہا کہ اس سیمینار سے اردو افسانے پر غور و فکر کی ایک ایسی روایت کا آغاز ہوا ہے جس کے اثرات دیرپا ہوں گے۔ سبھی نے بیک زبان پروفیسر گوپی چند نارنگ

کے حسنِ انتظام، دل سوزی، انتھک محنت اور صلاحیت ولیاقت کی داد دی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب انور جمال قدوائی، اساتذہ، طلبا اور طالبات کو مبارک باد دی کہ انھوں نے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نام بنام مقالہ نگار حضرات، افسانہ نگاروں، باہر کے ملکوں سے تشریف لانے والے مندوبین، شرکا، کارکنان منتظمین اور سامعین کا نہایت ہی پرتپاک شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کوئی بھی سیمینار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا چنانچہ ہم نے بھی نہ کوئی فیصلے کیے ہیں نہ حکم لگائے ہیں۔ البتہ سنجیدہ علمی طریقے سے غور و فکر کی فضا تیار کی ہے۔ سوال اٹھائے ہیں اور مسائل پر غور و خوض کی دعوت دی ہے۔ ہر اچھا سیمینار سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور فکر و نظر کے امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔ اگر یہ سعی بار آور ہوی ہے تو شکر کا مقام ہے اور آپ سب کے شکریے کا مستحق ہیں جنھوں نے ہمارے وسائل کی کمی کے باوجود اپنی رفاقت محبت، اخلاص، اشتراک، گرم جوشی اور تعاون سے اس سیمینار کو ایک یادگار تاریخی سیمینار بنا دیا ہے۔ افسوس کہ یہ تین دن پلک جھپکتے میں گزر گئے اور اردو ادب اور تنقید کے آفتاب و ماہتاب اور ستارے و سیارے جو چند لمحوں کے لیے جامعہ کی سرزمین پر اتر آئے تھے اب پھر خدا جانے کب اس طرح یکجا نظر آئیں۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

جلسہ گاہ سے جب لوگ باہر نکلے تو شام کجلا رہی تھی اور غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے بچھڑنے کے جذبات کی دھند ذہنوں پر چھانے لگی تھی لیکن ابھی افسانے کی دو شامیں اور ملنے ملانے کے دو مواقع باقی تھے۔ روشنوں پر بکھرتے ہوے ادب کھمبوں سے لگے ہوے لوگ اور سبزہ زار سے معدوم ہوتے ہوے چہرے یہ تاثر دے رہے تھے کہ سیمینار کے اختتام کی پرچھائیاں گہری ہونے لگی ہیں۔ بتدریج کاروں، جیپوں اور بسوں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ میں لوگ اپنی اپنی سیٹوں میں سمٹنے لگے اور یہ قافلہ ساہتیہ اکیڈمی کے استقبالیہ میں شریک ہونے کے لیے رابندر بھون دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

—— ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء ——

کہانیوں کی تیسری شام (ساہتیہ اکیڈمی، رابندر بھون)

رابندر بھون، رابندر ناتھ ٹیگور کی یاد میں بنائی ہوی نہایت خوش نما عمارت ہے اس کی تین منزلوں پر مرکزی حکومت کی طرف سے قایم کردہ فنونِ لطیفہ کی تین اکیڈمیاں ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی کے دفاتر دوسری منزل پر ہیں۔ پاکستانی دانشوروں اور ادیبوں کو دیے جانے والے اس استقبالیہ میں پنجابی ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ شرکا اور سامعین کی اتنی بڑی تعداد ساہتیہ اکیڈمی میں شاید ہی کبھی دیکھنے میں آئی ہو۔ سیمینار روم، لاونج، ساتھ کے کمروں اور زینوں میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوے تھے۔ پرتکلف عصرانے کے بعد کہانیوں کی شام جناب مالک رام کنہیا اور دو بورڈ، ساہتیہ اکیڈمی کی صدارت میں شروع ہوی۔ افسانہ نگاروں کا تعارف پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مخصوص

جامع اور دل کش انداز میں کرایا۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "چشمۂ بد دُور" احمد ہمیش نے نہایت عمدگی سے پڑھ کر سنایا۔ انتظار حسین صاحب نے اس موضوع پر اپنا افسانہ "پکھوے" سنایا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ آمنہ ابوالحسن نے اپنی کہانی "آگ" اور محمد عمر میمن نے "واپسی" سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر کیلکر اور ڈپٹی سکریٹری جناب دشنو کھرے کے اظہار تشکر کے ساتھ یہ جلسہ تقریباً نو بجے ختم ہوا۔

اس رات سفیر کبیر پاکستان جناب عبدالستار کی طرف سے مہمانوں کے عشائیہ کا پُر تکلف انتظام کیا گیا تھا۔ "گلِ رعنا" کے پائیں باغ میں نہایت خوب صورت شامیانہ میں نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چاروں طرف سبزہ زار کے پیڑ پودوں اور پھولوں کی جھاڑیوں میں رنگ برنگ برقی قمقمے فضا میں رنگ و نور کی لہریں بکھیر رہے تھے۔ اس یادگار موقع پر پاکستان کے ہر دل عزیز سفیر عبدالستار صاحب نے استقبالیہ کلمات کہے اور نہایت پُر تپاک لہجے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ساعی کو سراہا اور انھیں مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ایک یادگار ادبی کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے اور اگلا سیمینار پاکستان میں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے پروفیسر نارنگ کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ نارنگ صاحب نے اس موقع پر مختصر لیکن جانِ سخن قسم کی تقریر کی جس کے بارے میں عام تاثر تھا کہ وہ فکر انگیز اور پُر مغز ہونے کے ساتھ ساتھ لطافتِ بیان اور دلاویزی کے اعتبار سے بے نظیر تھی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اس برصغیر کی ایسی لسانی قوت ہے جس کے مختلف علاقوں اور خطوط میں مختلف روپ یا نام رہے ہوں لیکن اسے کوئی مٹایا دبا نہیں سکتا آغاز ہی سے اس زبان کے سر پر اولیا اللہ، صوفیوں، بھگتوں، سنتوں، اور درویشوں کا ایسا ہاتھ رہا ہے کہ باوجود موانع کے یہ ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے۔ اردو کی روایت انسان دوستی کی اعلا ترین روایت ہے جس کا مرکزی نقطہ خود کی ذات ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اردو ایک ایسا ثقافتی رابطہ ہے جس کی اہمیت اور امکانات کو ہمارے سیاست دانوں اور فیصلہ کاروں نے ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھا۔ اردو دل کی زبان ہے یہ دلوں کو جوڑتی ہے توڑتی نہیں۔ ہمارا سیمینار اردو افسانے کے بارے میں تو تھا ہی۔ ساتھ ہی ایک حقیر سی کوشش تھا ہندوستان اور پاکستان کے ثقافتی رشتوں کے استحکام کی راہ میں ایک قدم اٹھانے کی۔ اگر اس میں کچھ کامیابی ہوئی ہے تو اس میں سفیر کبیر پاکستان جناب عبدالستار صاحب مجناب منیر احمد شیخ، پریس کونسلر سفارت خانۂ پاکستان کا بھی حصہ تھا جس کا شکریہ لفظوں میں ممکن نہیں۔ دعوت کے بعد ایک بے تکلف سی شعری نشست منعقد ہو گئی جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، گلزار دہلوی، رفعت سروش، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر مظفر حنفی، کرشن موہن، حنیف کیفی، صلاح الدین پرویز، بلراج کومل، ڈاکٹر مغنی تبسم، احمد ہمیش، ڈاکٹر وزیر آغا اور صدر نشست پروفیسر آل احمد سرور سے ان کا کلام سنا گیا۔ "گلِ رعنا" کی یہ روشن اور منور تقریب سبزہ زار میں برقی قمقموں کے ٹمٹمانے اور فضائے بسیط میں کرمکِ شب تاب کے جلنے بجھنے کی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ نصف شب کے قریب اختتام پذیر ہوئی۔

——— یکم اپریل ۱۹۸۰ء ———

کہانیوں کی آخری اور چوتھی شام (اردو گھر انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی)

ہند و پاک اردو افسانہ سیمنار اگرچہ تین دن کا تھا لیکن اس کی مقبولیت اور سامعین کے اشتیاق پر چوتھی شام کا اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر نئی دہلی میں کیا گیا۔ اس کے ناظم انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔ کہانیوں کی یہ شام اردو گھر کے خوب صورت لان میں منعقد کی گئی جس میں چاروں طرف قناتیں لگا کر روشنی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ صدارت پاکستان کے جہان دانشور ڈاکٹر وزیر آغا نے فرمائی۔ جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے پاکستان سے آئے ہوئے ادیبوں اور افسانہ نگاروں اور ہندوستان کے افسانہ نگاروں کا استقبال کیا اور ان سب کی تشریف آوری پر اظہار مسرت کیا۔ اس موقع پر عصمت چغتائی، احمد ہمیش، رضوان احمد اور عبدالصمد نے اپنے اپنے افسانے پیش کئے۔ جناب انتظار حسین، مالک رام صاحب، اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ہندوستان اور پاکستان کے ثقافتی رشتوں اور مشاہیر ادب کی آمد پر اظہار خیال کیا۔ آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی مختصر تقریر دل کش انداز میں پیش کی اور دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو خراج تحسین پیش کیا۔

اس شب ادارۂ شمع نئی دہلی کے زیر اہتمام شمع کے مدیر اعلا جناب یوسف دہلوی اور یونس دہلوی کی طرف سے ان کی اپنی قیام گاہ پر عشائیہ کا شاندار انتظام کیا گیا۔ اس دعوت میں مہمان افسانہ نگاروں، دانشوروں اور مندوبین کے علاوہ معززین شہر اور ممتاز اردو ادیبوں اور صحافیوں کا زبردست اجتماع تھا۔ نیز ممبران پارلیمنٹ، فلمی دنیا کی شخصیات اور مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری وی پی ساٹھے نے بھی شرکت فرمائی۔

اس سیمنار نے اردو افسانے کے حق میں جو فضا تیار کی ہے اور اس کی طرف جو توجہ دلائی ہے اس کا سلسلہ گونج در گونج پورے برصغیر میں پھیل رہا ہے۔ اس سیمنار کی دیکھا دیکھی اب دوسرے سیمنار بھی منعقد ہو رہے ہیں اور افسانوں کی شاموں کا سلسلہ بھی دہلی، علی گڑھ اور بمبئی سے ہوتا ہوا شہر شہر قریہ قریہ اور ادارے ادارے تک پہنچے گا، اور جس نیک نیتی اور دل سوزی سے اس سیمنار کا ڈول ڈالا گیا تھا اس کا سب سے بڑا صلہ یہی ہے کہ اردو کو دلوں میں جگہ دی جائے اور اس کی محبتوں کا سلسلہ بڑھتا رہے۔

"ادارۂ ادبیات اردو" میں حاضر ہو کر میں بہت مسرور ہوا، نوادر کا اتنا بڑا ذخیرہ ایک چھت کے نیچے ہندوستان میں شاید ہی کہیں ہو۔ خدا مرحوم زور صاحب کے درجات اعلیٰ کرے۔ اور آج اس ادارے کو چلانے والوں کے ہاتھ مضبوط کرے تاکہ اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔

مخطوطات کی وضاحتی فہرست کے دوبارہ چھپوانے اور نئی جلد کی ترتیب و اشاعت کے سلسلہ میں ترقی اردو بیورو کی طرف سے جو امداد ہو سکے اس کے لیے میں حاضر ہوں۔

۵/جولائی ۱۹۸۰ء

شمس الرحمان فاروقی

(ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ حکومت ہند دہلی)

اُردو نامہ

اُردو کی علمی و ادبی اور تہذیبی خبریں

اے۔ ایف۔ خلیل

یکم جولائی: ریاستی گورنر نے جناب سید کمتر شاہ کو رکن قانون ساز کونسل کا حلف دلایا اور موصوف نے اردو میں حلف لیا۔

۲ر جولائی: ریاستی اردو اکیڈیمی کے پریس نوٹ کے بموجب اضلاع میں رہنے والے شعرا کے کلام اور حیات پر اکیڈیمی کی طرف سے انتخابی تذکرہ شائع کیا جائے گا۔ مسٹر چندر سریواستو ڈائرکٹر و سکریٹری اکیڈیمی نے شعرا سے اس سلسلے میں تعاون کی اپیل کی ہے۔

● مسٹر سیر قواس لاہوتی شریک معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے ریاستی وزیر تعلیم کو ایک مکتوب کے ذریعہ اضلاع کے متعدد مقامات پر اردو داں طلبا کی تعلیمی سہولتوں سے محرومی پر اظہار تشویش کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اردو داں اساتذہ کی تلگو مدارس اور تلگو جاننے والے ٹیچروں کی اردو جماعتوں میں تعیناتی ہر دو زبانوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔

● محفل خواتین کا " ماہانہ ادبی و شعری اجلاس محترمہ عظمت عبدالقیوم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین اور محترمہ عارفہ عطا اللہ نے علی الترتیب کہانی اور مضمون سنایا۔ عظمت قیوم، مظفر النا ناز، اور نسیم نیازی نے کلام پیش کیا۔ صدر محفل خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی نے محفل کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۴ر جولائی: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جدید نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ حکومت ہند نے ادبی رجحانات اور عصریت پر توسیعی لکچر دیا۔ جناب فضل الرحمٰن ایڈیٹر اردو انسائیکلوپیڈیا نے صدارت کی۔ صدر انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں نے جناب فاروقی اور ترقی اردو بورڈ کی خدمات کو آئینہ دکھایا۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ ادا کیا۔

۵ر جولائی: ادارۂ ادبیات اردو، مرکز خوشنویسی اور ماہنامہ " سب رس " کی طرف سے جناب شمس الرحمٰن فاروقی ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ کا " ایوان اردو " میں پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب محامد علی عباسی نائب صدر ادارہ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم رکن مجلس انتظامی ادارہ اور مدیر اعزازی سب رس نے جناب فاروقی کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حالی کے بعد فاروقی ایسے دانشور ہیں جنہوں نے اپنی ذہانت سے علم و ادب کو نئی سمتوں کا شعور بخشا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا اور مرکز خوشنویسی کی کارکردگی پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے ادارہ کی علمی و ادبی خدمات اور بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زور کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا اور ترقی اردو بورڈ کی نئی اسکیمات پر روشنی ڈالی۔ موصوف کو ادارہ کی کتابوں کا سیٹ نذر کیا گیا۔

● جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے نئے ذہن کے معروف افسانہ نویس جناب مظہر الزماں کی کہانیوں کے مجموعے " ہارا ہوا پرندہ " کی رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔

● حیدرآباد لٹریری فورم کی طرف سے جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا خیر مقدم کیا گیا۔ موصوف نے شعر و ادب کے جدید رجحانات اور رفتار ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب یوسف اعظمی نے شکریہ ادا کیا۔

● ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کی

دوروزہ سالانہ کانفرنس کا جناب یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج وصدر اردو اکیڈیمی نے افتتاح کیا اور جنوبی ہند میں اردو کے خوش گوار موقف کا ذکر کرتے ہوئے اردو کے مسائل کے حل کے لیے متحدہ اقدامات پر زور دیا۔ جناب سید مکرم شاہ، صدر ریاستی قانون ساز کونسل نے صدارت کی۔ مسٹر پی گنگا ریڈی وزیر سیول سپلائز، مسٹر کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر، حافظ ابو یوسف صدر مجلس انتظامی اردو اکیڈیمی، مولانا عباس رضوی، مسٹر چندر سری واستو، مسٹر باقر آغا اور مسٹر امان اللہ خاں اراکین اسمبلی نے مخاطب کیا۔ جناب غوث محمد خاں ایڈیٹر فلمی تصویر و معتمد استقبالیہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب اکرام جاوید معتمد عمومی اکیڈیمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس کانفرنس میں کرناٹک، مہاراشٹرا، آندھرا، ٹامل ناڈو، کیرالا اور گوا کے مندوبین کی قابل لحاظ تعداد اور محبان اردو نے شرکت کی۔

۶ جولائی: ساوتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کی جنوبی ہند اردو کانفرنس کے ڈیلی گیٹ سیشن میں جنوبی ریاستوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اردو کو اپنے علاقوں میں ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیں۔ اس موقع پر کئی اور مفید قرار دادیں بھی منظور کی گئیں جن کے بموجب ریڈیو، اور نظم و نسق نیز محکمہ تعلیمات میں اردو کے سلسلے میں وسیع النظر اور انصاف پسندی کے نقطۂ نظر سے اقدامات کیے جانے پر زور دیا گیا ہے۔ مسٹر کے پربھاکر ریڈی ریاستی ڈپٹی اسپیکر نے مندوبین کے اس اجلاس کی صدارت کی۔ اس سیشن کو مسرز پروفیسر جعفر علی (کرناٹک) چندر سری واستو (آندھرا پردیش) آغا اشرف (گوا) ابراہیم خلیل (بنگلور) اور مسٹر وقار الدین ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن نے مخاطب کیا۔ شب میں ایک محفل مشاعرہ جناب شاذ تمکنت لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ چند ایک شعرا نے شرکت کی اور کلام سنایا۔ جناب حسن فرخ نے معتمدی کے فرائض انجام دیے

۷ جولائی: علاقائی زبانوں کے ایک اجتماع میں جو مسٹر بی کشن لال سابق میئر بلدیہ کی صدارت میں منعقد ہوا، مقررین نے اردو زبان کو مراعات دینے کی مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ریاست میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۰ فی صد سے بھی کم ہے اس کے باوجود اردو بولنے والے اس زبان کو دوسری سرکاری زبان کا موقف دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جو قانون سرکاری زبان کے منافی ہے۔ مقررین میں مرہٹی کے پروفیسر باڈیکر، مادھو راؤ اور رام دیو سابق میئر بھی قابل ذکر ہیں۔

۸ جولائی: بزرگ صحافی خلیل عبدالحق (متوفی ۷ جولائی) سابق سب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن کی رحلت پر جناب امجد باغی ایڈیٹر ہفتہ وار نیا آدم نے تعزیتی بیان جاری کرتے ہوئے، مرحوم کی ۴۵ سالہ صحافتی زندگی کے پیش نظر پسماندگان کے گزر بسر کے لیے اردو اکیڈیمی سے مالی امداد کی اپیل کی۔

● دکن کے نامور سخن ور حضرت صفی اورنگ آبادی کی یادگار انجمن دبستان دکن کے سالانہ انتخابات میں مسرز ذکار صدیقی صدر، محمد منظور احمد نائب صدر، شمس الدین تاباں معتمد عمومی اور اراکین میں صالح مصلح حاتی، رؤف رحیم، مجید اللہ صدیقی، اختر یحییٰ جمیل کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۰ جولائی: "بانگ درا پبلی کیشنز" کے زیر اہتمام ماہنامہ "آواز امروز" کے پہلے شمارہ کی رسم اجرا مولانا عباس منصور خراسانی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یہ ماہنامہ جناب کرار حسین کاظمی کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔

۱۳ر جولائی: حیدرآباد کے نادرالکلام شاعر اوج یعقوبی کے دوسرے شعری مجموعہ "غنچۂ لب بستہ" کی رسم اجرا مسٹر جیند سرپواستو ڈائرکٹر و سکریٹری اردو اکیڈیمی نے انجام دی۔ جناب کے ادماتی راؤ اسپیشل آفیسر مجلس بلدیہ نے اس تقریب کی صدارت کی۔ جناب احسن علی مرزا، جناب صادق نقوی اور جناب راز عابدی نے اوج کی شخصیت اور فکر و فن کو خراج تحسین ادا کیا۔ اور جناب بشیر وارثی نے جلسہ کا اہتمام کیا۔ قدیم و جدید مکتب فکر کے شعرا اور محبانِ اردو نے شرکت کی۔

۱۶ر جولائی: جسٹس محمد احمد انصاری صاحب صدر نشین ریاستی اقلیتی کمیشن نے حکومت کو کمیشن کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے اردو سے منصفانہ سلوک روا رکھے جانے اور اقلیتوں کے تہذیبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے انصاف میں کمی پر اپنے احساسات قلم بند کیئے۔

۱۸ر جولائی: اردو اکیڈیمی کے صدر جناب یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج نے راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ مسٹر نیلم سنجیوا ریڈی سے ملاقات کی اور اردو اکیڈیمی کی سرگرمیوں سے متعارف کراتے ہوئے ملک کے سب سے بڑے "مخدوم ادبی انعام" کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ انعام اس سال نامور انقلابی شاعر علی سردار جعفری کو دیا جارہا ہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے مخدوم سے اپنے دیرینہ تعلقات کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ریاست کی چیف منسٹری کے زمانے میں مخدوم سے ان کے مراسم خوشگوار رہے ہیں۔ شری نیلم سنجیوا ریڈی نے مخدوم کو اچھا دوست، مخلص عوامی اور سیاسی رہنما اور ملک کا عظیم شاعر قرار دیا اور ان کے نام سے اس بڑے ایوارڈ کو موسوم کرنے پر اردو اکیڈیمی کو مبارکباد دی۔ مسٹر جیندر سری واستو ڈائرکٹر و سکریٹری اردو اکیڈیمی نے صدر ہند کو اکیڈیمی کی مطبوعات نذر کیں۔

۲۱ر جولائی: جناب غلام صادق الدین معتمد انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد نے ایک بیان میں بتایا کہ شہر میں اردو ذریعہ تعلیم کے ۳۶ ہائی اسکول ہیں اور دس لاکھ اردو بولنے والوں کے تناسب کے پیش نظر ان میں اضافہ کیا جانا چاہیئے۔ صادق صاحب نے اساتذہ، نصابی کتب اور مدارس کی حالت زار پر ارباب تعلیمات کو توجہ دلاتے ہوئے ان کی اصلاح پر توجہ دلائی ہے۔

● پاکستان سے موصولہ اطلاع کے مطابق حیدرآباد کے مشہور شاعر اور خطاط جناب منظر کامل (تاج الخطاط) ۱۶ر جولائی کو کراچی میں رحلت کرگئے۔ منظر کامل چند ماہ پہلے حیدرآباد آئے تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

۲۳ر جولائی: اردو اکیڈیمی کے ریس وینکٹ رام ریڈی میموریل ریسرچ سنٹر میں اردو سے ناواقف بالغوں اور بچوں کے لیے اردو تعلیم کے آغاز کا اعلان نامہ جاری کیا گیا ہے۔

۲۴ر جولائی: گولکنڈہ سوسائٹی کے خبرنامہ کے مطابق "گولکنڈہ اور حیدرآباد کے ثقافتی ورثے" کے موضوع پر اردو، تلگو اور انگریزی میں بین کلیاتی مضمون نویسی کے مقابلہ کا اعلان کیا گیا ہے اور حیدرآباد شہر کے ڈگری کالجوں کے طلبا سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ ۱۵ر ستمبر تک سکریٹری مسٹر زہیر بہار راؤ گولکنڈہ سوسائٹی معرفت ایوانِ اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۴۔ کے پتے پر کالج کے صداقت نامہ کے ساتھ مضامین روانہ کریں۔ سوسائٹی نے ہر زبان میں تین انعامات اول ۲۵۰/ روپے، دوم ۱۵۰/ روپے اور سوم ایک سو روپے ججس کے فیصلوں کے بعد دیے جانے کا اعلان کیا۔

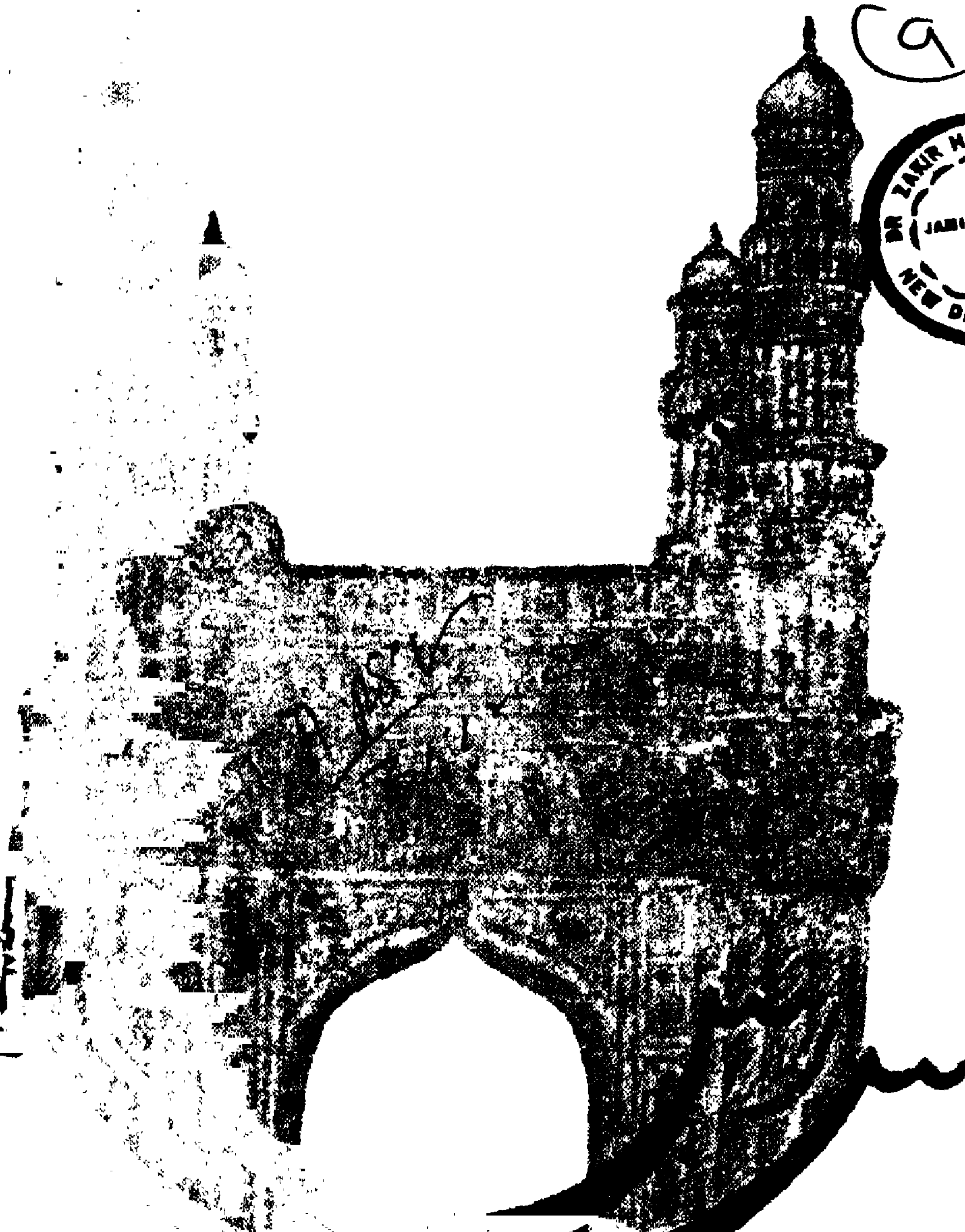
۲۷ر جولائی: ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کو ساوتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کی تاملناڈو یونٹ نے نائب صدر مقرر ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ریاستی اردو اکیڈیمی کی ادبی اور تہذیبی کمیٹی کی صدر اور ایک درجن علمی، تحقیقی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

GUST 1980

R N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

"SABRAS" Urdu Monthly

-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P.)



بریادگارڈاکٹرمحی الدین قادری زورؔ

سن اجرا: ۱۹۳۸ء

فون: ۳۸۲۶۹

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۴ ستمبر ۱۹۸۰ء شمارہ ۹

اریب نمبر

مدیر اعزازی ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر وقار خلیل

ادارہ ادبیات اردو ○ پنجہ گٹہ ○ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے

معمولی ڈاک سے
۲۰/- روپئے
کتب خانوں اور اداروں سے
۲۵/- روپئے

سالانہ
رجسٹری سے
۲۵/- روپئے
قیمت اریب نمبر
۲ روپئے

بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان برما سیلون	۸ ڈالر	۱½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔۲

ترتیب

باتیں	ڈاکٹر مغنی تبسم	۲
سلیمان اریب مرحوم	ڈاکٹر عالم خوندمیری	۴
اریب، جدید نظم کا شاعر	شمس الرحمن فاروقی	۷
ناخن کا قرض (خاکہ)	عوض سعید	۱۵
اریب کی نظمیں اور غزلیں	اریب	۲۳
اریب کے خطوط بنام	زبیر رضوی	۳۰
"	عبدالرب عثمانی	
"	عزیز قیسی	
"	محمود ایاز	
"	صفیہ	

اریب کو منظوم خراج عقیدت

شاعر کی موت	بلراج کومل	۴۰
اریب کے نام	ساجدہ زیدی	۴۱
ماتم اک شہر آرزو	حمید الماس	۴۲
اریب صاحب کی یادیں	عادل منصوری	۴۲

——(نقد و نظر)——

نئی کتابوں پر تبصرے	وقار خلیل	۴۳

——(اُردو نامہ)——

حیدرآباد کی ادبی خبریں	وقار خلیل	۴۵

باتیں

سب رس کا یہ شمارہ سلیمان اریب کی برسی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے۔ سلیمان اریب مرحوم کو ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور رسالۂ سب رس سے جو تعلق رہا ہے اس کے پیشِ نظر ہم اپنے حقیر نذرانۂ عقیدت کے طور پر یہ نمبر شائع کر رہے ہیں۔

سلیمان اریب ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے بعض اشاعتی کاموں میں زور صاحب کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔ مختصر تاریخ ادبِ اُردو کی ترتیب میں بھی انھوں نے مدد دی تھی اور اس کتاب کا اشاریہ مرتب کیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ رسالۂ سب رس کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انھوں نے نہ صرف اس رسالہ کے معیار کو بلند کیا بلکہ اس کو ہم عصر ادبی تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا۔ پھر انھوں نے خود اپنا رسالہ "ماہنامہ صبا"، جاری کیا جس کا شمار برصغیر کے گنے چنے معیاری ادبی جرائد میں ہوتا تھا۔

سلیمان اریب ایک عرصہ تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ان کے سیاسی خیالات میں آخر وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن جہاں تک ادب کا تعلق ہے وہ اسے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کے حامی نہیں رہے تھے اور ادبی معیارات کو اہمیت دینے لگے تھے۔ اپنی شاعری اور اپنے رسالے "صبا" کے ذریعے انھوں نے ادب کے جدید تر رجحانات کو فروغ دینے میں اہم حصہ لیا۔ وہ نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بہت سے ادیب اور شاعر جو آج ادبی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں پہلی بار "صبا" ہی کے ذریعے متعارف ہوئے۔

ڈاکٹر زور اور مخدوم محی الدین کے بعد اریب ہی کی شخصیت ایسی تھی جس نے حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی پر گہرے اور ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے اطراف لکھنے والوں کا اچھا خاصا حلقہ پیدا کرلیا تھا جس میں نوجوان اور پختہ کار، ترقی پسند اور جدید سبھی طرح کے ادیب اور شاعر شامل تھے۔

اریب ایک بڑے شاعر اور اچھے نثر نگار تھے۔ وفات سے چند برس قبل ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ میں نمایاں تغیر آچلا تھا۔ آخری چند برسوں میں انھوں نے جو نظمیں اور غزلیں کہیں۔ ان سے نہ صرف اریب کا شاعرانہ مرتبہ بلند ہوا بلکہ جدید اردو شاعری کی وقعت میں بھی اضافہ ہوا۔ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں اریب نے مختصر کہانیاں بھی لکھی تھیں جو سب رس اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ پھر انھوں نے افسانہ نگاری ترک کردی اور نثر کی کسی صنف میں تخلیقی کام نہیں کیا لیکن خطوط کی شکل میں وہ اپنی خوبصورت اور دل آویز نثر کا گراں قدر سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔

اریب کی وفات کے بعد ارادہ تھا کہ صبا کا اریب نمبر شائع کیا جائے لیکن ناساعد حالات میں اس رسالہ کو بند کردینا پڑا۔ اریب نمبر کے لیے برصغیر کے بہت سے ممتاز نقادوں، ادیبوں اور شاعروں نے مضامین تحریر کیے تھے اور نثر و نظم میں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ صفیہ اریب ان تمام مضامین کو یکجا کرکے کتاب کی صورت میں شائع کررہی ہیں ہم صفیہ اریب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے چند مضامین، نظمیں اور خطوط اس نمبر میں شائع کرنے کے لیے مرحمت فرمائے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ہر سال ماہ ستمبر میں اس کے بانی اور اردو کے ممتاز محقق، نقاد اور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی یاد منائی جاتی ہے۔ اس سال بھی ڈاکٹر زور کی برسی کے موقع پر ۲۸ ستمبر کو یاد زور کا جلسہ مقرر کیا گیا ہے۔ سب رس کا نومبر کا شمارہ زور نمبر ہوگا جس میں یاد زور کے جلسے میں سنائے گئے مضامین بھی شامل رہیں گے۔ ہم تمام اہل قلم اصحاب سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ زور صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر اپنے تاثرات اور مضامین ارسال فرمائیں۔

مغنی تبسم

○ سب رس کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں ہم ایک بار پھر اپنے باذوق قارئین سے اس امر کی خواہش کریں گے کہ وہ سب رس کا زر سالانہ ہر سال پابندی سے روانہ فرمایا کریں۔ اس کے علاوہ ہماری اپنے قارئین سے یہ گزارش ہے کہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں کم از کم سب رس کے دو خریدار فراہم کرکے اس قدیم ادبی رسالہ کو اپنا تعاون دیں۔ آج کل کتابت، طباعت اور کاغذ کے مصارف اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ خالص علمی، ادبی اور ریسرچ میگزین کو باقاعدگی سے شائع کرنا جوئے شیر لانے کے مصداق ہوگیا ہے۔

(ادارہ)

ڈاکٹر عالم خوندمیری

سلیمان اریب مرحوم

پچھلے سال مئی کے مہینہ میں جب اریب پر کینسر کا پہلا حملہ ہوا۔ میں حیدرآباد سے کافی دور تھا۔ ایک خط سے اس مرض اور اریب کے علاج کا علم ہوا میرے مزاج پرسی کے خط کا جواب دیتے ہوئے۔ اریب نے لکھا تھا آج سے سوا ڈیڑھ سال میں میں نے ایک نظم لکھی تھی وہ نظم تم نے یقیناً پڑھی ہوگی لیکن دوبارہ پڑھو۔

گلا رندھا ہو تو ہم بات کر نہیں سکتے
اشاروں اور کنایوں سے اپنے مطلب کو
بجائے کانوں کے آنکھوں پر تھوپ دیتے ہیں
گلا جو صاف تو کیا تیر ہم نے مارا تھا
یہی کہ نام کمایا تھا یاوہ گوئی میں
غزل سرائی میں یا فلسفہ طرازی میں
مگر وہ بات جو سچ ہے ابھی گلے میں ہے۔
گلا رندھا ہو گلا صاف ہو تو فرق ہی کیا؟
اور بتاؤ کہ اس اتفاق کی کیا تاویل ہو سکتی ہے جو
یا ہم جیسے چھوٹے شاعروں پر بھی "القا و الہام" کا نزول
ہوتا ہے؟"

"القا اور الہام" کے جو بھی حدود ہوں اس بات پر شک کرنا مشکل ہے کہ اریب نے موت سے بہت پہلے اپنے مستقبل کو دیکھ لیا تھا۔ یقین نہ کرنا مشکل ہے کہ اریب نے یہ نظم موت کے اندھیرے میں نہیں لکھی دیکھنے والوں کے لئے موت یک دم اور اچانک نازل ہوتی ہے لیکن شاید موت کا شکار اپنے قلب کی آنکھوں سے موت کے بھیانک چہرے کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کے قدموں کی آہٹ سن لیتا ہے۔ اریب کا کمال یہ تھا کہ ان لمحات میں جب موت دور تھی۔ اور جب موت قریب آئی، انہوں نے موت کی وحشت محسوس نہیں کی یا کم از کم اس وحشت کا اظہار نہیں کیا۔ شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں ایک عرصہ پہلے زندگی کا عرفان حاصل ہو گیا تھا۔ پندرہ سولہ برس پہلے انہوں نے ایک شعر کہا تھا

گذر رہا ہوں مسلسل اک ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

زندگی کی آگہی کے بغیر اس قسم کا شعر کہنا مشکل ہے اریب زندگی اور شاعری دونوں کے بارے میں متانت کا شکار نہیں رہے۔ متانت اصل میں ایک نقاب ہوتی ہے جسے کرہ چہرے کے لوگ اوڑھ لیتے ہیں۔ اریب کی

زبان ہمیشہ ان کے دل کی رفیق رہی اسی لئے ایک عنفری معصومیت ان کے چہرے پر جھلکتی رہی انھیں متانت کے نقاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بد قسمتی سے ہمارا سماج ایسے ہی افراد کو اہمیت دیتا ہے۔ جو متانت کا نقاب اوڑھے رہتے ہیں شائد اس لئے کہ ہم دنیا میں گھرے ہوئے لوگ بے ریائی اور معصومیت کی تاب لا سکتے۔ ادیب اپنی پوری زندگی میں اس چیز کے دشمن رہے جسے انگریزی میں (HUMBUG) کہتے ہیں پچھلے تین چار برسوں کی نظموں اور غزلوں میں انکا یہ رویہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے، مثال کے طور پر ان کی نظمیں "تم کس سے ملنے آئے ہو" "قاتل بے چہرہ" "لا یعنیت" "یہ ہاتھ" اور "تخلیق کی مجبوری" میرے اس بیان کی تصدیق فراہم کرتی ہیں۔ ادیب ان چند حساس شاعروں میں تھے۔ جنہوں نے اپنی فکر سے نہیں (کیوں کہ فکر بھی اکثر صورتوں میں HUM BUG ہوتی ہے) بلکہ اپنی بصیرت سے اس بات کا عرفان حاصل کر لیا تھا۔ کہ اقدار کے نراج (ANARCHY) کے اس دور میں عرصۂ زیست میں خود کو بچائے رکھنا "زندگی کا سب سے بڑا کمال ہے۔ آج ان کی موت کے بعد ان کے رفیق اور دوست یہ جانتے ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت اور جرأت سے خود کو بچائے رکھا وہ جانتے تھے کہ ایک کارِ نادر ہے اور زندگی جتنی طویل ہوگی یہ کام مشکل تر ہوتا جائے گا۔ ان کی ایک نظم "ایک صدی ایک پل" ان کے اس آگہی کا اظہار ہے ؎

ستر سال بہت ہوتے ہیں
کون جئے ستر صدیوں تک
اپنے ہی کاندھوں پہ اٹھائے
اپنا لاشہ
کون پھرے ستر لمحوں تک
ستر سال بہت ہوتے ہیں

یہ موت کی مریضانہ خواہش نہیں ہے اور نہ زندگی سے فرار کی علامت ہے۔ بلکہ زندگی کی رائیگانی کا یہ احساس زندگی کے گہرے شعور سے حاصل ہوتا ہے۔ متانت کے عہد میں زندگی سے معصوما دپیار آسان تھا لیکن ایک عصری ذہن جو شدتِ احساس سے مالا مال ہو، زندگی سے چمٹا رہنا آسان نہیں۔ علالت کے دوران ان کا احتیاط سے گریز، اس شبہ کو تقویت دیتا تھا کہ شائد ادیب خواہشِ مرگ کا شکار ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کی معصوم مسکراہٹ اس شبہ کو دور کر دیتی اور یہ محسوس ہوتا کہ یہ خواہشِ مرگ نہیں بلکہ ایک قلندر کی زندگی سے بے نیازی ہے۔ زندگی سے اس قلندرانہ بے نیازی کا اثر تھا کہ ادیب اپنی نوجوانی میں اپنے عہد کی سب سے زیادہ معنی خیز تحریک سے پُر جوش طریقے پر وابستہ ہو گئے ان کا شاعرانہ مزاج سیاست سے (جس معنی میں یہ لفظ مستعمل ہے) دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن زندگی کو بامعنیٰ بنانے کی خواہش نے انہیں انقلابی تحریک سے قریب کر دیا۔ ہر قسم کے "HUMBUG" سے ان کی نفرت ان کی والہانہ وابستگی کی رہنما تھی۔ اور جب تک وہ تحریک سے وابستہ رہے سرشار رہے، پُر جوش نظمیں لکھیں، عوام کو سنائیں اور ایک دن چپکے سے جیل پہونچا دیئے گئے۔ اس قلندرانہ شان سے ڈیڑھ سال جیل میں رہے اور جب رہا ہوئے تو ایسے کہ جیسے کوئی بڑا کام نہیں کیا تھا کسی خیر مقدمی تقریب کی تمنا کی اور نہ اس کے لئے کسی سے کہا سنا، دو تین برس بعد طلبا، پرانے ساتھی گروپ

چلائی گئی اس قلندرانہ انداز سے ادیب احتجاجی جلسے میں پہونچ گئے۔ ایک نظم سنائی، دوسرے دن پھر ایک بار جیل پہونچ گئے چار پانچ مہینے جیل میں قیام کیا، چلے آئے وہی بے نیازی اور وہی معصومانہ مسکراہٹ، نہ جلسہ نہ جلوس، کبھی زندہ باد کا نعرہ سنا اور نہ کبھی کسی اہم شخصیت نے ان کی جیل یاترا کی نوٹس لی جیسے ایک فرض تھا، انجام دیدیا، ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا، امن کمیٹی PEACE COMMITEE کے سکریٹری رہے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے سرگرم رکن رہے! درجن دنوں حالات ناسازگار تھے عوامی ادیبوں کی انجمن کے سربراہ رہے۔ اس پورے دور میں اس یقین سے سرشار رہے کہ "انسان مر نہیں سکتا"۔ یہی یقین ان کا سرمایۂ حیات رہا تحریک کو جتنا بھی دے سکتے تھے دیا۔ کبھی مانگا نہیں۔ جس طرح چپکے سے اس قافلے میں شامل ہوئے تھے اسی انداز سے ایک موڑ پہ الگ بھی گئے۔ لیکن کسی نہ کسی انداز سے اپنی وابستگی کو قائم رکھا اور وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے کی زندہ تصویر بن گئے۔ ان کی وفاداری پر شک کرنا ایک قسم کی بد عہدی ہوگی۔ انسان سے ان کا رشتہ استوار رہا ہے۔ وابستگی کی باتیں کرتے رہے لیکن احمدآباد کے فسادات پر ادیب نے ایک بھرپور احتجاج کیا اور مرنے سے چند ہی مہینے پہلے پھر ایک بار اقدار سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا ادیب نے حکیم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن ایک "مرد حکیم" کی خودشناسی کا ہمیشہ ثبوت دیا۔ فرزانگی کی اس سے بڑی علامت اور کیا ہوگی کہ ہوش مندی کے عالم میں کبھی قدم نہیں لڑکھڑائے اور رفیقوں سے غصہ کا اظہار کبھی نہیں کیا بعض لوگ مستی کے عالم میں رونے ہیں اور ہوشمندی میں اپنوں ہی سے جھگڑتے ہیں۔ لیکن ادیب کا رنگ دوسرا

تماشہ

شراب پی کے یہ احساس مجھ کو ہوتا ہے۔
کہ جیسے میں ہی تماشوں میں ایک قاتل ہوں
اور ایسا قاتل بے چہرہ جس کو صدیوں سے
زمانہ ڈھونڈھ رہا ہے۔
مگر نہیں ملتا۔

یہ خود ملامتی یا خود تادیبی کی کیفیت نہیں بلکہ یہ ان کا یہ "میں" ہر ہوشمند کو "مشاہدۂ نفس" کی دعوت دیتا ہے۔ یہ میں صیغۂ واحد متکلم نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ صیغۂ واحد متکلم کا سنجیدہ استعمال ایک قسم کی نرگسیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن ادیب کے جاننے والے اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ نرگسیت کا شکار نہیں رہے۔ نرگسیت کا شکار زمانہ کے ساتھ حرکت نہیں کرتا بلکہ اپنے حال کے لمحہ میں منجمد ہو جاتا ہے۔ ادیب کی شخصیت کبھی منجمد نہیں ہوئی اور اسی لئے ان کی شاعری ہر دور میں اپنے لئے ایک نیا راستہ ڈھونڈھتی رہی۔ ایک جذباتی سطح پر رومانی شاعر کی حیثیت سے انہوں نے شاعری شروع کی لیکن بہت جلد اس سطحی رومانیت سے آزاد ہوگئے اور انقلابی شاعری کی جب گمان ہوا کہ شائد تکرار ہونے لگے غزل کی جانب متوجہ ہوئے اور جدید غزل کے اچھے نمونے پیش کئے۔ ان کی شاعرانہ جبلت نے پھر ایک بار ادیبوں کی اور اپنی زندگی اور شاعری کے آخری دور میں ایک نئی سمت کی تلاش کرلی۔ ایک دیدہ ور نقاد محمود ایاز کے الفاظ میں گزشتہ چار پانچ سال سے ان کی شاعری میں جو نیا موڑ آیا تھا۔ اس نے اہل نظر کو چونکا دیا تھا۔ لیکن اس ستم کو کیا کیجئے کہ اہل نظر ایک ناقابل لحاظ اقلیت ہیں

بقیہ صفحہ پر دیکھیے

شمس الرحمٰن فاروقی

اریب — جدید نظم کا شاعر

میں اپنی عادت کے خلاف یہ مضمون ایک مغربی نقاد کے قول سے شروع کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس میں کچھ ایسی باتوں کا تذکرہ ہے جن پر اردو کے نقادوں نے پچھلے دنوں نسبتاً کم توجہ کی ہے۔

> بڑی چھان بین یا عمل کا ہر خط اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ہم ان تنقیدی مسائل کی طرف واپس جائیں جو وہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ آخری تجزیے میں وہ مسائل مابعد الطبعیاتی ثابت ہوتے ہیں اور مابعد الطبعیاتی انتخابات اور تفتیش کو ہمارے روبرو کر دیتے ہیں۔ چاہے ہم انھیں مابعد الطبعیاتی مانیں یا نہ مانیں، مابعد الطبعیات کو پسند کریں یا نہ کریں۔ انسان کس طرح کا ذی وجود ہے وہ کس طرح کی دنیا میں اپنا وجود رکھتا ہے، انسانی زندگی اگر کوئی معنی رکھتی ہے تو وہ کیا ہے، یہ سب مانتے ہوئے مابعد الطبعیاتی سوالات ہیں۔ [ادب کا مطالعہ دراصل اس کے "کافی" ہونے کا مطالعہ ہے۔] کافی ہونے کی اس حیثیت کو آسانی کے لیے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔ (۱) اظہار کا کافی ہونا۔ (۲) [ادیب اور ادب کا] اپنے پورے [آفاقی] تناظر میں کافی ہونا۔
>
> (والٹراشائن، تنقید بطور مکالمہ)

مجھے اس بات سے فی الحال کوئی بحث نہیں ہے۔ منقولہ بالا بنیادوں پر جو تنقیدی عمارت والٹراشائن نے کھڑی کی ہے وہ کس حد تک مضبوط ہے۔ ممکن ہے مجھے اس سے پوری طرح اتفاق ہی نہ ہو۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ ادب کا مطالعہ کرتے وقت ان بڑے مسائل کو نظر انداز کر دینا، جن کا وجود یا عدم وجود اس ادب پارے کا خلاصہ ہے، کبھی کبھی غلط فہمی کا بھی باعث بن سکتا ہے۔ ادب فہمی کے سلسلے میں معنی کی جس اہمیت پر میں اکثر اظہار خیال کرتا رہا ہوں، اس میں ایک بڑا حصہ اس معنوی اہمیت کا بھی ہے جو ادب پارے میں اٹھائے ہوئے سوالوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اظہار کا کافی ہونا

دراصل خود بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے (جسے اشائن نے ٹکراؤ یا آمنا سامنا ہونے کی کیفیت کا نام دیا ہے) وہ زندگی کے بارے میں ہمارے تجربے کو وسیع تر کرے، پہلے سے زیادہ تونگر بنائے اور زندگی فہمی کی ایک اہم منزل ہو۔ کسی ادب پارے میں صرف تنہائی یا بے زاری یا انسان دوستی یا علوہمتی یا شہری زندگی کی کش مکش یا صنعتی انقلاب کی حشر سامانیوں کا ذکر کافی نہیں۔ ان چیزوں کے نہ ہونے پر بھی ادب کی تخلیق ممکن ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ ٹکراؤ ENCONT اور آمنا سامنا EXPOSUSE اصلی ہو۔ ادب پارے کا اپنے آفاقی تناظر میں کافی ہونا ایک مابعد الطبعیاتی صورت حال ہے جس کے اظہار کے لیے کسی بھی بڑے شاعر، مثلاً غالب، اقبال کا حوالہ کافی ہوگا۔ اگر کسی تحریر یا تحریروں کے کسی مجموعے کو پڑھ کر یہ محسوس ہو کہ شاعر نے کچھ تجربات کا اظہار کیا ہے لیکن ان کے تضادات، کشاکشوں اور ناممکن اشاروں کو پوری طرح حل نہیں کر سکا ہے تو گویا وہ اپنے آفاقی تناظر میں کافی نہیں ہے۔ وہ ادب پارہ جس میں کسی نہ کسی طرح تمام تجربات کی تطبیق نہ ہو، ناممکن اور ناکافی ہے۔

میرے خیال میں اس بات کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ ہماری تنقید عام طور پر ان مسائل سے گریز کرتی رہی ہے جو میں نے اوپر مختصر آپیش کئے ہیں۔ کسی بھی شخصی کارنامے کی تعین قدر کرتے وقت ان سوالوں سے گریز ممکن نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں فرداً فرداً ادیبوں کے مطالعے نہایت ناکافی اور غیر مربوط رہے ہیں۔ یا تو ہم نے ان سماجی اور سیاسی حالات سے بحث کی ہے جن کا ہمارے خیال میں شاعر یا افسانہ نگار نے اثر قبول کیا ہے، یا پھر ہم نے اس کے موضوعات و انداز بیان پر عمومی باتیں کہہ دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ہی عہد میں رہنے والے لیکن مختلف المزاج شعرا پر ایک ہی طرح کی تنقید لکھی گئی ہے۔ اس سے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کسی ایسے شاعر کا مطالعہ کرنا پڑا ہے جس کے یہاں ارتقا کی ایک واضح لکیر نظر آتی ہے۔ مثلاً اریب کے بارے میں سب جانتے اور کہتے ہیں کہ وہ ترقی پسند ادب کے نعرہ بازی اور خارجی اسلوب سے گریز کر کے اس اسلوب کی طرف آئے جسے جدید کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس گریز نے ان کی شاعری میں کون سے اقداری QUALITATIVE تغیرات پیدا کئے، ان تغیرات کی روشنی میں پرکھا جائے تو کس قسم کے انسان کی تصویر بنتی ہے، ان سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔ صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا کہ اریب کے دور دوم کی شاعری میں اظہار ذات اور حیات و کائنات کے حائل، دونوں سے الجھنے کے آثار ملتے ہیں۔ صرف یہ کہنا بھی کافی نہیں کہ دور دوم کی نظموں میں جدید حسیت لفظیات اور طرز فکر ملتا ہے۔ یہ کہہ لینا بھی کافی نہیں کہ ان کی جدید شاعری میں احساس کی شدت اور جذبے کی نزاکت کی وہ فضا ملتی ہے جو روایتی ترقی پسند شاعری میں مفقود ہے۔ یہ باتیں تو ہم ذرا سے الٹ پھیر کے ساتھ سب ہی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں (یا آج کل کے تنقیدی معیاروں کو دیکھتے ہوئے کم سے کم ان لوگوں کے بارے میں، جن سے ہم ناراض نہیں ہیں)۔ بڑا سوال یہی رہتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد اریب کی شاعری کن مابعد الطبعیاتی سوالوں سے الجھتی ہے، کن تجربات کا اظہار کرتی ہے، اور وہ ان تجربات کو پوری طرح انگیز کرنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ نہیں؟

اریب کے مزاج کو رومانی کہا گیا ہے، اور اس خیال میں خاصی صداقت بھی ہے۔ "رسوائی" اور "آشفتگی" سے انھیں جس درجہ شغف تھا، اس کی روشنی میں یہ نتیجہ یقیناً نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے مزاج میں ایک روایتی قسم کی رومانیت

تھی اپنے اور دوسروں کے بارے میں اس قسم کے الفاظ لکھ کر وہ شاید خود کو رومانی ہیرو یا کم سے کم رومانی داستانوں کے ہیرو سے مشابہ سمجھتے تھے۔

بے گھری مجھ سے پتہ پوچھ رہی ہے میرا — دربدر پوچھتا پھرتا ہوں کہاں جاؤں میں

تری جدائی کو رسوائے عام کردوں گا — یہ میری نہیں خود آگہی تو دے مجھ کو

چلو کہ تھوڑی سی رسوائی مول لے آئیں
کہ ہم ہیں سودائی

میں کہ دنیائے ہوس میں بھی سرافراز رہا — کام آ ہی گئی آخر مری آشفتہ سری

یہ تو میں خود ہوں وہ احمق جس کی
اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے

نہ جانے کتنی دفعہ اور قتل ہونا ہے
مجھے یہ پاسِ دگر

لیکن یہ رومانی مزاج اگر صرف اس طرح کی خود فریبی آمیز جرأت مندی تک محدود ہوتا تو اریب کی شاعری مجاز کی طرح جھوٹے گونٹے کی شاعری ہوتی جس کا جادو آج چلنا مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اریب کے رومانی مزاج ہی نے ان کو حیات و کائنات کے ان مسائل کی طرف متوجہ کیا جن کا ذکر ہمارے نقاد گول مول الفاظ میں کرتے آئے ہیں۔ رومانی مزاج کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو خود ترحمی کی طرف مائل ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف اس میں اخلاقی جرأت بھی ہوتی ہے جو اسے نہ صرف سوالوں کی طرف اکساتی ہے، پوچھنے اور چھیڑنے پر مجبور کرتی ہے، بلکہ خود ترحمی کو دبائے بھی رہتی ہے۔ رومانی شاعروں پر گوئٹے کا مشہور طنز کہ وہ اس طرح لکھتے تھے گویا ساری دنیا ایک ہسپتال ہو اور وہ سب مریض ہوں، مغرب سے زیادہ اردو کے ان ہیچ پوچ شاعروں پر صادق آتا ہے جن پر سطحی تنقیدیں لکھ کر ڈاکٹر محمد حسن جیسے لوگوں نے اردو ادب میں رومانوی تحریک جیسی کوئی چیز دریافت کرلی ہے۔ اریب کی رومانیت کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ خود ترحمی سے محفوظ ہے، کیوں کہ ان کی اخلاقی جرأت اور ان کا مستفسر ذہن انھیں یا تو طنز کی طرف لے جاتا ہے یا ایک ایسی واقفیت کی طرف جس سے خود ترحمی کے علاوہ خود کو DRAMATIZE کرنے کی جبلت ہی کا اخراج ہوچکا ہے۔ خود کو DRAMATIZE کرنے کی

بیلت تو پھر بھی کہیں کہیں اوپر آجاتی ہے (جیسا کہ "رسوا" والی مثالوں سے واضح ہوا ہوگا) لیکن خود ترحمی کا اظہار شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔

کسی شاعر کی اخلاقی جرأت کیا ہے؟ ہم میں اور شاعر میں کیا فرق ہے؟ اگر میں اپنی کمزوریوں کو سمجھ لوں یا انھیں بیان کردوں یا اگر کوئی شخص میرے بارے میں کوئی ایسی خوش فہمی رکھے جس کا میں اہل نہیں ہوں اور میں اس کا دعویٰ کا فور کردوں تو میں اخلاقی جرأت کا حامل ٹھہروں گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس جرأت کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ممکن مجھ میں اس طرح کی جرأت کا فقدان ہو، لیکن پھر بھی میں اچھا شاعر ہوں۔ ممکن ہے مجھ میں اس طرح کی جرأت کوٹ کوٹ کر بھری ہو، لیکن پھر بھی میں اچھا شاعر کیا، شاعر ہی نہ ہوں۔ شاعرانہ اخلاقی جرأت سے مراد یہ ہے کہ شاعر زندگی کے ان مسائل سے آنکھ ملانا سیکھے جو اس نے خود چھیڑے ہیں، کیوں کہ شاعر کو یہ حق ہے کہ وہ صرف انھی مسائل کو اٹھائے جن کے ذریعہ اس کے ذہن میں کوئی تخیلی تحریک پیدا ہوتی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ہر شاعر ہر مسئلے پر اظہار خیال ہی کرے۔ مسائل کے امکانات کو کھنگالنے کی جرأت والے مسئلے کو چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار "فسانۂ آزاد" میں ہندوستان (یعنی اودھ) کی مائل انحطاط تہذیب کا مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اس کی تمام کمزوریوں سے واقف ہیں۔ اس کے کونے کونے میں جمی ہوئی گرد کے ذرے ذرے پر ان کی نظر ہے۔ نوابوں، چور اچکوں، مولویوں، مرغ بازوں، افیون بازوں، پیری مریدی کا دھندا کرنے والوں، ان سب کی اصلیت سے وہ خوب واقف ہیں۔ نوجوان نسل کی اخلاقی پستی، ان میں عمل اور ہمت کی کمی، یہ سب انھیں بخوبی معلوم ہیں۔ لیکن وہ ان کی تصویر کشی نیم دلی سے کرتے ہیں، اشخاص کا تجزیہ نہیں کرتے (سوائے آغاز داستان کے رنگے سیار کا، اور وہ بھی بہت عمومی ہے) وہ صرف TYPES کا بیان کرتے ہیں، افراد و واقعات کی کشاکش اور ان کی پیچیدگیوں کو وہ نظر انداز کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک بہت جاندار، چلتی پھرتی بولتی تصویر تو ہمارے سامنے آجاتی ہے، لیکن باتیں صرف سطحی ہاتھ آتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مزاح نگار تھے۔ وہ دراصل ایک دلچسپ قصہ کہہ رہے تھے، ان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہ تھا۔ اول تو یہ دلیل بالکل بے معنی ہے، کیوں کہ جب آپ کسی تحریر کو اہم ادبی تحریر سمجھ کر پڑھتے ہیں تو یہ کہنے کے مجاز نہیں رہ جاتے کہ یہ تحریر اہم تو ہے، لیکن ہم اس کا مطالعہ صرف اس طرح کریں گے کہ یہ محض تفریحی افسانہ معلوم ہو، کیوں کہ اس کی اہمیت اور وجہوں سے ہے۔ اس معیار سے پرکھتے تو دنیا کے کسی ادب کا سنجیدہ مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال سرشار نے اپنے کرداروں کے ذریعہ جن مسائل کو ہمارے سامنے اٹھایا ہے ان کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ نفسیاتی حقائق کی طرح ہمارے سامنے آئیں، محض ایک سطحی روداد کی طرح نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سرشار کا اصل مقصد تو تفریح مہیا کرنا تھا۔ تفریح مہیا کرنا تو ڈکنس کا بھی اصل مقصد تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈکنس کی دنیا صرف کاغذ ہی پر زندہ ہوتی ہے، ذہنوں میں نہیں۔ سرشار میں اخلاقی جرأت کی کمی تھی، ان کا ذہن صرف ایک طرف متوجہ ہوتا تھا، وہ یہ کہ میاں آزاد پر زیادہ سے زیادہ عورتوں کو عاشق ہونے کے مواقع فراہم کریں۔ اخلاقی جرأت کی اس کمی کی دوسری مثال برنارڈ شا کے یہاں ملتی ہے جب وہ بار بار پہلے سے طے شدہ مفروضوں کی خاطر المیاتی امکانات کو قربان کر دیتا ہے۔ المیاتی امکان سے مراد یہ نہیں ہے کہ برنارڈ شا

اپنے کرداروں کو مرنے کا موقع نہیں دیتا (اگر مرنے کے مواقع کی تلاش ہے تو عبدالحلیم شرر کی "خوف ناک محبت" پڑھیے، جس میں ہر قابلِ ذکر کردار کسی نہ کسی بھیانک موت کا شکار ہوتا ہے)، بلکہ یہ کہ وہ اپنے کرداروں کا انجام اپنے فرادی عقائد کی روشنی میں ترتیب دیتا ہے۔

ادیب کا رومانی مزاج انھیں احتساب پر آمادہ کرتا ہے، لیکن یہ احتساب صرف اس حد تک نہیں رہ جاتا کہ شاعر اپنے کو لعنت ملامت کرے۔ ادیب شاعرانہ اخلاقی جرأت کو کام میں لاکر اپنے الیے کو محض ایک حادثہ نہیں، بلکہ ایک مابعد الطبیعاتی حقیقت بنا دیتے ہیں۔ والٹر اشائن نے کیا عمدہ بات کہی ہے:

> جہاں کوئی آفاقی تطبیق RECONCILIOTION پر نہیں ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا المیاتی ماورائی عمل ہوتا ہے، وہاں صرف المیاتی مسئلہ رہ جاتا ہے..... جو دراصل (شاعر کی) المیاتی قوت کی ناکامی کی دلیل ہے۔

یہ المیاتی ماورائی عمل دیکھنا ہو تو ادیب کی نظم "ڈیپ فریز" پڑھیے، جس میں المیہ نہ صرف ادیب کی ناکامی ہے، نہ صرف "جدید انسان" کی (جس کا ذکر بعض لوگوں نے اس قدر کیا ہے کہ وحشت ہونے لگی ہے)، بلکہ صرف انسان کی ناکامی ہے، جو مسائل کے سامنے پنپ نہیں پاتا، جس کی زندگی پرائی ہے، اس قدر پرائی کہ جھوٹی معلوم ہوتی ہے اس کے ہاتھ پاؤں ایک SUSPENDED ANIMATION میں گرفتار ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی جنسی بھوک اپنی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ جنسی بھوک بھی مراجعت کی علامت ہے، اب اس میں نہ بھوک ہے نہ جنس، بلکہ صرف پناہ گزینی اور شکست خوردگی ہے۔ "ڈیپ فریز" کا "میں" سلیمان ادیب نہیں ہے، شمس الرحمن فاروقی نہیں ہے، اکبر اور اشوک بھی نہیں ہے، وہ صرف ایک معمولی روح ہے جو قبل التاریخ کے آدم میں بھی تھی جب وہ غاروں میں رہتا تھا، اور آج کے انسان میں بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج وہ روح ناطق ہو گئی ہے اور اپنا تجزیہ کر سکتی ہے اور اس طرح جدید انسان کی علامت بھی بن گئی ہے:

رات گئے جب گھر آتا ہوں
کانچ کی آنکھیں
پتھر کے دانتوں کا چوکا
بندر کا دل
عضوِ تناسل لیکن اپنا ـــ
سارے اعضا ایک اک کر کے ڈیپ فریز میں رکھ دیتا ہوں
اور بیوی کی گود میں چھپ کر سو جاتا ہوں

ڈیپ فریز جیسی سچی اور تلخ نظمیں اردو میں کم لکھی گئی ہیں، اور ان کے پڑھنے والے اور بھی کم ہیں۔ مجھے اس پر حیرت نہیں ہے کہ ماہنامہ "کتاب لکھنو" کے "گوشۂ ادیب" میں ڈیپ فریز کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اگر وحید اختر نے اپنے مضمون میں

اس نظم کا تفصیلی حوالہ اور مختصر تجزیہ نہ کیا ہوتا تو شاید آج بھی بہت سے پڑھنے والے اس سے بے خبر رہتے۔ گوشۂ اریب میں ڈیپ فریز کو نہ پاکر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ المیاتی امکانات کے ماورائی عمل اور ان کی مابعد الطبعیاتی تطبیق سے خوف کھانے والے برناڈ شاہ کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں۔

"کڑوی خوش بو" اریب کی آخری نظم ہے۔ یہاں بھی اس اخلاقی جرأت کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس کے بغیر بیشتر ساری شاعری خود ترحمی اور CLAUSTROPHABIA کا شکار ہوجاتی ہے۔ نظم سے آخری دو مصرعے کم کردیے جائیں تو یہ ایک عام قسم کی محرومی آمیز اور شکست خوردہ نظم ہوجاتی ہے، یعنی ایسی نظم جس پر ہمارے قاری اور نقاد اب تک سر دھن سکتے ہیں۔ نظم میں طنز یا ہمت کا کوئی بھی بعد DIMENSION نہ رہ جاتا، خوف آگیں امکانات کی طرف کوئی اشارہ نہ ملتا، سب لوگ خوش ہوتے کہ ہائے کیا درد بھری نظم ہے۔ جب کوئی جرأت مندانہ بات ہی نہیں کہی گئی تو خوف کاہے کا؟ لیکن چھپکلی اور اس کی کٹی دم کے تذکرے نے نظم کی سطح کو خود ترحمی اور شکست خوردگی سے اٹھا کر اس کا مقام وہاں متعین کردیا ہے جہاں شاعری زخم جگر اور سوہان روح نہیں، بلکہ محض ایک خاموش تاثر ہوجاتی ہے جس میں گھبراہٹ، اعصابی اضمحلال اور ہسٹریا کا کوئی ذکر نہیں ہوتا:

اب بھی ہنگامہ بپا ہے ہر سو
شام سے صبح مگر کیسے ہو
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے
زہر کی لہر ہے یا موت کی کڑوی خوش بو
لحہ لحہ مرے جی جان سے گذر جاتی ہے
پھیڈن لینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے

"موت کی کڑوی خوش بو" کا ہنگامہ خیز پیکر بھی آخری مصرعے کے سپاٹ پن اور غیر شاعرانہ خود ترحمی کے احساس کو نہیں کم کرسکتا۔ غیر شاعرانہ اس وجہ سے کہ یہ مصرعے بالکل نثری بیان ہے، اس میں شاعری کچھ نہیں۔ اگر نظم کامیاب ہوئی بھی ہو تو ایسے مصرعے اسے لے ڈوبیں۔ لیکن آگے چلیے:

زندگی
آج یہ معلوم ہوا
کچھ بھی نہیں

یہ اور بھی نثری بیان ہے، اگرچہ اس میں PETHEDINE جیسی دوا کا فیر اردو نام نہیں ہے جو نظم کی فضا کو (بہ ظاہر) تہ و بالا کردیتا ہے، لیکن یہ تین مصرعے صرف ایک گھسی پٹی بات ہیں۔ جو چیز ان میں زندگی کی رمق ڈالتی ہے وہ ان کا تین ٹکڑے ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے تھکن کا آہنگ بنتا ہے۔ اب آخری دو مصرعے یوں ہیں:

چھپکلی بھی نہیں

ہاں اس کی کٹی دم ہوگی۔

چھپکلی اور اس کی کٹی دم کا تذکرہ ممکن ہے نفاست پسند نقادوں کو برا لگے لیکن ایسے جانور کا نام لینا اور اس سے ایک پیکر خلق کرنا (کریہہ، گھناؤنا، حقیر، بے چارہ، مجبور، مسلسل پھڑپھڑاتی ہوئی ایک چیز، جو صرف اضطراری حرکت میں گرفتار ہے ورنہ دراصل اس میں جان ہے ہی نہیں) خود بھی انتہائی اخلاقی جرأت کی دلیل ہے۔ مگر اصل نکتہ یہ ہے کہ زندگی چھپکلی کی طرح کریہہ اور بدنما بھی نہیں ہے۔ اس کی کٹی دم بھی نہیں ہے جو بدرنگ، گندی اور تڑپنے پھڑکنے پر مجبور ہے۔ زندگی چھپکلی کی کٹی دم ہوگی۔ نکتہ "ہوگی" کے اشتباہ میں ہے۔ زندگی واقعی کیا ہے، یہ فیصلہ نہیں ہوسکا ہے، شاید کبھی نہ ہوسکے گا۔ "ہاں" کہہ کر بطور ایک AFTERTHOUGHT کے کہا گیا ہے کہ شاید یوں ہو۔ ... دم کٹ جانے کے بعد چھپکلی برقرار رہتی ہے کچھ دنوں بعد نئی دم بھی اگا لیتی ہے، لیکن دم خود اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اس کا ہونا نہ ہونا بے معنی ہے۔ اس کی ایک بدقوارہ، گندی چیز ہے، اس کی دم پھر بھی اس کی تکمیل کرتی ہے۔ چھپکلی دم کی تکمیل نہیں کرتی، بلکہ اس سے کٹ کر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ زندگی کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک قبیح اور غلیظ سی چیز ہے جو بے کار تگ و دو میں گرفتار رہتی ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ جس چیز سے وابستہ ہے (انسان، خدا، کائنات) اسے اس کی ضرورت نہیں۔

اریب کا شعری ارتقا جس ماحول میں ہوا تھا اس میں استعارے کی قدر نہیں تھی۔ اس لیے ان کا کلام استعاروں سے نسبتاً خالی ہے۔ اس کے باوجود شخصی اظہار کی بہترین منزلوں (ڈیپ فریز، کڑوی خوش بو، بغضو، قاتل بے چہرہ وغیرہ) میں انھوں نے استعارے کا استعمال بھی کیا۔ لیکن ان کی اصل قوت یہی تھی کہ وہ اپنے کو اندر سے کھنگال کر جس "میں" کے روپ میں پیش کرتے تھے وہ ایک شخص سے زیادہ ایک علامت بن گیا تھا۔ ان کی بیشتر نظموں میں متکلم "میں" ہے ڈیپ فریز اور کڑوی خوش بو کے علاوہ یہ مثالیں دیکھیے:

چلا تھا گھر سے کہ بچے کی فیس دینی تھی　　(خود فراموشی)
میں یہ دیکھ کر کے خوش ہوں کہ یہاں　　(بڑائی)
میں اسے دیکھ کے چپکے سے گزر جاتا ہوں　　(تسکین انا)
شراب پی کے یہ احساس مجھ کو ہوتا ہے　　(قاتل بے چہرہ)
کن حرفوں میں جان ہے میری　　(آخری لفظ، پہلی آواز)
مجھے نہ دیکھو مرے ہاتھ پر نظر رکھو　　(یہ ہاتھ)
میں ہر لمحہ میں سو سو بار جیتا اور مرتا ہوں　　(تمھیں کیا)
میرے باپ نے مرتے دم بھی　　(عرفان)
مجھ سے بس یہ بات کہی تھی۔

ظاہر ہے کہ صیغۂ واحد متکلم کی یہ کثرت محض رسمی یا برائے اظہار نہیں ہے۔ ترقی پسند بوطیقا اور جدید بوطیقا میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ترقی پسند بوطیقا کی رو سے شاعر MOB کا فرد ہے، اور اور جدید بوطیقا کی رو سے شاعر صرف ایک فرد ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے ۔ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق ۔ جدید شاعر اپنی کائنات خود ہے وہ صرف اپنی زبان میں گفتگو کرتا ہے ۔ اریب کے یہاں ابہام اور استعارے کے وہ منازل نہیں تھے جو شعر کو ایک گمراہ اسرار کائنات کے درجے پر پہنچا دیتے ہیں ۔ لیکن ان کی دروں بینی اور انفرادی علامت کا اظہار اریب کی نظموں کو جدید شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے ۔

عوض سعید

ناخن کا قرض

ادیب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ وہ ہندی پرچار سبھا کے آفس کے قریب لاہوتی سے باتیں کرتا ہوا پتہ نہیں کہاں جارہا تھا۔ جب اُسے اس بات کا علم ہوا کہ میں بھی افسانہ نگار ہوں تو اس نے بڑی محبت سے عوامی مصنفین میں مجھے کہانی سنانے کی دعوت دی اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ کہانی اگر زیادہ پسند کی گئی تو وہ اسے شاہراہ کو بھجوا دے گا۔

ابھی زمانے میں حیدرآباد میں عوامی مصنفین کا بڑا زور تھا۔ جو P.W.A کا بدلا ہوا نام تھا۔ جس کا سکریٹری بھی غالباً وہی تھا۔ ماہناموں میں شاہراہ کی بڑی دھوم تھی۔ اور دو ماہی رسالوں میں پرکاش پنڈت کے پرچہ "فنکار" نے اپنے لئے ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ اس نے رخصت ہونے سے قبل پھر ایک بار شاہراہ کے لئے کہانی کی فرمائش کی تو مجھے اس کا یہ سرپرستانہ انداز یک لخت پسند نہ آیا میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔ اب اس قصہ کو رہنے بھی دیجیے کوئی اور بات کیجئے ادیب صاحب۔

بہرحال بات آئی گئی ہوگئی مگر اس نے میری صاف گوئی کا برا نہ مانا نہ میں نے اس کی محبت بھری سفارش کا سہارا لیا لیکن جب بھی وہ مجھ سے ملتا اس سلسلے میں مجھے ضرور چھیڑتا۔

پھر ایک دن میں سبھا کے آفس میں بیٹھا تھا کہ ڈاکیے نے چند ایک پرچوں اور کئی خطوں کے ساتھ ایک لمبا لفافہ بھی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس میں کسی نے اس کی تازہ غزل کی تعریف کی تھی تو کسی نے اُسے مشاعرہ کی قبل از قبل اطلاع دی تھی۔ جب اس نے بڑی دیر تک اس لمبے لفافے کو ہاتھ نہیں لگایا تو مجھے تشویش ہوئی پھر اچانک شاید اُسے یاد آگیا کہ وہ لفافہ چاک کرنا بھول گیا ہے۔ یہ کہانی اقبال متین کی تھی جسے پرکاش پنڈت نے معذرت کے ساتھ واپس کر دی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو اس نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا "یہ کہانی غالباً میں نے نہیں بھجوائی تھی"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نیا دور اور ادب لطیف میں لکھ چکا ہے۔ اور اس نے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھا اور وہ کہانی بالآخر چھپ گئی۔ یہاں یہ سب کچھ لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال متین جیسے افسانہ نگار کو کسی سہارے کی ضرورت تھی یہ تو ادیب کی محبت تھی خلوص تھا۔ جو اُسے چپ بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ وہ تو یاروں کا یار تھا۔

اقبال متین کے علاوہ سردار سلیم بھی اس کا قریبی یار تھا۔ جو خیر سے میرا بھی دوست تھا۔ ان دنوں کمرہ نمبر ۱۷ پر روزانہ حاضری دینا اس کا معمول تھا۔ سردار ذہین مگر نرا جذباتی آدمی تھا۔ میں اسے اکثر چھیڑا کرتا تھا کہ تم اریب کی شخصیت سے مرعوب ہو نہ صرف مرعوب ہو بلکہ اس سے ڈرتے ہو۔ دبلا پتلا سردار جو پینے کے بعد اکثر پہلوان بن جایا کرتا تھا کافی بھڑک اٹھتا۔ پھر اس کا کھردرا ہاتھ میری ٹھوڑی پر ہوتا۔ "جی کیا فرمایا ہے عوض سعید صاحب آپ نے "سردار اریب سے ڈرتا ہے؟ سردار کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ پھر اس کی زبان قینچی کی طرح چلا کرتی۔ جب تک وہ اریب کی شان میں کچھ نہ کہتا ہمارا جی نہ بھرتا۔

قدرے بدلی ہوئی صورت میں یہی حال اقبال متین کا بھی تھا۔ لیکن یہ آدمی کچھ اتنا ہوشیار تھا کہ اریب سے لیکر محلہ کا بکری والا تک اس کا دوست تھا۔ یہ گنجا صلیب بدولش آدمی نہ ناراض ہی ہوتا تھا۔ اور نہ کبھی برہم۔ مگر میں نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ کسی بہانے اُسے غصّہ دلایا جائے۔ آسان صورت یہی تھی کہ اریب کی شخصیت کو درمیان میں لایا جائے۔

پھر ایک دن وہ سردار کے ساتھ تھرّا چڑھائے سڑک سے جاتا ہوا دکھائی دیا تو میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور چلا دیا۔

"میرا خیال ہے تمہارا مجموعہ اریب کی رائے کے بغیر بھی مجموعہ ہی رہتا لیکن پھر بھی دیباچہ کے لئے تمہیں اریب کے گھر کے کئی چکر کاٹنے پڑے۔

اس بار وہ خلافِ توقع غصّے سے بھڑک اٹھا ادبیات نے تلخی اختیار کرلی وہ پیے ہوئے تو تھا ہی انجانے میں سامنے سے آتی ہوئی ایک گائے سے ٹکرا گیا اور دفعتاً نیچے آرہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اس واقعہ کے بعد متین نے اُسے کبھی نہ چھیڑا۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔ اریب میں آخر کیا کشش ہے۔ جو لوگ اس سے ملتے جلتے ہیں۔ جواباً اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا پیارے وہ بڑا نفیس آدمی ہے ایک دم نفیس

مگر مجھے اس کی شرافت قائل کرتی ہی نہ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اپنی کوتاہ بینی کے سبب اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو۔

مگر ان ساری باتوں کے بعد جب اریب مسکراتا ہوا ہم سے ملتا تو لگتا جیسے واقعی وہ ایک اونچا آدمی ہے۔ قدآور۔ اسے اپنے احباب کے ساتھ چندہ کر کے چائے اور شراب پینے میں زیادہ مسرت ہوتی تھی۔ لیکن اس کے مزاج کا اکھڑپن اور حد سے بڑھی ہوئی انا کے سبب اکثر پینے پلانے کی محفلوں میں بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی۔ چوتھے یا پانچویں پیگ کے بعد وہ عموماً بہک جاتا تھا۔ اور مینڈک کی طرح ٹرانے لگتا تھا۔ ایسے وقت اس کی زد سے بچ نکلنا بہت مشکل ہوتا۔ وہ حالتِ نشہ میں کچھ کچھ پاگل ہو جاتا تھا کہ اُسے یہ خبر تک نہ ہوتی تھی کہ مخاطب اس کے مسلسل تھوک اڑانے

پر احتجاج کر رہا ہے۔

اتفاقاً کبھی بار میں اس کا کوئی عزیز سا تھی (ایسے ساتھیوں میں سردار سلیم، اقبال متین اور عزیز قیسی کا نام لیا جاسکتا ہے) اس کی کسی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دے تو وہ بپھر جاتا تھا۔ لیکن کہی ہوئی بات اگر اس کے ذہن میں جونک کی طرح چمٹ جاتی تو وہ ایسے فوری جھٹک کر بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ اور بار سے یک لخت اُٹھ کر کہیں اور چلا جاتا تھا۔ اس کے سارے احباب چیخ اُٹھتے ۔ اریب ٹھیرو ۔ رک جاؤ میری جان ۔ اریب آخر چلا گیا مردود ....

وہ بڑا نفاست پسند اور خوش پوشاک واقع ہوا تھا۔ لباس خواہ وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو اس کے جسم پر خوب سجتا تھا۔ لیکن وجے نگر کالونی میں منتقل ہونے سے پہلے اس کے ہاتھ میں ایک زنگ خوردہ سی چیز ہمیشہ چمٹی رہتی تھی، جسے وہ سیکل کہتا تھا۔ اور اس احتیاط سے اس پر سوار ہوتا تھا جیسے ہندوستان کا کوئی باشندہ صحرائے عرب کے کسی ناقے پر پہلی مرتبہ بیٹھ رہا ہوں۔

وہ بیک وقت صبا کا ایڈیٹر بھی تھا مینیجر بھی تھا اور منشی بھی۔ لیکن خطوط نویسی کے معاملہ میں بڑا ذمہ دار اور کاہل واقع ہوا تھا۔ اس کی کوتاہ قلمی کا یہ عالم تھا کہ وہ شاعروں، ادیبوں اور ساتھیوں کو جواب دیتا بھی تھا تو صرف چند سطوروں میں۔

چہرے پر بال بکھرائے اور منہ میں چارمینار سگریٹ دبائے دو تین گھنٹوں کی غوطہ زنی کے بعد بھی وہ مشکل سے چند خطوط کے جواب دے سکتا تھا۔ ایسے وقت کمرہ نمبر ۱۷ پر دوست احباب اچانک ہلّہ بول دیں تو وہ ان خطوط کو پوسٹ بھی نہ کر پاتا تھا۔ اس کے اس فن کارانہ لاابالی پن نے بہت سے لکھنے والوں کو اس سے دور کر دیا تھا۔ مگر مزے کی بات یہ تھی کہ کسی خاتون کی کوئی چیز صبا میں چھپنے کے لئے آ جاتی تو اس کی کوتاہ قلمی زود نویسی میں بدل جاتی اور اس کا سست رو قلم بجلی کی طرح چلنے لگتا تھا۔

دراصل عورت اور شراب اس کی دو ایسی کمزوریاں تھیں جس کے بارے میں اس کا چہرہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ اگر کسی نے اُسے بزمِ خیام میں مدعو کیا ہو تو وہ صبا کو پریس پھینک آنے کا خیال کئے بغیر اچانک غائب ہو جایا کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے اس نے مجھے اور شاذ کو ایک بنگلے کے نیچے کھڑا کر کے کسی خاتون سے ایک طولانی گفتگو شروع کر دی تھی۔ صبا کی وہ مہم جس کا ہلکا سا خاکہ لئے ہم لوگ چل پڑے تھے۔ وہ آمیے شاید بھلا چکا تھا۔ جب کافی دیر ہو چکی تو شاذ نے ایک چٹ پر مخدوم کا یہ مصرع لکھ بھیجا ؎

مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا۔

اور وہ مارے خفت کے فوری نیچے اُتر آیا تھا۔ دوسرے دن بھی صبا کی خریداری اور اشتہارات کی مہم کسی وجہ سے سرد پڑ جاتی تو وہ خود پر ہنس پڑتا۔ اور پھر جب سر پر کام کا بھوت سوار ہو جاتا تو

با کے لئے اپنی زنگ خوردہ سیکل پر مارا مارا حیدرآباد کی سڑکوں پر گھوما کرتا اور جب وہ کافی تھک جاتا تو کہہ اٹھتا۔
یکل سوار بن گئے گنہگار ہم ہوئے۔

ادیب کو کمرہ نمبر ۱۷ سے بڑی محبت تھی۔ ۱۷ جہاں ادیب، شاعر، موسیقار کاتب سب ہی یکجا ہوتے تھے۔ اور
ب طویل عرصہ تک کرایہ ادا نہ کرسکنے کے سبب اسے قرقی کا نوٹس ملتا تھا۔ ۱۷ سے چند دنوں کے لئے ادیب، شاعر، صحافی
ب ہی ایک ایک کر کے غائب ہو جاتے تھے۔ اور تنہا ادیب رہ جاتا تھا۔

ادیب پر کبھی کبھار خوش فہمی کا بھی بھوت سوار ہو جایا کرتا تھا۔ اس نے اپنے Over estimation
ایک واقعہ جو لطیفہ سے کم نہیں یہ تھا کہ اس نے یہ سوچے بغیر کہ سیاست میں اس کا کیا مقام ہے۔ اس نے بلدیہ کا الکشن
ڑنے کی ٹھان لی۔ یہ غالباً ۵۳، ۵۴ء کی بات ہے۔ وہ بنجارہ ہلز کے حلقے سے کونسلر کی سیٹ کے لئے ایک امیدوار
حیثیت سے کھڑا ہو گیا۔ وحید اختر، شاذ اور دوسرے احباب اس کی کن وسنگ Canvassing کے لئے مقرر
ہ گئے تھے۔ جو یا تو اپنی تازہ نظمیں ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ یا ادیب کے بھولپن پر ہنستے تھے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ
وہ ادیب بھی اس مسخرے پن میں شامل رہتا تھا۔ اپنی ضمانت ضبط کروانے کے بعد بجائے وہ شرمندہ ہونے کے اس
رح خوش ہوا۔ جیسے اس نے بہت بڑا تیر مار لیا ہو۔

ادیب میں Sense of humour بھی کافی تھا۔ وہ اپنی ذات کو مذاق کا ہدف بنا کر خود بھی ہنستا تھا اور دوسروں
ہ بھی ہنساتا تھا۔

جن دنوں وہ اے سی گارڈز کے چھوٹے سے خستہ مکان میں رہتا تھا۔ اکثر میں اور شاذ کمرہ نمبر ۱۷ سے بازار گھاٹ کے
ورلے تک اس کے ساتھ پیدل چل کر جاتے اور گھنٹوں باتوں میں منہمک ہو جاتے۔ باتوں باتوں میں فلمی اداکاروں اور
ناعروں کے معاوضے کی بات چل نکلی تو شاذ نے کہا کیوں نہ ہم تینوں فلمی دنیا میں چلے جائیں۔ تاکہ اس کرب سے نجات
لے۔ ادیب صاحب آپ فلمی شاعر نہ سہی اپنے لمبے قد کے سبب ہیرو تو بن سکتے ہیں۔ لیکن ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہمارا قد
موٹا ہے۔

ادیب نے بے ساختہ کہا "تو پھر کیرکٹر ایکٹر!"
یہ کہکر وہ قہقہے لگانے لگا اور ہم بھی اس کے قہقہوں میں شامل ہو گئے۔

ادیب کے گھر چوری کی خبر اخبار میں چھپی تو بیشتر احباب بجائے افسوس کرنے کے ہنستے ہی رہے۔ کیوں کہ انھیں اس
ت کا پورا اطمینان تھا کہ ادیب کے گھر میں چور کے منصب و مقام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

وضع داری، شرافت، محبت اور خلوص کے باب میں وہ ان لوگوں سے کہیں بہتر تھا۔ جو محض دوستی اور محبت کا
ھونگ رچاتے ہیں۔ وہ جتنا اونچا پورا تھا اتنا ہی کم خوراک بھی تھا۔ دعوتوں میں جہاں اکثر ادیب شاعر حضرات

اچھے کھانے پر ٹوٹتے تھے۔ وہاں وہ بڑے سلیقہ اور تہذیب کا مظاہرہ کرتا تھا۔ لیکن بنتِ عنب سے ہم آغوش ہونے کے بعد اس کی یہ ساری خوبیاں دھری رہ جاتی تھیں۔ ایسے وقت ایک فلم بھی اس کے مزاج کے ناموافق نکل جائے تو وہ بپھر جاتا تھا۔ کبھی کبھار جب اس کے غصے کا پارہ چڑھ جاتا تو وہ اپنے مخالف کے سر پر گلاس پھینک مارنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ مگر صبح جب اس سے ملاقات ہوئی تو سب سے پہلا آدمی وہی ہوتا جو اپنے روٹھے ہوئے ساتھی کو پیار سے گلے لگاتا۔ خواہ اس کا ادبی قد صفر کے برابر کیوں نہ ہوتا۔ اس لئے اگر ہم رات کے سلیمان ادیب اور دن کے ادیب کا محاسبہ کریں تو اس کی تہہ در تہہ شخصیت کے ساتھ بہت دور جانا ہوگا۔ جذباتی اور یک طرفہ نگاہ رکھنے والوں کو بھلا کیا پڑی تھی کہ وہ یہ دردِ سر مول لیں۔ اس لئے وہ اُسے باآسانی نامعقول آدمی کہنے سے جھجکتے نہ تھے۔

ادیب نے شادی سے پہلے مجازؔ اور اخترؔ شیرانی کی طرح بڑی بوہیمین زندگی گذاری تھی۔ ایسے وقت اس نے اخلاق کے سارے سکہ بند پیمانے توڑ بھی دیے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

وہ اپنی بے شمار خامیاں اور خوبیوں سمیت اپنی ذات میں بڑی کشش رکھتا تھا۔ کوئی بڑا شاعر یا ادیب ایسا نہ تھا جو حیدرآباد آئے اور اس سے نہ ملے، کوئی شعری محفل ایسی نہ ہوتی جس میں اس کی شرکت ناگزیر نہ سمجھی گئی ہو۔

وہ اعلیٰ سوسائٹی سے لے کر ادنیٰ سوسائٹی تک کا منظورِ نظر تھا۔ شادی سے پہلے لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں اور شادی کے بعد صفیہ اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ صفیہ کے بغیر شاید سانس بھی نہ لے سکتا تھا۔ محبت کی شادی کی اس سے اچھی مثال شاید ہی ملے۔

وہ سماج کے مروّجہ اخلاقی پیمانے پر بھی یوں نہ اُترا اور اُسے اس بات کا غم بھی نہ تھا کہ وہ ایک شاعر بدمست کی حیثیت سے شہرت حاصل کر رہا ہے۔ ہمارے لئے مقدم تو اس کی وہ خوبصورت شاداب شاعری تھی جس کے بل بوتے پر وہ سر اونچا کئے پھرا کرتا تھا۔ ارد گرد پھیلی ہوئی خود غرضی، منافقت اور جھوٹ سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ کیوں کہ وہ اپنی ذات سے ایک سچا، خوددار اور کھرا آدمی تھا۔ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں جہاں سانس لیتے ہوئے بھی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ وہ اُسے پے در پے ٹھوکر لگاتا رہا۔

اگر وہ مجلسی آدمی ہوتا تو کسی بگڑے نواب زادے کا شریک بزم بن جاتا مگر وہ خود اپنی انا کے بل بوتے پر اپنا ہی لہو زندگی بھر پیتا رہا۔

ادیب مرنے سے چند مہینے دلّی ریڈیو کے مشاعرے سے جب حیدرآباد لوٹا تو گمان نہیں گزرتا تھا کہ یہ کڑی چند ماہ کے بعد ہمیں دھوکہ دے جائے گا۔

انور معظم کے گھر ادیب سے ملاقات ہوئی تو اس نے باتوں باتوں میں کہا تمھیں ایک بات سناتا ہوں تم یقین نہیں کروگے۔ اور میرا بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر دلّی میں بہت سے لوگوں نے مجھے بتایا کہ شاذ نے میری شرکت کے خلاف ریڈیو والوں کو ایک شکایتی خط لکھا تھا۔ میں نے اور انور معظم نے اُسے سمجھایا تھا کہ

ہر کے مشاعروں میں آئے دن جاتا رہتا ہے وہ بھلا ایسی گھٹیا حرکت کیوں کرنے چلا۔

دوسرے دن میں نے شاذ سے اس بات میں پوچھا تو اس نے کہا۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ ہوسکتا ہے یہ چند ان کی شرارت ہو۔ اگر میری کوئی تحریر ریڈیو والے بتا دیں تو میں مان لوں کیوں کہ شکایتی تحریر پہ نام اور پتہ کھانہ اسے فائل کر دیا جاتا ہے۔

اسی شام عابد روڈ کی ایک دوکان سے شاذ نے فون نمبر ڈائل کر کے رسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا کہ تم ادیب ات کرو اور کہہ دو کہ یہ سب بکواس ہے۔ وہ اپنے ذہن کو صاف کر لیں۔

میں نے شاذ کے حوالے سے صرف اتنا کہا کہ شاذ کے نام سے کسی نے آپ سے شرارت کی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے اپنے دل سے اس بدگمانی کو نکال دیں یا اس کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کریں۔

ادیب نے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے کسی ثبوت کے فراہم کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاذ جب کہہ رہا میرے لئے یہی کافی ہے۔ اس سے کہہ دو میرا دل صاف ہے۔

اس بات سے ادیب کے مزاج کا اندازہ ہوتا تھا کہ دوستوں کے لئے اس کے دل میں کتنی جگہ تھی۔ حالانکہ شاذ ں کے تعلقات ایک مدت سے استوار نہ تھے۔

ادیب کی بیماری کے زمانے میں مغنی تبسم اور انور بالالتزام کینسر ہاسپٹل جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار میں بھی جایا کرتا لیکن ادیب کو جاکر دیکھنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی پھر ایسے میں صفیہ ہارٹ اٹیک ہونے کے یم ہسپتال سکندرآباد منتقل ہو چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر دم گھٹتا جاتا تھا۔ اور ہر لمحہ یہ خیال ذہن کو کچوکے لگاتا تھا۔ ی اب ہم میں نہیں رہے گا۔ اور اس المیے سے دوچار ہونے کو کسی طرح جی نہ چاہتا تھا۔

ادیب جو کھانا کھانے کے بعد کم از کم دو گلاس پانی پینے کا عادی تھا۔ آخری زمانے میں پانی کے لئے ترس گیا کیونکہ وہ نہ پانی پی سکتا تھا اور نہ اسے پیا سکتا تھا۔ اس کرب اور بے چارگی کے عالم میں بھی کسی ساتھی نے پہ اس کا ہاتھ معانقہ کے لئے ضرور آگے بڑھتا اور وہ ہر دوا خانہ آنے والے ساتھی کا مسکراہٹ کے ساتھ ستقبال کرتا۔

ایک دن میں اور مغنی اس کے پاس بہت دیر تک بیٹھے رہے کسی سوچ میں گم تھا۔ پھر ڈریسنگ کے لئے ایک نوجوان [illegible]۔ وارڈ بوائے کے ساتھ ادیب کے کمرے میں داخل ہوئی تو ہم لوگ اٹھ کر باہر آگئے بہت دیر تک دونوں کمرے کے باہر ہی چپ چاپ ٹہلتے رہے۔ نرس اور وارڈ بوائے کے جانے کے بعد ہم اس کے بیڈ قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گئے۔ اس نے بمشکل اپنے زخم آلود حلق سے آواز نکالی۔ تم لوگ خواہ مخواہ میرے اتنی تکلیف اٹھا رہے ہو۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کہ میرے لئے میرے دوستوں کو تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔" یہ کہ کر کچھ آبدیدہ سا ہو گیا۔ ایسا نہ سوچیے۔ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ کہتے رہے۔ وہ تھوڑی دیر یوں

ہی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس پر اچانک غنودگی طاری ہوگی اس وقت جھاجھم پانی برس رہا تھا اور بادل گر
گرج کر برس رہا تھا۔ ہوائیں جیسے نوکناں تھیں۔ مغنی نے دھیرے سے کہا آؤ سامنے والے ہوٹل میں چائے پیں
مغنی کے چہرے سے کبیدگی ٹپک رہی تھی۔ ہوٹل میں داخل ہونے تک ہم بھیگ چکے تھے۔ چائے پیتے پیتے مغنی نے کہا
" ایک نظم سنئے۔

پھر انھوں نے وہ نظم سنائی جو ادیب کی بیماری کے آخری دنوں کی یادگار تھی۔

یہ بادل برستے رہیں
یہ بادل برستے رہیں
میں نے سوچا تھا ایسا
کہ بادل برستے رہیں
مجھے خوف تھا آ نہ جائے کہیں
وہ "موعود" جو راستے میں کسی پیڑ کے نیچے شاید کھڑا ہے۔
تبھی میں نے سوچا تھا
بادل برستے رہیں
نہ جانے وہ کس سوچ میں گم تھے
یکلخت رونے لگے
بجلیاں چیخنے اور تڑپنے لگیں
میں بہت خوش ہوا
کہ بادل برسنے لگے
میں اٹھا
اپنے بستر پہ پہنچا
لحاف اوڑھ کر سو رہا
یک بیک فون ــــ
سمجھا وہی ہوگا۔
(جواب نہ جانے کہاں ہے۔)
مگر آج تک میرے کانوں میں بجتی ہیں گھنٹیاں
جو بہت دیر تک مجھ سے فریاد کرتی رہیں موت کی

یکبارگی مجھے لگا جیسے موت کا عقاب کینسر ہاسپٹل کی عمارت کے ارد گرد کہیں منڈلا رہا ہے۔ ہوا کے ہر زخمی جھونکے بارش کے ہر اداس قطروں میں ادیب کی آخری سانس کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ خوف کے بطن سے جنم لینے والے وسوسوں کی آخری کھیور رات تھی جس میں ڈوبا ہوا میں گھر لوٹا تھا۔

پھر ستمبر کی وہ صبح بھی آ گئی جب عالم خوندمیری اور مغنی نے میرے گھر دستک دی۔ میں سمجھ گیا کہ آج حیدرآباد کا امیج کرچی کرچی ہو کر ہوا میں تحلیل ہو چکا ہے۔

دیکھنا

درد کے نواح میں
افق کی سمت
لاش جا رہی ہے
کون لوگ جا رہے ہیں شام کی طرف ؟

(بقیہ صفحہ ۶ سے آگے)

سخنور اور سخن شناس تو بہت ہیں لیکن ایسے دیدہ ور کم ہیں جو الفاظ کے جھروکے سے معانی کو دیکھ سکیں۔ ہر عہد کا آہنگ مختلف ہوتا ہے۔ یہ شاعر کا نہیں مخاطب کا فرض ہے کہ وہ اس بدلے ہوئے آہنگ کا عرفان حاصل کرے ادیب جیسے شاعروں کا بہت بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کی شخصیت کے آئینہ میں ان کی شاعری کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب شخصیت میں کوئی چونکا دینے والا رنگ نظر نہیں آتا تو شاعری کو بھی بے رنگ فرض کر لیتے ہیں۔ ہم عام طور پر یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ بعض شاعروں کے لئے خود شاعری ایک "طرز حیات" ہوتی ہے۔ ادیب ایسے ہی ایک شاعر تھے۔ جنہوں نے زندگی کو شعر کے طور پر برتا اور شعر کو اپنی زندگی کا حاصل تصور کیا۔ میرا خیال ہے۔ (اور میری رائے بند نہیں ہے کیوں کہ میں پیشہ ور نقاد نہیں ہوں) کہ جدید اردو شاعری میں ہمیں اس قبیل کے صرف دو قابل ذکر شاعر نظر آتے ہیں مخدوم اور ادیب ۔

سلیمان اریب کی چند نظمیں اور غزلیں

تارِ عنکبوت

ایک تارِ عنکبوت پہ سب ہیں رواں دواں
بوڑھا ہو یا جواں
اک قبر میری راہ میں اُبھری ہے ناگہاں
رکھتا ہوں میں کہاں ؟
یہ قبر میں ہوں، باپ ہے میرا، ہے میری ماں
ہے تارِ عنکبوت میں لپٹا ہوا جہاں

تسکینِ اَنا

جب کوئی قرضِ صداقت کا چکانے کے لیے
زہر کا دُردِ تہہ جام بھی پی لیتا ہے
اپنا سر ہنس کے کٹا دیتا ہے
زندگی جبر سہی جبرِ مسلسل ہی سہی
سہتا ہے
اور اس جبر کو سو رنگ عطا کرتا ہے
حرف کا، صوت کا، صورت کا، فسوں کاری کا
میں اسے دیکھ کے چپکے سے گزر جاتا ہوں
یہ تو میں خود ہوں وہ احمق جس کی
اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے

تخلیق کی مجبوری

(قُل کُلٌّ یَعمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (سُبحٰن الذی۔ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۱۰)

تم یہ کیا مجھ سے کہتے ہو
لکھی ہیں میں نے جو نظمیں
اچھی ہیں لیکن میں ان کو
دوسرے ڈھنگ سے لکھ سکتا تو
اور بھی اچھی ہو سکتی تھیں
میرے بھائی!
مجھ سے بڑا فن کار خدا ہے
قادرِ مطلق، خالقِ عالم
لیکن وہ بھی میری طرح مجبورِ محض ہے
جس کو اس نے جس صورت پر خلق کیا ہے
اس سے اچھی صورت وہ بھی دے نہ سکا ہے

▲

○

تمہاری قید وفا سے جو چھوٹ جاؤں گا
ازل سے لے کے ابد تک میں ٹوٹ جاؤں گا
خبر نہیں ہے کسی کو بھی خستگی کی مری!
مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا
تمہاری میری رفاقت ہے چند قدموں کی
تمہارے پاؤں کا چھالا ہوں پھوٹ جاؤں گا
ہزار ناز سہی مجھ کو اپنی قسمت پر
حنائے دستِ نگاریں ہوں چھوٹ جاؤں گا
تمہاری بزم سے اٹھ کر یہ وعدہ کرتا ہوں
جہاں بھی جاؤں گا اب جھوٹ موٹ جاؤں گا

▲

○

اک فقط وصل کی لذت کو لگا رکھا ہے
ورنہ اب دشتِ تمنا میں بھی کیا رکھا ہے
جو گزرتا ہے وہ رک جاتا ہے اک پل کے لیے
دل کو آئینۂ بازار بنا رکھا ہے
لالہ و گل کی طرح کھینچے ہے دامانِ نگہ
ہم نے اس طور سے زخموں کو سجا رکھا ہے
عالمِ آشوب میں آج اتنی کہاں ہے فرصت
سانس لینے کو بھی اب کل پہ اٹھا رکھا ہے
پھول اک ہاتھ میں لے کر وہ چلے آئے تو کیا
ہم نے پہلو میں جہنم کو دبا رکھا ہے
جیسے روتے ہوئے بچے کو کوئی چمٹا لے
یوں غمِ دہر کو سینے سے لگا رکھا ہے
ساری اقدار کو رو پیٹ کے ہم نے ایّب
نرغۂ زیست میں اک خود کو بچا رکھا ہے

▲

فرسٹریشن نمبر دس

ہم نے دو کتے پالے ہیں
ایک کو ماما لے آئی تھی
جب وہ اتنا سا پلا تھا
دوسرا کتا بھی بن مانگے اک صاحب نے بھیج دیا تھا
میری بیوی دو دو کتے ان کے نجس ہونے کی وجہ سے رکھنے پر تیار نہیں تھی
لیکن میرے بچوں کی ضد کی بالآخر جیت ہوئی تھی
اب یہ کتے ٹامی ٹوٹی گھر کی رکھوالی کرتے ہیں
ساتھ ہمارے ہی رہتے ہیں
ان کتوں سے میری بیوی پہلے بھی نفرت کرتی تھی
اور اب بھی نفرت کرتی ہے
میرا بچہ جو ننھا ہے —— ان کتوں سے
اب بھی پیار کیا کرتا ہے
گھنٹوں ان کو ساتھ لیے گھوما کرتا ہے
میرا ان کتوں سے رشتہ خونی یا روحانی
کیا ہو سکتا ہے
کتے بھی واقف ہیں اس سے
میں کہ نہیں اصحاب کہف سے
لیکن اب یہ حال ہے میرا
روزانہ
جب تک کتوں کے راتب کا بندوبست نہیں ہوتا ہے
مجھ کو اپنا کھانا پینا جرمِ انسانی لگتا ہے
یہی نہیں بلکہ مجھ کو تو اکثر یہ احساس ہوا ہے
کچھ بھی نہیں اب زیست کا مقصد
کتوں کی خاطر جیتا ہوں

▲

کڑوی خوشبو

ایک ہنگامہ برپا ہے ہر سو
ان گنت صدیوں سے یہ ہنگامہ
یوں ہی بپا ہے ہر سو
جس میں
تو بھی میں بھی
اس طرح جکڑے ہوئے وسعتِ زنجیر تک آزاد بھی ہیں
جس طرح مکڑی کے جالے کے اسیر

●

پاس سے ہو کے مرے کوئی جوانِ رعنا
جب بھی گزرا ہے مرا جی چاہا
اس کو لپٹا کے کئی پیار کر دوں

●

ہائے وہ پیکرِ نظورۂ صد عشوہ طراز
جب بھی آیا ہے تصور میں مرے
میں نے جینے کی تمنا کی ہے

●

رات چپکے سے مرے کمرے میں
چاند کی ایک کرن در آئی
اُس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا
آؤ ہم چاند تک ہو آئیں ذرا
چاند کی سیر سے جب میں لوٹا
گھر کی دہلیز پہ سورج تھا کھڑا

●

اُف یہ برسات یہ ہنگامِ گل و مُل یارب
عام کر دے کہ یہاں کوئی بھی
تشنہ لب ہونے کا شکوہ نہ کرے
ساقیِ کوثر سے وہاں

●

اب بھی ہنگامہ بپا ہے ہر سو
صبح سے شام مگر کیسے ہو
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے
زہر کی لہر ہے یا موت کی کڑوی خوشبو
لمحہ لمحہ مرے جی جان سے گزر جاتی ہے
پینٹھیڈرن پینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے

●

زندگی
آج یہ معلوم ہوا
کچھ بھی نہیں
چھپکلی بھی نہیں
ہاں اس کی کٹی دُم ہو گی

▲▲

پیار کا درد کا مذہب نہیں ہوتا کوئی
کعبہ و دیر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی

سچ تو یہ ہے کہ میں ہر بزم میں تنہا ہی رہا
یوں مگر پاس مرے کب نہیں ہوتا کوئی

جان و ایمان ہی سب کچھ سہی تو میرے لیے
ہائے کس منہ سے کہوں سب نہیں ہوتا کوئی

ایک سایہ تھا جسے میں نے پکڑنا چاہا
وہ جو ہوتا تھا کوئی اب نہیں ہوتا کوئی

چاندنی، پھول، ہوا، جام، ستارے خوشبو
زہر کے نام ہیں جس شب نہیں ہوتا کوئی

مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دیتی دنیا
چھپ کے ملتا ہوں کبھی جب نہیں ہوتا کوئی

جس کو مل جائے یہ دولت ہو مبارک اس کو
شعر سب کے لیے منصب نہیں ہوتا کوئی

کوئی دشمن، کوئی ہمدم بھی نہیں ساتھ اپنے
تو نہیں ہے تو دو عالم بھی نہیں ساتھ اپنے

ساتھ کچھ دور ترے ہم بھی گئے تھے لیکن
اب کہاں جائیں کہ خود ہم بھی نہیں ساتھ اپنے

وہ بھی اک وقت تھا خورشید بکف پھرتے تھے
یہ بھی اک وقت ہے شبنم بھی نہیں ساتھ اپنے

ناخنِ وقت نے کب زخم کو دھکایا ہے
ایسے اک وقت کہ مرہم بھی نہیں ساتھ اپنے

سامنے کتنی صلیبیں ہیں گڑی بے گنہی!
آج لختِ دلِ مریم بھی نہیں ساتھ اپنے

پی کے سوچا کہ خریدیں گے غمِ دنیا بھی
طے ہوئے دام تو درہم بھی نہیں ساتھ اپنے

○

آج بھی ہاتھ پہ ہے تیرے پسینے کی تری
یعنی ہے آج بھی شاخِ شجرِ درد ہری

پاسِ داماں نہ سہی پاسِ گریباں ہی سہی
تجھ پہ لازم نہیں اے دستِ جنوں جامہ دری

میں کہ دنیائے ہوس میں بھی سرافراز رہا
کام آہی گئی آخر مری آشفتہ سری

دل کی بستی سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا
اب نہ پیغام بری ہے نہ کوئی نامہ بری

ہم نے بھی چھوڑ دیا مسلکِ اربابِ وفا
وہ بھی اب بھول گئے شیوۂ بیداد گری

رات کا کرب سمیٹے ہوئے اپنے دل میں
جھلملاتا ہے کہیں دور، چراغِ سحری

میں نے کس دل سے شبِ غم کی سحر کی ہے ادیبؔ
یاد آئے گی زمانے کو مری بے جگری

▲

○

یوں تو شہروں میں نہ ہم جانے گئے
ہائے کن گلیوں میں پہچانے گئے

اک وفا نا آشنا کے واسطے
کتنے صحرائے وفا چھانے گئے

تشنگی میں جن کی عمریں کٹ گئیں
جانِ میخانہ وہی مانے گئے

زلفِ گیتی، زلفِ جاناں تو نہ تھی
آج ہم بھی اس کو سلجھانے گئے

کچھ نہ پایا سر میں چوٹ آئی مگر
ایک سائے سے جو ٹکرانے گئے

ہم پیالہ، ہم نشیں، ہمدم مرے
اُٹھ کے محفل سے کہاں جانے گئے

▲

○

کبھی بہ پاسِ صداقت بھی منہ نہیں کھلتا
بہت عجیب ہے یہ داستانِ جرم و سزا

نہ ہو سکا جو مداوائے زخمِ لالہ و گل
بچا کے آنکھ چمن سے گزر گئی ہے صبا

بہار اور خزاں مل کے ڈھونڈتے ہیں اُسے
جو پھول تیری قبا تیری سیج تک پہنچا

ہمارے دم سے ہے قائم روایتِ مستی
جو ہم نہ جائیں ہوئے میکدہ اٹھے نہ گھٹا

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

ہر ایک دوست نے دامن جب اپنا کھینچ لیا
اریبؔ رو نہ سکا پھر اریبؔ رو نہ سکا

▲

○

جو تیرے حسن میں نرمی بھی بانکپن بھی ہے
وہ کیفِ تازہ بھی ہے نشۂ کہن بھی ہے

مجھے تو چین سے رہنے دے اے دلِ وحشی
کہ دست بھی ہے ترے سامنے چمن بھی ہے

کہاں کی منزلِ مقصود راستہ بھی نہیں
سفر میں ساتھ خدا بھی ہے اہرمن بھی ہے

وہ ایک لمحۂ یزداں وہ ایک ساعتِ دید
حنا بہ دست بھی ہے لالہ پیرہن بھی ہے

بہ چشمِ شبنمِ گریاں اگر کوئی دیکھے
ترا لباس ہی اے گل! ترا کفن بھی ہے

وہ ایک خوشۂ جنت جسے دکن کہیے
نگارِ شاعرِ بدنام کا وطن بھی ہے

▲

اریب کے خطوط

زبیر رضوی کے نام

۱۴ اگست ۱۹۵۷ء

(۱)

مائی ڈیر

آج سے پورے چونتیس دن پہلے میں نے ایک خط تمھیں لکھا تھا۔ اس اثنا میں غالباً تمہارا ایک خط اور آیا لیکن مجھے خود حیرت ہے کہ میں جو خط تمہیں لکھ رہا تھا اسے پوسٹ کیوں نہیں کیا۔ ادھر عوض کے بھی دو تین خط آئے چناں چہ آج بھی ان کا ایک خط آیا ہے لیکن میں انھیں بھی جواب نہ دے سکا۔ وجہ؟ وجہ کچھ بھی نہیں۔ بس ایک جمود اور تعطل کی سی کیفیت طاری ہے جسے باوجود کوشش نہیں توڑ پا رہا ہوں۔ عوض اپنے تقریباً ہر خط میں پیار سے ڈانٹتا اور یہ شکایت کرتا ہے کہ میں اسے جواب کیوں نہیں دیتا۔ تمہیں خط کیوں نہیں لکھتا؟ اور ہر بار بڑی ندامت سی محسوس کر کے یہ طے کرتا ہوں کہ تمہیں بھی منالوں گا اور اس کی شکایت بھی رفع کر دوں گا لیکن آج سے پہلے اس کی توفیق نہیں ہوی۔ تم عوض کو یہ خط دکھا دو یا اس سے اس خط کا ذکر کر دو۔ میں اسے آج تو نہیں پرسوں ضرور خط لکھوں گا۔ عوض سے یہ بھی کہہ دو کہ مجھے اس کی کہانی مل چکی ہے۔

پرسوں نثار احمد فاروقی صاحب کا خط شاہد صدیقی کے نام آیا جس میں انھوں نے شاہد سے دو غزلیں بھیجنے کے لیے لکھا اور یہ بھی لکھا کہ غزلوں کا جو انتخاب وہ شائع کر رہے ہیں اس میں میرا کلام بھی رہے گا۔ آج عوض کے خط سے معلوم ہوا کہ تم نے اس انتخاب کے لیے میری تازہ غزل جو صبا اور شاہراہ میں پچھلے مہینے شائع ہوی ہے دے دی ہے۔ یہ تم نے اچھا کیا۔ میری یہ غزل عام طور پر پسند کی جا رہی ہے لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ اس ایک غزل سے میری بھرپور نمائندگی ہو جائے گی؟ کیا میری ایک آدھ غزل اور لی جا رہی ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ ہر شاعر کی دو دو غزلیں لی جانی چاہئیں لیکن اگر اس سے ضخامت اور گنجائش کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ ایمانداری اور سختی کے ساتھ انتخاب میں صرف انھیں شعرا کو جگہ دی جائے جو خالص غزل گو ہیں یا جو نظم لکھنے کے ساتھ ساتھ غزل گو بھی کہلائے جا سکتے ہیں، مثلاً فیض، مجاز اور جذبی اور اسی طرح

کے اور شعرا۔ جدید شعرا سے پہلے کی نسل میں اس تعریف میں نہ جوش آتے ہیں اور نہ امجد صرف اقبال آتے ہیں۔ لہٰذا فاروقی صاحب سے کہو کہ میری اس ناقص رائے پر غور کریں۔ تم انھیں میرے خط کا یہ حصہ دکھادو۔

میری دوسری غزلوں میں سے :

ع تیری قربت تیری دوری عالم عالم دنیا دنیا (مگر یہ غزل ایک اور انتخاب میں آچکی ہے)

یا ع نہ جانے کفر کا انجام اپنے کیا ہوتا۔

یا ع پرسشِ حال وہ اس طرح سے فرماتے ہیں

یا ع پوچھ مت دیکھ کہ کیا حال اریب آج بھی ہے

والی غزلوں میں سے (یوں تو اور کئی غزلیں ہیں) کوئی غزل آسکتی ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب سے بات کرنے کے بعد مجھے مطلع کرو۔

یہاں تک لکھ پایا تھا کہ خط ختم کرنا پڑا۔ لہٰذا خدا حافظ۔ میں چاہتا ہوں کہ فی الحال یہ دونوں خط فوراً پوسٹ ہوجائیں ورنہ اور دیر ہوجائے گی۔

وقار صاحب سے میرا سلام کہہ دو۔ امید ہے کہ وہ مع الخیر ہوں گے۔

تمہارا

اریب

۱۷ راگست ۵ء

دیکھو ڈیر

مجھے جو اندیشہ تھا پورا ہوا یعنی ۱۴ راگست کو لکھا ہوا خط آج ۱۷ راگست کو پوسٹ کررہا ہوں۔

پرسوں تمہارا ایک اور پوسٹ کارڈ ملا لیکن اس میں تم نے ایک تو اپنی ذہنی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے جس سے تشویش ہوئی اور دوسرے انتخاب کے بارے میں تم نے کچھ نہیں لکھا۔ اب کے خط میں ان دونوں باتوں کے بارے میں لکھو۔ آیا ذہنی پریشانیاں دل کے ہیں یا دنیا کے ہاتھوں؟ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ تم اس کانٹ چھانٹ سے کرسکتے ہو جو چینی رسمِ خط کے انداز میں ہر جگہ نمایاں ہے۔

اگست کا شمارہ تقریباً تیار ہوچکا ہے ابھی تک اس لیے پریس نہیں جاسکا کہ پریس کا پورا بل ادا نہیں ہوا ہے۔

کیا ادھر تم نے کچھ نہیں لکھا؟ "شاہراہ" میں تمہاری ایک نظم پڑھی تھی جلد جواب دو لیکن اگر تم چاہو تو دو مہینے تک مجھے بھی ٹہلا سکتے ہو۔

پیار

تمہارا اریب

اور ہاں جی یہ تم مجھے "صاحب" کیوں لکھتے ہو۔ اس سے غیریت کی بو آتی ہے۔

ارِیب

(۲)

۲۴ر فروری ۱۹۶۵ء

ڈیر زبیر

ادھر میں جو بھی خط تمہیں لکھتا ہوں تو اس میں اپنے جھگڑے لے بیٹھتا ہوں اور جب بھی تم میرا کوئی خط پاتے ہوں گے۔ یہ سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص خط نہ لکھے تو اچھا ہے۔

ادھر ہفتے عشرے سے میں سخت ذہنی کوفت میں مبتلا ہوں۔ کوئی پانچ سو روپے بمبئی۔ دہلی اور مدراس سے آتے ہیں۔ جنوری کا "صبا" آچکا ہے۔ اس میں ایک ہزار روپے سے زائد اشتہار ہیں لیکن یہاں عالم یہ ہے کہ جیب میں رکشا کا کرایہ نہیں ہے۔ اب تم ہی سوچو کہ میں کس طرح بیسیوں مسائل سے نمٹتا اور بیسیوں لوگوں کو Face کرتا ہوں گا۔

جن اشتہاروں کی رقم آتی ہے ان پر دو دو تین تین ماہ گزر چکے ہیں لیکن کوئی بھی روپیہ نہیں بھیجتا۔ ایسی صورت میں ذہنی سکون کے ساتھ کام کیا کروں گا اور "صبا" کو کس طرح جاری رکھ سکوں گا۔ احباب کہتے ہیں کہ میں اب بھی "صبا" کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہوں لیکن انھیں کیا پتا کہ

بہ زیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نہ خوردہ گزند راچہ خبر

— — — — — — — — — — — — — — — —

مغنی تبسم کو "لہر لہر ندیا گہری" پر تبصرہ کرنے کے لیے مسلسل دق کر رہا ہوں لیکن اس خاموش نوجوان کا بھی جواب نہیں کہ اس نے اب تک کچھ نہیں دیا۔ اپنے مجموعے متعلق تفصیل سے لکھو کہ دہلی اور یوپی میں کیا Respence ملا۔ کیا ان دنوں کوئی نظم یا غزل نہیں ہوئی۔

اچھا اب خدا حافظ

تمہارا۔ ارِیب

عبدالرب عشمانی کے نام

میرے دوست

تمہارے محبت نامے، شکایت نامے اور عتاب نامے آتے رہتے ہیں جن کو پاکر میں ایک ملنے کے لیے ہی

سبھی یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ ابھی اس سرزمین کون و فساد پر میرا ایک ایسا دوست بھی موجود ہے جو مجھ سے بے لوث محبت کرتا اور میری بے اعتنائی کے باوجود مجھے عزیز رکھتا ہے۔

عثمانی! تم یقین نہ کرو گے کہ جب بھی تمہارا کوئی خط آتا ہے تو میں اس کا فوراً جواب دینے کے لیے کتنے جتن کرتا ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ زندگی بڑی بے درد، سفاک اور ظالم ہے اور وہ ہر ایک کو اپنے دام تزویر میں اس طرح جکڑے ہوئے ہے کہ کوئی بھی چوں و چرا نہیں کر سکتا اور سب ہی اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چل کر ایک دن اس کے اوپر اپنی جان نثار کر دیتے ہیں۔

دو تین سال قبل میں جب تم سے ملا تھا اس وقت بھی میں پریشان تھا اور آج بھی میں پریشان ہوں اور سخت پریشان تم جانتے ہو کہ اس دنیا میں ایک شریف آدمی کا اور اگر وہ خوددار بھی ہو اپنے کچھ اصول اور اقدار بھی رکھتا ہو تو زندہ رہنا اور اپنے اہل و عیال کے لیے آرام و آسائش فراہم کرنا کتنا مشکل ہے۔ میرا ذریعہ آمدنی رسالہ ہے اور وہ بھی ایک ادبی اور سنجیدہ رسالہ ۔۔۔۔۔۔ آج کے زمانے میں ادب یا بے ادبی سب کمرشیل لائنس پر چلتے ہیں اور تجارت میں جب تک آپ پہلے کچھ سرمایہ مشغول نہیں کرتے کچھ کما بھی نہیں سکتے لہٰذا عمر عزیز صرف زندہ رہنے کی جد و جہد میں کٹ رہی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کبھی ایک شعر کہا تھا:

گذر رہا ہوں مسلسل اک ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

یہ شعر آج بھی مجھے پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔ دعا کرو کہ قسمت کا یہ چکر ختم ہو۔ میرے حالات سدھریں اور میری زندگی میں بھی وہ دن آئے کہ میں تمہارے ہر خط کا جواب دے سکوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

کے مصداق شاہد صدیقی کا انتقال ہو گیا۔ قریبی احباب تتر بتر ہوتے جا رہے ہیں اور جو حیدرآباد میں موجود ہیں وہ بھی اپنی اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ گو حمید کا مکان میرے مکان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بھی نہ ہوگا ظاہر ہے کہ یہ کوئی دوری نہیں لیکن بُعد کا یہ عالم ہے کہ نہ میں اس سے ملتا ہوں اور نہ وہ مرد خدا مجھ سے ملتا ہے۔ حمید کے خطوط تمہارے پاس آتے ہوں گے لیکن ہم تو ایک دوسرے کو خط بھی نہیں لکھ سکتے۔

"صبا" تو مل رہا ہوگا۔ امید ہے کہ تم مع الخیر ہوں گے۔

تمہارا - ادیب

عزیز قیسی کے نام

۹ر اگست ۱۹۷۴ء

ہاں صاحب

تم نے بہ طرزِ غالب و ارؔیب خط لکھنے کا اچھا ڈھنگ اختیار کیا جیتے رہو اور خوش رہو۔
میں نے ادھر تمہیں خط لکھنے کا کئی بار ارادہ کیا لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ لہذا آج سے پہلے تمہیں خط لکھنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔
حالات میرے وہی ہیں کبھی نرم اور کبھی گرم۔ صفیہ سے تعلقات بھی حالات کے زیرِ اثر کبھی خوش گوار اور کبھی ناخوش گوار رہتے ہیں یعنی کبھی نسخہ آتے ہیں اور ان کے ساتھ خوب دہشکی اڑتی ہے یا کبھی تمہارے دوست ابنِ احمد تابؔ کے ساتھ تھوڑا سا تھرا چکھ لیتا ہوں تو دو دن تک صفیہ بیگم کا منہ پھلا ہوا رہتا ہے ورنہ یہ ناچیز ان کا وہی فرماں بردار شوہر رہتا ہے جیسے کہ اس کے آبا و اجداد اپنی نیک بیبیوں کے ساتھ رہے ہوں گے اور صفیہ بیگم خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر تمہارا ذکر آجاتا ہے اور تمہارا نام برائی میں بھی اچھائی سے آجاتا ہے کہ تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ عثمانی کے ساتھ بھی عثمانی کی اب کی ٹرپ میں تین دن تک پینا پلانا رہا اور اُم حسین کا موڈ بگڑا ہوا رہا۔
دوست احباب کی باتوں کا کیا مزا نہیں اور ان سے کیا خوش ہوں کہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ عثمانی اپنے تین دن کے قیام میں اکثر سنجیدگی کے ساتھ بہ عالمِ شکر صفیہ سے اس کے پی ایچ۔ ڈی کے "تاپک" پر گفتگو کرتے رہے اور اس کو مشورے دیتے رہے۔ چناں چہ بمبئی پہنچ کر دو کتابیں صفیہ کے لئے بھجوائی ہیں اور آئندہ بھی اس کو کتابیں بھیجنے یا کتابوں کے نام بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔
یار "صبا" کے لئے بمبئی میں کچھ کرو اور کہیں سے روپیہ دلاؤ مگر تم یہ کام نہیں کرو گے۔ ذرا بارش ختم ہوتے تو میں پھر بمبئی آؤں گا اور صفیہ اور حسین بھی ساتھ آؤں گا تم اور شمدحسن مکان کا انتظام کر رکھو۔
تمہارے متعلق ادھر اچھی خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ خدا کرے کہ صحیح ہوں بس ذمہ داری سے کام کئے جاؤ اور جب تک موٹر نہ خرید لو حیدرآباد کا رُخ نہ کرو۔
تابؔ صاحب اس وقت سامنے بیٹھے ہیں۔ آج کل کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں کہو تو انھیں تمہارے پاس بمبئی روانہ کردوں؟ ابھی چند دن پہلے میرے ڈانٹنے ڈپٹنے پر نوری نے استعفیٰ دے دیا تھا جسے میں نے پڑھا نہیں لیکن نوری صاحب قبلہ پھر رجوع ہو چکے ہیں اور پھر وہی وہ ہیں وہی ذلت و خواری ہے۔
سردار نہیں ملتا۔ نواب کے پاس گئے ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ ہائے۔ ہاں مظہر صاحب سے ملنا پڑتا ہے۔ مجھ کا برتھ سرٹیفکیٹ تو خوب پہنچا۔
افسانہ روانہ کر دیا ہوتا۔ پوچھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ بے ایمان سمدھن کیسی ہے؟ اس سے کہو کہ آج کل میرا بھابی کے پاس جانا بھی قطعی بند ہے۔ نہ دن میں نہ رات میں۔

بہو کو پیار
صفیہ اور حسین مع الخیر ہیں
تمہارا۔ اریب

یکم جولائی ۱۹۶۹ء

(۲)

ڈیر قیسی

تمہارا ۱۴ جون کا خط مجھے بنگلور سے واپسی پر مل گیا تھا اور میں نے ۱۹ جون کو تمہیں ایک خط بھی (تقریباً) لکھ دیا تھا لیکن وہ ادھورا ہی رہ گیا اور اب اس خط کو ایک ادھوری نظم کی طرح مکمل کرنا مشکل نظر آرہا ہے۔ لہٰذا دوسرا ہی خط لکھ رہا ہوں۔

بنگلور میں تین چار دن بہت اچھے گزرے۔ ایاز نے ایک بڑھیا ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا تھا۔ شراب کا معقول انتظام تھا۔ کمپنی مخدوم محی الدین، باقر مہدی، مغنی تبسم اور محمود ایاز کی تھی۔ بڑی دلچسپ بحثیں اور لڑائیاں ہوئیں۔ تم اور وحید اختر بہت یاد آئے اگر تم دونوں بھی ہوتے تو میں مخدوم کو بچا ہی نہ سکتا تھا اور کسی نہ کسی کا قتل ہو جاتا۔

حیدر آباد پہنچ کر میں بھی تنہا ہو گیا۔ علاج کی غرض سے مجھے ایک دن پہلے پلین سے بھجوا دیا گیا تھا۔ صفیہ اور حسین بعد میں ٹرین سے آئے۔ بڑی مشکل سے کرفیو کے زمانے میں پہنچے۔ میری تنہائی میں پریشانی اور بے بسی کو بھی شامل کر لو اُفوہ، نہ پوچھو دو دن کیسے گزرے

۲۳۔ جون کو میرا علاج (Radio Cobalt) ختم ہو گیا۔ علاج ختم ہونے کے بعد پرسوں تک گویا میری زندگی کا بدترین وقت گزرا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا۔ حلق بند۔ سوتے جاگتے میں دو تین بار ایسی کھانسی (ٹھسکا) کہ جیسے اب دم نکل جائے گا۔ نہ کھایا جائے نہ پیا جائے۔ تھوک نگلنے میں تک تکلیف۔ بے مزگی، بے رنگی، بے کیفی اور بے چینی۔ بس لطف آ گیا۔ کل تک ریڈیم کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کے لیے علاج ہوتا رہا۔ اب نسبتاً حالت بہتر ہے ڈاکٹر خوش ہے کہ علاج کامیاب رہا اور صفیہ بیوقوف کی خوشی کی تو کوئی انتہا نہیں کہ اس کا سہاگ نہیں اجڑا۔ ابھی تھوڑا بہت علاج جاری ہے۔ جمعہ کو یعنی ۴ جولائی کو E.N.T کا ڈاکٹر حلق دیکھے گا۔ ڈاکٹر موتق اگلے ہفتے حیدر آباد آرہے ہیں۔ وہ میرے معالج سے مل لیں گے۔ صفیہ نے بمبئی جانے کے سلسلے میں سردار جعفری کو خط لکھا تھا اور انھوں نے بہت پیار سے بلایا بھی ہے لیکن اس کا انحصار ڈاکٹر موتق اور ڈاکٹر افضل کی ہم خیالی پر ہے۔ علاج کے لیے اب بمبئی نہیں آنا ہے۔ ہاں Check up کے لیے آسکتا ہوں۔ بہت سے احباب کا اصرار ہے کہ میں بمبئی ضرور جاؤں اور میرا ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ Check up کے لیے بمبئی کیا کہیں بھی ہو آنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ بہرحال بمبئی آنے کا پروگرام بنے تو تمہیں فوراً مطلع کروں گا۔

اچھا ہوا کہ خورشید آپا کی لڑکی کی شادی ملتوی ہو گئی چند دنوں کے لیے سہی۔ کیا اچھا ہوتا کہ خورشید آپا کی شادی بھی اب تک ملتوی ہوتی رہتی۔

اب میں بڑی حد تک ٹھیک ہو چکا ہوں۔ آواز نکل رہی ہے۔ اب کام کرنے اور زندہ رہنے کو بھی جی چاہ رہا ہے۔

تمہاری نظمیں امروز و فردا میں ڈھونڈ نکالوں گا۔ پہلے میرے ان سوالات کا جواب دو۔

تم نے اب تک اپنی کتنی نظمیں جمع کر لی ہیں؟

مجموعے میں صرف نظمیں ہی رہیں گی نا؟
مجموعہ کوئی ادارہ چھاپے گا یا تم خود چھپواؤ گے؟
نظموں کے انتخاب میں کیا غالب کی طرح کسی صاحب نظر سے مشورہ لو گے؟
کسی سے پیش لفظ لکھواؤ گے یا خود لکھنے کا ارادہ ہے؟
صفیہ کہہ رہی ہے کہ سطریں بہت ٹیڑھی جا رہی ہیں لہٰذا خط ختم کرو اور قیسی میاں سے صرف اتنا کہہ دو کہ ہم آ رہے ہیں۔ دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو؟
مختار کو دعا۔ بچوں کو پیار
تمہارا۔ اریب
مولانا اختر حسن اور اپنے قیصر متی سے ملاقات ہو تو میرا اسلام پہنچا دینا۔ میں نے قیصر کو خط بھی لکھا تھا۔

محمود ایاز کے نام

۵ جولائی ۱۹۶۹ء

کیوں صاحب ہم نے خط نہیں لکھا تو تم نے بھی خط لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالاں کہ ہماری اور تمہاری حیثیتوں میں یوں فرق ہوا کہ تم زندہ تھے اور ہم زندگی کے لیے لڑ رہے تھے۔ اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا لیکن ہمارا ڈاکٹر یقین دلاتا ہے کہ ہم بچ گئے یعنی صفیہ بیوہ ہونے سے بچ گئی اور حسین یتیم ہونے سے بچ گیا اور ہاں اگر ہمارے بچنے کی اہمیت ہے تو انھیں دونوں کی وجہ سے ہے ورنہ:

بجائے کل کے اگر آج مر گئے تو کیا

RADIO COBALT کا میرا علاج ۲۳۔ جون کو ختم ہوا لیکن اس کے بعد سے ابھی تین چار دن پہلے تک ریڈیم کے اثرات سے میرا جو حال ہو گیا تھا وہ سخت قابل رحم تھا اور ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ یہ سب کچھ ہو گا۔ بارے اب آواز کھلی ہے۔ منہ کا مزہ بدل رہا ہے اور گلے کا راستہ بھی کھل رہا ہے۔ ابھی حلق میں درد ہے اور ابھی تک میں کچھ کھانے کے لائق نہیں ہوں مشروبات ہی پر گزر بسر ہے۔
صفیہ مجھے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ لے جانا چاہتی ہے۔ اس بارے میں اس نے ایک جان پہچان کے ڈاکٹر (ڈاکٹر موثق الدین) اور سردار جعفری کو لکھا تھا۔ ڈاکٹر موثق خود حیدرآباد آ رہے ہیں۔ وہ میرے ڈاکٹر (معالج) سے ملنے کے بعد ضروری ہوا تو مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے جائیں گے ورنہ نہیں۔ ویسے مزید check up کے لیے خود ہمارا ڈاکٹر کہتا ہے کہ کہیں بھی جانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔
تم نے صفیہ اور حسین کو جس ٹرین سے حیدرآباد بھجوایا نہ بھجواتے تو اچھا تھا وہ تو سمجھو کہ بسلامتی پہنچ گئے دونوں۔ ہمارے حالات کے ساتھ حیدرآباد کے موجودہ حالات نے مل کر عجیب صورت حال پیدا کر دی ہے۔ جیسے

تلنگانہ بننے کی کوئی توقع نہیں ہے ہمارے حالات سدھرنے مستقبل قریب میں کوئی توقع نہیں ہے۔ جہاں سے بھی قرض ملتا ہو لیتا ہوں لیکن کب تک قرض لیتا رہوں گا اور ادا کروں گا تو کہاں سے۔ آبائی مکانوں کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اب صرف رجسٹریاں ہونی ہیں۔ میں اپنا حصہ فوراً فروخت کر دینا چاہتا ہوں لیکن موجودہ حالات میں خریدار کہاں ملے گا؟ اب تو گھر میں پڑے پڑے سخت بوریت اور کوفت ہونے لگی ہے۔

سیٹھ نے جو زم زم از راہِ عنایت دیا تھا وہ صفیہ مجھے پلاتی ہے اور میں بھی اسی عقیدت سے پی رہا ہوں۔ سیٹھ سے کہدو۔

تم نے جس ٹھاٹ سے ہمیں بنگلور بلایا۔ رکھا۔ کھلایا اور پلوایا اس سے مولوی مخدوم اور مسٹر مغنی دونوں متاثر ہیں اور تمہارے حسن انتظام اور رکھ رکھاؤ، محبت اور رعب داب کے قائل ہو گئے ہیں۔ پرسوں محمد علی صاحب سے میں اور مغنی ملے تھے۔ پرسوں صفیہ کے ابا آئے ہیں

سیٹھ کو سلام۔ مریم کو دعا۔ جواد اور دیّی کو پیار۔

تمہارا

یارِ غمگسار

اریب زار

(۲)

۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء

برادرِ عزیز

تمہارا ۸۔ جولائی کا خط مل گیا تھا۔ کل صفیہ کی دوائی (گولیاں) بھی ملی۔ یار مجھے فوری علاج، صحیح تشخیص یا صفیہ اور اس کے خدا کسی نے بچایا ہو لیکن ایسی راہبانہ زندگی گزارنے سے تو عمر طبعی کو نہ پہنچنا اچھا۔ نہ پان نہ سگریٹ، نہ کام نہ کام کے دام۔ بس آرام ہی آرام۔ اس پر اس نیک بخت صفیہ کا ساتھ۔ جنت اور گھر میں فرق ہی کیا ہوا۔ پھر تلنگانہ بند، شراب بند، پانی بند۔ نہ پوچھو کتنا اکتا گیا ہوں زندگی کی اس یکسانیت اور بے معنویت (یا لغویت) سے۔

قرض وام کر کے غالب نمبر کے لیے جتنے مضامین کی کتابت ہوئی تھی ان کی کاپیاں پریس بھجوا دی گئی تھیں اور مغنی کو چیف ایڈیٹر بنا کے سارا کام سپرد کر دیا تھا لیکن پروف آنے کی رفتار بتا رہی ہے کہ انشاءاللہ جولائی کے اختتام تک بھی پرچہ پریس سے نہیں آئے گا۔ پرچہ نکلے چھ مہینے ہو رہے ہیں۔ گھر بیٹھے کب تک کھاتا اور کہاں سے کھلاتا رہوں گا۔

تقریباً دو برس سے میری بڑی بہن (خواہ مخواہ) آبائی مکانوں کے حصے بخرے ہونے نہیں دے رہی تھیں اور اب جب کہ تصفیہ ہو چکا ہے تقریباً پچاس ہزار کی جائداد کوئی پچیس ہزار میں بھی لینے کے لیے تیار نہیں اور اس تلنگانہ ایجی ٹیشن کا اونٹ ابھی کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آتا اور ڈر یہ ہے کہ اگر تلنگانہ بن گیا تو مکان کوڑیوں کے مول بھی فروخت نہیں ہوں گے

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

محمد علی صاحب سے نہایت سرسری ملاقات اور گفتگو رہی ۔ مغنی بھی میرے ساتھ تھے ۔ بس ہم نے ان کی مزاج پرسی کی اور انھوں نے ہماری ۔ تم محمد علی صاحب سے ملو ۔ مجھے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اشتہارات دلانے کے لیے کہو ۔ انفارمیشن ، ٹرانسپورٹ اور کوڈیس کا اشتہار پھر مل سکتا ہے ۱۵ اگست کے لیے ۔ غالب نمبر تو اب آہی جائے گا ۔ تم محمد علی صاحب سے بات کر کے مجھے لکھو کہ متذکرہ بالا پارٹیز کو راست خطوط بھیجے جائیں یا تم محمد علی صاحب کے سر پر سوار ہو کے ان کے P.A کے ذریعے بھجوا دوگے ۔

خوشی ہوی کہ اب جواد کی طبیعت ٹھیک ہو چکی ہے ۔

کیا اب صفیہ سے تمہاری باضابطہ ٹھن گئی ہے ؟

سلیٹھ اور مریم سے میرا سلام عرض کر دو ۔ وصی کو پیار

تمہارا ۔ اریب

صفیہ کے نام

دہلی ۶

۹/مئی ۶۵ء

ایک بجے رات

صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ

صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ

صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ

صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ

صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ صفیہ

تمہارا اریب

۱۴/اپریل ۶۸ء

جانِ من

صبر دو دن نہ ہوا روئے بہت یاد کیا

والی کیفیت سے گزر رہا ہوں ۔ دو ہی دن میں اس نکلتے سے بھی جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر مرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

جی اوچٹ گیا ہے اور باوجود چہل پہل، سیر تفریح، آرام و آسائش اور سکون و تنہائی کے تمہارا اور حسین کا خیال دبے پاؤں کسی وقت بھی آجاتا ہے۔ تم سے ہر وقت کی لڑائی اور پھر تمہارا ہمہ وقتی پیار یہاں کہاں۔ سب سے بڑھ کر تمہاری وہ چشم نگراں میرے ساتھ نہیں جس نے مجھے بگاڑ بھی دیا ہے اور جو میری قوت بھی ہے۔

پرسوں رات اور کل رات عجیب طرح کے خواب دیکھے۔ میرے متعلق ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ میں چند دن کا مہمان ہوں اور مجھے اپنی موت کے لیے تیار رہنا چاہیے اور میری دلی خواہش یہ ہے کہ میں کسی طرح حیدرآباد پہنچ جاؤں تا میں تمہیں اور حسین کو آخری بار دیکھ لوں۔

عدیم الفرصتی کے باوجود فرصت کا یہ عالم ہے کہ کل شیو بنانے کے بعد سو کے اٹھنے کے بعد بروقت جلسہ گاہ بھی پہنچ گیا۔ تمہارا کلکتے ساتھ نہ آنے کا احساس کل ایک بار اور شدید طور پر ہوا۔ کل کے پوئیٹس سشن میں میں نے پڑھا۔ اتفاق سے پہلا شاعر جسے پڑھایا گیا میں ہی تھا۔ میں نے دو نظمیں 'عرفان' اور 'تم کس سے ملنے آئے ہو' پڑھیں (ان ہی نظموں کا ترجمہ سوو نیر میں شامل ہے) دونوں سشن میں مختلف زبانوں کے شعرا کو سننے والوں اور خود بعض ایماندار شعرا کا خیال ہے کہ میرا کلام اور میرا پڑھنا سب سے اچھا تھا۔ مجھے اکثر لوگوں نے مبارک باد دی جن میں مخدوم بھی تھے اور ہاں ایک لڑکی تو اس 'بڈھے' سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس سے بہ آسانی رومانس چل سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ کامیابی اور نیک نامی صرف تمہارے پیار اور بہی خواہی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے [فدوی کے اس عروج پہ کرتی ہے غور کیا = تیری ہی جوتیوں کا تصدق ہے اور کیا]

ہمارا خیال ہے یہاں کی مصروفیات کی وجہ سے ۱۱ اپریل کو کلکتے سے روانہ ہونے کا تھا لیکن اب ہم کل ہی روانہ ہو جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ خط میں تمہیں دوپہر کے کھانے کے بعد "قیلولہ" کیے بغیر لکھ رہا ہوں۔ اب تھوڑی دیر سے تیار ہو کر جلسہ گاہ جانا ہے۔ وہاں سے مندنی والوں کے ایک جلسے میں پھر پرویز شاہدی کے گھر۔

کل میں ٹیلی گرام کر دوں گا کہ کب حیدرآباد پہنچوں گا۔

حسین کو پیار

تمہارا اور صرف تمہارا

اریب

بلراج کومل

شاعر کی موت

(سلیمان اریب کی یاد میں)

صبا نے گلشن میں
لالہ و گل کے ساتھ چلنے کا تجربہ آج پھر کیا ہے
ہجوم میں چند نام رکھنے کا فائدہ کچھ نہیں تھا لیکن
حسین الفاظ مجھ کو جتنے بھی یاد تھے
میں نے ان سے منسوب کر دئے۔
تاکہ لطف وابستگی میں کوئی کمی نہ آئے۔
انھیں وہ انداز میں نے بخشے
ملائکہ جن کے ذکر سے سرفراز ہوتے رہے ہیں اکثر
خرام تازہ سے ان کو میں
جمال آگیں بنایا راہوں کی سختیوں میں
میں ہم سفر ان کا بن گیا
میرا ذوق ہمسائیگی فزوں تر تھا فہم و دانش کی رفعتوں سے
مگر جوں ہی ایک موڑ پر ہم رکے تو میں تھا
مرا ہی سایہ، جو تیرا تھا
تمام سایوں کا منجمد صرف اک ہیولا
جہاں پہ اب میں کھڑا ہوں وہ کونسا جہاں ہے
یہ وقت ہے یا رواں دواں ساعتوں کا ریلا
جو چھوڑ آیا ہوں اپنے پیچھے وہ اجنبی تھے۔
جو مجھ کو آگے ملیں گے وہ میرے کون ہوں گے۔
شعور ہوں اپنی ذات کا، اس وجود کا
جو ہماری ہر انتہا سے شائد عظیم تر ہے
رفیق مجھ سے بچھڑ گئے تشنۂ خدا تھے
میں تشنۂ زندگی تعاقب میں خدا کے مانند بیکراں ہوں ▲

ساجدہ زیدی

سلیمان اریب کے نام

(ان کی علالت سن کر)

تم مرے دوست ہو نہ ساتھی
نہ تم سے چشمک معاصرانہ
نہ قند جمع نہ تلخ باتیں
نہ لمحۂ رفاقت کی نرم یادیں
نہ تم سے وابستہ کوئی بھی سلسلہ ہے پہروں کی گفتگو کا
نہ کانگت اور نہ دوستی کا،
نہ گروہ بندی نہ مصلحت کا،
نہ ہم نے لفظ معانی و فکر و حسن احساس کی گرہیں
کبھی بھی کھولیں ہیں مل کے شائد۔
نہ ہم نے ایک دوسرے کو جانا۔
نہ اس کی بے ساختہ ضرورت کبھی بھی محسوس کی ہے شائد
مگر مجھے لگ رہا ہے ایسا۔
کہ تم بھی اس راہ کے مسافر ہو۔
جس کی قدموں نے میرے چھانی ہے خاک برسوں
کہ تم نے بھی آبلوں سے پاؤں کے، ریت میں گل کھلائے اکثر
کہ تم نے بھی ریگزار ہائے سراب کے پیچھے پیچھے چل کر۔
وہ چند پتھر جو میں نے پگھلائے ہیں حقیقت کی بھٹیوں میں
تمہارا بھی ان سے کوئی رشتہ ہے۔

تم بھی ایسے ہی چند پتھر
خود اپنی فکر رسا کے آتش کدہ میں پگھلا رہے ہو شائد۔
اک ان سنی ان کہی حقیقت
مجھے تمہاری حیات و موت وجود کی کشمکش سے نزدیک لا رہی ہے
کہ جیسے صدیوں سے میں تمہیں جانتی ہوں
صدیوں سے میرا اس کشمکش سے ہے اک عجیب رشتہ
ہزار مایوسیوں کے پردے سے چھنتی اب بھی
تمہاری بے لوث مسکراہٹ کی نرم کرنیں
دکھا رہی ہے عجیب منظر
تمہاری ہیکل حیات سے اٹھتے
موت کے گرم تند شعلے
جلا رہے ہیں نظر کا دامن۔
میں تم سے مایوس ہوں نہ خود سے نہ زندگی سے
مگر عدم اور وجود کے بے نشان ساحل پہ
دم بخود ہوں۔

▲▲

حمید الماس

ماتمِ اک شہرِ آرزو

(اریب کی نذر)

بزمِ دنیا میں کسی یار نے پوچھا بھی نہیں
کیا ہوا تم جو فسردہ سے نظر آتے ہو
کیوں اکیلے ہی نکل پڑتے ہو بازاروں میں
شہر سے دور سرِ شام کہاں جاتے ہو
کس طرح راہ پہ لاتے ہو طبیعت اپنی
دلِ برباد کو کن کھیلوں سے بہلاتے ہو
میکدہ میں کسی بدمست نے ٹوکا بھی نہیں
کیوں تہی جام سرِ رطلِ گراں بیٹھے ہو
رخ ہر رند چراغاں کا سماں ہے لیکن
دوست تم کس لیے فریاد کناں بیٹھے ہو
سرِ دہلیز یہ اک اک کو تکنا کیسا
تم کو کچھ اپنی خبر ہے کہ کہاں بیٹھے ہو
ہائے کس طرح سناؤں سببِ تشنہ لبی
میری مئے میری صراحی میرا ساغر گم ہے
کھو گئی جرأت و سرمستیٔ پیمانہ زنی
میری بہکی ہوی راتوں کا مقدر گم ہے
وہی میخانہ کی دیوار ہے لیکن خم ہے
وہی صہبا ہے مگر نشہ کا جوہر گم ہے

عادل منصوری

اریب صاحب کی یاد میں

دور اُفق پر لہو لہو چہرہ
جانے کب سے پکارتا ہے کسے
کوئی ہو تو جواب دے اُس کو

دور آواز کے اندھیروں میں
لفظ چپ چاپ سرنگوں تنہا
منتظر ہے کہ کوئی بول پڑے
پیالوں میں پگھلتے سیپارے
بڑھتی لمبائی لفظ کی پیہم
رات میں رات .... مسلسل رات
آخری بس تو کب کی جا بھی چکی
کب تلک یوں کھڑے رہو گے یہاں
نیند دروازہ کھولتی ہی نہیں

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)۔ ادارہ

نام کتاب "مدرسۂ عمل" مصنف: اڈولف فیریر، ترجمہ و ترتیب شیخ غلام حسین، ڈیمائی سائز صفحات ۱۸۲، اشاعت ۱۹۷۹ء طباعت آفسیٹ قیمت: ۹ روپے ۵، پیسے ناشر ترقی اردو بورڈ، ویسٹ بلاک ۸، آر، کے پورم نئی دہلی ۲۲۔

زندگی بجائے خود مدرسۂ عمل ہے، اور تعلیم۔ زیر نظر کتاب بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور کی اہم تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ بقول نامور ہندوستانی ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین مرحوم "ہمارے ملک کے موجودہ تعلیمی دور میں اس ترجمہ کی اشاعت کی ایک خاص اہمیت ہے، ہم بھی اس وقت یہی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے ملک کی تعلیم کوئی بنیادوں پر قایم کریں اور اس میں اور زندگی میں جو خلیج حائل ہو گئی ہے اس کو پاٹیں، زندگی میں کام کاج ہے، جد و جہد ہے، لوگوں سے میل جول ہے، حقوق و فرائض کی تقسیم ہے۔ کھیتی باڑی، دست کاری اور صنعت و حرفت کے دھندے ہیں، غریبوں کی زندگی کے کٹھن اور تلخ مسائل ہیں کام کرنا اور کام کر کے سیکھنا ہے۔ بوجھ اٹھا کر قوت پیدا کرنا ہے، لیکن "مدرسہ" میں کام کے بجائے محض پڑھنا لکھنا ہے، جد و جہد کے بجائے جمود ہے، میل جول اور حقوق و فرائض کے بجائے درسی کاموں کا بندھا ٹکا معمول ہے، آزادی اور ذمہ داری اور عملی مشاغل کی حیات بخش فضا کے بجائے بے جان ٹائم ٹیبل ہے، جس کی وجہ سے نہ اپج پیدا ہو سکتی ہے نہ ذمہ داری کی صلاحیت۔ غرض سیدین صاحب نے ملک کے ناقص اور ادھورے تعلیمی نظام کے پس منظر پر مکمل بحث کرتے ہوئے زیر نظر کتاب "مدرسۂ عمل" کی افادیت، مقصدیت اور ضرورت کو افزوں کیا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ دستی کام، سماجی مشاغل، ذہنی نشو و نما کو بچوں اور بالغوں کی نفسیات کے آئینے میں وضاحتاً تفہیم کی گئی ہے۔ اساتذہ کے لیے یہ کتاب رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے۔ "مدرسۂ عمل" کے دوسرے حصے میں جدید تعلیمی ضرورتوں اور نئی تعلیم کے رموز پر مہاتما گاندھی، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر بھگوان داس کی منتخب اور بصیرت افروز تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ جن کے بین السطور میں فریر کی دانشورانہ صلاحیتوں کو قابل قبول بنایا گیا ہے۔ ترقی اردو بورڈ نے تعلیم جیسے اہم موضوع پر ایک عمدہ کتاب شائع کر کے اردو والوں اور اساتذہ کی بے نہایت رہبرانہ خدمت کی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ تعلیم کو جدید تقاضوں سے مربوط کرنے میں معاونت کرتا ہے (د۔خ)

نام کتاب "نورتن کہانیاں" (بچوں کے لیے) مصنف: محمد بخش مہجور، انتخاب: شمیم احمد، ڈیمائی سائز، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۶ روپے ۵۰ پیسے، اشاعت: ۱۹۸۰ء طباعت آفسیٹ، ناشر، ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر، کے پورم نئی دہلی۔ ۲۲

محمد بخش مہجور کی کتاب "نورتن" کو ادب اطفال کے باب میں ادب عالیہ کا مقام حاصل رہا ہے۔ مہجور کی سینکڑوں کہانیاں ملک کے مختلف حصوں کے بچوں میں شوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں، ہندوستانی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ ان تمام کہانیوں میں نئی نسلوں کے پند و نصائح کے ساتھ ساتھ زندگی کے نشیب و فراز کی باتیں قصوں، داستانوں اور کہانیوں کے انداز میں دل نشیں کرانے کی سعی مشکور روشنی کے افق بناتی نظر آتی ہے۔

شمیم احمد نے نورتن کی قدیم لکھنوی زبان کو سہل اور عام فہم بنانے کی سعئ مشکور انجام دی ہے۔ مجموعی طور پر یہ تمام کہانیاں پُرلطف اور دلچسپ ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کا فکشن ابتدا ہی سے عمومی طور پر دلچسپیوں کا حامل رہا ہے۔ کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں عقلمندوں کی کہانیاں درج کی گئی ہیں۔ شیر، چیتا، لومڑی، گائے، بکری، بڑھئی، عورت، سنار کے کرداروں سے داستانوں کو دل نشیں بنایا گیا اور عقل و دانش کے رموز کو واضح کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں مختلف اور متنوع کرداروں کے سہارے انصاف، امانت، بھائی چارگی، حفظ المراتب اور سچائی کی تفہیم کی گئی ہے۔ نورتن کہانیوں کا دلچسپ باب "بے وقوفوں کی کہانیاں" ہے۔ جنھیں کیا بچے اور کیا بڑے سبھی پڑھتے وقت کیف محسوس کرتے ہیں۔ چوتھا باب ظریفانہ داستانوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ آخر کے دو باب افیونیوں اور کنجوسوں کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مجموعی طور پر ابتدائی اور وسطانی درجوں کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب مفید قرار پاتی ہے۔ ایسے درس گاہوں میں جنرل نالج کے طور پر پڑھایا جا سکتا ہے۔ قصے کہانیوں کے ذریعے کام کی باتوں کا ابلاغ عصری تعلیم کا ایک اہم باب قرار دیا گیا ہے اس افادی پہلو کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ کتاب جلی حروف میں ستھری چھپی ہے اور ہر اعتبار سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی اہل قرار پاتی ہے۔ جناب شمس الرحمن فاروقی ناظم اعلیٰ ترقی اردو بورڈ حکومت ہند اس کے لیے مبارکباد کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

نام کتاب "**جوئے سبز**" (شاعری) حمید الماس، ڈیمائی سائز صفحات ۶۴، اشاعت: دسمبر ۱۹۷۹ء، تعداد (۵۰۰) قیمت ۶ روپے ناشر زبیدہ الماس، حیدرآباد۔ ملنے کا پتہ: اردو لائبریری سنٹر سٹی مارکٹ بنگلور۔ ۲ (کرناٹک) ——

حمید الماس دور حاضر کے باشعور اور صاحب فکر و نظر شاعر، کنڑی ادبیات کے نبض شناس مترجم اور قومی و ملی احساس رکھنے والے حرکیاتی قلم کار کی حیثیت میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تین شعری تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ جوئے سبز ۲۰ نظموں کا گلدستہ ہے۔ ان نظموں میں ایک نظم فارسی سے ترجمہ ہے۔ نظم "کرناٹک" کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ اسے آصف جاہ اوّل نواب میر قمر الدین علی خاں شاکر نے خطۂ کرناٹک پر اپنے تاثرات "از دل ریزد و بر دل خیزد" کے انداز میں نظم کئے ہیں اور ترجمہ میں الماس نے اصل کے حسن کو برقرار رکھا ہے۔ حمید الماس ارض کرناٹک کے فرزند ہیں انھوں نے اپنی سرزمین کو ایک علاحدہ نظم میں بھرپور خراج ادا کیا ہے اور کرناٹک کی صباحتوں، ملاحتوں اور وہاں کی حیات افروزیوں کے نئے افق کو مسرتوں اور ترقیوں سے ہمکنار بتایا ہے۔ دیگر نظموں میں غنائیہ روشن قدم، پاکستانی دوستوں کے نام، رشتۂ درد اور پھر ہارے خون سے تازہ ہوا رخسار وقت (غنائیہ) مہربان آنکھیں اور گنج سوختہ، وطن دوستی، قومی یگانگت اور گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کو اجالتی اور متاثر کرتی اہم تخلیقات نے جوئے سبز کو شادابی اور عطر بیزی عطا کی ہے۔ ایک نظم "کسان" ہے جو بہ ظاہر خوب ضرور ہے، کاش ہمارے معاشرے میں عملی طور پر کسان کو یہ منصب حاصل ہو، وہ بیچارہ بھی وائٹ کالر لوگوں کی طرح تشنہ کام اور آرزوں کا متلاشی نظر آتا ہے۔

قومی اور ملی احساسات کو فن شعر کا حصہ بناتے ہوئے عمومی طور پر گہرائی اور گیرائی کو تج دیا جاتا ہے اور سطحی جذباتیت کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے حمید الماس نے اس موضوع پر سنبھل کر قلم اٹھایا ہے اور ہجوم سے بچ کر فکر کی صلابت سے "جوئے سبز" کو شاداب اور گلبار کیا ہے (و۔خ)

اردو نامہ

اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

وقار خلیل

۲؍اگسٹ:۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے لیس وینکٹ رام ریڈی میموریل ریسرچ سنٹر واقع پرانی حویلی میں تعلیم بالغان کے تحت ابتدائی اردو کی تدریس کا انتظام کیا گیا ہے۔

۴؍اگسٹ:۔ انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کی عاملہ کے اجلاس میں اردو مدرسوں کی زبوں حالی، ناقص عمارتوں اور خراب فرنیچر پر اظہار تاسف کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی طرف توجہ دہانی کے لیے حکومت سے نمایندگی کا فیصلہ کیا گیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ صدر انجمن نے صدارت کی۔ جناب غلام صادق الدین معتمد انجمن نے بتایا کہ مغلپورہ میں اردو گھر کی تعمیر کا کام ستمبر میں شروع کر دیا جائے گا۔

۵؍اگسٹ:۔ ریاستی وزیر مسلم اوقاف جناب احمد شریف نے اسماء اردو اسکول گولکنڈہ کے دوسرے سالانہ جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کی افادیت پر روشنی ڈالی اور ریاستی حکومت کی اردو دوستی کا ذکر کیا۔ جناب منظور ظفر نے جلسہ کی صدارت کی اور بانی مدرسہ غلام صادق الدین نے رپورٹ سنائی۔

۶؍اگسٹ:۔ مترنم اور شاعروں کے مقبول سخنور جناب بسمل ﷲ تابی کی علالت سے متاثر ہو کر ان کی مالی اعانت کے طور پر ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کی خواہش پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے ۵ ہزار روپے کی امداد دی گئی جناب یم باگا ریڈی صدر اردو اکیڈمی نے اس کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے میں جب کہ وہ اترپردیش کے گورنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ جناب بسمل کی علمی اور شعری حلقوں میں بے پناہ مقبولیت سے گہرا تاثر لیا تھا اور ہمارے اردو دوست چیف منسٹر نے بسمل صاحب کے افراد خاندان کی درخواست پر اکیڈیمی کو توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ شخصی طور پر بھی ایک ہزار روپے کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔

۷؍اگسٹ:۔ ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کا اردو ترجمان ماہنامہ آندھرا پردیش جو اب تک ٹائپ میں چھپتا تھا، جولائی سے آفسٹ پریس میں شائع ہو رہا ہے۔ ان دنوں اس رسالہ کی ادارت جناب ملک محمد علی خاں انجام دے رہے ہیں

۸؍اگسٹ:۔ ڈاکٹر چنا ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش نے قطب شاہی عہد کی تاریخی مکہ مسجد کے احاطہ میں نو تعمیر شدہ کتب خانہ اسلامیات کا افتتاح کرتے ہوئے قومی یکجہتی کے فروغ پر زور دیا اور عہد آصفی کے ہندو مسلم اتحاد کی روایت کو خراج تحسین ادا کیا۔ جناب ظہیر احمد صدر نشین نظامس ٹرسٹ نے صدارت کی۔ جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری نے بتایا کہ کتب خانہ اسلامیات مکہ مسجد میں $3\frac{1}{2}$ ہزار کتب موجود ہیں۔

۱۴؍اگسٹ:۔ محب اردو آنجہانی مسٹر کے وی رنگا ریڈی ریاستی ڈپٹی چیف منسٹر کی یاد میں ایک محفل شعر جناب یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈمی کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ جناب ظہیر احمد چیرمین نظامس ٹرسٹ اور مسٹر پی گنگا ریڈی ریاستی وزیر سیول سپلائز مہمانان خصوصی کی حیثیت میں شریک محفل رہے جناب صدر اور جناب فکر حیدرآبادی کنونر جلسہ نے آنجہانی ریڈی صاحب کی اردو دوستی کو خراج عقیدت ادا کیا اس موقع پر ایک سوانحی کتاب بھی ریلیز کی گئی۔ محفل شعر میں جناب ندار افسر، خیرات ندیم کنول پرشاد کنول، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، علی سرور، عزیز النسا، صبا، امام الدین فدا

اور دیگر شعراء نے کلام سنایا۔ وقار خلیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور جناب علی احمد صدیقی نے خیر مقدم کیا۔

۱۵ ؍ اگست :- یوم جمہوریہ کے پُرمسرت موقع پر ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام مخدوم ادبی ایوارڈ برائے سال ۱۹۸۰ء ایک تاریخی جلسۂ عام میں ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے ملک کے دانشور شاعر اور ترقی پسند نقاد جناب پدم شری علی سردار جعفری کو پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت صدر اکیڈیمی جناب یم باگا ریڈی نے کی اور ایک سپاسنامہ سناتے ہوئے مخدوم اور جعفری کی گراں قدر خدمات کو زبردست خراج ادا کیا اور کہا کہ اردو دنیا کا سب سے بڑا انعام اردو اکیڈیمی کی طرف سے جناب جعفری کو پیش کرتے ہوئے دلی مسرت ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر چنا ریڈی نے حیدرآباد کے اردو ماحول اور ریاست میں اردو تحریک پر اظہار مسرت کیا اور مخدوم کی یاد کو بھرپور خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے جعفری صاحب کو اس ایوارڈ پر مبارکباد دی۔ جناب سردار جعفری نے ایوارڈ کو قبول کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم اور حیدرآباد سے ان کی اٹوٹ محبت کے جذبات کو یہ ایوارڈ مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اس موقع پر سردار جعفری نے حیدرآباد کی دیرینہ ادبی خدمات کو تاریخ ادب اردو کا کارنامہ قرار دیتے ہوئے چیف منسٹر کی اردو دوستی کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ایک تجویز رکھی کہ اردو ادب کے کلاسیکی سرمایہ کو ۵ سالہ منصوبہ کے تحت حیدرآباد سے شائع کیا جانا چاہیے۔ جعفری صاحب کی اس تجویز کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے چیف منسٹر آندھرا پردیش ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے برسر موقع سالانہ ایک لاکھ کی گرانٹ اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیئے جانے کا اعلان کیا۔ تلگو ملک الشعرا ڈاکٹر داسرتھی، مولانا حافظ ابو یوسف اور چیرمین مخدوم ایوارڈ کمیٹی ڈاکٹر زینت ساجدہ کے علاوہ ڈائرکٹر و سکریٹری اردو اکیڈیمی جناب چندر سری واستو نے بھی مخاطب کیا۔

● آندھرا پردیش آرٹ اکیڈیمی کے زیر اہتمام مشاعرہ جشن آزادی نواب طاہر علیخاں رکن حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر یم بالیا چیرمین "صدا" نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے تحریک آزادی میں اردو شعر و ادب کی رہنمایانہ خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس مشاعرہ میں سعید شہیدی، اوج یعقوبی، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، امان ارشد، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، رئیس اختر، امام الدین فدا، صادق نقوی، فیض الحسن خیال، عزیز النساء صبا اور ڈاکٹر اندو وشسٹ نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر نے معتمدی کے فرائض انجام دے۔ جناب اختر عثمان نے شکریہ ادا کیا۔

۱۶ ؍ اگست :- انجمن اردو برقی بورڈ کے زیر اہتمام عید ملاپ اور جشن آزادی کی مسرت میں ایک مشاعرہ جناب امیر احمد خسرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی نے اس مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ محکمہ برقی نے علم کی روشنی پھیلانے کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے ایک اچھا اقدام کیا ہے۔ جناب اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے بھی اس محفل کو مخاطب کیا اور حیدرآباد کے شعری و ادبی ماحول کو خراج ادا کیا۔ مخدوم ایوارڈ یافتہ شاعر جناب علی سردار جعفری کا اس مشاعرہ میں خیر مقدم کیا گیا اور ان کی گلپوشی کی گئی۔ ابتدا بزم اردو کے معتمد جناب میر کمال الدین علی خاں نے انجمن اردو برقی بورڈ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ انجمن کی طرف سے ماہانہ ادبی و شعری محفلوں کے علاوہ اردو تلگو تعلیم بالغان اور لائبریری کی اسکیمات بھی عنقریب روبہ عمل لائی جائیں گی۔ اور ایک ادبی رسالہ بھی شائع کیا جائے گا۔ اس مشاعرہ میں ممتاز قادری، سوز عابدی، نصیرالدین بسمل، بشیر وارثی، قدر عریضی، سیف حموی، خسرو، خیرات ندیم، مختار خلیل، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، علی سرمد، سعید شہیدی، رئیس اختر، اسد انصاری نے کلام سنایا۔

۲۳ ؍ اگست :- اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ۱۹۷۸ء کی مطبوعات پر بصراحت ذیل مصنفوں کی مطبوعات پر انعامات کا

اعلان کیا ہے دو دو ہزار روپے کے (۷) انعامات مسز زادرج یعقوبی (غنچۂ لبستہ) شاعری (علی الدین نوید (صدف تمام ریت ریت) (شاعری) ڈاکٹر حسینی شاہد (شاہ معظم) (تحقیق) ڈاکٹر افضل الدین اقبال (مدراس میں اردو) (تحقیق) محسن علی (لہو آستین کا) (ناول)، قدیر الزماں (پنجرہ کا آدمی) (ڈرامہ) محمد تقی شاہ (انڈین کاجو) (انشائیہ) ——

ایک ایک ہزار روپے کے گیارہ انعامات:

مظفر مجاز (موسم سنگ) (شاعری) رؤف خلش (نئی رتوں کا سفر) (شاعری) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (ادبی مطالعہ) (تنقید) ڈاکٹر ثمینہ شوکت (حسن و لال شادانی) (تحقیق) نعیم زبیری (گونجتے دریچے) (فکشن) نجمہ نکہت (سیب کا درخت) (فکشن) ڈاکٹر اصغر خانم (ژونگ کا نظریہ ٹائپ) (نفسیات) فرید مرزا (سفرنامہ) علی افسر (تجلیات رسالت) (سیرت) وقار خلیل (لڑائی ڈالی پھول) (ادب اطفال) مریٹ حیدرآبادی (دھرگھسیٹ) (طنز و مزاح) ——

۵۰۰ روپے کے ۲۶ انعامات: اسلم عمادی (اجنبی پرندے) (شاعری) رئیس اختر (آئینۂ دل) (شاعری) صلاح الدین نیر (شکن در شکن) (شاعری) رشید عبدالسمیع جلیل (اضطراب دل) (شاعری) ناصر کرنولی (نفس نفس) (شاعری) محسن جلگانوی (الفاف) (شاعری) صاحب حیدرآبادی (انجمن در انجمن) (شاعری) ڈاکٹر حبیب ضیاء (مہاراجہ کشن پرشاد) (تحقیق) ڈاکٹر اکبر علی بیگ (مرزا علی لطف) (تحقیق) میر سراج الدین علی خاں (ذکر سالک) (تحقیق) ڈاکٹر صابرہ سعید (اردو ادب میں خاکہ نگاری) (تنقید) بیگ احساس (خوشۂ گندم) (فکشن) مظہر الزماں خاں (ہارا ہوا پرندہ) (فکشن) جمیل شیدائی (دلِ گفتار) (ڈرامہ) اظہر افسر (زندگی کی خوشبو) (ڈرامہ) شجاع احمد قائد مرحوم (سیاہ آنسو) (ڈرامہ) طیبہ خسرو (سرِ مژگاں) (فکشن) عزیز احمد جلیلی (ہندوستانی افسانے) ڈاکٹر سکندر حسین (ظہور ترتیب سائنس) عابد انصاری (حیرت انگیز معلومات سائنس) ڈاکٹر غوث الدین (ٹرکش یا نہ طب) شاہد عظیم (پرندوں سے جانوروں تک) (معلومات عامہ) بانو طاہرہ سعید (سات دوست) (ادب اطفال) ارشد علی خاں (شوشے) (طنز و مزاح) پاگل عادل آبادی (چوں چوں کا مربہ) (طنز و مزاح) ——

بیرون ریاست مندرجہ ذیل ۵ مصنفین کو ایک ایک ہزار روپے:- اعجاز صدیقی مرحوم (کرب خود کلامی) (شاعری) اختر انصاری (غزل اور غزل کی تعلیم) (تنقید) کلام حیدری (الف لام میم) (فکشن) مشتاق احمد (مولانا آزاد) (سوانح) ایس ایم آئی ساجد (سپنے سلونے) (ادب اطفال)۔

۵۰۰ روپے کے ۹ انعامات: مظفر حنفی (پرچم بہ پرچم) (شاعری) اختر قادری (آثار خیر) (تنقید) ڈاکٹر عصمت جاوید (وجدان) (تنقید) ظفر ادیب (یوں سوچا تھا) (ناول) حفیظ مالیگانوی (نقوش) (تذکرہ) ریاض احمد خاں (زمیندار کی حویلی) (ادب اطفال) رضاء الجبار (نئے دستخط) (فکشن) رام لال نابھوی (تبسم) (طنز و مزاح) پریم پال اشک (خلیے کیسے بنتے ہیں۔ معلومات)

۲۴ اگسٹ:- نامور نقاد اور جدید لہجے کے ممتاز سخن ور ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے پہلے شعری مجموعہ "پہلی کرن کا بوجھ" کی ایوانِ اردو میں جدید اور معروف شاعر جناب مصحف اقبال توصیفی کے ہاتھوں رسم رونمائی انجام پائی۔ جناب علی احمد جلیلی نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔ جناب سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس، معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو نے ڈاکٹر تبسم کی ادارہ کی طرف سے گلپوشی کرتے ہوئے ادارہ اور سب رس سے ان کی وابستگی اور علمی و ادبی دنیا میں ان کی قدر و منزلت کا ذکر کیا۔ ممتاز افسانہ نویس جناب عوض سعید نے خوب صورت خاکہ سنایا۔ رؤف خلش اور یوسف اعظمی صاحبان نے ڈاکٹر مغنی تبسم کی شاعری پر مضامین سنائے۔ وقار خلیل اور مرزا سرفراز علی صاحبان نے نذرانۂ سخن پیش کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنا کلام سنایا۔ قدیم ترقی پسند اور جدید مکاتیب فکر و فن کے

شیدائیوں اور محبانِ اردو نے اس تقریب میں شرکت کی۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور وقار خلیل نے شکریہ ادا کیا۔

۲۸ راگسٹ: ممتاز شاعر جناب صلاح الدین نیر نے ریاستی اردو اکیڈیمی کی طرف سے دیا گیا ادبی انعام واپس کرتے ہوئے اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے صدر نشین کے نام ایک بیان میں احتجاج کیا ہے کہ مجلس اور عاملہ نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتی اور جانبداری کو روا رکھا۔

۳۰ راگسٹ: مولانا حافظ ابو یوسف صدر نشین مجلس انتظامی اردو اکیڈیمی نے وضاحتی بیان جاری کرتے ہوئے بتایا کہ اکیڈیمی نے انعامات کی تقسیم میں جمہوری طریقۂ کار پر عمل کیا ہے اور مجلس کے فیصلوں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ہے۔

● سالار جنگ میوزیم کے اہتمام ایک محفل شعر منعقد ہوئی جس میں مسرز صلاح الدین نیر، خیرات ندیم، ڈاکٹر غیاث صدیقی، روشن خیال کے علاوہ چند سندھی شعرا نے کلام سنایا۔ مسز سری نواس لاہوٹی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۳۱ راگسٹ: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب فضل الرحمٰن چیف ایڈیٹر اردو انسائیکلوپیڈیا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ احباب بھارت چندر کھنہ نے فکاہیہ اور ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے ناول اور دل چسپی کے موزوں پر پُر مغز مقالہ سنایا۔

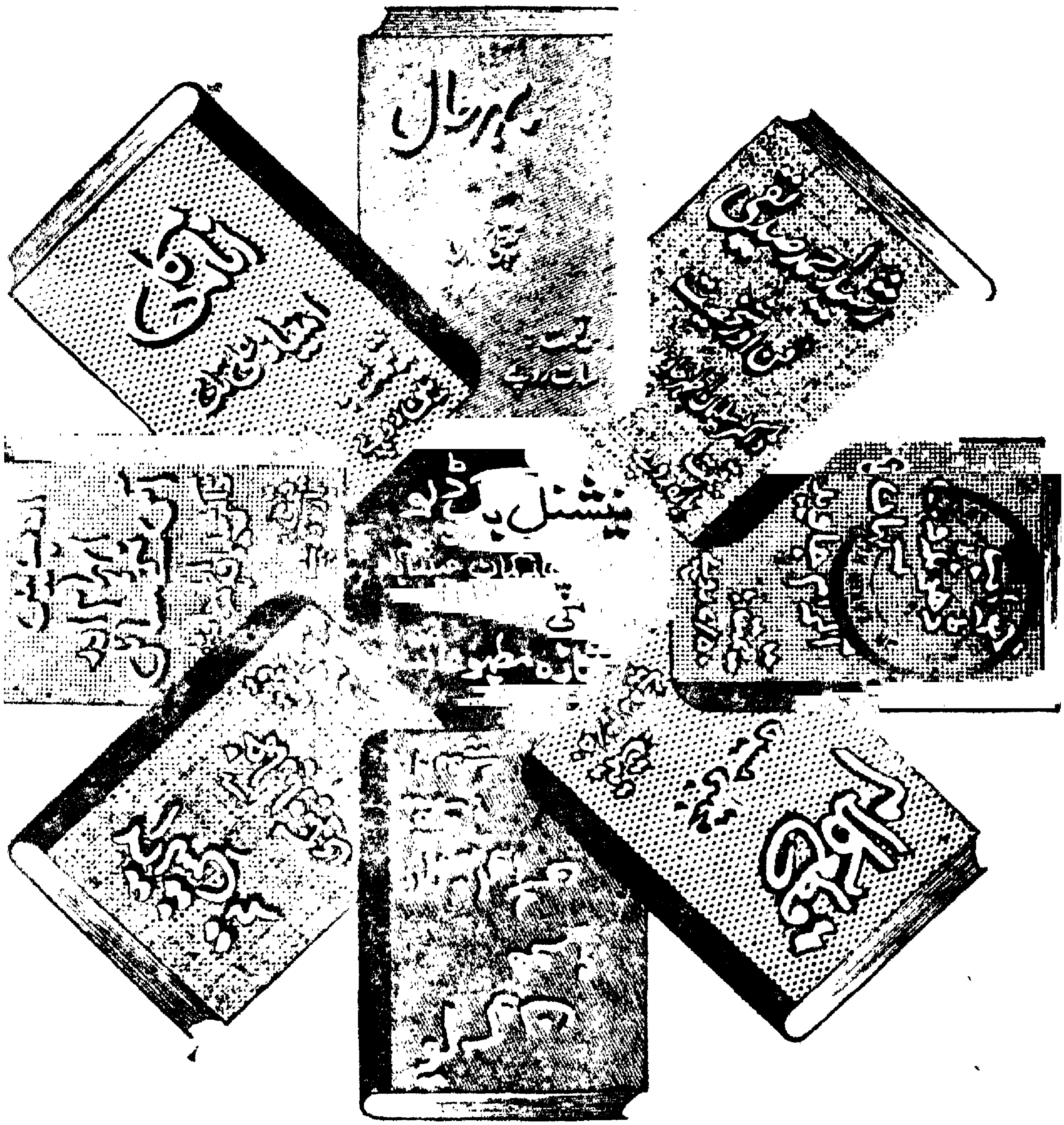
جناب خیرات ندیم کی صدارت میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مسرز خیرات ندیم، محمد منظور احمد، بانو طاہرہ سعید، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، رحمٰن جامی اور روشن خیال نے کلام پیش کیا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اعزازی اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

TEMBER 1980

R. N. 18822/2
Regd. No. 13

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P.)



National Fine Printing Press, Charkaman Hyderabad—500 002 A. P

۱۰



31.12

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زؔ

سن اجرا: ۱۹۳۸ء

فون ۳۸۴۶۹۱

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء شمارہ ۱۰

مدیر اعزازی ڈاکٹر مغنی تبسم
معاون مدیر وقار خلیل

فی پرچہ ۱/۷۵ : زر سالانہ: ۲۰ روپے، کتب خانوں و اداروں سے ۲۵/ روپے
بیرونی ملکوں سے: مشرق وسطیٰ ۱۰ ڈالر، پاکستان ۸ ڈالر، انگلستان (ہوائی ڈاک) ۶ پونڈ

ادارہ ادبیات اردو • پنجہ گٹہ • حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

ترتیب

اردو املا: جدید و قدیم مسائل — یس اے صدیقی ۳
غزلیں — ساقی فاروقی ۱۱
شمس الرحمن فاروقی
حضرت بندہ نواز اور دکنی اردو — وہاب عندلیب ۱۲
غزلیں — میر تقی علی خاں ثاقب ۱۶
اردو کی پہلی خاتون صاحب دیوان شاعر: لطف النسا امتیاز — ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری ۱۷
غزلیں — عزیزہ احمد جلیلی، محمد منظور احمد ۲۴
روزنامچہ کا ادبی جائزہ — مجید بیدار ۲۵
ترائیلے — رؤف خیر ۲۸
خوابوں کا بازار، سمندر کے آنچل پر (نظمیں) یوسف اعظمی ۲۹
غزلیں — شہپر رسول، مظفر النساء ناز ۳۰
نام کی کہانی — خالدہ اصغر ۳۱

(نقد و نظر)

نئی کتابوں پر تبصرے — وقار خلیل ۳۲

(اردو نامہ)

حیدرآباد کی ادبی خبریں — وقار خلیل ۳۸

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲

آندھرا پردیش ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے!



یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک' اکیلے تھے لیکن ہم اپنی بہترین صلاحیتوں اور اپنے مخصوص دائرہ کار کے تحت ہمیشہ ایسی کوشش کرسکتے ہیں۔

آندھرا پردیش نے ایسا عمل عیدالفطر کے روز ۱۳؍اگسٹ کو کر دکھایا جب چیف منسٹر ایک یادگار عید ملاپ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ شامل ہوئے۔

آندھرا پردیش نے دوبارہ ۲۳؍سپٹمبر کو یہ کام کیا جب صرف حیدرآباد میں دس لاکھ سے زائد ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر گنیش مورتیوں کے وسرجن کے دن گنیش تیوہار کی خوشیاں بانٹیں۔ چیف منسٹر نے کئی پر تھکن لیکن مسرت بخش گھنٹے ان کے درمیان گزارے یہ ایک بے نظیر موقع تھا۔

گاندھی جی نے ہمیں کہا تھا کہ ہم سب خدا کے بچے ہیں۔ آندھرا پردیش میں ہم نے اس بات کو اپنے چھوٹے پیمانہ پر ثابت کر دیا ہے۔

اس روایت کو برقرار رکھیے

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش

یس اے۔ صدیقی

اردو املا۔ جدید و قدیم مسائل

اردو رسم الخط اور املا کے مسائل پر عرصے سے لکھا جا رہا ہے اور ماضی قریب میں تو اس پر اس درجہ خصوصی توجہ دی گئی ہے کہ بگمان اردو املا کے مسائل طے ہو چکے ہیں۔ لیکن خود املا ہے کہ ع ۔ "آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز"۔ یہ عدم فراغت کسی حد تک تو ہماری بے اصولی کا نتیجہ ہے لیکن بڑی حد تک اس کا سبب زبان کی ارتقا میں جو چیز سب سے زیادہ زود حس ہوتی ہے وہ اس کا نظام اصوات ہے جس کے لیے پروفیسر عبدالقادر سروری نے "ارتقائی صوتیات" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ بحیثیت اصطلاح یہ کس حد تک قابل عمل ہے قطع نظر اس سے خود اصطلاح میں اس تصور کی کتنی سمائی ہے کہ ہر زبان کا صوتی نظام انتقال پذیر ہوتا ہے۔ جب کہ رسم الخط کے ارتقا کی رفتار نہایت سست ہوتی ہے۔

لیکن اردو رسم الخط نے سست رفتاری کے باوصف ارتقا کی ایک طویل منزل طے کی ہے۔ اگرچہ ارتقا کا ایک مرحلہ اس نے ایران ہی میں طے کر لیا تھا۔ یعنی پ چ گ د ژ، جو اردو کے اہم ترین آریائی مصمتے ہیں ان کے املا کا مسئلہ تو ایران ہی میں طے ہو گیا تھا اور قیاس یہ ہے کہ ایران میں یہ کوئی دشوار گزار مرحلہ نہ رہا ہوگا باوجود اس کے کہ فارسی آریائی خاندان کی زبان ہے جبکہ رسم الخط سامی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ دراصل یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ عربی اور فارسی اردو مختلف خاندانِ السنہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن املا کی سطح پر ان زبانوں کے درمیان مصوتوں کا نہیں بلکہ مصمتوں کا فرق رہا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں مصوتوں کو کبھی کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی جس کی وجہ سے عربی میں مصوتوں کے لیے نہ تو باقاعدہ حروف ہیں اور نہ ان کے تحریری اظہار کو لازمی سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی رسم الخط میں حرف الف ہی ایک حرف مصوتہ ہے اور اگر اس علامت کی کثرتِ استعمال کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ بھی ایک منفرد حرف کے بجائے املائی علامت کی حیثیت میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ لفظ کی ابتدا میں کسی بھی مصوتے کو الف کے بغیر لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ رہا و اور ی کا معاملہ تو یہ حروف بھی دوہرے عمل کا شکار ہیں کیوں کہ ان سے نیم مصوتوں کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ املا کی یہ روایت رسم الخط کے ساتھ اردو میں بھی آئی اور مصوتوں کی انفرادی حیثیت اور ان کے تحریری اظہار میں یہاں بھی کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ غالباً یہی پس منظر ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کے مصوتوں کی تفریق پر کبھی کوئی بحث نہ ہو سکی ۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر زبان میں مصوتوں کی تعداد تو زیادہ ہوتی ہے لیکن تحریری علامتیں کم ہوتی ہیں اس کمی کو کہیں تو اعراب سے پورا کیا جاتا ہے اور کہیں ایک ہی علامت مختلف مصوتوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ آوازوں کے ساتھ یہ عمل اس نفسیات کا غماز ہے جس کے عقب میں یہ تصور پروان چڑھا کہ مصمتوں کے مقابلے میں مصوتوں

کی یا تو کوئی اہمیت ہوتی ہی نہیں یا ثانوی ہوتی ہے۔ عربی رسم الخط سے اس خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے جہاں خفیف مصوتوں کو تو لکھا ہی نہیں جاتا اور جن طویل مصوتوں کو تحریر کیا جاتا ہے ان کو بھی حروفِ علت کا نام دیا گیا ہے جب کہ مصمتوں کے لیے حروفِ صحیح کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اصطلاحیں دراصل زبان کے عمل ہی کا پتہ نہیں دیتیں بلکہ اس نفسیاتی عمل کی بھی عکاس ہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ مذہبی ضرورت کے پیشِ نظر مصوتوں کی اہمیت کو محسوس کیا گیا اور ایجاد و اختراع سے کام لے کر قرآنی تلفظ کی حد تک اعراب کا استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ مصوتوں کے لیے کچھ اور علامتیں وجود میں آگئیں لیکن تحریریں کو خاص پیش رفت نہ ہو سکی اور عربوں نے اسے جس منزل میں چھوڑ دیا تھا اردو میں بھی یہ مسئلہ آج تک اسی منزل میں ہے۔

ہندوستان میں بھی اس رسم الخط کا ارتقا صرف مصمتوں تک محدود رہا البتہ ایک بڑی پیش رفت جو یہاں ہوئی وہ خطِ نستعلیق کا مستقلاً رواج ہے۔ جب کہ ایران میں مختلف خطوں پر تجربے ہوتے رہے۔ من جملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ آج اردو رسم الخط اپنی اصل سے مختلف اور ترقی یافتہ ہے نیز ایک انفرادیت کا حامل ہے تاہم اس انفرادیت کا بنیادی سبب اردو کی وہ خالص ہندوستانی آوازیں ہیں جن کے تحریری اظہار میں اردو والوں نے وقتاً فوقتاً اجتہاد سے کام لیا۔ اور اپنے اس صوتیاتی شعور کا پتہ دیا جس کے نقوش اردو کی لسانی تاریخ کے آغاز ہی میں نظر آتے ہیں۔ ان نقوش کے تحقیقی مطالعے سے اردو املا کے ارتقائی مدارج کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو والوں نے اجتہاد کی اس تاریخ میں تجاہلِ عارفانہ سے بھی منہ نہیں موڑا ہے۔ ان دونوں امور کی وضاحت کے لیے میں یہاں اردو املا کے صرف ایک مسئلے کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ اور وہ ہے ہکار آوازوں کا تحریری اظہار۔

اردو میں ہکار آوازوں کا اظہار اپنے آغاز و ارتقا کی ایک تاریخ رکھتا ہے اور یہ تاریخ وہ ہے جو مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چوں کہ ہمارا مسئلہ اردو املا ہے نہ کہ اردو زبان۔ اس لیے یہ مطالعہ فارسی کی ان ترقی پذیر صوتی عادتوں سے شروع ہوتا ہے جو ابھی ہندوستانی آوازوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پائی تھیں۔ اردو کی تاریخ میں مرزا معز موسوی فطرت کا یہ شعر اکثر نقل کیا جاتا ہے:۔

از زلفِ سیاہِ تو بدل دوم پری ہے — در خانۂ آئینہ گتا جوم پری ہے

(گھٹا جھوم پڑی) (دھوم پڑی)

یا مولانا بہاؤالدین نے جب قطب الدین ایبک کو مخاطب کیا:۔

"اے بخشش تو لک (لکھ) بجہاں آوردہ"

اس طرح بابر جو ہندوستان ایک طویل عرصہ تک رہا تھا اور ہندوستان کے لسانی، تہذیبی اور جغرافیائی مزاج سے واقف تھا اس کا ایک مصرعہ حافظ محمود شیرانی نے نقل کیا ہے۔

مج کانہ ہوا کچھ ہوسِ مانک موتی

ان مثالوں میں خط کشیدہ الفاظ کا تلفظ اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ فارسی کی صوتی عادتیں ابھی خالص ہندوستانی آوازوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پائی ہیں۔ تاہم ان نو واردوں نے نئے صوتی ماحول سے بیگانگی بھی نہیں برتی بلکہ جس طرح انھوں نے ہندوستان کے لسانی و تہذیبی مزاج کو اپنایا اس کا ثبوت خود اردو زبان اور اس کا صوتی مزاج ہے۔ چنانچہ صوتی عادتوں کی یہ تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے بلکہ بہت جلد ان باہر سے آنے والوں نے یہاں کے لسانی میلانات سے سازباز کر لیا تھا جس کا ثبوت امیر خسرو کا کلام ہے (اگر یہ کلام انھیں کا ہے) لیکن صوتی ارتقا کے مطالعے میں جو ایک دشوار مرحلہ آتا ہے وہ اردو کے قدیم نمونوں کا اکثر جدید املا ہے اس مسئلے کا احساس خاص طور پر اس وقت ہوتا ہے جب قدیم اور اصل نسخوں تک رسائی ممکن نہ ہو۔ اور نئی کتابوں میں جو قدیم نمونے نقل کیے جاتے ہیں ان میں اکثر قدیم تلفظ کو جدید املا پر ڈھال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ آیا یہ واقعی ترقی پذیر صوتی عادتوں کا عمل ہے یا کتابت کا عمل ہے۔ مثلاً ہرات کے حکیم یوسفی جن کا عہد لودھی کے زمانے سے لے کر ہمایوں کے دور تک تھا ان کا ایک قصیدہ " در لغات ہندی " ہے اس کے دو شعر اس طرح نقل کیے گئے ہیں:۔

آنکھ چشم و ناک بینی بول ابرو ہونٹ لب
دند دنداں کا رہ گردن گوتہ زانو مونڈ سر
کھال پوست و مِنج مغز و استخواں گویند ہاڈ
انگلی انگشت باشد انگوٹہ انگشت نر

ان اشعار میں خط کشیدہ الفاظ ہکاری اور معکوسی آوازوں کو پیش کرتے ہیں جن کو غیر ہکار اور غیر معکوس استعمال کیا گیا ہے لیکن انھی اشعار کھال اور مونڈ جیسے الفاظ میں ہکار اور معکوس آوازوں کو پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان الفاظ کا جدید املا کتابت کا نتیجہ ہے یا واقعی یہ الفاظ اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ ہندوستان کی ہکار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان الفاظ کا جدید املا کتابت کا نتیجہ ہے یا واقعی یہ الفاظ اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ ہندوستان کی ہکار اور معکوس آوازیں بتدریج تلفظ پر اثر انداز ہوتی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے اکثر (خط کشیدہ) الفاظ کا تلفظ غیر ہکار اور غیر معکوس ہے اور کہیں اس کو اصل کے مطابق ادا کیا گیا ہے۔ اگر یہ املا اصل کے مطابق ہے تو ان مثالوں سے یہ قیاس کرنے میں مدد ملتی ہے کہ اردو میں ہکار اور معکوس آوازیں بتدریج داخل ہوی ہیں لیکن ماضی کا مطالعہ ہم چونکہ صرف تحریر کے واسطے سے کر سکتے ہیں اس لیے اردو کے محققین کو اس طرف توجہ دینی چاہیے کہ قدیم نمونوں کے حوالے دیتے وقت ان کے اصل املا میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ زبان کے لسانیاتی ارتقا کی تاریخ قدیم الفاظ کے اصل املا کی بنیاد پر ہی مرتب کی جا سکتی ہے۔

بہرحال سر دست ہم صرف ہکار آوازوں کے املا سے بحث کر رہے ہیں جو مخصوص ارتقائی منازل سے گزرا ہے۔ البتہ ان ارتقائی منازل کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اردو والوں کو جیسے ہی مخصوص آوازوں کی ہکاریت کا احساس ہوا ان کے املا کی طرف توجہ دی گئی اور اس سلسلے میں انھوں نے جس اجتہاد سے کام لیا اس کا ثبوت ھ کا استعما

ہے۔ یہ شکل براہِ راست عربی املا سے ماخوذ ہے چوں کہ عربی میں ہائے ہوز کے لیے بڑی حد تک اسی شکل کا استعمال ہوتا ہے۔ خود قدیم اردو میں اور غالباً عربی املا ہی کی پیروی میں ہائیہ آواز کے لیے ہائے دوچشمی ہی کا استعمال ہوا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے اصل نسخے (عکس مرتبہ جمیل جالبی) کے مطالعے سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ غالباً ہائے ہوز کی موجودہ شکل اردو میں بہت بعد کو استعمال کی گئی جب کہ ہائے دوچشمی کو ہکار آوازوں کے لیے اور ہائے ہوز کو ہائیہ آواز کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ یہاں یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اردو میں ھ کا استعمال اس خیال کی دین ہے کہ ہکار آوازیں مفرد ہائیہ سے مرکب ہیں اور اسی لیے اکثر ھ کے ساتھ ساتھ ہائے ہوز کا استعمال بھی برابر ہوتا رہا ہے مثلاً (گھوڑا۔ گھوڑا)۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ھ اور ہائے ہوز اردو میں دو منفرد علامتیں ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو ہائے ہوز کی موجودگی میں ھ کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا اور اوپر کی مثال میں لفظ "گھوڑا" کے املا میں ھ کی جگہ ہائے ہوز کا استعمال وہی تجاہلِ عارفانہ ہے جسے بے قاعدگی کا نام دیجیے۔ بہرحال اس علامت نے اردو املا کے ایک بہت بڑے مسئلے کو حل کر دیا ہے۔ چناں چہ تمام ہکار آوازوں کو اس ایک علامت کے اشتراک سے جس آسانی کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا ہے اس سے ایک طرف تو علامتوں کی تعداد محدود ہو گئی دوسرے رسم الخط کی تحصیل میں بھی ایک منزل آسان ہو گئی۔

اس علامت کی وجہ سے اردو کو دیگر زبانوں کے مقابلے میں ایک امتیاز بھی حاصل ہوا ہے۔ اکثر دوسری زبانوں میں ہکاریت کے اظہار میں جس اجتہاد سے کام لیا جاتا ہے اس سے عمومی حالت میں اکائی کے تصور کی نفی ہوتی ہے مثلاً رومن میں ہکار آوازوں کو 'h' کے اشتراک سے ظاہر کیا جاتا ہے جب کہ 'h' خود ایک منفرد علامت ہے اور یہ علامت اپنی اس انفرادیت کو ہکاریت کی خاطر دوسری علامت میں ضم نہیں کر دیتی۔ جب کہ اردو میں ھ اول تو کسی انفرادیت کی حامل نہیں اور جب یہ دوسری علامت سے ملتی ہے تو یہ دونوں علامتیں ایک منفرد اکائی کی تخلیق کرتی ہیں اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں اس اکائی کا وجود اصولی اور نظریاتی ہے۔ عملی سطح پر اس اکائی کو توڑ ہی دیا جاتا ہے۔

اس موضوع پر مزید بحث کے لیے ایک نظر دیوناگری املا پر بھی ڈال لینی چاہیے۔ دیوناگری میں جن ہکار آوازوں کے لیے منفرد علامتیں استعمال ہوتی ہیں وہ یہ ہیں بھ پھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ کھ گھ (ڑھ کے لیے ایک نقطے کے اضافے سے کام لیا جاتا ہے)۔ اردو میں بھی ان آوازوں کے املا میں ھ کو ایک جزوِ لازم کی حیثیت حاصل ہے لیکن رھ لھ مھ نھ کے لیے دیوناگری میں علامتیں نہیں ہیں اس لیے ان آوازوں کو ہائیہ علامت کی مدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ہندی املا کا شعوری یا غیر شعوری اثر ہو سکتا ہے کہ اردو میں بھی ان چاروں آوازوں کے املا میں ھ کو اس طرح جزوِ لازم کی حیثیت حاصل نہیں ہے جس طرح اول الذکر دس آوازوں کے املا میں۔ چناں چہ ان آوازوں کا املا بے قاعدگی اور باقاعدگی کے درمیان جھولتا رہا ہے اردو کتابوں میں لہ مہہ نہہ کی ترکیبیں آزادانہ استعمال کی جا رہی ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ ہائے ہوز کا یہ باقاعدہ استعمال شدہ پہلی دس علامتوں تک بھی پہنچا اور آخر کار ھ اور ہائے ہوز کی تمیز اٹھ گئی۔ جب کہ ہائے ہوز ایک منفرد علامت ہے اور ھ صرف ایک املائی علامت ہے جس کی مدد سے کسی بھی ہکار آواز کو بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس بحث میں جزوی ہکاریت کی دلیل بھی ایک عامل کی حیثیت رکھتی ہے یعنی لھ مھ نھ آوازوں میں ہکاریت کلّی نہیں جزوی ہوتی ہے اور یہ جزوی ہکاریت جواز بن سکتی ہے لھ مھ نھ کے املا کا۔ قطع نظر اس سے کہ صوتیات کلّی اور جزوی ہکاریت کی تفریق کو روا رکھتی ہے یا نہیں، اگر جزوی ہکاریت کا معیار سماعت ہے تو ہر آواز لفظ کے آخر میں جزوی ہکار ہوجاتی ہے بلکہ اکثر ہندستانی مصمتوں میں تو یہ معدوم ہوجاتی ہے۔ مثلاً "دودھ" اور "ہاتھ" میں ہر آخری آواز غیر ہکار ادا ہوتی ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ اردو کے معیاری املا میں ان آوازوں کو ھ کے ساتھ کیوں لکھا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان آوازوں کو اردو کے صوتی نظام میں ہکار تسلیم کیا گیا ہے باوجود اس قولِ صداقت کے کہ اردو کا صوتی مزاج غیر ہکاری ہے۔ تاہم اس قول میں اگر کچھ صداقت ہے تو اس حد تک کہ اردو مصمتے لفظ کے آخر میں غیر ہکار ہونے کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس رجحان کی مثالیں اردو کے لسانیاتی ارتقا کی تاریخ میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

پنکھا ہوکر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ   مج جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ   (امیر خسرو)

۲

اول تے دل لگا جج سوں اتا تو کی پھراتے ہیں۔
ہمارے شک بھرے جیو کرتے کی تم ڈوک میں بھاتے ہیں۔   (علی عادل شاہ)
بھلی لے کے چھب سوں پکڑیت میں پات   (نصرتی)
اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب   دیکھتا ہوں توں رہے نہ منج میں تاب   (عبداللہ قطب شاہ)

خط کشیدہ الفاظ کا املا اس صوتیاتی شعور کی نشان دہی کرتا ہے کہ کون سی آواز کہاں ہکار ادا کی جاتی ہے اور کہاں غیر ہکار۔ چناں چہ خط کشیدہ الفاظ کے مصمتے آخری حالت میں غیر ہکار ہیں لیکن ابتدائی اور درمیانی حالت میں یہ آوازیں عموماً ہکار ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں اردو کا املا زیادہ صوتیاتی تھا۔ لیکن اس پر بھی شاید ہندی کا اثر ہوا اور اردو املا کو باقاعدہ بنانے کے لیے ان آوازوں کو بھی ہندی کی صوتیاتی وضاحت پر ڈھالا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اردو کے مصمتے بھی آخری حالت میں ہکار استعمال ہونے لگے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہندی کی صوتیاتی وضاحت وہی ہے جو سنسکرت کی ہے اور سنسکرت میں عام طور پر لفظ کے آخری مصمتے کے بعد ایک کا نشان استعمال ہوتا ہے جو ایک خفیف مصوتے کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آخری حالت کے مصمتے صوتیاتی نقطۂ نظر سے درمیانی حالت میں آجاتے ہیں اور اس طرح ہکاریت مکمل ہوجاتی ہے اس کے برعکس اردو میں عام طور پر آخری حالت میں خفیف مصوتوں کا رجحان نہیں ہے (چند مستثنیٰ مثالوں کے سوا) پھر بھی اردو املا میں اس رجحان کی حد تک اتنا تصرف ضرور کیا گیا ہے کہ وہ سہ حرفی (م ح م) الفاظ جن کے دونوں مصمتے ہکار تھے ان میں سے آخری مصمتے کو غیر ہکار ہی رہنے دیا مثلاً بھوک، بھینس، دھوکھ وغیرہ کہ ہندی میں ان الفاظ کے آخری مصمتے بھی ہکار ہیں۔

آخری حالت میں مصمتوں کی ہکاریت کا شعور اور ان کا املا بھی غالباً بتدریج ارتقا کی منزل سے گزرا ہے۔ اس سلسلے میں اوپر جو الفاظ سپردِ قلم کیے گیے ہیں ان میں سے دو اشعار پر خصوصی توجہ درکار ہے۔

آنکہ چشم و ناک بینی بوں ابرو ہوتہ لب ۔ دند دنداں کارہ گردن گوتہ زانوں مونڈ سر

اے پری پیکر ترا مکہ آفتاب ۔ دیکھتا ہوں توں رہے نا منج میں تاب

ان اشعار میں "آنکھ" اور "مکھ" (آنکہ۔ مکہ) کا املا نہ تو خالص غیر ہکاری ہے اور نہ ہکاری بلکہ ہائے مختفی کے ساتھ یہ املا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ آخری حالت میں بھی اردو مصمتوں کی ہکاریت بتدریج ارتقا کی منزل سے گزری ہے البتہ یہاں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان الفاظ کا زیر بحث املا کاتب کے قلم کا ثمرہ ہوسکتا ہے۔ اس کے جواب میں یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ کاتبوں کا عام رجحان یہ ہے کہ اکثر وہ قدیم تلفظ کو جدید املا پر ڈھال دیتے ہیں لیکن جدید تلفظ کو قدیم املا کے مطابق لکھنا قرینِ قیاس نہیں ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان الفاظ کے املا کو اصل کے مطابق نہ سمجھا جائے۔

بہرحال یہ ہندی ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اردو میں بھی دس ہکار آوازیں تسلیم کی گئیں اس کے بعد "ڑھ" اور "رھ" کا اضافہ ہوا اور اب بشمول رھ لھ نھ ان کو پندرہ تسلیم کیا جاتا ہے پروفیسر گیان چند جین نے ان میں ایک اور آواز کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ "مذہب" کے عوامی تلفظ میں /ذ/ کو ہکار ادا کیا جاتا ہے۔ اگر اس خیال کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ تعداد سولہ ہوجاتی ہے لیکن اس میں ایک سترھویں آواز کو اور شامل کیا جانا چاہیے یعنی /شھ/۔ یہ آواز لفظ مشہور (مشھور) میں بولی جاتی ہے۔ اردو کے عوامی معیار میں اس لفظ کا تلفظ ہکاریت کے ساتھ ہوتا ہے اگرچہ معیاری تلفظ میں "ش" اور "ہ" دونوں آوازیں دو مختلف ارکان میں واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

اس شعر میں "مشہور" کا تلفظ ان دو ارکان سے مل کر بنا ہے "مش + ہور" تاہم یہ عوامی تلفظ یقیناً نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں روایت ہے کہ تلفظ کے لیے سند شعرا کے کلام سے لی جاتی ہے نہ کہ عوامی معیار سے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مثال بدلتے ہوئے صوتیاتی رجحانات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ان رجحانات کے مطابق ہمیں رسم الخط کے امکانات کا جائزہ لینا چاہیے اور نئے سرے سے املا کے مسائل پر توجہ دینی چاہیے۔ آج اردو زبان ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے (زبان ہمیشہ عبوری دور میں ہوتی ہے) اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احیا پرستی کے اس دور میں لسانی خصوصیات بھی اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہیں۔ چنانچہ اردو آج پھر اس رشتہ کو استوار کررہی ہے جس کی تنسیخ لکھنؤ میں ناسخ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ آج پھر اردو میں ہندی کے الفاظ داخل ہورہے ہیں اور اردو صوتیات کو متاثر کررہے ہیں اردو کی ان مخصوص آوازوں کے علاوہ جن کی ادائیگی پر ہندی املا اثر انداز ہوا ہے (اردو کی مخصوص آوازوں کو دیوناگری میں ایک نقطے کے اضافے سے لکھا جاتا تھا لیکن اب اس نقطے کے

...... تغیر تلفظ کا جو فرق ہندی میں واقع ہوا ہے وہ اب اردو میں بھی عام ہوتا جا رہا ہے)۔ میں یہاں خاص طور پر دو آوازوں ذکر کرنا چاہوں گا یہ آوازیں ہیں /ب/ اور /و/۔ یہ دونوں آوازیں اردو کے منفرد مصوتے ہیں جو سنسکرت الفاظ میں اسی فرق کے ساتھ آئے ہیں کہ /ب/ کو /و/ میں اور /و/ کو /ب/ میں تبدیل کر دیا گیا۔ مثال کے لیے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں بن (ون) بیاہ (وواہ) برکھا (ورشا) آشیرواد (آشیرباد) لیکن یہ صوتی معیار پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ رہا ہے جس کا سبب ہندی املا ہے اردو پر اس کا براہِ راست اثر پڑ رہا ہے اور "بالمیکی" "کو والمیکی" اور "باجپئی" کو "واجپئی" عام طور پر بولا جا رہا ہے حتیٰ کہ پاکستان کے ایک اردو نشریہ میں "آشیرواد" کا تلفظ "آشیرباد" سنا گیا ہے۔

اگر اردو کے لسانی اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اس کو آسانی سے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور وہ تھا جب اس پر عربی اور فارسی کا سایہ پڑا اور ان زبانوں کے الفاظ اور مصطلحات کا سہارا لے کر بہت جلد یہ ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی۔ دوسرا دور وہ تھا جب اس پر انگریزی زبان کے اثرات پڑے اور جدید یورپی لغات کی ایک بڑی تعداد اس زبان میں در آئی مثلاً اسٹیشن، ریڈیو، سینما، فلم، کیمرہ، اسکول، پرنسپل، کالج، یونیورسٹی، ٹکٹ، ریل اور موٹر جیسے الفاظ انگریزی کے واسطے سے اردو زبان میں داخل ہوئے اور اس زبان کے اثرات غالب آئے اور ہندی الفاظ کی ایک بڑی تعداد اردو میں استعمال ہونے لگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ایک ترقی پسند زبان ہے اور ہر دور کے لسانی میلانات سے ساز باز کر لینے کی اس میں پوری پوری صلاحیت موجود ہے لیکن ہندی کے معاملے میں یہ صلاحیت پوری طرح کام میں نہیں آ رہی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اردو ہندی کے درمیان بول چال کی سطح پر جو نازک سا فرق ہے وہ مخصوص الفاظ کے استعمال پر ہی منحصر ہے۔ جس کی وجہ سے ابھی ہندی کے الفاظ صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور ان الفاظ کا استعمال وہ لسانی عادت نہیں بنا ہے جس کے تحت ہم اسٹیشن اور ریڈیو جیسے الفاظ استعمال کر کے اردو بولنے کا دعوا کرتے ہیں اس کے برعکس آشیرباد، گمبھیر، وشواس، پرچار، آکاش وانی اور النکار جیسے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے اگر ہم اردو بولنے کا دعوا کریں تو شاید اسے تسلیم نہ کیا جائے (تحریر اس سے مستثنیٰ ہے)۔ گویا اردو ہندی کا رشتہ استواری کی اس منزل میں نہیں ہے جہاں اس کو ہونا چاہیے تھا۔

یہ عدم استواری اس متوازی رشتہ کے سبب بھی ہو سکتی ہے جو اردو کے عہد آفرینش سے تعلق رکھتا ہے اور جو اردو کی لسانی تاریخ میں ایک بدیہی حقیقت بن چکا ہے۔ اس حقیقت کا ایک پہلو یہ رہا ہے کہ اردو نے جس طرح سنسکرت کی آوازوں کو اپنے صوتیاتی مزاج پر ڈھالا اسی طرح اس نے عربی فارسی الفاظ کے استعمال میں صوتی تصرف سے کام لے کر نئے تلفظ قائم کیے اس طرح اردو میں ایسے الفاظ کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی جن کا تلفظ اپنی اصل سے مختلف ہے۔ اس کی ایک مثال ہائے مکسورہ ہے جو اردو میں ہمزۂ مکسورہ میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن جدید اردو املا نے ہائے مکسورہ کو جس طرح عام کیا ہے اس کے نمونے جدید اشاعتوں میں وافر تعداد میں مل جاتے ہیں باوجود اس حقیقت کے کہ اردو صوتیات میں ہائے مکسورہ کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس قبیل کی دوسری مثال تشدید کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ یعنی اردو میں ایسے الفاظ کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جو اصل میں مشدد ہیں لیکن اردو میں ان کا تلفظ غیر مشدد رہا ہے مثلاً مقدمہ۔ عطیہ۔ اصلیت

اہلیت ۔ اقلیت وغیرہ لیکن اب اردو املا میں اصلاح کے عنوان سے اصل کی طرف لوٹنے کا جو رجحان شروع ہوا ہے غالباً اس کے اثر سے اب ان الفاظ کو بھی مشدد لکھا جا رہا ہے جس کا اثر تلفظ پر پڑنا ناگزیر ہے ۔ تشدید کا یہ رجحان اردو کی اس صوتیاتی خصوصیت پر بھی اثر انداز ہوا ہے کہ اردو کا کوئی مصمتہ آخری حالت میں مشدد نہیں ہوتا ۔ لیکن جناب مالک رام نے اپنی کتاب " وہ صورتیں الٰہی " کے مقدمے میں " لابدّ " کی دال کو تشدید کے ساتھ استعمال کیا ہے (یہ املا کتابت کو نہیں تلفظ ہی کو ظاہر کرتا ہے) ۔ اس کے علاوہ " اجلّ " (بزرگ) کے لام کو بھی مشدد استعمال کرنے کا پتہ چلتا ہے گویا یہ رجحان برقرار رہا تو آئندہ ردّ ۔ حدّ ۔ حسّ ۔ ضدّ جیسے الفاظ کو بھی بغیر عطف و اضافت مشدد استعمال کرنے کے امکانات نظر آتے ہیں ۔

اس طرح اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو اردو میں یہ دو رجحانات ایک دوسرے کے متوازی عمل پیرا نظر آئیں گے یعنی ایک طرف ہندی کے الفاظ اردو میں اپنا راستہ بنا رہے ہیں لیکن قدیم تلفظ کے ساتھ ۔ دوسری طرف خود اردو ہی کے الفاظ اپنے تلفظ اور املا میں اصل کی طرف لوٹ رہے ہیں ۔ یہ دونوں رجحانات اردو زبان پر احیا پرستی کی تحریک کے اثرات کو واضح کرتے ہیں ان اثرات کو اردو املا کے واسطے سے پہنچنے کا موقع مل رہا ہے اس لیے کہ تحریر ہی ایسی چیز ہے جو ماضی کے شعور کو زندہ رکھ سکتی ہے اور تحریر تک رسائی بھی اسی شعور کی ممکن ہے جب کہ عوامی شعور کی رسائی تحریر تک یا تو ہوتی نہیں یا بہ مشکل ہوتی ہے ۔ مثال ہمارے سامنے ہے کہ اردو املا نہ صرف عوامی بلکہ عمومی معیار کو نظر انداز کر کے اس معیار کو رواج دے رہا ہے جسے کلُّ شئیٍ یرجعُ اِلیٰ اصلہٖ کے مصداق اصلاح پسندوں نے درست جانا ہے ۔

لطف النسا امتیاز صفحہ ۲۳ سے آگے

امتیاز حج و زیارت سے مشرف ہوئی ۔ افسوس ہے کہ اس سے زیادہ حالات نہیں ملے " اس سلسلے میں کہ امتیاز حج کی سعادت سے بھی سرفراز رہیں ۔ ہم کچھ کہنے سے قاصر ہیں ۔ اس وجہ سے کہ ہمیں اس کے کلام میں کہیں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے دیوان میں کئی ایک اشعار اور بہت سارے مقطعے ملتے ہیں جس میں اس نے کمالِ عقیدت کے ساتھ نجف و کربلا کی زیارت کی آرزو کی ہے ـــــ امتیاز کے دیوان کے اس تعارف اور اس کی شخصیت کے بارے میں ان وضاحتوں کے بعد ہم اس کے فن کا جائزہ لیتے ہیں جو ہمارے اس طویل مضمون کا دوسرا حصہ ہے ۔

روزنامچہ کا ادبی جائزہ صفحہ ۲۰ سے آگے

کے حقائق اصلیت کے روپ میں نمایاں ہو سکتے ہیں یعنی اگر کوئی محقق کسی شخصیت کی سوانح اور خدمات کی پیش کشی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لیے موضوع و مواد کی فراہمی میں روزنامچہ کا طرزِ اسلوب قیمتی مواد فراہم کر سکتا ہے ۔ ان بنیادی خصوصیات کی وجہ سے روزنامچہ کا ایک طرزِ اسلوب کے درجہ کے علاوہ شخصیت و کارناموں کی تحقیقی تشکیل میں معاون بننے والا بہترین طرزِ اظہار کا درجہ دیا جاتا ہے ۔ اس لحاظ سے روزنامچہ اردو نثر کی ایک قیمتی طرزِ تحریر ہے جس سے تشکیل انانیت اور تعدات اور کارناموں کا عکس واضح ہوتا ہے ۔

ساقی فاروقی (لندن)

غزل

وہ سخی ہے تو کسی روز بلا کر لے جائے
اور مجھے وصل کے آداب سکھا کر لے جائے

میرے اندر کسی افسوس کی تاریکی ہے
اس اندھیرے میں کوئی آگ جلا کر لے جائے

بحر میں جسم کے اسرار کہاں کھلتے ہیں
اب وہی سحر کرے، پیار سے آکر لے جائے

خاک آنکھوں میں ہے، وہ خواب کہاں ملتا ہے
جو مجھے قید عناصر سے رہا کر لے جائے

یہ مری روح میں ندی کی تھکن کیسی ہے
وہ سمندر کی طرح آئے، بہا کر لے جائے

▲

شمس الرحمٰن فاروقی

غزل

شوخ لہریں تھیں کہا تھا مجھ میں ہے کس بل چلوں گا
لیکن اب ٹھہراؤ آنے ہی کو ہے دو پل چلوں گا

جیسے پرچھائیں کوئی بے روشنی میں جسم ڈھونڈے
اے سکوتِ ابر تجھ میں رات بھر بے کل چلوں گا

اے جگر کو چیرتے والی صدائے بے صدا سن
آج بھر چپ رہ میں تیرے ساتھ مرکر کل چلوں گا

آسماں کو چھو کے گرتے سبز نجم شب سے بچ کر
اپنے سر پر اوڑھ کر سنگِ سیہ بادل چلوں گا

تیز تیکھا ذائقہ، بھوکی زمیں، جشن شہادت
میں ہوا کے رتھ پہ بیٹھا ہوں سوئے مقتل چلوں گا

▲

وہاب عندلیب

حضرت بندہ نواز اور دکنی اردو

حضرت سید محمد حسینی خواجۂ دکن بندہ نواز گیسو درازؒ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے ہادیٔ اعظم ولی کامل اور باکمال صوفی تھے۔ جن کے روحانی فیوض و برکات آج بھی جاری ہیں۔ حضور بندہ نوازؒ نے آٹھویں صدی ہجری میں روحانیت اور تصوف کی تبلیغ کی۔ آپ نے ملفوظات، مکتوبات، تصانیف، مواعظ اور نصائح کے ذریعہ اپنے ارادت مندوں کی تربیت کی۔ صوفیائے کرام کا یہ وطیرہ خاص رہا ہے کہ وہ انسان کے چھپے ہوئے اصل اسرار سے آگہی کے لیے دلوں کو ٹٹول کر تہہ تک پہنچ جاتے۔ یوں بھی دلوں کی تسخیر کے لیے ایک دوسرے کی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ چنانچہ اولیائے کرام نے رشد و ہدایت کے لیے متعلقہ خطہ کی زبان سیکھی۔ اور عوام سے انھیں کی بولی میں بات چیت کرنے اور تعلیم و تلقین فرمانے لگے۔ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ نے رعیت کی زبان پنجابی کو اپنایا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے ہندوی کی بنیاد رکھی اسی طرح دکنی اردو حضرت بندہ نواز اور ان کے خانوادہ و سلسلہ کی دین ہے۔ اس لیے بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ شمال کے مقابلے میں دکن میں اردو نثر و نظم کی ابتدا پہلے ہوئی اور اس کی سرپرستی صاحب حال و قال درویشوں نے کی تھی اور اس سلسلہ میں حضرت بندہ نوازؒ ان کے خلفا اور ارادت مندوں کو اولیت حاصل ہے۔

حضرت بندہ نوازؒ ۸۰۳ھ (۱۳۹۸ء) میں بہمنی سلطان فیروز شاہ کے عہد میں گلبرگہ تشریف لے آئے۔ بہمنی خاندان ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۵ء تک اس ملک کی تہذیب و تمدن، سیاست و معاشرت، علم و ادب پر اثر انداز رہا اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑ گیا جو ہمیں ہمیشہ اس کی یاد دلاتی رہیں گی۔ ان ہی انمول یادگاروں میں اردو زبان بھی ہے جو شاہانِ بہمنیہ کی سرپرستی میں دکن میں بحیرۂ عرب سے لے کر بحیرہ بنگال تک رائج ہوگئی۔ سلطان تاج الدین فیروز شاہ اسی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا۔ جو ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں تخت نشین ہوا۔ فیروز شاہ بہمنی کا عہد علم و فضل شعر و سخن اور تہذیب و تمدن کے لیے تاریخ میں امتیاز رکھتا ہے۔ وہ بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں علماء، شعرا، ادبا، فضلا، صوفیا، مشائخین اور مورخین جمع تھے۔ بادشاہ کو مذہبی علوم کے علاوہ زبان و ادب سے بھی دل چسپی تھی وہ اس علاقے کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے بڑی رواداری سے حکومت کی اور دیگر مذہب کے ماننے والوں سے قریبی روابط قائم کئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ نئی زبان دکنی کو فروغ حاصل ہوا اور گلبرگہ دکن میں اردو کا پہلا مرکز بن گیا۔ اسی علم و ادب کے مربی نے حضور بندہ نوازؒ کو گلبرگہ آنے کی دعوت دی تھی۔ جب آپ گلبرگہ پہنچے تو

دکنی زبان کی حیثیت ایک بولی سے بڑھ کر نہ تھی۔ حضرت بندہ نوازؒ نے اپنے اعجاز سے اس بولی کو علمی و ادبی زبان دیا گویا حضرت گیسو درازؒ نے ترسیل و ابلاغ کے لیے فارسی پر دکنی اردو کو ترجیح دی۔ آپ کی آمد کے بعد اس زبان نے روز افزوں ترقی کے زینے طے کیے کیوں کہ آپ نے محسوس کیا کہ اس خطہ کے عوام تک خدا رسی کے پیام کو پہنچانے کے لیے عوام کی یہ بولی موثر ثابت ہو سکتی ہے چناں چہ آپ نے اپنے ارادت مندوں اور طالبانِ حق کو نہ صرف د میں درس دینا شروع کیا بلکہ اس زبان میں بھی تصوف اور عرفان کے موضوع پر اپنے قلم کو جنبش دی۔ چشتیہ سلک بزرگوں میں حضرت خواجہ حسن بصری سے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی تک کسی نے بھی تصنیف و تالیف کی جانب توجہ نہیں کی اس سلسلہ میں حضرت بندہ نوازؒ کو اولیت حاصل ہے اور آپ صاحبِ تصانیفِ کثیرہ بھی تھے اسی علامہ سید سلیمان ندوی نے آپ کو سلطان قلم کہا ہے۔

پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم نے حضرت بندہ نوازؒ سے منسوب دکنی رسائل کی تعداد ۱۲ بتائی مگر وہ ان تمام رسائل کی نشاندہی نہیں کر سکے۔ تا حال حضرت بندہ نوازؒ سے منسوب دکنی رسائل میں معراج العاشقین شکار نامہ، تلاوت الوجود، دُر الاسرار، ہشت مسائل، تمثیل نامہ، رسالۂ سہ بارہ، ہدایت نامہ، خلاصۃ التو اور معراج نامہ قابل ذکر ہیں۔ معراج العاشقین کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے صحیح لفظ اور فرہنگ کے ساتھ کیا تھا جب یہ کتاب نایاب ہو گئی تو سنہ ۱۹۵۴ء میں ممتاز محقق و ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور ان کے ڈاکٹر خلیق انجم نے دوبارہ شائع کیا۔ معراج العاشقین کا موضوع تصوف و عرفان ہے۔ شکار نامہ کو پہلی بار کر کے شائع کرنے کا اعزاز پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم کو حاصل ہے۔ حال ہی میں گلبرگہ ہی کی ایک خاتون محق ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بھی شکار نامہ کو دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ شکار نامہ میں عرفان اور وحدانیت اسرار و رموز ملتے ہیں۔ شکار نامے کا مخطوطہ سالار جنگ لائبریری کے علاوہ گلبرگہ کے کتب خانہ روضتین میں بھی ہے۔ تلاوت الوجود کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ اور سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ رسالہ بڑی حد تک طالب و مرشد کے مکالمے پر مشتمل ہے۔ جس میں مرشد نے طالب کی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کی ہے۔ دُر الاسرار کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں ملتا ہے جس میں صوفیانہ مسائل معرضِ بحث میں آگئے ہیں۔ بندہ نوازؒ کی دکنی نظم کے مختلف نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ آپ کا تخلص شہباز تھا۔ مختلف بیاضوں میں شعر آپ کے نام سے منسوب کیے گئے ہیں جیسے ؎

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھتا دسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولتا کسے
یوں کھوئی خودی اپنی، خدا سات محمدؐ
جب گھل گئی خودی تو خدا ہن نہ کوئی دسے

بعض بیماریوں کے نسخوں کو بھی آپ نے نظم کیا ہے۔ دانت کے منجن کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

جوں جوں لگاوے پاوے سُکھ
تجھ دانتوں کا جاوے دُکھ

حضرت بندہ نوازؒ نے اصلاح معاشرہ کے لیے راگ اور راگنیوں کے علاوہ لوریوں اور چکی ناموں کی صورت میں بھی عشقِ حقیقی و عرفان کے مسائل پیش کیے۔ یہ لوریاں اور چکی نامے بھی ہمارا قیمتی تہذیبی اثاثہ ہیں جو نہ صرف سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں بلکہ چکی کے یہ گیت آج بھی دکنی خواتین کو از بر ہیں۔ بارہ بند پر مشتمل آپ کی نظم "چکی نامہ" کا مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں قدیم طرز ریختہ میں تحریر کردہ ایک غزل نقل فرمائی ہے جس کا مقطع حسب ذیل ہے ؎

شہباز حسینی کھوے کر، ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ آپسے یک ہوے کر، تب پاوے گا دیدار توں

مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں کہ "اس غزل کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حضرت بندہ نوازؒ کی ہے" ڈاکٹر زور کی رائے میں یہ غزل حضرت بندہ نوازؒ کی نہیں بلکہ سید شہباز حسینی کی ہے۔ جو حضرت بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے اور سید ہدایت اللہ حسینی کے پوتے اور خلیفہ تھے۔ سید شہباز حسینی نے ۱۰۱۵ھ م ۱۶۰۶ء میں بیجاپور میں وفات پائی۔

حضرت بندہ نوازؒ دکنی کے اولین شاعر ہونے کے علاوہ اردو کے پہلے نثر نگار بھی ہیں۔ مگر اس خصوص میں تاریخ ادب اردو کے مرتبین متفق الخیال نہیں ہیں۔ ابتدائی محققین کا خیال تھا کہ فضلی کی "دہ مجلس" یا کربل کتھا غالباً اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ۱۱۴۵ھ میں محمد شاہ کے عہد میں لکھی گئی۔ "اردوئے قدیم" کے مصنف شمس اللہ قادری نے شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ کے رسالے کو سب سے قدیم دکنی رسالہ قرار دیا تھا۔ اب تک حضرت کا کوئی دکنی رسالہ دستیاب نہیں ہوا۔ وہ تین رسالے جن کا ذکر مصنف اردوئے قدیم نے کیا تھا بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض محققین کے مطابق حضرت بندہ نوازؒ کے والد ماجد سید شاہ یوسف راجوؒ بھی اردو کے پہلے نثر نگار تھے۔ داستان تاریخ اردو کے مصنف حامد حسن قادری، خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ایک رسالہ اخلاق و تصوف کو جو ۷۵۸ھ / ۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا گیا تھا، اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھتے ہیں۔ چوں کہ یہ کتاب منظر عام پر نہیں آئی اس لیے تاریخ ادب اردو کے مصنف اعجاز حسین نے یہ سوال اٹھایا کہ "دعویٰ کے لیے ضروری تھا کہ اس نسخے کو اور بھی لوگ دیکھ سکتے نہ معلوم یہ کتاب صیغہ راز میں کیوں ہے؟" بعد کی تحقیق کے نتیجہ میں "معراج العاشقین" کو نہ صرف حضور بندہ نوازؒ سے منسوب کیا گیا بلکہ اردو کے پہلے نثر نگار ہونے کی فضیلت آپ کے حصے میں آئی۔ معراج العاشقین کا سنہ کتابت ۹۰۲ھ ہے گویا یہ رسالہ حضرت گیسو درازؒ کی وفات کے ۸۱ سال بعد تحریر کیا گیا۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، رام بابو سکسینہ، اعجاز حسین جیسے ادبی محققین و مورخین نے معراج العاشقین کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف "معراج العاشقین کا مصنف" کے ذریعہ یہ انکشاف فرمایا کہ معراج العاشقین بارھویں صدی کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی

کی تصنیف۔ ڈاکٹر موصوف نے دکنی مخطوطات کی نقل کے دوران سنین کے غلط اندراج کی متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے قیاس آرائی کی ہے کہ معراج العاشقین کے مخطوطہ پر درج شدہ تاریخ ۹۰۶ھ غلط ہو سکتی ہے۔ حفیظ قتیل صاحب کے بموجب معراج العاشقین، تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں چوں کہ مخدوم شاہ حسینی نے اپنے پیر کا نام پیر اللہ بتایا ہے اور یہ نام تلاوۃ الوجود کے آخر میں درج ہے اس لیے معراج العاشقین اور تلاوۃ الوجود مخدوم شاہ حسینی کی تصانیف ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں پاکستان کے ڈاکٹر جمیل جالبی نے نئے سرے سے اردو ادب کی تاریخ مرتب کی ہے جسے برصغیر کے ادبی حلقوں نے فکر انگیز اور عظیم تصنیف قرار دیا ہے۔ جہاں تک معراج العاشقین کا تعلق ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ڈاکٹر حفیظ قتیل کے نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سوال اٹھایا ہے کہ شاہ محمد علی سامانی نے جو بارگاہِ بندہ نوازؒ کے مرید و خادم تھے اپنی تصنیف سیر محمدی کے باب پنجم میں اگرچہ حضرت بندہ نوازؒ کی ۳۷ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس فہرست میں کوئی اردو تصانیف شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر جمیل جالبی دونوں ہی نے حضرت بندہ نوازؒ کے دیگر رسائل پر تبصرہ کئے بغیر ہی حضرت برہان الدین جانمؒ کے نثری رسالے کلمۃ الحقائق ہی کو اردو نثر کا پہلا مستند رسالہ قرار دیا ہے۔ ابھی اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ تلاش و فکر اور تحقیق و جستجو کے دروازے ہنوز وا ہیں اگر مستقبل میں تحقیق مزید کے بعد اگر اس امر پر اتفاق رائے بھی ہو جائے کہ معراج العاشقین حضرت بندہ نواز کی تصنیف نہیں ہے تب بھی حضور بندہ نوازؒ کے اولین نثر نگار ہونے میں کوئی کلام نہیں کیوں کہ معراج العاشقین کے بغیر بھی دیگر کئی رسائل بندگی مخدوم سے منسوب رہیں گے شاہ محمد علی سامانی کی حضرت مخدوم کی اردو تصانیف کے بارے میں خموشی بھی اہل تحقیق کے لیے کوئی نئی بات نہیں کیوں کہ حضرت سامانی نے سیر محمدی حضور بندہ نوازؒ کے وصال کے ۶ سال بعد ہی مرتب کی تھی۔ گزشتہ ۵۰ سال سے اردو کے ان محققین پیش نظر حضرت سامانی کی یہ کتاب ضرور رہی ہوگی جنھوں نے نہ صرف دکنی کے کئی رسائل حضرت سے منسوب کیے بلکہ انھیں اردو کا پہلا نثر نگار قرار دیا۔ بہر کیف آج سے ۶ سو سال پہلے آپ ہی نے اردو کو ایک معمولی بولی ٹھولی کے درجہ سے اٹھا کر تصنیف و تالیف کے اونچے درجے پر فائز فرمایا۔ حضرت بندہ نوازؒ کی تقلید کرتے ہوئے ان کے خانوادہ و سلسلہ کے ارکان بھی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور تصوف و عرفان کے گہربار مضامین سے اس زبان کو مالا مال کیا۔ اس خصوص میں حضرت بندہ نواز کے فرزند اکبر سید محمد اکبر حسینی، پوتے حضرت عبداللہ حسینی کے علاوہ خلفاء و ارادت مندوں میں حضرت میراں جی شمس العشاق، حضرت برہان الدین جانم، حضرت امین الدین اعلیٰ، حضرت میراں جی خدا نما، حضرت ہاشم حسینی خداوند ہادی، شاہ صدر الدین اور عارف شاہ قادری کے نام قابل ذکر ہیں۔
اس خانوادہ و سلسلہ کا یہ فیض کچھ کم نہیں کہ ہماری زبان اردو روز افزوں ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے ہم اسے خواجۂ دکن کا فیضِ جاریہ کہہ سکتے ہیں۔

میر نقی علی خاں ثاقب

○

ریگ زارِ گماں میں سب تر سے
ابر برسے تو پھر کہاں برسے
کیا کھلی پل کو نیم خوابیٔ چشم
راز گھبرا کے چل دیے گھر سے
دیر سے محوِ گفتگو ہیں کھنڈر
اپنی یادوں کے سنگِ مرمر سے
سارے اسرار درمیان سے ہیں
کوئی اندر سے ہے نہ باہر سے
تشنگی مے میں گھول دی تھی بہت
غم کو آنے لگے ہیں چکر سے
شہر سب بن گئے ہیں دستِ سوال
اب توقع نہیں کسی در سے
دامنِ ضبط کیا دراز کروں
درد پتھر کا آپ پتھر سے
عمر نے کی وفا تو لے آؤں
ساری تنہائیاں سمندر سے
شمعیں طاقوں میں رنگ بننے لگیں
کھڑکیاں لگ گئی ہیں منظر سے
دو گھڑی کوئی مستعار ہی لے
فن کا جو بوجھ ہے مرے سر سے

▲

○

روز آئے ہے گھر بلائے بن
اک حسینہ کہ جس کا سولھواں سن
اس کی گولائیاں شفق جیسی
نرمیاں جیسے ابر چھائے دن
یار و ارفتہ سب مزے میں ہیں
کہیں گانجہ کہیں چرس کوکن
عمر کو شعبدے ہی راس آئے
ایک اور تین... پانچ.. تو بھی گن
ملک سے ختم ہو گیا "وائرس"
کس کی ایجاد ہے "فری مائی سن"
چاندنی سے سفید ہو جائے
شب پہ مَل دو گر ایک "صابن رن"
ویسے دفتر کی عمر باقی ہے
اور یہاں گھر سے ہو گئی پن چن[1]
زندگی ہم سے یوں ملی ثاقب
ہیٹ پہنے کھڑا ہو اسٹالن

۱۔ دکن میں غیر تعلیم یافتہ لوگ پنشن کو پن چن کہتے ہیں۔

▲

ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری

اردو کی پہلی خاتون صاحب دیوان شاعر
لطف النسا امتیاز

اردو زبان و ادب کے آغاز اور ارتقا کے باب میں سرزمین دکن کو اولیت حاصل رہی ہے اس زبان کے اولین
ب دیوان شعرا اور نثر نگار اسی سرزمین سے متعلق ہیں حسنِ اتفاق کی بات ہے کہ اردو کی سب سے پہلی صاحبِ دیوان خاتون
کا تعلق بھی اسی سرزمین سے رہا ہے ۔ لیکن اس بارے میں محققین میں بڑے اختلافات موجود ہیں ۔

ڈاکٹر زور نے شرف النسا شرف کو اردو کی پہلی صاحب دیوان خاتون شاعر قرار دیا ۔ انھوں نے ادارۂ ادبیات
کی فہرست مخطوطات میں تحریر کیا ہے کہ یہ پہلی خاتون ہیں ۔ جن کا دیوان مرتب ہوا ۔ شرف النسا ٹیپو سلطان کے
رسپہ سالار میراں سید اشرف کی پوتی اور سید غلام دستگیر قادری کی زوجہ تھیں ۔ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۱۵ء سے
فات پائی ۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے مجلہ عثمانیہ کے حیدرآباد ادب نمبر میں ڈاکٹر زور سے اختلاف کرتے ہوئے اس طرح تحریر کیا ہے
" ابھی تک اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ کی حیثیت سے ماہ لقابائی چندا کا نام لیا جاتا رہا جس
ان پہلی مرتبہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں مرتب ہوا ۔ پھر جب تک
النسا امتیاز کا مجموعہ کلام محققین کی نظر سے مخفی رہا ۔ اولیت کا سہرا شرف النسا شرف کے سر بندھا گیا ۔"

ڈاکٹر خالدہ یوسف نے مجلہ عثمانیہ کے حیدرآباد ادب نمبر کے صفحہ ۳۲ پر لطف النسا امتیاز اور اس کے دیوان کے
ے میں وضاحت کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے ـــــ

" تمنا کی بیوی کا تخلص امتیاز اور نام لطف النسا تھا موصوفہ صاحبِ دیوان
شاعرہ تھیں "

آگے چل کر وہ لکھتی ہیں کہ ـــــ

" بہرحال فخر کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صنفِ نازک میں امتیاز اردو زبان کی
معیاری شاعرہ گزری ہیں "

جناب نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی وضاحتی فہرست کے صفحہ ۲۲۴ پر اس طرح تحریر کیا ہے۔

"امتیاز دکن کا شاعر تھا۔ بچپن میں اس کے ماں باپ مر گئے تھے۔ رشتہ داروں نے تعلیم دلائی۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ لیکن ہم کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کس کا شاگرد تھا۔ اس کا ذکر کسی قدیم اور جدید تذکرے میں نہیں ہے"

دیوان امتیاز کے مختصر تعارف کے بعد آخر میں انھوں نے اس شبہ کا بھی اظہار کیا ہے کہ امتیاز کوئی شاعرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ——

"اختتامی شعر میں لفظ کنیز آیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے ممکن ہے کہ امتیاز کوئی شاعرہ ہو"

محققین کے بیانات میں اس طرح کے تضاد اور اختلاف کے بعد ہمیں اس بات کا تعین کرنا ہے کہ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کس کو قرار دیا جائے۔ شرف النساء شرف اس وجہ سے خارج از بحث ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ م ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئیں جب کہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء ہی میں ماہ لقابائی چندا کا دیوان مرتب ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ مجلہ عثمانیہ کے حیدرآباد ادب نمبر کے صفحہ ۱۶۱ پر ماہ لقابائی چندا کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں ——

"چوں کہ چندا کا تعلق طوائفین کے طبقہ سے تھا۔ اس لیے یہ سمجھا جاتا رہا کہ اس کا کلام نسوانی ذہنیت کا مکمل نمونہ نہیں ہے"

ہمیں اس بیان سے اس وجہ سے اختلاف ہے کہ چندا طوائف ضرور تھی۔ لیکن ایسی طوائف نہیں تھی جس کے معیار کے تعلق سے ہمارا ذہن فوری منتقل ہوتا ہے۔ وہ پیشہ ور نہیں تھی۔ اس کا باپ مرزا سلطان بلخ سے ہندوستان آیا تھا۔ اور شاہ عالم کے زمانۂ شہزادگی میں صلابت خاں اور بادشاہی کے دور میں بسالت خاں کے خطاب سے سرفراز تھا۔ اور بخشی فوج کے ایک ممتاز عہدہ پر فائز رہا۔ چندا کو علم و فن کا بڑا شوق تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے نہایت اہتمام سے سلاطین آصفیہ کی تاریخ مرتب کروائی اس کا نام "تاریخ دل افروز" ہے۔ چندا کے کردار کا حال اس کی روزمرہ کی معمولات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ فجر کی نماز پابندی سے پڑھتی اور اس کے بعد تلاوت قرآن مجید میں دیر گئے تک مصروف رہتی۔ ظہر سے عصر تک بھی وہ تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتی۔ عصر سے مغرب تک علمی صحبت رہتی۔ اور اساتذۂ سخن جمع رہتے۔ اور علمی مذاکرے و مباحثے ہوتے۔ نماز عشاء کے بعد اساتذۂ فن موسیقی جمع ہوتے۔ محفل گرم رہتی۔ اور یہ سلسلہ آدھی رات تک چلا رہتا۔

ڈاکٹر خالدہ یوسف نے امتیاز کا تعارف ضرور کروایا ہے لیکن اس کو اردو کی پہلی خاتون شاعر قطعیت کے ساتھ قرار نہیں دیا۔

بعد کی تحقیقات میں جناب نصیر الدین ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں امتیاز کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے ——

" اس وقت تک کی معلومات کے لحاظ سے لطف النسا امتیاز کو پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا حیدرآباد سے تعلق تھا۔ اور آصف جاہ ثانی ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ء تا ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کے عہد میں موجود تھیں "

مجلہ عثمانیہ کے دکنی ادب نمبر سنہ ۶۴ - ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر اشرف رفیع نے جب کہ وہ ایم اے ابتدائی کی طالبہ تھیں، لطف النسا امتیاز کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے، اور امتیاز کے دیوان، اس کی زندگی اور فن پر روشنی ڈالی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک جناب نصیر الدین ہاشمی کی ہی خوشہ چین رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون کے صفحہ ۱۸۴،۱۸۳ پر دیوانِ امتیاز کے تعارف کے سلسلے میں اس طرح تحریر کیا ہے

" دیوان کا خاتمہ دیوان کی تاریخ پر ہوا ہے -

چوں از کنیز حضرتِ خاتوں دریں زماں
اشعار تازہ جمع شدہ، دل شگفتہ شد
از روئے یمن سالِ ہمایون ایں کتاب
دیوانِ امتیاز بخوانید گفتہ شد

۱۲۱۲ ہجری

یہاں انھوں نے آخری مصرعہ کو خط کشیدہ کرتے ہوئے اس کے نیچے ۱۲۱۲ھ لکھا ہے۔ جو کسی حساب سے درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس وجہ سے کہ اس پورے مصرعہ کے اعداد ۲۰۱۲ ہوتے ہیں۔

امتیاز کے دیوان کا ہمیں صرف ایک ہی قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں دستیاب ہوتا ہے۔ اس دیوان کے صفحہ آخر پر یہ فارسی قطعہ موجود ہے۔ جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس آخری مصرعہ کے صرف پہلے تین لفظوں یعنی " دیوان امتیاز بخوانید " خط کشیدہ ہیں لیکن اس کے اعداد بھی ۱۲۰۳ ہوتے ہیں جو بہ ظاہر اس دیوان کا سنہ تصنیف قرار پاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بھی اختلاف ہے اس وجہ سے کہ لطف النسا امتیاز کے دیوان میں ۲۱۹ اشعار پر مشتمل ایک مختصر مثنوی ملتی ہے۔ جس کے شعر نمبر ۲۰۵ سے صاف اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ دیوان ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں مرتب ہوا۔

کیا سن ہی ہجری کو میں جب عیاں ہوے یک ہزار دوسو پہ بارا ہے جہاں

ایسی صورت میں ہم صرف یہی استنباط کرسکتے ہیں کہ دیوان کے آخری فارسی مصرعہ کے تین الفاظ کے نیچے جو خط کھینچا گیا ہے۔ وہ صرف اس نسخہ کے کاتب کی موشگافی ہے اور مزید اس مسئلہ پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مذکورہ بالا ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات خود بخود پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اردو کی پہلی خاتون صاحب دیوان شاعر لطف النسا امتیاز ہے نہ کہ ماہ لقا بائی چندا۔ یہاں ایک اور بات کی وضاحت بر محل ہوگی کہ چندا کا دیوان

۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں مکمل ہوا۔ اور اس کی تاریخ " ھو اللطف الاعظمی " سے نکلتی ہے۔

بعض محققین کو یہاں بھی تھوڑا بہت تسامح ہوا ہے وہ اس طرح کہ بعضوں نے " ھو اللطف الاعظم " سے چندا کے دیوان کی تاریخ کا استخراج کیا ہے جس کے اعداد ۱۲۰۳ ہوتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ چندا کا دیوان مختصر ہے۔ اور یہ ورث غزلیات پر مشتمل ہے اور اس کو راجہ راؤ رنبھا کے حکم سے نصیر الدین خاں قدرت نے اپنے دیباچہ کے ساتھ مرتب کیا۔ لطف النسا امتیاز کا دیوان کم و بیش سارے اصنافِ سخن پر مشتمل ہے۔ جس میں غزلیات، قصائد، مثنوی، رباعی، قطعات، فرد، مخمس، مسدس اور مثمن وغیرہ ملتے ہیں۔ یہ دیوان ۲۱۶۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ جو امتیاز کی مثنوی کے شعر نمبر ۲۰۲ سے واضح ہے۔ ؎

ہوے دو ہزار ساٹھ اور ایک سو　　ہیں تعداد ابیات دیوان جو

اس دیوان کے علاوہ ہمیں امتیاز کی ایک طویل مثنوی بھی دستیاب ہوتی ہے جو بقول نصیر الدین ہاشمی تقریباً ۶۰۰۰ چھ ہزار اشعار اور ۴۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم مثنوی کا سائز ۸ × ۱۲ ہے اور جس کا مسطرہ ۱۵ سطری ہے۔ اس مثنوی کا نام گلشنِ شعرا ہے۔

دکنی شاعری کے بہت سارے بلند پایہ شعرا کی طرح لطف النسا امتیاز کی زندگی کے حالات بھی ہمیں کسی تذکرے یا تاریخ میں نہیں ملتے۔ امتیاز کے دیوان میں جو ۲۱۹ اشعار پر مشتمل ایک مختصر مثنوی موجود ہے۔ وہی امتیاز کی زندگی کے مختلف گوشوں پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالتی ہے۔ یہ مثنوی جہاں امتیاز کی زندگی کے حالات کی ایک اہم دستاویز ہے وہیں اپنے شوہر سید اسد علی خاں تمنا کی موت کا مرثیہ بھی۔ لیکن اس میں کہیں بھی سنین کا تعین موجود نہیں ہے۔ امتیاز کی شخصیت پر ہماری معلومات کا ماخذ جناب نصیر الدین ہاشمی کے مضامین ہیں لیکن ہاشمی صاحب نے اس بارے میں کچھ انصاف نہیں کیا ہے اور خود مثنوی کے بیانات سے بڑی حد تک انحراف کرتے ہوئے نہیں معلوم کیوں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:

" امتیاز کا وطن حیدرآباد تھا۔ ماں کا انتقال اس کے بچپن میں ہونے سے آصفیہ شاہی خاندان میں اس کی پرورش ہوئی۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر اسد علی خاں تمنا سے بیاہی گئی مگر افسوس جوانی میں بیوہ ہوگئی "

ہاشمی صاحب سے ہمیں یکسر اختلاف ہے یہ صحیح ہے کہ امتیاز اسد علی خاں تمنا کی شریکِ حیات ضرور تھی لیکن نہ تو ان دونوں کا وطن حیدرآباد تھا، نہ ہی امتیاز کی پرورش آصفیہ شاہی خاندان میں ہوئی، اور نہ وہ جوانی میں بیوہ ہوئی۔ اپنے اس بیان کی تصدیق میں ہم خود امتیاز کی مثنوی کے اشعار پیش کرتے ہیں۔

امتیاز اورنگ آباد کے ایک متوسط اور خوش حال گھرانے کی فرد تھی۔ اس کا خاندان اور قبیلہ وسیع تھا۔ وہ ابھی سوا برس ہی کی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا اس نے بیان کیا ہے ؎

سوا برس کی بے شبہ تھی یہ جاں　　کہ اوّل جدائی کیا باپ و ماں

تو پائی اسی عمر میں ماں نے فوت   دی خلعت یسیرے کی جب آکے موت
وہ غم باپ و ماں کا مجھے بے شمار   قبیلہ ہی میرا تھا کچھ کم ہے سزاوار

ماں کے انتقال کے بعد ایک لاولد شیعہ امیر نے امتیاز کو گود لے لیا۔ اور بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش ہونے لگی۔ وہ اس بارے میں یوں وضاحت کرتی ہے ؎

ہوا پرورش ہائے غیروں کے ساتھ   ہوے ان پہ دن عید، شب، شب برات
نہ اولاد بھی ان کو اور آل تھی   وہ ہوتے تھے صدقے یہ دیکھ حال ہی

جب امتیاز نے اپنی عمر کے پانچویں سال میں قدم رکھا، دھوم دھام سے بسم اللہ کی تقریب منائی گئی۔ اور اسکی تعلیم کا اہتمام سے آغاز ہوا۔ وہ لکھتی ہے ؎

ہوا پرورش ہائے غیروں کے ساتھ   ہوے ان پہ دن عید، ست، شب برات
نہ اولاد بھی ان کو اور آل تھی   وہ ہوتے تھے صدقے یہ دیکھ حال ہی

جب امتیاز نے اپنی عمر کے پانچویں سال میں قدم رکھا، دھوم دھام سے بسم اللہ کی تقریب منائی گئی۔ اور اس کی تعلیم کا اہتمام سے آغاز ہوا۔ وہ لکھتی ہے ؎

ہوا جب شروع آکے سال پنجم   تو سونپے معلم جو تھے خوش رقم
دو بسم اللہ جب دھوم سے میں پڑھا   ہوا اسم اللہ مرا رہنما
جو لازم تھا عمداؤں کی نسل کو   نجیبوں، امیروں کی اولاد کو
پڑھا اور لکھا کر ہی قابل کئے   گویا چرخ کج رو کو قائل کئے

امتیاز کی عمر جب نو سال کی ہوی، اس نے شعور کی عمر میں پہلی بار اپنے والد کو دیکھا۔ اس عرصے میں اس کے اقرباء میں سے کوئی کبھی کبھار آکر اس سے ملتا رہا ان واقعات پر حسب ذیل اشعار سے روشنی پڑتی ہے۔ ؎

کچھ ایک اقربا آکے ملنے لگے   وہ نو سال کے بعد باپ آملے
رہی ناشناسائی ان کی مجھے   کہ قبیلہ ہے میرا یا کوئی غیر ہے
ولیکن انھوں نے تو لخت جگر   میں تھا قوت جان، نور البصر
فدا دم بدم مجھ پہ کرتے تھے جان   وہ قربان ہوتے تھے ہر آن آن

امتیاز کے والد آٹھ سال طویل عرصے تک اپنی بیٹی سے نہیں ملے۔ جدائی کا سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا اگر امتیاز کے والد بھی اثنا عشری معتقدات کے حامل ہوتے تو یقین تھا کہ سالانہ محافل و مجالس میں بہرحال وہ اس کے گھر جاتے اور تعلقات کی بھی استواری برقرار رہتی۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ امتیاز کے والد اتنے مرفہ الحال نہیں تھے اور بار بار ایک امیر گھرانے میں آنا جانا سماجی نابرابری کی وجہ سے شاید انھیں گوارا نہ ہوسکا۔

تعلیم و تربیت کے اس اہتمام کے دوران امتیاز کو شاعری سے بھی شغف ہوگیا۔ اور اوائل عمر ہی سے اس نے

شعر کہنا شروع کیا۔ حسب ذیل اشعار اس کے ثبوت ہیں ؎

لڑکپن سے یہ شوق دل نے کیا　　یہ کچھ شعر و اشعار کا مشغلہ
لیاقت تو کیا شعر کہنے کی تھی　　ہوس یوں ہی جب کہنے سننے کی تھی

اسد علی خاں تمنّاؔ سے لطف النسا امتیازؔ کی شادی کس سنہ میں ہوئی ہمیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ زمانۂ قدیم میں شعور کی اوائل عمر ہی میں شادی بیاہ کا رواج عام رہا ہے۔ اور خصوصاً خوش حال امیر اور متمول گھرانوں میں شادیاں بہت جلد ہی ہو جایا کرتی تھیں۔ قیاس اغلب ہے کہ ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۷۵۴ء کے کچھ ادھر ادھر امتیازؔ کی شادی ہوی ہوگی۔ اس طرح سے امتیازؔ کا سنہ پیدائش کم و بیش ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء قرار پاتا ہے۔

تمنّاؔ کے والد اپنے خاندان کے ساتھ اورنگ آباد سے ترک وطن کر کے حیدرآباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے تمنّاؔ کی شادی کے بعد امتیازؔ کو بھی اپنے سسرال منتقل ہونا پڑا۔ اور اس کے بعد سے مستقل سکونت حیدرآباد کی ہو گئی۔ اس دوران ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کبھی اورنگ آباد جانے کا اتفاق نہیں ہوا ایک عرصہ بعد جب وہ اورنگ آباد گئے تو اسی دوران تمنّاؔ کا وہیں انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کا ثبوت ہمیں مثنوی کے ذیل کے اشعار سے ملتا ہے ؎

ذرا تو میرے دل کی شورش کو سن　　مسافر ہوں دل خستہ و بے وطن
نہ کوئی یار و غم خوار ہے یہاں میرا　　نہ ہے پاس میرے نگار اب میرا
ہے اوّل مجھے اس سفر میں یہ غم　　کہ تنہا ہوں میں ہے بڑا یہ ستم

امتیازؔ کے لیے شوہر کی موت کا حالت سفر میں یہ جانکاہ صدمہ شدید تھا۔ شوہر کی موت اور اولاد کے نہ ہونے کا نتیجہ بجز آہ و زاری کے اور کچھ حاصل نہ تھا۔

جناب نصیر الدین ہاشمیؔ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ

امتیازؔ مشہور شاعر اسد علی خاں تمنّاؔ سے بیاہی گئی مگر نوجوانی میں بیوہ ہو گئی۔ کیوں کہ تمنّاؔ کا انتقال ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں ہوا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تمنّاؔ کا انتقال ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء ہی میں ہوا۔ لیکن امتیازؔ کی جوانی میں بیوگی کی بات ہماری فہم سے بعید ہے۔ جب کہ خود امتیازؔ نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد جو مثنوی لکھی ہے اس میں صاف واضح کیا ہے کہ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے چھتیس سال تمنّاؔ کے ساتھ بسر کئے۔ وہ لکھتی ہے کہ ؎

مشقت برس ہائے چھتیس کی　　سو یک بارگی ہائے دھوئی گئی
سراعشق ہے سال چھتیس کا　　سو برباد یل میں یہ کیا گیا

شاید ہاشمیؔ صاحب نے ازدواجی زندگی کے چھتیس سال کو امتیازؔ کی عمر سمجھ لیا۔

اسی طرح کا ایک اور تسامح ہاشمی صاحب کو ایک اور مرحلہ پر ہوا ہے۔ جب کہ انھوں نے یہ تحریر کیا کہ ـــــ

"امتیازؔ نے چھتیس سال کی عمر میں دیوان مرتب کیا۔"

حالاں کہ اپنی مشقِ سخن کے تعلق سے امتیاز نے صاف لکھا ہے کہ ؎

کرے نامۂ اعمال کوئی سیاہ کیا برس چھتیس اس میں تباہ
ہوتا چار اس دہر سے برق وار تو کر رخش قرطاس خامہ سوار
یہ کر جلد جولاں دوجا یک خرام تو دیوان کو بھی دیا انتظام

ان اشعار سے دو باتوں پر صاف روشنی پڑتی ہے پہلی بات یہ کہ امتیاز نے اپنی شادی کے بعد سے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ دوسرے یہ کہ شاعری میں امتیاز نے یقیناً تمنا ہی سے مشورۂ سخن کیا ہوگا۔

امتیاز کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کے لاولد ہونے کا ثبوت بھی ہمیں مثنوی کے اس شعر سے فراہم ہوتا ہے ؎

نہ کوئی ہے خلیفہ نہ کوئی جانشیں ہمیشہ یہ دو حرف نقش نگیں

شوہر کے انتقال کے بعد امتیاز نے اپنے دیوان کی تدوین کی۔ اور آٹھ سال بعد ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں یہ دیوان مرتب ہوا۔ اس وقت امتیاز کی عمر کم و بیش ۵۰ سال کی تھی۔

امتیاز اپنے معتقدات کے اعتبار سے شیعہ ضرور تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرت سید شاہ عطاء اللہ سحر سے سلسلہ قادریہ میں بیعت و ارادات بھی رکھتی تھی۔ اس واقعہ پر اس نے اپنی ضخیم مثنوی "گلشنِ شعرا" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ؎

تو میش حقیقی سے مدہوش ہے شراب محبت سے بے ہوش ہے
عطا وہ کئے معرفت کا کلام عطاء اللہ سحر میرے مرشد کا نام
امین الدین اعلیٰ جو ہیں ان کے جد وہ علم حقیقی کے ہیں مجتہد
جہاں تک تیں ہے دہاں تک امیں ہیں سب اولیا میں وہ مثل نگین

امتیاز کی اس طویل مثنوی کا قلمی نسخہ کتب خانہ خواتین دکن میں محفوظ ہے۔

شاہ عطاء اللہ کے حالات "گلزار آصفیہ" میں بالتفصیل موجود ہیں۔ بادشاہِ وقت نظام علی خاں کے عہد ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۰ء تا ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں وہ بیجاپور سے حیدرآباد آئے۔ اور کچھ عرصہ تک حیدرآباد میں قیام پذیر رہے آصف جاہ ثانی آپ کے بڑے معتقد ہو گئے تھے۔ وزیر اعظم ارسطو جاہ کو بھی آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ محلات شاہی کی کئی بیگمات بھی ان کی مرید ہوئیں۔ حیدرآباد سے آپ کرنول تشریف لے گئے۔ کرنول کے نواب غلام رسول خاں بھی آپ کے مرید تھے۔ شاہ صاحب کا انتقال بھی کرنول میں ہوا۔ اور وہیں آسودہ ہیں۔

جناب نصیر الدین ہاشمی نے اپنے مضمون "اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ" کے متعلق جدید انکشافات میں لکھتے ہیں کہ

"آج سے پونے دو سو سال پہلے جب کہ حج کو جانا آسان نہیں تھا (بقیہ صفحہ ۱۰۰ پر دیکھئے)

عزیز احمد جلیلی

○

سکون راس ہے مجھے کیوں نہیں خدا جانے
خزاں گئی تو بہار آ گئی ہے تڑپانے
سہار رائے کے میری زندگی محبت کا
جنوں کا راز خرد کو چلی ہے سمجھانے
بہار کا تھا بہت انتظار مستوں کو
بہار آئی تو باقی رہے نہ میخانے
نگاہ میں کسی بے کس کا آشیاں ہوگا
کس اہتمام سے آئی ہے برق لہرانے
نگاہ مست سلامت رہے تری ساقی
کہاں کے شیشہ و ساغر کہاں کے میخانے
جلا کے شمع کو بھی رکھ دیا سرِ محفل
چلے تو آپ اکیلے چلے نہ پروانے
عزیزؔ ہو گئے ادھر سے کوئی تو گزرا ہے
ہر ایک گام پہ بکھرے ہوئے ہیں افسانے

محمد منظور احمد

○

گھور اندھیرے میں مجھکو ڈھونڈتی تھی
رات سناٹے میں صدا کس کی
آشیاں میرا زد میں تھا لیکن
جانے کیسے بھٹک گئی بجلی
کارواں جا چکا سوئے منزل
دیر تک گرد پھر بھی اُڑتی رہی
سوچ میں گم نراس کیوں بیٹھیں
تھی، مگر اتنی آس بھی تو نہ تھی
رات تھوڑی سی اور باقی ہے
اور کچھ دیر جاگ لیں تو سہی
کچھ مداوا نہ ہو سکا اب تک
کب ان آنکھوں کی دور ہو گی نمی
کھولے بیٹھا ہے منھ ہر ایک صدف
جانے حصّے میں کس کے ہے موتی

مجید بیدار

روزنامچہ کا ادبی جائزہ

اردو نثر کے منفرد اسلوب میں جن مختلف طرز نگارشات کو شامل کیا جاتا ہے ان میں " روزنامچہ " بھی اپنی اہمیت و افادیت رکھتا ہے ۔ ایک خاص انداز اور منفرد لہجہ اور بیان کے ساتھ یہ اسلوب عام انسان کی زندگی کے حالات اور معاملات کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ روزنامچہ اپنی خصوصیت کی بنا پر کوئی علحدہ صنف نثر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کا مرتبہ ایک مرکب صنف کی حیثیت سے کیا جا سکتا ہے ۔ انسان کی روزمرہ مصروفیات اور مشاغل کا ذکر اس اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ۔ درحقیقت یہ اسلوب ایک سوانحی بنیاد کا علمبردار ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے روزآنہ کے معمولات زندگی کی تاریخ میں مقید کرتے ہوئے اپنی حیات کی سوانح مرتب کرتا ہے اس اعتبار سے روزنامچہ ایک طرزِ اسلوب ہونے کے علاوہ سوانحی شکل وحیثیت بھی رکھتا ہے ۔ جس کی ابتدا اردو میں " تذکرہ نگاری " سے ہوتی ہے ۔

اردو زبان میں لفظ روزنامچہ کا استعمال فارسی کے ذریعہ ہوا ۔ فارسی زبان میں روزنامہ یا روزنامچہ ایسی کتاب تحریر کے لیے مستعمل ہے جس میں روز کا حال بیان کیا جائے ۔ اس اعتبار سے روزنامچہ کی لغوی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ فنی اعتبار سے جس کتاب میں روزآنہ واقعات اور حالات اور واردات کا ذکر ہو اس کا شمار " روزنامچہ " میں کیا جائے گا لغوی بنیادوں پر روزنامچہ روز کا حال لکھنے کا نمائندہ ہے اس اعتبار سے روز کا حال سے مراد وہ تمام ضروریات کیفیات اور حالات کا ذکر روزنامچہ میں پیوست ہو جائے گا ۔ جو انسانی زندگی میں حرکیت کے ضامن ہیں ۔ اس پس منظر میں انسان کی سیاسی دلچسپیاں، معاشی جدوجہد، علمی و ادبی مشاغل، سماجی و فلاحی مصروفیات اور مذہبی و روحانی تبلیغ کا ذکر بھی " روزنامچہ " کی لغوی معنی کی نمائندگی کرے گا ۔

فارسی زبان میں " روزنامچہ " کا استعمال عام طور پر بادشاہوں کے معمولات اور ان کی روزآنہ مصروفیتوں کو پیش کرنے کے عمل کو کسی تحریری انداز میں رواج دینے کے لیے کیا جاتا ہے ۔ یعنی اپنے مصروفیات کو دن بھر کے منصوبے سے مربوط رکھنے کے لیے بادشاہ یا امراء ایک مخصوص طریقہ اختیار کرتے تھے جس کی تفصیل تحریری طور پر محفوظ کر دی جاتی تھی ۔ اور یہی عمل ہر روز کی مصروفیات کا نمائندہ ہوتا ۔ اسی لیے ایسی تحریروں کو " روزنامچہ " کا عنوان دیا گیا ۔ ایرانی اور ہندوستانی بادشاہوں کے دربار میں روزنامچہ نگار موجود ہوتے جو بادشاہ کی مصروفیات کی تفصیل ہر روز کے بیان کے

کرتے تھے۔ یہی طریقہ آج کے ادبیات میں "روزنامچہ نگاری" کے نام سے موسوم ہے۔

لفظ "روزنامچہ" فارسی ترکیب سے اردو میں مروج ہوا۔ فارسی زبان میں "روزنامہ" لفظ اس کی ابتدائی نہج
ے اختیار کیا گیا ہے۔ فارسی میں "روز" کا لفظ دن کے لیے مستعمل ہے۔ اور اسی روز سے ایک نئی ترکیب "روزنامچہ"
کی گئی۔ "روزنامچہ" کا لفظ دو الفاظ کا مرکب ہے جس کے مطابق روز بمعنی دن اور "نامچہ" بہ معنی لکھا ہوا
بار سے "روزنامچہ" سے مراد ایسی تحریر ہوگی جو دن بھر کی مصروفیات کو ایک ہی دن میں تحریری طور پر پیش کی جائے
کی مصروفیات کو آج کی تاریخ میں ہی لکھنا "روزنامچہ" کہلائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ طوالت یا مصروفیت کی بناء پر
شاغل کو دوسرے دن تحریر کیا جائے لیکن روزنامچہ کے ذریعہ صرف اپنی تحریروں کو اسلوب میں شمار کیا جائے گا
کیفیات کی نشاندہی کرتی ہوں۔ فارسی زبان کے دو الفاظ کے اشتراک سے بننے والا لفظ روزنامچہ فنی طور
نفرد اسلوب نثر کی حیثیت سے فارسی اور اردو زبان میں مروّج ہوا۔

انگریزی زبان میں "روزنامچہ" کے لیے DIARY کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ ڈائری اپنی بنیاد کی
سے لاطینی زبان کے DIARLUM سے استفادہ کرتا ہے۔ لاطینی زبان میں Diarium کے معنی DAY
ے ہوتے ہیں DIARIUM کا لفظ تصرف میں لایا جاکر DIES میں تبدیل ہوا۔ اور پھر وہ اپنی ہیئت بدلتے ہوئے
حیثیت اختیار کر گیا۔ لفظ DAY سے انگریزی میں ڈائری کا رواج ہوا جو درحقیقت لاطینی لفظ DIARIUM
رہ ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان میں ڈائری کا لفظ روزنامچہ کے لیے موزوں اور متبادل قرار دیا جاسکتا ہے۔
ر ڈائری کے اسلوب اور اس کے انداز و تشکیل کی تعریف کرتے ہوئے ان سائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے روزنامچہ
ے میں لکھا ہے کہ

"A Daily Record of events Kept by a diarist.
It describes mattevs Coming Under the writer's
observation, Including those gleaned from
Contem pevary Reports, Correspondence and
Conversations, With his personal Comments,
Not all daily Record Kept by amindvidual
are diaries in the generallyaccepted Sense
of terms, connoting those which have Some
biographical, historical, or literary value
The word Journal is often used Synov
ymously. the Sirwalter scott's journal is a

diary. the ancient Greeks kept diaries (ephemerides).

" روزنامچہ نویسی کی فنی تعریف کرتے ہوئے اس بیان میں انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین نے بتایا ہے کہ روزنامچہ سے مراد ایسی اندراجات ہیں جن میں روزآنہ معاملات کا ذکر کیا جائے اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ روزنامچہ نویسی اپنی تحریر سے اندراجات کو روا رکھتے ہوئے فن کو ظاہر کرتا ہے یعنی روزنامچہ ایسی تحریر میں خصوصیت قرار پائے گی جس میں بذات خود اپنے حالات وتجربات کو قلم بند کیا جائے درحقیقت روزنامچہ نویسی اک ایسی تحریر قرار دی جائے گی جو ذاتی مشاہدات کی آئینہ دار ہو۔ اور جس کے ذریعہ مصنف اپنے روزآنہ کے حالات لکھتا او بیانیہ انداز میں روز کے معاملات کی روشنی میں خود کی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے۔

روزنامچہ کی حیثیت کی تشریح کرتے ہوئے اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا طرزِ اسلوب ہے جس کے ذریعہ وقت کی دستاویزی خصوصیت تکمیل پاتی ہے۔ یعنی روزنامچہ نویسی کی تحریروں سے دور کے حالات کے ہی منظر میں زندگی عمل کرتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈائری درحقیقت چند اندراجات خانگی معاملات انفرادی خصوصیات اور باہمی گفتگو کے علاوہ خط وکتابت اور مراسلت سے مربوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار شخصی حالات ومعاملات کی عکاسی کی وجہ سے سوانح عمری میں کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ روزنامچہ ایک شخصی سوانح عمری کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزنامچہ کو اردو کی قدیم طرزِ تحریر " تذکرہ نگاری " سے اس لیے مربوط کیا جاتا ہے کہ جدید صنفِ سوانح نگاری کی ابتدائی تشکیل اردو زبان میں تذکرہ گوئی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ درحقیقت روزنامچہ انسان کی شخصیت کا تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔ جس میں خود نویسی سوانح عمری کی خصوصیت اور فنی سوانح نگاری کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ نویسی اردو تذکرہ نگاری سے قریب سوانح نگاری سے ازلی رشتہ اور خود نوشت سوانح سے پوری طرح استفادہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے روزنامچہ سوانح، تذکرہ اور خود نوشت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

روزنامچہ نویسی کے دوران سیاسی، سماجی اور ادبی اقدار کی پیش کشی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی اور معاشرتی معاملات کی جھلکیاں بھی بحیثیت میں روزنامچہ کے ذریعہ اکٹھا کی جاتی ہیں۔ شخصی واردات اور منفرد ذہن کی عکاسی بھی روزنامچہ کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایک اعتبار سے روزنامچہ سوانحی، تاریخی اور ادبی اقدار کا حامل ہوتا ہے جس میں شعوری طور پر ذاتی حالات کو قلم بند کرنے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اگرچہ کہ روزنامچہ نویسی ایک منفرد صنفِ نثر کی حیثیت نہیں رکھتی لیکن اس طرزِ تحریر کے ذریعہ شخصی انفرادیت اور ذاتی صلاحیت کے علاوہ اہم خدمات اور خصوصیات کا ذکر روزآنہ تاریخ کے ہی منظر میں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں روزنامچہ نویسی کو بنیاد بنا کر خود نوشت سوانح عمریاں لکھی جارہی ہیں۔

روزنامچہ نویسی کے ذریعہ شخصیت اور کارناموں کی تحقیق اور مواد کی فراہمی کا عمل طے پاسکتا ہے۔ اور زندگ

(بقیہ صفحہ پر دیکھیے)

رؤف خیر

ترائیلے

25th HOUR

ساعت شدید کے نرغے میں آگئے
یبز دائرے سے نکلتی ہوی سی ہے
ں کے سب جتنے شیر تھے پنجرے میں آگئے
ساعتِ شدید کے نرغے میں آگئے
ں ڈگر پہ جاگتے سوتے میں آگئے
شکل حرزِ جاں تھی وہی اجنبی سی ہے
ساعت شدید کے نرغے میں آگئے
بیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے

▲

سفید ہاتھی

میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
چھچھوندر، سانپ کے ذہن میں
نہ چھوٹتی ہے نہ چھوڑتا ہوں
میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
ضمیر پر کب سے ہنس رہا ہوں
سفید ہاتھی کے پیرہن میں
میں کس غلامی میں پھنس گیا ہوں
چھچھوندر — سانپ کے ذہن میں

▲

یوسف اعظمی

خوابوں کا بازار

تمہارے لیے ہی سجی ہے یہ دنیا
تمکس کے پیرہن، جسم کی چاندنی، دل کی تازہ امید
نور کی انگلیاں
آنے والی حسین ساعتوں کے بدن
کرسیوں پر مچلتی ہوئی آرزو
تخلیق کی دل کشا آگہی
مامن کے در
یا بوڑھے اوناسس کا پھیلا ہوا خوب صورت جزیرہ
کہ گم گشتہ فردوس کی آرزو
روح نظر بند شوکیس ہے
سقراط کے گیت، خوابوں کے چہرے، سانسوں کی بکتی ہوئی نکہتیں ہیں
دھڑکنوں کی حسین سمفنی بک رہی ہے
ٹوٹ کر بننے لگتی ہیں سرگوشیاں
چاند تاروں کی اُجلی زمین کو سجانے کی خاطر کھڑے ہیں
شاہراہوں پہ سورج کا نیلام ہے
زمیں آسماں کو ہتھیلی میں لے کر کھڑی ہے
سات پردوں کے پیچھے جوان دیکھی تقدیس بیٹھی ہوئی ہے
لوگ نیلام کرنے لگے ہیں
یہ تسلسل نہ جانے کہاں ختم ہوگا

سمندر کے آنچل پر

ہاتھوں میں تم آسماں کو اٹھا کر
سمندر کے آنچل پہ بیٹھے ہوئے ہو
سمندر جو اپنا چمن تھا
سورج جو پانی کی لہروں پہ اک گیند کی طرح سے جھولتا ہے
تمہاری مچلتی جوانی کا بھیگا ہوا آئینہ ہے
چلے آؤ اس گیند کو لے کے دوڑیں
سمندر کے ساحل کے گیلے بدن پر
ہوا بھیگی بھیگی تمہارے بدن کو مسلتی ہوئی بہہ رہی ہے
صدا زندگی کی بدن کے حصاروں سے آگے کھڑی ہے
ہم ہاتھ میں ہاتھ لے کر کدھر بہہ رہے ہیں
جواں جسم کے گیت سازِ اوّل پہ ہنکتا ہوا ایک خود کار نغمہ بنے ہیں
جسم سے چاندنی بہہ رہی ہے
تمہارے جھکتے ہوئے گیسوؤں سے
سمندر معطر ہوا جا رہا ہے
سمندر کے آنچل پہ بہتے ہوئے منظروں کی کہانی
کہاں ختم ہوگی ؟
ادھورے جہاں میں انجھول چاہت کے بے نام شہرِ قفس ا
سمندر کے آنچل پہ یہ ایک لمحہ
ایک بوسہ ہوا کا
لہو کے لیے ایک سوغات ہے

شہپر رسول

○

قرب کا موسم کرے گا رقص جب دیکھے گا کون
فاصلوں میں کھو چکے بینائی سب دیکھے گا کون

سبز رُت کے ساتھ ہی پنچھی بھی سب جانے لگے
ان جھلتی ڈالیوں کی سمت اب دیکھے گا کون

روشنی کی ناف میں ہو جائیں گی آنکھیں تمام
ماجرا کیا ہے پسِ افسونِ شب دیکھے گا کون

لوگ وحشی قہقہوں سے نیم جاں ہو جائیں گے
کوئی بیٹھا ہے کہیں خندہ بلب دیکھے گا کون

سائے میں بیٹھے مسافر سے یہ برگد نے کہا
خشک اور برہم ہواؤں کا غضب دیکھے گا کون

کاروانِ مہوشاں یوں ہی گذرتے جائیں گے
راستوں کے کرب کا عالم عجب دیکھے گا کون

مظفر النساء ناز

○

آئینہ دل کا ہر اک رُت میں سجائے رکھیے
جانے کب آئیں گے وہ شمع جلائے رکھیے

کہیں ایسا نہ ہو تا عمر ہنسی کو ترسیں
غم کا تحفہ ہے اسے دل سے لگائے رکھیے

پیار کو جرم سمجھ بیٹھیں گے دنیا والے
زندگانی کو نہ افسانہ بنائے رکھیے

زندگی بھر کبھی توقیر ہیں ہوگی نہ کمی
سرفرازی کے لیے سر کو جھکائے رکھیے

دوست کا پیار تو ہے اپنی جگہ پر قائم
اُس کی نفرت کو مگر دل سے لگائے رکھیے

نازؔ اس راہ سے اک روز تو وہ گزریں گے
اُن کے قدموں کے لیے پھول بچھائے رکھیے

خالدہ اصغر

نام کی کہانی

اب وہ کسی سے کیا کہتی؟ اول تو یہ نام بھول جانے کا قصہ ہی عجیب تھا کہ حرف سب کے سب موجود تھے اور مل کر ایک نام اب بھی بناتے تھے، اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہی اس کا نام تھا مگر مشکل یہ تھی کہ پہلے یہ لفظ وہ خود تھی۔ مگر اب وہ محض خول تھا، وہ اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اصل نام وہ خول تھا، یا وہ خود، جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اسی لیے سب کام تھم گئے تھے۔ یا شاید یہ حادثہ اس لیے ہوا تھا کہ ایک مدت تک وہ اپنے نام کا شدید احساس کرتی چلی آئی تھی۔ مثلاً جب جمیل نے اُسے چھوڑا تو اُسے ہر دم اپنے نام کا احساس رہتا۔ وہ لوگوں سے الگ موجود تھی، ایک اٹل لفظ۔ کیوں کہ لوگوں نے اسے اپنے سے علاحدہ کیا تھا۔ چناں چہ سوتے جاگتے، اندھیرے اجالے، کوئی یہ لفظ اس کے کان میں پھونکتا رہتا۔

اُس لفظ کی کیفیت عجب تھی کہ اسے ہر دم ہوشیار رہنا پڑتا۔ وہ پل بھر غافل ہوی اور نام نے اپنے لمبے لمبے پنجوں میں اسے جکڑا۔ اس سے بچنے کی خاطر اس نے سو سو جتن کیے۔ پہلے پہل نزہت کا جہیز تیار کیا اور راتوں جاگ جاگ کر کپڑوں پر قطعی غیر ضروری کڑھائی کی، گوٹا لچکا لگایا۔ پھر سب گھر کے کپڑوں کی سلائی کا ذمہ لیا۔ دھلائی، استری، کڑھائی۔ مگر جونہی وہ پل بھر کو سانس لینے رکتی کوئی وہ لفظ اس کے کان میں پھونکتا۔ پھر ایک ایک چیز کا دھن پیدا۔ چاروں سمت بس ایک ہی لفظ رہ جاتا (وہ خود اپنی آنکھوں سے چیک کے رہ جاتی) اور اس لفظ کی عجیب دہشت تھی کہ سنتے ہی اس کا جی ڈھینے لگتا جیسے خواب میں کوئی بلا پیچھے بھاگے اور بھاگا نہ جائے۔ پاؤں کسی طلسم سے بوجھل ہو جائیں اور فاصلہ کاٹے پر نہ کٹ پائے۔

مگر جب وہ نزہت کے پاس آن رہی تو عجیب اتفاقات ہونے شروع ہوے۔ اب یہ بھی ہوا کہ گھنٹوں اسے اس لفظ کی یاد نہ آتی۔ کچھ اس لیے بھی کہ نزہت کے بلو، گنٹو، اور منو کا بے ڈھنگا کام اسے الجھائے رکھتا۔ انھیں اسکول کے لیے تیار کرنا، ناشتہ کروانا، کپڑوں کا حساب، کمروں کی صفائی، نزہت کے کپڑوں کی سلائی، نسیم کے کرتے۔ کبھی کبھی تو ایک پل کی فرصت نہ ملتی۔ صبح آنکھ کھلتی اور پلک جھپکتے میں رات آن پہنچتی۔ کبھی نیند اور بیداری کے درمیانی فاصلے میں وہ لفظ ہوا کے جھونکے کی طرح چھو کر گذر جاتا۔ مگر پھر بلو کے کپڑوں، گنٹو کے سویٹروں اور منو کی گڑیوں کا سلسلہ پھیلنے لگتا اور پل بھر میں صبح ہو جاتی۔

اب کاموں کا سلسلہ اسے ایک طلسمی دنیا نظر آتا۔ دنیا میں کتنے بے شمار کام پھیلے تھے۔ کبھی کبھی وہ دل ہی دل میں ان کاموں کی فہرست بنانے لگتی۔ پھر اسے اس بات پر حیرانی ہوتی کہ آخر اتنے ڈھیروں کام پیدا کس طرح ہوئے۔ تب اس کا ذہن نئے نئے کاموں کی تخلیق میں الجھنے لگتا۔ ٹاٹ پر اون کی کڑھائی۔ دھجیاں جوڑ جوڑ کر پردے اور پلنگ پوش بنانا۔ گھر کی آرائش کی نت نئی چیزیں۔ ان کاموں کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وقت گزرتا رہتا۔ دن کے طلوع اور غروب کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہتا۔ کام فاصلوں اور وقت کو چوسنے کا آلہ تھا۔ جس طرح سیاہی چوس سیاہی چوسنے کا۔

کام کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی تھی۔ بھوک ـــــ اندر ہی اندر پھیلنے والا ایک اندھا شگاف، جس میں آگ دہکتی تھی اور اس آگ کے دہکتے رہنے میں عجب طمانیت تھی۔ ایسے میں وہ کمر کے ساتھ چپکے پیٹ کو محسوس کرتی۔ اس کی انگلیاں ابھری پسلیوں کو گنتیں۔ پھر جسم کی ایک ایک ہڈی اسے نظر آتی۔ جیسے وہ خود اپنا ایکس رے ہو۔ اس پر اسے میٹھا میٹھا اطمینان ملتا۔

"آپو ـــــ خدا کے لیے کچھ کھا لو۔ مٹاؤ یہ کام۔" نزہت بار بار کہتی۔

"بس ابھی آئی ـــــ" مگر وہ گھنٹوں بھوک اور مٹتے جسم اور ابھرتی ہڈیوں کے سرور میں بیٹھی رہتی۔

"تمھیں تو کام کا ہوکا ہے آپو ـــــ" نزہت اس وقت کہتی جب وہ اس کے کہنے پر کسی سے ملنے ملانے چلی جاتی مگر تمام وقت اسے یوں لگتا رہتا جیسے دنیا سے کام مٹتے چلے جاتے ہوں اور کاموں کا مٹنا سب سے بڑا عذاب تھا۔

مگر اچانک یوں ہونے لگا کہ سورج ڈوبنے کا عمل دیکھتے ہی دیکھتے طویل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ گھنٹوں پیلی پیلی دھوپ منڈیروں پر رینگتی انگل انگل سرکتی ہے۔ سورج گھنٹوں اندر باہر رہتا ہے اور وقت کا رشتہ دن کے ساتھ جڑتا ہے نہ رات کے ساتھ۔ پہلے جو دن پورے کا پورا کٹ جایا کرتا تھا اب نہ کٹتا۔ گذرنے پر بھی کہیں آس پاس منڈیروں پر منڈلاتا رہتا اور اس پر اسے مدتوں پہلے کا پانی بھرا تسلا یاد آتا۔ جب کبھی سورج گرہن لگتا تو چھت پر پانی بھرا تسلا رکھا جاتا۔ پہلے پانی دیر تک مچلتا رہتا۔ پھر تھمتا اور سنولائے سورج کی پرچھائیں اس میں تیرتی۔ پرچھائیوں کے دیکھنے پر اسے ہمیشہ یوں لگتا جیسے نیند میں چل پھر رہی ہو اور نیند میں چیزیں لمبی، گھٹتی ہوئی، چپٹی، کھنچتی چلی جاتیں۔ اب تو دن کا بھی یہی عالم ہوا تھا آسمان سے طلوع ہوتا نہ غروب۔ جیسے پانی بھرے تسلے میں ڈولتا پھرتا۔ نیند سے بھرا ـــــ لمبا، چپٹا ـــــ کھنچتا ہوا ـــــ

چنانچہ پہلے کی طرح اب دن گذرنے پر اسے کسی لکیر کے کٹ جانے کا احساس نہ ہوتا۔ اسی لیے کام لمبے ہوتے چلے جاتے۔ جیسے کوئی مٹیالا الاسٹک کھنچتا چلا جائے۔ یوں بھی وہ اکثر کام کر چکنے کے بعد وہم میں پڑ جاتی کہ واقعی وہ کام ہوا یا نہیں۔ دنوں کی طرح پہلے کام بھی پورے کے پورے نبٹ جاتے تھے۔ صبح سویرے بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا ـــــ پھر کپڑوں کی دھلائی، استری، دوپہروں میں سلائی اور کڑھائی ـــــ اسی طرح مارا مار کام اور دن گذرتے چلے جاتے اور رات کو سوئی سوئی تھکن میں سب کچھ ڈوب جاتا۔

تب کی نیند بھی اب کی نیند سے بہت مختلف تھی۔ اپنے وقت پر شروع اور ختم ہو جاتی۔ مگر اب اس کا کوئی شروع تھا نہ آخیر۔ جب وہ سمجھتی کہ جاگ رہی ہے اور کام کرتی ہے، تب اچانک اسے لگتا کہ ہاتھ ہلنے کے باوجود نہیں ہلتے اور ٹب کے صابن گھلے پانی میں ذرا سا بھی گیلا پن نہیں۔ کپڑوں کا کوئی لمس نہیں۔ پھر بھی وہ کپڑے دھو رہی ہے۔ اس پر اسے

حیرت ہوتی اور پھر اس پر کھلتا کہ دراصل وہ چوکی پر بیٹھے بیٹھے سوتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر پمپ چلاتی۔ تب بھرجاتا اور دھلائی شروع ہو جاتی۔ کپڑے دھلتے چلے جاتے اور الگنی بھرتی چلی جاتی۔ پھر بھی اسے یوں لگتا جیسے وہ چوکی پر بیٹھی بیٹھی سو رہی ہے نیند اور بیداری کی حدیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔

کبھی کبھی اسے خیال سا آتا کہ اس سے پہلے چیزیں صاف صاف اور جیتی جاگتی تھیں اور یاد کے بے شمار سلسلے ان کے گرد اگرد پھیلے تھے۔ مگر اب کبھی ایک آدھ ٹکڑا تصویر کا، اور بے ربط بیہیں ادھر ادھر سے آن جڑتیں۔ برسوں پہلے کی کوئی آواز سنہری چمکیلا سلیٹی فرش پر بکھری کترن۔ پیتل کی جگر جگر کرتی بالٹی۔ خوشبوؤں کا بھی یہی عالم تھا کہ کبھی گھپ اندھیری نیند سے وہ اندر ہی اندر پھیلتے کسی شگاف سے چونکتی۔ اور چونکنے اور پوری طرح بیدار ہونے کے درمیانی فاصلے میں وہ بے موسمے پھولوں کی خوشبوئیں آتیں جو بیدار ہونے پر بالکل وہم لگتیں۔ پہلے چیزوں اور خوشبوؤں کا یہ طور تھا کہ واقعات کے سلسلوں میں گندھی گندھائی چلی آتی تھیں۔ مگر اب ان سلسلوں کے بغیر ٹکڑے ٹکڑے مٹیالے پن میں تیرتی پھرتی تھیں۔

باتوں، خوشبوؤں، چیزوں اور آوازوں کا یوں ٹکڑے ٹکڑے مٹیالے پن میں تیرتے پھرنا کچھ ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ایک مدت سے اسے کسی بات پر تشویش بھی نہیں ہوی تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ایک شام وہ منو کے بال سنوارتی تھی، اور بلو گڈو قریشی صاحب کے بچوں کے ساتھ باہر لان میں کھیلتے تھے۔ نزہت اور نسیم بھی لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور اندر سب کے سب کمرے، سجے سجائے خالی پڑے تھے۔ منو کے بالوں سے صابن کی گیلی گرم مہک آتی تھی اور اس کے ہاتھ الجھے بالوں کو تیزی سے سلجھا رہے تھے اور بالوں اور کنگھی کا ـــــ اور اس کرسی کا جس پر وہ بیٹھی تھی کوئی لمس نہ تھا۔ تب اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر رک گئی۔ خشک بے رنگ جلد پر ابھری بھری نیلی نسیں۔ مردہ شاخوں کی طرح نکلی انگلیاں جن میں سیاہ رنگ کی وہ دندانے دار چیز تھمی تھی۔ اور ان دندانوں میں بال الجھے تھے۔ پھر اس کی نظر ہولے ہولے تیرتی سوکھی کلائی پر جا رکی۔ اور اسے اس بات پر حیرت ہوی کہ وہ اس ہاتھ اور کلائی کے ساتھ برسوں سے رہ رہی ہے اور اس ہاتھ اور کلائی نے اسے اپنے جسم کے باقی حصوں کی یاد بھی دلائی جو شروع سے اس کے رفیق تھے۔ تب اسے یوں لگا کہ وہ نیند میں ہے اور گھپ اندھیرے میں سب سمتیں کھو گئی ہیں اور معلوم نہیں وہ کس رخ، کس سمت موجود ہے دن کے اجالے میں جانی پہچانی چیزیں اندھیرے میں گھل گئی ہیں۔ برسوں پہلے اس طرح ہوا کرتا تھا کہ گھنی رات میں اچانک اس کا جی دھلتا اور اسے اپنی جگہ اور سمت کا اندازہ نہ ہو پاتا۔ مگر اب دن کے اجالے میں اسے اپنے آپ کو اس جگہ اور حالت میں پاکر حیرت ہوئی جیسے وہ نیند میں چلتے چلتے یہاں آن پہنچی ہو۔ اس نے بہت یاد کرنا چاہا کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ وہ کہاں سے چلی ـــــ کدھر سے آئی۔ مگر اس کے پیچھے ـــــ آگے، چاروں طرف مٹیالی دھند تھی۔

تب اسے یقین ہوا کہ اس سے پہلے وہ تھی ہی نہیں۔ بس شروع سے آج تک اسی طرح تھی۔ ہاتھ میں کنگھی تھامے منو کے بال سلجھاتی۔ مگر منو تو بہت چھوٹی سی ہے۔ یہی کوئی پانچ برس کی۔ اور اس نے اپنی ڈھلکتی کلائیوں پر دوبارہ نظر کی۔ اسے وقت کے بے تحاشا گزرنے کا خیال آیا مگر ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ سورج گھنٹوں سے غروب ہو رہا ہے اور پیلی پیلی دھوپ منڈیروں پر نیند بھری رفتار سے انگل انگل سرکتی ہے اور سرک نہیں چکتی۔ صبح سے معلوم نہیں کب سے ـــــ سورج

اندر باہر ہے ۔ دن ہی ہے نہ رات ــــ اور سب کام ادھورے، کھنچتے چلے جاتے ہیں ۔

"ہائی آپو بس بس ۔" بے خبری میں منو کے بال کھنچ گئے تھے ۔

"اچھا اچھا ــــ" اس نے کنگھی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی ۔ منو اچھلتی ہوئی باہر چلی گئی

"راجہ کی چابی چوری گئی ۔ چوری گئی ــــ" بچے لان میں کھیل رہے تھے ۔

"آپو باہر آجاؤ ــــ" نزہت نے اسے پکارا ۔

مگر اسے تو بہت کام کرنا تھا ۔ وہ نزہت کی ادھوری قمیض میں ترپائی کرنے لگی ۔ پر دو ہی ٹانکوں بعد اسے نیند ہوئی ۔ اور اسے خیال آیا کہ آج وہ دن بھر نہیں سوئی ۔ تب قمیض کو گود میں رکھے رکھے وہ دیوار کے ساتھ لگ کر سو گئی اس طرح سوئے ہوئے اسے مدتوں پرانی وہ نیند یاد آئی کہ جب ایک گہرا، لپٹا ہوا ۔ نہ ہونے کا احساس آلیتا تھا ۔ یہ دھوپ میں جلتی چھت پر کھڑی تھی ۔ اور تسلے کے مچلتے پانی میں سورج کی سنولائی پرچھائیں تیرتی تھی ۔ نزہت پاؤں تسلے پر جھک جھک کر گرے جاتی تھی اور کس کے گندمی دو چھوٹی چھوٹی چوٹیاں جانے سے بھری ۔ اس کے کانوں پر جھو وہ خود بھی تسلے پر جھکی اور اب کے ہلتے پانی میں اس کی اپنی پرچھائیں تیرتی ۔ پھر تسلا پھیلنے لگا ۔ یہاں تک کہ چھت کے ہو گیا ۔ پھیلتے تپتے تانبے نے اسے دیواروں کے ساتھ بھینچنا شروع کیا ۔ یہاں تک کہ وہ دیوار کے اندر داخل ہو گئی مٹیالی اینٹوں میں کی ایک اینٹ، جس کی کوئی پہچان نہ تھی ۔ اس نے جاننا چاہا کہ وہ نیند میں ہے اور اس لیے وہ جاگ مگر جاگ اٹھنے پر اس نے دیکھا کہ وہ برابر قمیض میں ترپائی کرتی رہی ہے اور اب بس ذرا سا کرنا باقی ہے ۔

یہ جاگتی نیند بھی عجیب تھی ۔ شروع شروع میں اس نے پرانی باتیں یاد رکھنے کی کوشش کی ۔ مثلاً یہی کہ اس آج تک کون کون سے کپڑے پہنے ۔ پرانی پرانی قمیضیں ــــ جوتے ــــ اس کے سامنے مٹیالے پن میں تیرتے آتے ۔ پھر خوشبوئیں اور زیور ــــ سبھی کچھ موجود تھا مگر واقعات کہیں نہ تھے ۔ کیوں کہ واقعات کھو چکے تھے اس وہ خود بھی موجود نہ تھی ــــ بغیر واقعات کے کوئی کس طرح ہو سکتا ہے؟

کبھی نزہت نسیم کو پچھلی باتیں سناتی ۔

"اماں ابا جان پر آپو کا بڑا رعب تھا ۔ ہماری تو بس پٹائی ہوتی تھی ــــ"

اور اسے گذرے انسانوں پر حیرت ہونے لگتی ۔ اماں ابا کی تصویر نزہت کے کمرے میں لگی تھی ۔ مگر وہ شبیہیں محض خول تھیں ۔ ان کے اندر بھرے انسانوں کے معنی کب کے ختم ہو چکے تھے ۔ پہلے کبھی کبھی وہ ان تصویروں کے حیرانی سے رک جاتی کہ ان فریموں میں سے تصویریں کہاں گئیں؟ پھر وہ دیکھتی کہ تصویریں تو موجود ہیں ۔ مگر اب تو سے اسے ان بھرے فریموں کا خالی پن بھی نظر نہیں آیا تھا ۔ سو اس نے چیزیں یاد کرنے کی محنت ترک اور نام سے بھی نجات حاصل کی ۔

پہلے جب دن کا شروع اور آخیر تھا ۔ وقت کی لمبان کو کام کاٹتے تھے ۔ اب دن مٹیالے الاسٹک کی طرح کھنچا تھا اور کام رکے رہتے تھے اور اس طرح دنوں کے کھنچنے اور کاموں کے رکنے پر اسے شدید بھوک لگتی ــــ

ہے آپو تمہیں بھی بھوک لگی۔" نزہت بہت خوش تھی۔

اب بھوک وقت کی لمبان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتی۔ مگر شہد کی طرح بھوک کا بھی عجب عالم تھا کہ اس کا کوئی شروع تھا نہ آخر — کھا کر بھی اسے لگتا نہیں کھایا — چنانچہ اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے اسے بار بار کھانا پڑتا۔ آہستہ آہستہ اس کے چپکے پیٹ اور کمر کے تنگ حلقے پر گوشت کی نرمی جمنے لگی — اور ہڈیاں چھپنے لگیں۔ اس کا وہ پرانا ڈھانچہ مٹ رہا تھا۔ اسی لیے اپنے کو چھو کر اسے کسی اور کو چھوتے کا احساس ہوتا —

شروع میں ہر چیز کا اپنا ایک ذائقہ تھا۔ نمکین — میٹھا، ترش، کڑوا۔ مگر جوں جوں بھوک بڑھتی ذائقے ختم ہونے لگے۔ اب محض ایک ذائقہ باقی تھا۔ بالکل اس جاگتی نیند کا سا۔ جو شاید ذائقہ بھی نہیں تھا — دراصل وہ محض زبان تھی — سر سے پاؤں تک — ذائقے سے عاری۔

نزہت اب اسے کھاتا دیکھتی اور پریشان ہوتی۔ "آپو طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟" اور روٹیوں کی پلیٹ اس کے سامنے سے کھینچتے کھینچتے رک جاتی۔

"ہاں — کیوں؟" وہ بے دھیانی سے پوچھتی۔

"نہیں کچھ نہیں —" نزہت کچھ کہتے کہتے رک جاتی۔ اور وہ اپنے خول کو بے ذائقہ مواد سے بھرنے لگتی۔ جو بھر کر بھی خالی رہتا۔

پہلے اس نے دیکھا کہ اس کی تمام ہڈیاں گوشت کی دبیز تہوں میں جا چھپیں۔ اور اب اس کی پہچان مٹی — وہ بدل چکی تھی۔ کچھ اور بن چکی۔ پھر اُسے گوشت کا بوجھ اپنے جسم سے الگ محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ منوں گوشت کا لوتھڑا ہو —

"آپو تم بیمار ہو — چلو ڈاکٹر کے پاس — جسم کا بے تحاشا بڑھنا ٹھیک نہیں۔" نزہت بہت فکرمند تھی۔ اس پہ اسے حیرت ہوئی۔ جسم بڑھنے سے کیا مطلب؟ یہ تو سب کا سب خود جسم ہے۔ ہمیشہ سے اسی طرح — اس نے پہلے اپنے جسم پر نگاہ کی اور پھر اپنے گرد دیکھا۔ معلوم نہیں وہ دن کا کون پہر تھا۔ ہر چیز سانس تھامے کھڑی تھی اور چاروں طرف مٹیالی روشنی پھیلی تھی۔ ایک گھٹنا اس خول کی طرح تنا تھا۔ سڑک کی جانب سے کہیں سویا سویا سا شور جاگا۔ بہت سی آوازیں اور لفظ ایک دوسرے میں گھل کر ایک لمبی ہوک بن گئے تھے —

"کالیاں اٹاں کالے روڑ —" اس ہوک کی مدھم سی پہچان اٹھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھا۔ بچوں کی بے ڈھنگی ٹولیاں، کٹورے بجاتیں، مٹیالے اس میں لپٹے آسمان کی طرف منہ اٹھائے پکار رہی تھیں۔

"مینہ وسا دے زور و زور —" دور بچوں کی ہلتی مچلتی ٹولی میں ایک شبیہہ چھوٹی سی لڑکی کی تیری۔ اس نے پہچاننا چاہا — اور کھڑکی سے قریب ہوتے ہوئے اچانک آئینہ کے سامنے آن رکی۔ بے ڈھنگے کپڑوں میں لپٹا منوں گوشت — ڈھلکتے چہرے پر کھچڑی بال — پھر اس کی نظریں اس شبیہہ کی آنکھوں میں آن رکیں۔ ایک لفظ کے دائرے اور نقطے ان کلبلاتے تیرتے پھرتے تھے تب اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا مگر اس کے پاؤں کسی سیاہ طلسم سے بوجھل ہوئے۔ وہ ایک قدم کا فاصلہ تھا کہ پھیلتا — کھینچتا — آسمان سے جا ملا تھا —

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی ۲ جلدوں کا آنا ضروری ہے، ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے —— (ادارہ)

نام کتاب :- شام کا پہلا تارا (مجموعۂ کلام) زہرا نگاہ، مجلد ڈیمائی سائز صفحات (۱۶۰) آفسٹ طباعت قیمت اکیس روپے
اشاعت: جولائی ۱۹۸۰ء - ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

برصغیر کی خوش نوا اور خوش کلام شاعرہ زہرا نگاہ کا یہ پہلا مجموعۂ کلام شام کی خوشگوار اور دل فریب فضا کا عکس و نقش ہی نہیں بلکہ زمینی مہک اور نشاطیہ کرب و انبساط کا خوش گوار تر امتزاج بھی ہے۔ زہرا نگاہ ویسے تو پاکستانی شاعرہ کی حیثیت رکھتی ہیں مگر ان کا تعلق ارضِ دکن سے بھی استوار رہا ہے، نثار یار جنگ مزاج، علی اختر اور نظر حیدرآبادی کے گھرانے کی یہ خاتون عصر حاضر کی نمایندہ اور نتھری ستھری شعری حسیت کے بھرپور ادراک کا شعور رکھتی ہیں۔ فیض احمد فیض نے دیباچہ میں بالکل درست لکھا ہے کہ ان کا کلام پنجابی اصطلاح میں بالکل "نخالص" شاعری ہے جو غالباً شاعری کا منتہی مقام ہے"

علی سردار جعفری نے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "زہرا کی شاعری میں آج کی بے چین دنیا کی بے چین روح ہے، ظلم کے خلاف احتجاج کی لَے ہے، الفاظ نرم اور لطیف ہیں، انداز بیاں آسان اور خوبصورت، ان کی شاعری میں نشہ سے زیادہ سرور ہے، ان میں زندگی کا کرب ڈھلتا ہے لیکن نشاطِ زیست کے احساس کے ساتھ وہ سنجیدگی ملتی ہے جو اچھی شاعری کی جان ہے"

عبارت مختصر: زہرا نگاہ نظم اور غزل کی رمز شناس شاعرہ ہیں، اور واردات ذات کو سلیقے سے شعر کا لباس پہنانے میں نمایاں نظر آتی ہیں "شام کا پہلا تارا" میں ۵۱ سلمیٰ ستارے اور ۳۳ غزلوں کے جگر پارے گہرا تاثر چھوڑتے اور ایک فضا سی خلق کرتے نظر آتے ہیں، رومانی واقعات نگاری اور ماحول کے کرب کی عکاسی ان کی نظموں کا وہ وصف ہے جو معاصر شاعری میں کم کم ملتا ہے۔ زہرہ نگاہ کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ کے دوش بدوش عہد کے بھرپور لہجے کی سگندھ اور ٹھنڈی ٹھنڈی طراوٹ ملتی ہے، لہجے کی شیرینی اور کہنے کے انداز کی شگفتگی نے ان کی غزلوں کو گلدستۂ سخن کا روپ انوپ دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہر آستاں پہ لکھا ہے اب نام شہر یار ؛ وابستگانِ دل کے لیے کوئی جا نہیں
خوب ہے صاحب محفل کی ادا ؛ کوئی بولا تو بُرا مان گئے
آنکھوں پہ قرض آج بھی ہے تیرے خواب کا ؛ آسان راستوں میں بھی دشوار کون ہے
اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا ؛ کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا
اُجلے کپڑوں پہ اُس دن کس غضب کی آب تھی ؛ سارے دن کا کام اُس دن کس قدر ہلکا لگا

اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے ⁂ کوئی آجائے تو وقت گزر جاتا ہے
اب دوستی وہ فن ہے جو سیکھے وہی نبھائے ⁂ اور ہے وفا وہ کھیل جسے آئے وہ دکھائے
گھر کے سارے بھول ہنگاموں کی رونق ہو گئے ⁂ خالی گلدانوں سے باتیں کر کے سو جائیں گے ہم
اُس نے آہستہ سے زہرا کہہ دیا دل کھل اٹھا ⁂ آج سے اس نام کی خوشبو میں بس جائیں گے ہم
بھولیں اگر تجھے تو کہاں جائیں کیا کریں ⁂ ہر رہگزر میں تیرے گزرنے کا حسن ہے

نام کتاب "حیدرآباد میں اردو صحافت" (تذکرہ) طیب انصاری، ڈیمائی سائز مجلد، خوبصورت گرد پوش صفحات (۲۴۴) اشاعت جون ۱۹۸۰ء۔ قیمت ۳۲ روپے بہ اعانت ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، محکمہ تعلیمات آندھرا پردیش۔
ملنے کا پتہ: طیب انصاری۔ A-19 خیریت آباد، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴۔

طیب انصاری نئی نسل کے عثمانین ہیں۔ تالیف و تصنیف سے لگاؤ دیرینہ رہا ہے۔ اب تک ۵ کتابیں شائع کر چکے ہیں، کرناٹک گلبرگہ کے گورنمنٹ کالج میں اُردو کے استاد اور صدر شعبہ کی حیثیت میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، حیدرآبادیات سے انھیں گہرا تعلقِ خاطر رہا ہے۔ عہد عثمانی کے حیدرآباد اور دکنی کلچر سے ان کی وابستگی "بدنامی" کے حدود پھلانگ چکی ہے، طبعاً منکسر المزاج ہیں اور روایت سے بغاوت پر آمادہ بھی نظر آتے ہیں، صوفیانہ گھرانے سے رشتہ رکھتے ہوئے بھی شعلگی افتادِ طبع سے منسلک ہیں، تضادِ فکر و نظر کی حشر سامانیاں ان کی تحریروں میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ زیر نظر کتاب موضوع کے لحاظ سے اولیت کا مقام رکھتی ہے۔ حیدرآباد کی اردو صحافت کو شمال والوں نے درخورِ اعتنا سمجھا، صحافت سے علاقہ استوار نہ رکھتے ہوئے بھی حیدرآباد کی صحافت پر طیب انصاری کی یہ کتاب جو قدیم تذکروں کے نہج پر لکھی گئی ہے معلومات سے عبارت خزینہ قرار دی جا سکتی ہے۔ طیب نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۶ء تک کے رسائل و جرائد کے بارے میں جیسی تیسی معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ دراصل ایم اے کا مقالہ ہے جسے پروفیسر مسعود حسین خاں سابق صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کی نگرانی میں تکمیل پانے کا شرف حاصل ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی اُردو صحافت پر مستند مواد تو ملتا ہے، ہاں زبان و بیان کے اعتبار سے تحقیقی ادب کے متن کی سی تمازت اور طہارت اور صداقت کا جھول کھٹکتا ہے۔ مورخ کی نظر اور محقق کے فہم و ادراک اور نقاد کی دروں بینی کاش طیب پر منکشف ہو، عبارت مختصر: حیدرآباد میں اردو صحافت کے تذکرہ کو طیب انصاری نے کتب خانوں، رسائل و جرائد کی فائلوں اور مختلف انٹرویوز کی مدد سے پُر از معلومات تو بنا دیا ہے، چند ایک فروگزاشتوں کے باوصف اس کا مطالعہ حیدرآباد کی تاریخ اُردو صحافت سے شناسائی کا موجب ضرور قرار پاتا ہے۔ (وقار خلیل)

اُردو کی وضاحتی کتابیات: وضاحتی کتابیات کی پہلی جلد جو ۱۹۷۶ء کی کتابوں پر مشتمل ہے اور جسے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر مظفر حنفی نے مرتب کیا ہے، ترقی اُردو بیورو سے شائع ہو گئی ہے۔ (صفحات ۳۱۹، قیمت سترہ روپے) اسے ان تمام مکتبوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے جہاں سے ترقی اردو بورڈ کی کتابیں دستیاب ہیں۔ وضاحتی کتابیات سال بہ سال ترقی اُردو بیورو سے شائع ہوگی۔ اس میں اردو میں شائع ہونے والی ہر نئی کتاب کا اندراج ہوگا خواہ وہ ادبی ہو، مذہبی ہو، علمی، درسی، سائنسی یا تفریحی ہو۔ وضاحتی کتابیات میں تبصرے کے لیے اردو کی ہر نئی کتاب کی ایک جلد ذیل کے پتے پر روانہ کی جائے:

پروفیسر گوپی چند نارنگ (صدر شعبۂ اُردو جامعۂ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵)

اردو نامہ

اردو کی علمی و ادبی اور تہذیبی خبریں

وقار خلیل

یکم ستمبر: یس یس سی۔ اردو ذریعہ تعلیم کے ناکام طلبا کے لیے ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مدرسہ آصفیہ میں ایک کوچنگ سنٹر کا ریاستی وزیر مسٹر رام دیو نے افتتاح کیا اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی خدمات کو ملک کے لیے قابل تقلید قرار دیا اور کہا کہ انجمن کی تعلیمی سرگرمیوں کے باعث اردو ذریعہ تعلیم کا معیار اونچا ہونے چلا ہے۔ صدر انجمن ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کی زبوں حالی پر تاسف کا اظہار کیا اور انجمن ترقی اردو کی تعلیمی مہم میں اردو دوستوں کو عملی طور پر حصہ لینے کی دعوت دی ڈاکٹر حبیبی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج نے اردو تدریس گھر کی افادیت پر رپورٹ پیش کی۔

۳ ستمبر: محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ سعیدہ جہاں کی صدارت میں ہوا۔ برصغیر کی نامور ناول نویس محترمہ جیلانی بانو نے ناول اور فکشن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیدہ طیبہ نے کہانی سنائی اور خواتین شعرا نے کلام پیش کیا۔

۴ ستمبر: جناب چندر سری واستو ڈائرکٹر و سکریٹری اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی اعانت کے لیے قایم کردہ ویلفیر فنڈ کے لیے اردو اکیڈمی کے صدر جناب یم باگا ریڈی کی توجہ کے سبب ابتدائی امداد کے طور پر ۸۰ ہزار روپے دئیے گئے۔ ویلفیر فنڈ کے کارپس کو ۵ لاکھ تک پہنچانے کے لیے جناب سری واستو نے محبان اردو سے تعاون کی اپیل کی۔ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ ویلفیر فنڈ سے ریاست کے ۹ ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے ضرورت مند اور مستحق افراد خاندان کو ماہانہ ۵۰ روپے الاونس دیا جارہا ہے اس کے علاوہ ۱۰ ہزار روپے ضرورت مند اور نادار قلم کاروں کو اعانتاً منظور کیے گئے۔

۵ ستمبر: ریاستی مسلم وقف بورڈ کے زیر اہتمام ایک مسلم وقف اکیڈیمی کی تشکیل عمل میں آئے گی، جس کی طرف سے ادب، شاعری، صحافت اور سیاست کے زمروں میں تخلیقی کارنامے انجام دینے والوں کو سالانہ ایوارڈ دئے جائیں گے

۶ ستمبر: بزم نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب ٹھاکر بجرنگ سنگھ فقیر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مرزا سرفراز علی، اسد انصاری، ناظم بیزاری، معراج صوفی اور محوی سروشی اور قدیم مکتب سخن کے کئی شاعروں نے کلام پیش کیا۔

۱۲ ستمبر: بزم اردو الکٹرسٹی بورڈ کے زیر اہتمام ایک نمایندہ محفل شعر جناب بھارت چند کھنہ (آئی اے یس) کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، سعید شہیدی، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، علی الدین نوید، فیض الحسن خیال، صادق نقوی، بانو طاہرہ سعید، مظفر النسا ناز، محمد منظور احمد، روشن خیال، منیر الزماں منیر، عابد حسین اور صبر آغائی صاحبان نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور محترمہ زینت یوسف زئی نے خیر مقدم کیا۔

● انجمن اردو برقی بورڈ (منٹ کیا و تما) کی طرف سے تہنیتی اجلاس اور مشاعرہ

جناب حمایت اللہ کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ ابتداءً رشید قریشی اور مسیح انجم صاحبان نے طنز و مزاح سے لبریز مضامین سنائے۔ مشاعرے میں علی صاحب میاں طالب خوندمیری، مصطفےٰ علی بیگ، صبغتہ اللہ بمباٹ، سرپٹ حیدرآبادی، حفیظ خاں مذاق، گرگٹ حیدرآبادی اور ان پڑھ بھونگیری نے اپنی تخلیقات سے نوازا۔ جناب میر کمال الدین احمد لیبر ویلفیر آفیسر پی آر او نے جو انجمن اردو کے فعال معتمد بھی ہیں، خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب سوز عابدی نے محفل کی کارروائی انجام دی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۳ ستمبر: قومی، ادب، سخنستان اور بزم جوہر کے زیر اہتمام ایک خیر مقدمی ادبی و شعری محفل جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ "منصف" کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اردو زبان اور اردو کلچر سے سرزمیندر سریواستو ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی اور صلاح الدین اویسی (ایم ایل اے) کی دیرینہ وابستگی کے اعتراف میں مخلصانہ خیر مقدم کیا گیا اور بکثرت گلپوشی ہوئی مسٹر سری واستو نے اردو اکیڈیمی کی سرگرمیوں کو چارمینار کے شہر میں توسیع دینے کا ذکر کرتے ہوئے شعری محفلوں کے انعقاد کے لیے اکیڈیمی کے ریسرچ سنٹر کا پیشکش کیا مسٹر اویسی نے اردو سے حقیقی انصاف کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ دل خوش کن باتیں بیکار سی لگتی ہیں، اردو زبان اور اس کے ادب کی ترقی کے لیے متحدہ طور پر مخلصانہ جد و جہد کی ضرورت ہے مشاعرہ میں منوہر لال بہار، علی افسر، بشیر وارثی، خورشید جنیدی، ڈاکٹر راہی، معلم جنیدی داود نصیب، علی سرور، ارادت جہاندار جاہی، حافظ بیابانی، عارف بیابانی، محوی سروشی اور عظیم حیدرآبادی نے کلام سنایا۔

۱۴ ستمبر: ادبا دوستوں کے ایک خیر رسمی اجتماع میں ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر شعبہ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی نے ہند و پاک کے مقبول جاسوسی ناول نویس ادیب ابن صفی مرحوم کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک مبسوط مقالہ سنایا۔ مضطر مجاز، رحمٰن جامی اور رحمت یوسف زئی نے بھی ابن صفی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۵ ستمبر: ممتاز مورخ اور عالم پروفیسر ہارون خاں شروانی سابق صدر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونی ورسٹی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ پروفیسر شروانی کی قومی اور مورخانہ خدمات کے اعتراف میں حکومت نے پدما بھوشن کے اعزاز سے نوازا تھا اور مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کی طرف سے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا ہوئی تھی۔

۱۶ ستمبر: ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی اور اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے صدر نشین مولانا حافظ یوسف نے علاحدہ علاحدہ تعزیتی بیان کے ذریعہ پروفیسر شروانی کی وفات کو قومی نقصان قرار دیا ہے اور کہا ہے ملک ایک قابل فخر اسکالر سے محروم ہو گیا ہے۔

۱۷ ستمبر: مشہور ماہر تعلیم جناب میر سرفراز علی سرفراز کے مجموعۂ کلام کوثر خیال کی مسٹر ایم باگا ریڈی ریاستی وزیر و صدر اردو اکیڈیمی نے رسم اجرا انجام دی۔ بزرگ سیاستداں جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے جلسہ کی صدارت کی جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے مرزا صاحب کی شخصیت اور فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کوثر خیال کے شاعر نے اس موقع پر اپنا کلام سنا کر سامعین کو متاثر کیا۔ صلاح الدین نیر نے معتمدی کے فرائض انجام دیے۔

۱۸ ستمبر: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کا جلسۂ تعزیت پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارۂ ادبیات اردو کی صدارت میں ہوا۔ بیرسٹر اکبر علی خاں اور جناب خواجہ محمد احمد نے خراج عقیدت ادا کیا اور قرارداد منظور کی گئی۔

● انجمن ترقی اردو کے زیر انتظام چار مینار کے قدیم شہر کے ادبی مرکز مغلپورہ میں اردو گھر کی تعمیر کے کام کا جناب ظہیر احمد سابق سفیر سعودی عرب کے ہاتھوں آغاز ہوا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے جلسہ کی صدارت کی اور اردو دوستوں سے خواہش کی کہ وہ اردو گھر کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کریں۔ موصوف نے کہا کہ اردو گھر میں ماڈل اسکول، کتب خانہ اور تحقیقاتی مرکز بھی قایم ہوگا جس سے اردو والوں کو تعلیم و ادب کے لیے بہتر مواقع میسر آسکیں گے۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر انجمن شہری کمیٹی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ اردو گھر کے لیے نظامس چیاریٹیبل ٹرسٹ سے ۵۰ ہزار کی ابتدائی گرانٹ ملی ہے یقین ہے جیسے جیسے عمارت کی تعمیر کا کام بڑھے گا اس گرانٹ میں بھی اضافہ ہوگا۔ آپ نے جناب ظہیر احمد کے فلاحی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ مسز سرینواس ریڈی (نائب صدر) غلام صادق الدین (معتمد) اور امجد باغی نے بھی مخاطب کیا۔ اردو گھر فنڈ میں جناب ایس یم ذکریا منیجر کنارا بینک پتھر گٹی حیدرآباد نے دو سو روپے کا عطیہ دیا

۲۱ ستمبر: اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر حسینی شاہد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر ڈاکٹر مجاور حسین نے عالمانہ اور مبسوط مقالہ سنایا۔ رحمن جامی کی ایک نظم پر مصلح الدین سعدی نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ رحمت یوسف زئی معتمد نے جلسہ کی کارروائی انجام دی۔

۲۲ ستمبر: انجمن ترقی اردو، اردو آرٹس کالج اور اردو ایوننگ کالج کی طرف سے اردو ہال میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کا جلسہ تعزیت پروفیسر حبیب الرحمن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر شروانی کو خراج عقیدت ادا کیا گیا۔

۲۳ ستمبر: اردو، فارسی اور انگریزی کی شاعرہ محترمہ بانو طاہرہ سعید کو ٹکسن یونی ورسٹی امریکہ کی طرف سے علمی و شعری خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

۲۴ ستمبر: اردو ریسرچ اسوسی ایشن جامعہ عثمانیہ کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ ناز صدیقی نے مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی خدمات پر مبسوط مقالہ سنایا۔ محترمہ عظمت عبدالقیوم اور جناب صلاح الدین نیر نے اپنا کلام پیش کیا ابتداءً ڈاکٹر یوسف سرمست نے مہمانوں کا خیر مقدم اور جناب منظور احمد شریک معتمد ریسرچ اسوسی ایشن نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶ ستمبر: بزم خاصانِ ادب کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب بشیر وارثی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز سعید شہیدی، عادل نجمی، باقر منظور، عازم رضوی، آغا سروش، علی احمد جلیل، علی سرور، داود نصیب، سلیم عابدی اور اسد انصاری نے کلام سنایا۔

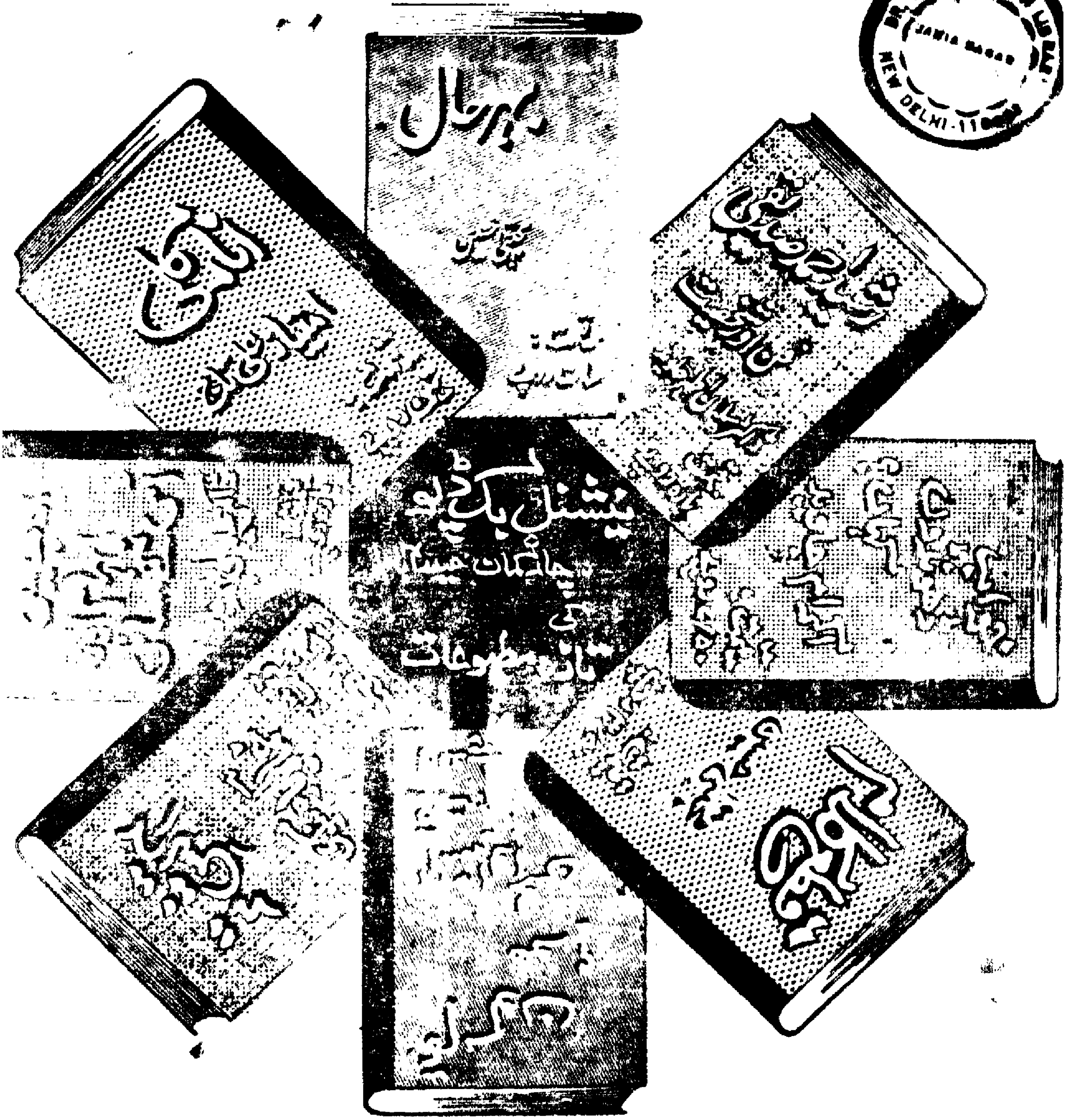
۲۸ ستمبر: دکنی اردو کے نامور محقق ادارۂ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ۱۷ ویں برسی کے موقع پر ایوانِ اردو میں یادِ زور کا ادبی اجلاس جناب سری کرشن سنہا آئی اے ایس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر شعبہ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی، جناب مرزا سرفراز علی سابق نائب ناظم تعلیمات محترمہ بانو طاہرہ سعید، محترمہ ناز صدیقی لکچرار جامعہ عثمانیہ اور محترمہ فاطمہ پروین ریسرچ اسکالر نے ڈاکٹر زور عہد ساز تحقیقی، تنقیدی، شعری اور کلچرل خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ ابتداً پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ نے پروفیسر شروانی پر تعزیتی قرارداد پیش کی جسے احتراماً ایستادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ منظور کیا گیا۔ محمد منظور احمد صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

CTOBER 1980

R N 10922/5
Regd. H/HD. 33

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500004. (A. P.)



National Fine Printing Press, Charkaman Hyderabad 500



بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

زور نمبر

جلد ۴۳ نومبر ۱۹۸۰ء شمارہ ۱۱

ادارۂ ادبیاتِ اردو • پنجہ گٹہ • حیدرآباد ۴۔ ۵۰۰۰۰۴

قیمت ایک روپیہ پچہتر پیسے

سالانہ

معمولی ڈاک سے
۲۰/۰ روپئے
کتب خانوں اور اداروں سے
۲۵/۰ روپئے

رجسٹری سے
۴۵/۰ روپئے

قیمت زور نمبر
۲ روپئے

بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۔ ۲

ترتیب

باتیں — وقار خلیل — ۳

ڈاکٹر زور اور انیس کی مرثیہ نگاری — ڈاکٹر مجاور حسین رضوی — ۴

ڈاکٹر زور چند یادیں .. بانو طاہرہ سعید — ۱۰

زور : ایک شاعر .. ناز صدیقی — ۱۳

ڈاکٹر زور : مختصر جائزہ .. فاطمہ پروین — ۱۷

منظوم خراجِ عقیدت

ساقیٔ علم و دانش .. وقار خلیل — ۱۹

یادِ زور .. بانو طاہرہ سعید — ۱۹

قندِ مکرر

اردو ادب اور سیاست — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — ۲۰

ڈاکٹر زور لندن میں خطوط کی روشنی میں — سید رفیع الدین قادری — ۲۴

نقد و نظر

نئی کتابوں پر تبصرے .. مسعود ہاشمی، وقار خلیل — ۳۳

اردو نامہ .. وقار خلیل — ۳۷

باتیں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ۱۸ ویں برسی کے موقع پر "یادِ زور" کے ادبی اجلاس میں شخصیت اور فکر و فن کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ یہ اجلاس ۲۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کو "ایوان اردو" میں منعقد ہوا۔ ممتاز عثمانین جناب سری کرشن سہنا (آئی اے یس) نے صدارت کی۔

"یادِ زور" کے موقع پر جن نامور قلم کاروں اور اساتذہ نے مقالے پیش کئے، سب رس کے زیرِ نظر "زور نمبر" میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اپنی فکر و دانش، تحقیقی دروں بینی اور تنقیدی بصیرت و بصارت سے اردو ادب کی تاریخ کو معتبر اور باوقار بنانے کی جو سعیٔ مشکور کی ہے اُس کی منزلت برصغیر کی جامعات میں آج بھی برقرار ہے۔

جامعہ عثمانیہ کو ابتدا ہی سے تحقیق اور تنقید کے روشن اُصولوں کا اہم مرکز تسلیم کیا گیا ہے اور ڈاکٹر زور کے عہد سے اب تک "عثمانین" بین یہ وصف افق در افق استحکام کی منزلیں طے کر رہا ہے، جنوبی ہند میں تحقیق اور تنقید کے معیار کو جامعہ نے نہ صرف بامِ عروج پر پہنچایا بلکہ برصغیر کی درسگاہوں اور دانش گھروں کو بھی اپنے معیار کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا ہے۔ اس ادبی اعتبار کو ہم زور صاحب کا فیضان ہی کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر زور شجرِ سایہ دار کے مصداق تھے، انھیں دبستانِ دکن کا آخری معلم بھی کہا جاتا ہے، آج دکن میں اردو زبان، ادب، تحقیق، تنقید اور شعر و سخن کے باب میں جو سرگرمیاں نظر آتی ہیں اُن کے پس منظر میں ڈاکٹر زور کی چشمِ نگراں کا پرتو روشن اور محیط ہے۔ (و، خ)

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش



عوام کی خدمت کیلئے

- ایک حقیقی عوامی حکومت
- صاف ستھرا اور کارکرد نظم و نسق
- کسی بھی سطح پر بدعنوانی کی گنجائش کے بغیر
- کسانوں اور صنعتی مزدوروں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ
- کمزور طبقات کی ترقی کے لیے ترجیحی پروگرام

حکومت آندھرا پردیش نے چیف منسٹر شری ٹی انجیا کی قیادت میں ایک ایسے انتظامیہ کو وجود میں لانے کے لیے ہمہ رخی مہم شروع کر دی ہے۔ جس کا مقصد کام کرنا اور عاجلانہ و فائدہ مند نتائج کا حصول ہے۔

بدعنوانیوں کے خلاف جنگ: اعلیٰ عہدوں پر متعین عوامی شخصیتوں کے خلاف الزامات کی تحقیقات کے لیے لوک ایوکت اور اپ لوک ایوکت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ریاستی مقننہ کے آئندہ اجلاس میں قانون سازی کا اقدام کیا جائے گا۔ بدعنوانی کے سراغ کے لیے ایک "فلائینگ اسکواڈ" تشکیل دیا جائے گا۔

روشن تر مستقبل: وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام اور سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام کی موثر اور با مقصد عمل آوری کے تیقن کے لیے ایک خصوصی شعبہ تشکیل دیا جائے گا۔

کمزوروں کی بھرپور مدد: سرکاری زمینات پر ایک سال سے زائد مدت سے جھونپڑیوں میں رہنے والوں کا تخلیہ نہیں کرایا جائے گا ایسی صورت میں جب زمین سرکاری اغراض کے لیے درکار ہو تو رہائشی کا متبادل انتظام کیا جائے گا۔ حکومت ہر مزدور کی ملازمت سے سبکدوشی کے موقع پر اپنے ذاتی مکان کی فراہمی میں مدد کرے گی۔

مصیبت زدوں کی امداد: خشک سالی کے سلسلے میں امداد و تدابیر کی عمل آوری کے لیے ۶۵ کروڑ روپیے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ ضلع سریکاکلم میں سیلاب زدہ عوام کی مدد کے لیے مرکز سے ۱۵ کروڑ روپے کی امداد طلب کی گئی ہے۔

قیمتوں کی روک تھام: قیمتوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے گی غریبوں کو متوسط طبقات کو تاجروں اور مالکین ہوٹل کے استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ آندھرا پردیش عظیم کامیابیوں کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے عوام خاص کر کمزور طبقات کی بھلائی کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی دعاؤں کے زیر سایہ ہماری ریاست ایک روشن اور خوب تر مستقبل کے یقین کے ساتھ سلور جوبلی سال میں قدم رکھ رہی ہے۔

جاری کردہ: ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

DIPR/35275/ADVT/86

ڈاکٹر سجاد حسین رضوی

ڈاکٹر زور اور انیس کی مرثیہ نگاری

مرثیہ کی ادبی تفہیم کی جو روایت شبلی سے شروع ہوئی تھی اُس کی بنیاد خالص تجزیاتی تھی۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اردو مرثیہ کا نقش اول بھی حیدرآباد کا رہین منت ہے۔ مرثیہ کی یہ تجزیاتی تفہیم جو موازنہ انیس و دبیر کی شکل میں ظاہر ہوئی وہ بھی رود موسیٰ کی خوشگوار ہواؤں میں ہی پروان چڑھی۔ شبلی نے موازنہ اُس زمانے میں لکھا جب وہ وقار الامراء کے دور میں حیدرآباد آئے تھے اور اسے بھی حسن اتفاق کہنا چاہیے کہ موازنہ کی اشاعت کے ۱۹ سال بعد مرثیہ کی تجزیاتی تفہیم کے ساتھ مرثیہ کا تنقیدی بصیرت کے ساتھ مطالعہ بھی حیدرآباد کے ہی ہونہار فرزند ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے ذریعہ سامنے آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرثیہ اور انیس راقم الحروف کے نزدیک ہم معنی ہیں لیکن اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں انیس وہ نقطہ مانے گئے ہیں جس کے گرد مرثیہ نگاری کی پوری تاریخ گھومتی ہے اور بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر انیس کے مراثی کی تفہیم ہو جائے تو پھر کسی بھی مرثیہ نگار کو سمجھنا یا اس کی معرفت حاصل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور سے قبل انیس پر لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی کا نام آتا ہے۔ شبلی اور ڈاکٹر زور کے درمیان جو کتابیں مرثیہ سے متعلق لکھی گئیں یا جن میں مرثیہ سے بحث کی گئی ان کتابوں میں نذیر الحسن فوق کی المیزان، امیر احمد کی یادگار انیس، اشہری کی حیات انیس، نظم طباطبائی کا مقدمہ، لالہ سری رام کا تذکرہ خمخانۂ جاوید، عبدالحی کا تذکرہ گل رعنا اور عبدالسلام ندوی کی شعر الہند اہم ہیں۔ یہاں قصداً عبدالغفور نساخ اور مرزا محمد رضا معجز کی تطہیر الدا و ساخ کا تذکرہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کی معرکہ آرائی صرف محاوروں روزمرہ کے استعمال اور بندشوں کے جواز سے متعلق تھی۔ ان میں مجادلہ اور مناظرہ کا لطف تو ہے مگر ادبی تفہیم یا تنقیدی بصیرت ندارد ہے لیکن بقیہ تصانیف میں انیس کا تذکرہ بالکل تجزیاتی انداز میں نظر آتا ہے ان کے کرداروں کا بیان، ان کی منظر نگاری، ان پر جذبات نگاری کی شدت، واقعہ نگاری میں معمولی معمولی تفصیل کو پیش نظر رکھنا یہ ہے تجزیہ کا انداز۔ المیزان اور حیات دبیر میں انیس کا تذکرہ دوسرے انداز سے ہوا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں دبیر کے محاسن شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے اور انداز فکر صرف یہ ہے کہ جن اوصاف کی بنا پر شبلی نے انیس کو دبیر پر ترجیح دی ہے وہ سارے اوصاف دبیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ انیس کے سلسلے میں جو باتیں شبلی نے کہی ہیں اُن ہی کا دبی زبان سے اعتراف ہے:

بے شک انیس کا یہ تجزیاتی مطالعہ ہماری تنقید کی آبرو ہے اس نے ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے تاریخ کی ایک اہم ضرورت تھی جسے شبلی نے پورا کیا ان کے بعد والوں نے ۹۱ برس تک اس کی توسیع کی۔ مرثیہ کے ایک شاعر کو مذہب کے دائرے سے نکال کر اس کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوششیں کی گئی۔ اور مرثیہ کے تہذیبی پہلو کو اجاگر کیا گیا۔ لیکن ادب کے عام طالب علم کے لیے موازنے کا تجزیاتی پہلو تشفی بخش نہیں ہو سکتا تھا وہ لوگ جو انیس سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے یا وہ افراد جن کی نظر میں مرثیہ سننا مرثیہ پڑھنا اور مرثیہ سنانا کار ثواب تھا اور نجاتِ اخروی کا باعث، وہ تو فنی اور ادبی اقدار کو بنیاد نہیں بناتے تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان سارے پہلوؤں سے بے نیاز تھے لیکن ادب کے ایک عام قاری کے ذہن میں فنی اور ادبی اقدار کی بنیاد پر موازنہ اور اس کے بعد کے اسی قبیل کے تجزیاتی مطالعے، بے اطمینانی اور ذہنی انتشار کی فضا پیدا کرتے رہتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مشرق و مغرب کے امتزاج کا عمل شروع ہو چکا تھا اور مغرب نے مفکرانہ تشکیک کا جو سرمایہ دیا تھا اس کے سہارے پر صنف ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ادب کے طالب علم کے ذہن میں ہزاروں سوالات ابھرتے تھے۔ مرثیہ کے ساتھ بھی یہ بات تھی ایک عام طالب علم سیدھے سیدھے انداز میں سوچتا تھا کہ مرثیہ کے کردار عربی ہیں لیکن انیس کے مرثیوں میں جو معاشرہ نظر آتا ہے نہ صرف یہ کہ وہ عربی میں ہے بلکہ لکھنؤ کے اشراف کا معاشرہ ہے کیا یہ فنی اعتبار سے درست ہے؟ مرثیہ تو ایک مذہب کے ماننے والوں کے کچھ بزرگوں کے تاریخی واقعات بیان کرتا ہے اس سے دوسروں کو کیوں دلچسپی ہو؟

مرثیہ کی فضا ہندوستانی ہے۔ جب کہ مرثیہ کا پس منظر ریگ زار کربلا ہے ریگ زار میں ان مناظر کی گنجائش کہاں

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار ✽ پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
وہ جھومنا درختوں کی شاخوں کا بار بار ✽ بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے گلشن زہرا جو آب کے ✽ شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

یہ منظر اپنی جگہ پر بہت خوب صورت اور مکمل سہی ایسی تصویر سہی جہاں فطرت شاعر کی زبان سے بولتی نظر آتی ہے لیکن ریگ زار کربلا میں ان کا وجود کیسے؟ اور پھر وہ منطقی تضاد کہ جہاں ماہی سے سوج تک آ کر کباب ہو جاتی ہے حباب انگارے میں اور پانی شرر فشاں ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں چھپتی پھر رہی ہے اور آفتاب گردوں کے پاؤں کا چھالا ہے ایسے موسم میں یہ لالہ و گل یہ جگر کو سردی بخشنے والی ہوا کہاں سے آ گئی؟

لیکن قاری فطرت کے ان مناظر کی اپنے ذہن سے توجیہہ کر سکتا ہے اس لیے کہ یہ مناظر عمومی ہیں ان میں کربلا کی تخصیص نہیں ہے لیکن کردار تو مخصوص ہوتے ہیں اس لیے جب وہ ہندوستانی معاشرتی آداب دیکھتا ہے اور عربی چہرے اسے ہندوستانی لباس میں نظر آتے ہیں تو کہیں کہیں تو اس کا ذہن الجھ جاتا ہے اور فنی اور ادبی اعتبار سے اسے مرثیہ کی فضا مناسب نظر نہیں آتی۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تاریخ سے واقفیت کی بناء پر قاری مراثی میں بیان کردہ روایت میں خوش عقیدگی کے پہلو دیکھتا ہے اور ان کے باہمی تناقص پر غور کرتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے غلطی کی ہے۔ شبلی نے مرثیہ کے معلم اول کی حیثیت سے ان مسائل پر غور نہیں کیا انتقاد کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ محاکمہ کرے اور ہر پہلو پر نظر رکھے انھوں نے انیس کے مرثیہ کا تہذیبی زاویۂ نظر سے مطالعہ ضرور کیا لیکن اس پہلو کو تشنہ چھوڑ گئے کہ

تاریخی صداقت اور شاعرانہ صداقت میں کیا فرق ہوتا ہے صرف ایک جملہ لکھ کر وہ آگے بڑھ جاتے ہیں "تمام مرثیہ گویوں نے اہلِ حرم کے عادات اور مراسم ہندوستان کے شرفاء کی مستورات کے مطابق فرض کیے"۔ لیکن اس پر روشنی نہیں ڈالتے کہ یہ حق ہے کہ قبیح یہ وصف ہے یا نقص ——— !

اور یہ کارنامہ ڈاکٹر زورؔ نے انجام دیا اور انھوں نے تنقیدی بصیرت کے ساتھ انیس کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسے اہم سوالات کا جواب دیا جو مرثیہ کے ایک عام طالب علم کے لیے الجھن کا سبب ہو سکتے تھے۔ انیس کی مرثیہ نگاری پر اُن کے ۲ مضامین جون ۲۶ء میں نیرنگِ خیال اور الناظر میں شائع ہوئے۔ یہ دونوں مضامین ایک دوسرے سے مربوط ہو کر انیس کی مرثیہ نگاری کے عنوان سے "روحِ تنقید" میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کا یہ مضمون تین اعتبار سے اہم ہے۔

① دورِ حاضر میں آئی۔ اے۔ رچرڈس کی معرکہ خیز تصنیف Practical Criticism کے بعد عملی تنقید کا چرچا اس حد تک ہوا کہ اب نصاب میں الگ موضوع کی حیثیت سے اسے شامل کیا گیا ہے۔ یہ تصور بیسویں صدی کے بعد مقبول ہوا۔ ڈاکٹر زورؔ نے اُس سے تقریباً ۲۰ سال پہلے تنقیدی اصولوں کے ضوابط معین کرنے کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے اُن ابتدائی نقوش کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جن کی داغ بیل مشرقی روایات اور اصولِ نقد کی روشنی میں آزادؔ، حالیؔ اور شبلیؔ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی۔ اُن کی عملی تنقید کا نمونہ انیسؔ کی مرثیہ نگاری والے مضمون میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن کا طرزِ فکر بھی مشرقی ہے وہ الفاظ کے Tension یا صوت، آہنگ پر زیادہ زور نہیں دیتے بلکہ اس کے برخلاف الفاظ سے جس لہجے کی تخلیق ہوتی ہے اس کی طرف قاری کی توجہ دلاتے ہیں لکھتے ہیں "بھائی کی محبت اور اُن کے ساتھ برتاؤ کی ایک معمولی مثال یہ ہے کہ حضرت عباس آپ کے فرمانے پر فوجِ شام کے ساتھ جنگ و جدل سے باز آتے ہیں مگر غصہ باقی ہے اور غصے سے کانپ رہے ہیں تو اُن کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سمجھاتے ہیں اور دونوں مل کر اپنی بہن حضرت زینب کے پاس آتے ہیں وہ چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی لپٹ کر رونے لگتی ہیں ؎

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن ۔۔۔ صدقہ اُتارو کچھ مرے بھائی پر اے بہن
تھے دس ہزار مستعدِ جنگ تیغ زن ۔۔۔ جیتا میں، زخمی ہوتے جو عباسِ صف شکن
آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا ۔۔۔ دیکھو! ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا

یہ تھی ایک بڑے بھائی کی چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت اور پاسِ خاطر کی مثال ——— !" عملی تنقید کا یہ پہلو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتا لیکن تاریخی تسلسل کی ایک اہم کڑی ضرور ہے

ڈاکٹر زورؔ کے متذکرہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے حبیب الرحمان خاں شروانی نے لکھا تھا "میر انیسؔ کی شاعری کا یہ قصور ناقابلِ عفو ہے۔۔۔۔۔

۱۔ روحِ تنقید ۔ میر انیس کی شاعری پر رائے صفحہ (۷)

بہر حال اس بارے میں خود آپ کا قول حکم ہے ۔ ذہنیاتی فضا اور قلبی کیفیات کے بیان میں وسعت تخیل اور وجدان صحیح کا لحاظ ضروری ہے :

دراصل حبیب الرحمان خان شیروانی کا اعتراض مذہبی بنیادوں پر تھا ۔ اور بہت سے واقعات اُن کے خیال کے مطابق تاریخی لحاظ سے ساقط الاعتبار تھے روایت راوی رجال مستند اور پھر عربی طرز معاشرت کی جگہ ہندوستانی طرز معاشرت اور اُسی کے ساتھ ریگ زار کربلا میں کشمیر سے زیادہ حسین عروسی فطرت کا جلوہ ! ڈاکٹر زور نے پہلی بار بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ مرثیہ کو مذہبی حدبندی سے نکال کر تہذیبی صنف سخن کی حیثیت دی ۔ مذہبی اعتبار سے صرف مسلمانوں کو ہی اس سے وابستگی ہو سکتی تھی ۔ لیکن تہذیبی اعتبار سے مشترکہ تہذیب کی علامت اردو کی ایک صنف ہونے کی بنا پر ہر مذہب کا ماننے والا مرثیہ کی ادبی قدر و قیمت کا عرفان حاصل کر سکتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ والمیکی کی مہابھارت یا تلسی داس کی رام چرترمانس یا ملٹن کی پیراڈائیز لاسٹ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں پڑھی جاتیں بلکہ ان میں مذہبی صداقت سے زیادہ تہذیبی صداقت اور تاریخی سچائی سے کہیں زیادہ شاعرانہ سچائی کی تلاش کی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں

" شاید ان صنائیوں کو مذہبی عینک سے دیکھنا اس کی شعری و تخلیقی خوبیوں کا خون کرنا ہے ..... اگر کسی کا موضوع اعلیٰ ہے اور وہ کسی موجود صداقت کی نقل نہیں ہے بلکہ اس میں جو صداقت پائی جاتی ہے وہ شاعر کی ذہنیاتی تخلیق ہے تو اس قسم کا کارنامہ اور بھی زیادہ قابل وقعت ہوگا " اس طرح ڈاکٹر زور اردو مرثیہ نگاری کی تنقید میں وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے شاعرانہ صداقت اور تاریخی صداقت میں فرق کرتے ہوئے مرثیہ کو مذہبی صنف کے بجائے تہذیبی صنف کی حیثیت سے روشناس کرایا ۔

" ذہنیاتی تخلیق " کے استعارے میں ایک جہان معنی آباد ہے اور اس کی تشریح مختصر الفاظ میں یوں کی جا سکتی ہے کہ شاعر جن کرداروں سے جذباتی وابستگی اور عقیدت رکھتا ہے انھیں اپنے الفاظ کے پیکر میں لانے کے لیے اسے خود اپنی ذہنی فضا کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔

ذہنی فضا محدود بھی ہو سکتی ہے مشروط بھی ہو سکتی ہے اور اس میں وسعت بھی ہو سکتی ہے انیس کے مرثیوں کے کردار تاریخی اور مذہبی اعتبار سے اتنے ارفع و اعلیٰ ہیں کہ بے شک الفاظ ان کی تصویر کشی کے لیے ناکافی ہیں ۔ اپنے عقائد اور اپنے جذبات کی ترسیل کے لیے شاعر کو جس فضا کی تخلیق کرنی پڑتی ہے وہ فضا یقیناً تاریخ، جغرافیہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں ہو سکتی اور الفاظ کے ذریعہ جذبات کو متشکل کرنا خصوصاً جہاں مذہب اور عقیدہ ساتھ ساتھ ہوں پل صراط سے گذرنے سے کم نہیں اور اسی منزل سے گذرنے کے لیے شاعر " ذہنیاتی تخلیق " کرتا ہے ۔ تاثر پر حرف آنے نہ پائے کردار کے عظمت و جلال کا صحیح تصور بھی پیدا ہو سکے اور اپنے اظہار کے نقص کو بھی چھپایا جا سکے ۔ شخصیت پیکر نور اور اظہار کرنے والا مادی اور خاکی وجود، یقیناً اظہار میں نقص ہوگا ۔ لیکن ذہنیاتی تخلیق سے وہ اس نقص کو چھپا لیتا ہے ۔

۳۔ شبلی صرف اتنا ہی لکھ کر رہ گئے کہ "تمام مرثیہ گویوں نے اہل حرم کی عادات و مراسم ہندوستان کے شرفا کی مستورات کے مطابق فرض کیے ہیں" یہ مرثیہ کا فنی اعتبار سے اور منطقی اعتبار سے بھی عیب سمجھا جاتا تھا شبلی نے اس کی کوئی تاویل نہیں پیش کی۔ ڈاکٹر زور اس پہلو کی صراحت کرتے ہیں اور یہ صراحت اتنی مکمل اور بھرپور ہے کہ یہ گوشہ جو نقص معلوم ہوتا تھا مرثیہ کا سب سے بڑا حسن بن کر سامنے آتا ہے۔ جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں "انھوں نے عربی طرزِ معاشرت کی جگہ ہندوستانی طرزِ معاشرت کے خاکے میں اپنے عرب رجال داستاں کو متحرک کیا۔۔۔ وہی تصنیف اعلیٰ ہوتی ہے جو اپنے زمانے اور ماحول کی خالص پیداوار ہوتی ہے اعلیٰ صناع تو وہ ہے جو اپنی مخلوق کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کے مخاطب اس کو اپنے ہی میں کا ایک شخص تصور کرنے لگیں ——"

"عربستان کی عورت ہندوستان کی عورت سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی کیوں کہ ہندوستانی ان کی پیش کردہ چیزوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے۔"

ڈاکٹر زور کے اس بیان کی تائید میں ضمناً پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو "ہندوانی رسم و رواج مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں داخل ہوئے تو ہندوؤں نے مسلمانوں کی بعض روایات کو اپنا لیا امام حسن و حسین علیہ السلام کی شہادت کربلا کے واقعات ..... یہ سب اور ایسے ہی دوسرے قصے مقامی اثرات اور مقامی جذبات کے تحت اضافے اور ترمیمات کے ساتھ تلگو گیتوں میں پرو دیے گئے —— اور انھیں آج بھی رائلسیما اور آندھرا پردیش کے دوسرے علاقوں میں کسان اپنا ہل چلاتے ہوئے کمہار اپنا چاک پھراتے ہوئے اور جولاہا کپڑا بنتے ہوئے گاتا ہے —— اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے ہیرو باہر کسی دیس کے رہنے والے ہیں۔"

ڈاکٹر زور پوری تشریح کے ساتھ میر انیس کے پیش کردہ نسائی کرداروں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں کردار عربی روح رکھتے ہوئے اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے حامل ہوتے ہوئے ایک مثالی حیثیت کے مالک ہوتے ہوئے ہندوستانی رسم و رواج کے پس منظر میں نظر آتے ہیں ان میں عرب کے سوز دروں کے ساتھ عجم کا حسن طبیعت اور ہند کی نزاکت بھی نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں "میر انیس نے جن نسائی سیرتوں کو پیش کیا ان میں حدِ معینہ تک ہندوستانی فطرتوں کو بھی شامل کیا ہے۔" جہاں تک بین کا تعلق ہے ان مرثیوں کی جملہ عورتیں ہندی ہیں رسم و رواج کے لحاظ سے نصف ہندی ہیں اور نصف عرب۔ جب حضرت زہرہ اور حضرت زینب کے کردار پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ بالکل عرب عورتیں دکھائی دیتی ہیں" انیس کے مرثیوں سے مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ ہے ایک عرب عورت کی فیاضی کہ اپنے بیٹوں کے مقابلہ میں بھائی کو ترجیح دیتی ہے" "اور یہ ہے ایک بہادر عورت کا ایثار کہ اپنے موروثی حق سے اپنے چھوٹے بھائی کو سرفراز کرتی ہے" "حضرت زینب کا کردار بالکل عربی ہے انیس نے صرف ایک معینہ حد تک انھیں ہندی نفسیات سے متعلق کیا ہے...... اور وہ بھی صرف بیٹوں میں" "حضرت زینب کی عرب نفسیات اس وقت نمایاں ہو جاتی ہے جب کربلا کے میدان میں تمام رفقا شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں اور صرف گھر والے باقی رہ جاتے

ہیں ۔ حضرت زینب کو بڑا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کے بچوں کی لاشیں کیوں نہیں آئیں ..... دنیا کی کوئی عورت جرأت و دلیری کے ایسے جذبات و تخیلات نہیں رکھتی جیسے کہ ایک عرب عورت کو عطا کیے جاتے ہیں ۔ وہ کسی کو اپنے گھر خاوند اور بچوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی تہہ خانے کے گوشے میں چھپنے کسی باولی میں ڈوب کر یا کسی آگ میں جل جانے کی کوشش نہیں کرتی ۔ حضرت زینب اپنی قومی اور خاندانی روایات کے مطابق اپنے بچوں کو نام آوری کے لیے آمادہ کرتی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست سپہ سالار اپنے نوجوان سپاہیوں کو کسی معرکۂ جنگ کے لیے جوش دلا رہا ہے"

"یہاں تک تو انیس نے حضرت زینب کو ایک عربی شکل میں پیش کیا ۔ لیکن جب بین شروع ہوجاتے ہیں تو وہ ایک ہندوستانی فطرت رکھنے والی عورت میں تبدیل ہوجاتی ہیں ۔ اور چونکہ مرثیہ کی ظاہری کامیابی کے لیے اس عنصر کا شامل کرنا ضروری تھا اس لیے انیس نے اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے"

اس طرح ڈاکٹر زور پوری وضاحت کے ساتھ انیس کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے مرثیوں پر تنقید میں پہلی بار اس نکتہ سے آگہی بہم پہنچاتے ہیں کہ انیس کے کرداروں میں ہندی عربی عناصر کی آمیزش نے ایک نئی کیفیت پیدا کی ہے کرداروں کا تجزیہ اس طرح سے ہے کہ کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے میدان محاربہ میں مجاہد کی آنکھیں شرارے برسا رہی ہیں ۔ وقت نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ہے اور کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ فانوس غم میں آنسوؤں کی شمعیں روشن ہیں اور دلوں کی دھڑکنیں، جذبات کا وفور، غم انگیز فضا، اور درد بھری کہانی ساری دنیا کے انسانوں کو متاثر کر رہی ہے۔ ڈاکٹر زور کا یہ مضمون اردو میں مرثیہ پر تنقید کی تاریخ میں شبلی سے لے کر ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر محمد حسن ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر نریش چندر کے درمیان ایک سنہرے رابطے کی حیثیت رکھتا ہے اور انیس کی مرثیہ نگاری پر کئی طرح کے شبہات اور الجھنوں کی وضاحت اور صراحت ہی نہیں کرتا بلکہ ایسا مواد پیش کرتا ہے کہ انیس کے کمال فن سے آگہی ہوتی ہے اور ان کے عرفان کی دولت حاصل ہوتی ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کے اس مضمون کے بعد ابواللیث صدیقی، کلیم الدین احمد اور احسن فاروقی نے وہی اعتراض دہرایا جس کا جواب پندرہ سال پہلے زور صاحب دے چکے تھے اور کسی نے جواب دیا بھی تو وہ خواہ اثر لکھنوی ہوں یا ڈاکٹر مسیح الزماں، وہ جواب ڈاکٹر زور کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے ۔

تنقید اس وقت تحقیق سے بڑھ جاتی ہے اور تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے جب نقاد عروس معنی کا گھونگٹ ہٹا کر حقیقت کے نئے جلوے دکھاتا ہے ۔ برگساں کے الفاظ میں شاعری ہمیشہ اندرونی کیفیتوں کی ترجمانی کرتی ہے ۔ نقاد ان اندرونی کیفیتوں کا جب ادراک حاصل کر لیتا ہے اور اس کی وابستگی اس حد تک ہوجاتی ہے کہ عام قاری ان کیفیتوں سے مکمل طور پر اپنے کو ہم آہنگ پانے لگتا ہے تو پھر اسے تخلیقی تنقید کہنا پڑتا ہے ڈاکٹر زور نے بھی متذکرہ مضمون میں انیس کی انہی اندرونی کیفیتوں کی بازیافت کی ہے اور اس لیے جب تک انیس کے کمال کا آفتاب چمکتا رہے گا اور اس کی شعاعیں پھوٹتی رہیں گی ڈاکٹر زور کے اس تنقیدی مضمون کی آب و تاب بھی باقی رہے گی ۔

(ادبی اجلاس یادزور میں پڑھا گیا)

بانو طاہرہ سعید

ڈاکٹر زور: چند یادیں

میں اپنے آپ کو غیر معمولی خوش نصیب اور بے انتہا بد قسمت سمجھتی ہوں۔ مجھے طالب علمی کے زمانے ہی سے بعض عالی مقام دانشوروں کی شفقت اور عنایت نصیب ہوئی جو ہر ایک کا حصہ نہیں "ایں سعادت بزور بازو نیست" شمالی سندھ میں فارسی اور پولیٹیکل سائنس کے استاد صاحبان نے نہ صرف مجھے متاثر کیا بلکہ میری کردار سازی میں ان کا فیض شامل ہے۔ ایران میں ملک الشعرا بہار مرحوم کی صحبت اور خصوصی توجہ نے مجھ پر صیقل کا کام کیا۔ کئی نامور پاکستانی ادیب اور ماہر لسانیات عالموں نے مجھے ذہنی طور پر خود اعتمادی کا راستہ دکھلایا اور چند انگریزی ادیبوں نے بھی ہمت افزائی کی۔ حیدرآباد میں آنے کے بعد جناب نصیر الدین ہاشمی نے مجھے ڈاکٹر زور صاحب سے متعارف کیا اور ایسا لگا جیسے ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے جانتے ہوں، ان کی گرمجوشی اور مشفقانہ لہجہ کبھی نہ فراموش ہونے والی یادگاریں ہیں۔ بہت مختصر عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی صاحبزادی "تہذیب" نے مجھے ان کے خاندان کے اراکین میں ایک رکن ہونے کا احساس دلایا "ایوان اردو" بن رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہر جلسے مشاعرے میں علمی کمیٹیوں میں مجھے مدعو کرتے تھے اسٹیج پر آکر کلام سنانے کے وہ اور ہاشمی صاحب ذمہ دار ہے تھے کیوں کہ ریڈیو اسٹیشن کے سوا میں محفلوں میں کلام سنانے کبھی نہیں آئی تھی پھر بھی میں نے ایوان اردو کی محفلوں میں ذرا سی بھی جھجک یا اجنبیت محسوس نہیں کی۔ اس ایوان کے علاوہ نزدیک ہی میں ڈاکٹر صاحب کے ارد گرد ہمیشہ اہل قلم کا اژدحام رہتا تھا۔ مجھے مقامی شعرا اور ادیبوں سب سے ملنے کا موقع ملا۔ شاہد صدیقی، مخدوم، سلیمان اریب، سرور ڈنڈا، کنول پرشاد، وقار خلیل، منظور احمد اور صلاح الدین نیر میرے پسندیدہ شعرا تھے اور ان سب کا برتاؤ بھی کچھ اتنا محبت آمیز، پُرخلوص اور ہمت افزا تھا کہ میں اسے قید بیاں میں نہیں لاسکتی۔ یہ تو فضل خدا ہے اگر خدا کے بندے کسی شخص پر مہربان ہوجائیں! بیشک میں بہت خوش قسمت ہوں اس لحاظ سے۔ لیکن ہائے بد قسمتی کہ میرے کرم فرماؤں میں اکثر و بیشتر عالم بالا میں جا بسے ہیں۔ یہ دکھ۔ یہ داغ۔ یہ غم میری رگ رگ میں پیوست ہے اور ڈاکٹر زور صاحب کے دوری تو بہت ہی گہرا داغ ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی یہی دوری اس قدر نزدیکی میں بدل جاتی ہے کہ وہ میرے روبرو اپنی پُروقار مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کو مجھ سے توقعات تھیں ۔ انھیں یقین تھا کہ اردو کی خدمت میرا دھرم ہے اور رہے گا۔ میرا
وعۂ کلام "برگِ سبز" انھیں کے متواتر اصرار کی بناء پر منظرِ عام پر آیا۔ اگرچہ ان دنوں ڈاکٹر صاحب کشمیر میں تھے۔
سے پیش لفظ روانہ فرمایا۔ یوں ان گنت یادیں میرے دل پر منقش ہیں لیکن قلی قطب شاہ کے پہلے یوم کی
ں ۔ ایوانِ اردو کے افتتاح کا جلسہ اور حضرت امجد کی سلور جوبلی کا جشن و مشاعرہ بڑی رنگین یادیں ہیں ۔
صاحب کے حکم پر ہر موقع پر میں نے نظمیں لکھیں اور رفتہ رفتہ موضوعاتی نظمیں لکھنے کی مجھے عادت سی ہوگئی ۔
ہ کی عظمتِ پارینہ کو نئی زندگی بخشنے میں ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کا کتنا بڑا اثر تھا یہ تو سب کو معلوم ہے۔
ششوں نے بانیٔ شہر محمد قلی قطب شاہ کے یوم کو ایک تاریخی مقام عطا کیا اور آندھرا پردیش کے قومی تہوار
ت میں جلوہ گر کر دیا ۔ مگر انھیں کیا کچھ نہ برداشت نہ کرنا پڑا۔ کتنی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑیں ۔ خونِ جگر
۔ دھن کے پکے خدمت گزارِ تہذیب و تمدن نے آخر کار فتح پائی اور اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے ۔
نبہ ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے ڈرائنگ روم میں مجھے یہ بتلایا کہ علمی ادبی یا شاعرانہ حسد کیا کچھ زہر پھیلا
ہے ۔ فرمایا — "ہر قدم پر رنگ برنگ کی مخالفتیں سامنے آتی ہیں ۔ میں قطب شاہی دور کو اس لیے
رنے کی جد و جہد میں لگا ہوا ہوں کہ یہ دور سارے ہندوستان کے لیے فخر و مباہات کا باعث ثابت
ا ہے ۔ قومی یکجہتی ۔ لسانی رواداری اور ترقیاتی نکتۂ نظر سے قطب شاہوں کا زمانہ قابلِ ستائش ہے
یہاں کے بعض تنگ نظر ۔ کوتاہ فکر اور کور دماغ لوگوں نے میرے خلاف پروپگنڈہ شروع کر دیا
۔ ان کا کہنا ہے کہ قطب شاہی سلاطین کا تعلق مغلوں سے مختلف فرقۂ اسلام سے تھا۔ وہ کسی فرقہ
سے ہو۔ قطب شاہ مسلمان حکمراں ہی کہلائیں گے اور ہماری تاریخ میں نیک نامی سے یاد کیے
گے۔" مجھے یہ واقعہ سن کر سخت حیرت اور ملال ہوا۔ میں نے عرض کیا ۔ "ڈاکٹر صاحب ۔ جاہلوں
ب خاموشی بہتر ہے ۔ دلے ۔ سوہان روح ہے ایسے اشخاص کا تصور تک ۔ !!" آپ کھلکھلا کر
پڑے ۔ چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کیا اور مشاعرہ وغیرہ کے پروگرام پر بحث چھڑ گئی ۔ ریڈیو
ٹ عائشہ ارشاد صاحبہ آگئی تھیں جنھیں مشاعرے کی کارروائی چلانا تھا ۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا
صاحب نے فارسی کا ایک شعر بآوازِ بلند پڑھ دیا ۔ جس پر عائشہ نے کہا یہ فارسی وارسی ہمارے پلے
پڑتی ۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "بانو کس لیے ہے !" میں بول اٹھی ۔ "عائشہ ۔ ڈاکٹر صاحب
م کا فتویٰ صادر کر رہے ہیں ۔ مجھ سمجھ میں آیا ۔ اس شعر کا مطلب ہے کہ ۔ تم تیغ ناز اٹھالو ۔ اور سب
بہا دو ۔ جو چاہے وہ کرو !! ہائیں یہ کیسے ؟ عائشہ ارشاد چونک پڑی ۔ ڈاکٹر صاحب موڈ میں تھے ۔ قہقہہ لگایا
نے ۔ "تفسیر بانو سے دریافت کر لو ۔" ہم سب بیساختہ ہنسنے لگے ۔ بحث ہی ختم ہوگئی ۔ مشاعرہ کے ہال اور
ں سجاوٹ اور کارروائی سب نہایت موزوں رہی ۔

فروری ۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا ۔ میں نے سوچا کہ ایوانِ اردو میں گھڑی نہ ہونے سے وقت معلوم نہیں ہوتا

میرے پاس ایک ویسٹ اینڈ دیواری گھڑی تھی جو بہت صحیح وقت بتلاتی تھی۔ میں اسے لے کر "ایوانِ اردو" پہنچی کہ تحفتہً پیش کر دوں۔ ڈاکٹر زور صاحب وہاں موجود تھے کشمیر سے چھٹیوں پر آئے ہوئے تھے۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ فوراً اسٹول منگوایا۔ ہتھوڑی اور کیل منگوا کر۔ خود اپنے ہاتھوں سے دیوار میں کیل ٹھونک کر گھڑی آویزاں کی۔ بالکل اسٹیج کے پیچھے کی دیوار پر عین وسط میں جہاں اس وقت گاندھی جی کی تصویر آویزاں ہے۔
مجھے مخاطب کیا "آپ نے ایوان کی شدید ضرورت کو پورا کر دیا۔ دلی خوشی ملی۔ میں بہت مطمئن ہو گیا کہ عوام کو وقت کا احساس بھی رہے گا اور ایک دوسرے سے وقت پوچھنا نہیں پڑے گا۔" دو تین دن بعد ان کا شکریے کا خط چپراسی کے ذریعہ سے مکان پر آیا جو میرے پاس محفوظ ہے۔!

آج بھی یہ گھڑی ایوانِ اردو میں موجود ہے اور شاید اس کا مقام اب زیادہ اونچا ہے لیکن وہ مقام نہیں ہے جو ڈاکٹر صاحب نے خود تعین کیا تھا۔ اس ایوان کا چپہ چپہ یادگاروں سے بھرا پڑا ہے۔ بلکہ گولکنڈہ سے کشمیر تک زور صاحب کی یادگاریں بکھری ہوئی ہیں۔ حیدرآباد دکن کا نایاب رتن کشمیر کی گلفشاں فضاؤں میں جا چھپا۔ حیدرآباد کی دولت ضرور لٹ گئی۔ ڈاکٹر زور صاحب اصل دکن سے دور جا بسے لیکن ہمارے دلوں سے تو دور نہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ وہ ہمارے خیالوں میں۔ خوابوں میں۔ تمناؤں میں اور اردو زبان کے وجود میں مینار روشنی بنے رہیں گے۔ جانے والے کی یاد آتی ہے ۔۔۔!! (یوم زور کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)

.....

نازؔ صدیقی

زورؔ ایک شاعر

دنیا میں جن شخصیتوں نے زندگی کے کسی بھی شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیے وہ غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے انسان تھے جنہیں عام طور پر جینس کہا جاتا ہے۔ جینس کی جو نشانیاں بتائی جاتی ہیں ان میں ایک اہم اور ضروری علامت یہ ہے کہ وہ غیر معمولی قوتِ تخیل رکھتا ہے لیکن کوئی (بہ روئے کار) جینس اپنی اس صلاحیت کو بہ روئے کار نہیں لا سکتا اگر اس میں تخلیقی لگن نہ ہو جسے اقبال نے "عشق" اور "خونِ جگر" کا نام دیا ہے۔ ایسی تمام شخصیتیں جو جینس ہوتی ہیں اور جن کے لافانی کارناموں سے ساری انسانیت بہرہ مند ہوتی ہے خواہ وہ بڑے سائنس داں ہوں، عالم ہوں، دانشور ہوں یا قومی رہنما بنیادی طور پر فن کار ہوتی ہیں۔ فن کار محض خواب ہی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے خوابوں سے ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ یہ تخلیقی دنیا کلچر کی راہ سے حقیقی دنیا پر اثر انداز ہوتی اور اس میں تبدیلی لاتی ہے۔ بعض تخلیقی جینس رکھنے والی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو فلسفہ علم یا فن کا سہارا لیے بغیر براہِ راست اپنے افکار کو عملی شکل دیتے اور خوابوں کو حقیقت میں ڈھالتے ہیں۔ سرسید احمد خاں اور مہاتما گاندھی کی شخصیتیں اسی ذیل میں آتی ہیں اور پھر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ تخلیقی فن کار براہِ فن اپنے جذبے اور تخیل کے آہستہ خرام اور بالواسطہ نفوذ سے مطمئن نہیں ہوتا اور کلچر پر براہِ راست اثر انداز ہونے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ شبلی، مولانا آزاد اور محمد علی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر زور کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک بڑے محقق، نقاد، ادبی مورخ اور مجاہد اردو کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان تمام حیثیتوں کے پیچھے دراصل ایک فن کار کی شخصیت کارفرما تھی جو بنیادی طور پر ایک شاعر اور افسانہ نگار تھا۔

ڈاکٹر زور نے اپنی علمی اور ادبی زندگی کے آغاز میں تنقیدیں لکھیں تحقیقی کام کیے ساتھ ہی ساتھ شاعری بھی کی اور کہانیاں بھی لکھیں۔ آگے چل کر انھوں نے شعر گوئی ترک کر دی اور افسانہ لکھنا بند کر دیا اور اپنی ساری توانائیاں زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ ان کا جذبۂ تخلیق سرد پڑ گیا تھا۔ ہوا صرف یہ کہ گولکنڈے کا افسانہ خواں اب دکن کا ادبی مورخ بن گیا تھا اور اس تاریخ نویسی

میں دکن کے تہذیبی ماضی سے اس کی ایک رومانوی وابستگی شامل تھی۔ اردو ادب کے ایک تاریک دور کی روشنی میں لاکر دراصل وہ ایک نئی دنیا تشکیل دے رہے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات مدون کرتے ہوئے انھوں نے خود کو اردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر سے اس طرح [illegible] نہ کیا ہو کہ یہ قلی قطب شاہ کا کلام نہیں میری اپنی تحقیقات ہیں اس کے ہر شعر میں میرا اپنا دل دھڑک رہا ہے۔ اور جب زور صاحب نے بہت سے دکنی شہ پاروں کو منظر عام پر لاکر اس قدیم کلچر کی بازیابی کے کام کو اس حد تک آگے بڑھایا کہ انھیں یقین ہوگیا کہ آنے والی نسلیں اس کام کو ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر جاری رکھیں گے اور پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے تو زبان اردو کی خدمت کا جذبہ انھیں کشمیر لے گیا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہاں ریاستی زبان اردو ہونے کی وجہ سے وہ وسیع تر پیمانے پر کوئی کام کرسکیں گے لیکن اردو کی جڑیں اس کلچر میں کچھ اکھڑی اکھڑی سی دیکھیں تو وہ اجنبیت کے احساس کا شکار ہوگئے انھیں دکن کی یاد ستانے لگی اور ان میں سویا ہوا شاعر جاگ پڑا۔ انھوں نے چند غزلیں کہیں۔ جذبات کی گرمی سے تابندہ اور احساس کی روشنی سے منور غزلیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے تو جلد ہی وہ مسلمہ شاعروں کی صف میں اپنی جگہ بنالیں گے لیکن موت نے اس چراغ کو بے دردی کے ساتھ بجھا دیا۔

زور صاحب نے جب شعر گوئی کی ابتدا کی تھی تو انداز ایسے تھے کہ دو چار سال ہی میں وہ شاعر کی حیثیت سے اپنی انفرادیت منوالیں گے ان کی نظم "چاندنی" پڑھیے تو آج بھی ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھر ذکرِ رونقِ شبِ مہتاب آگیا
سامانِ وحشتِ دلِ بے تاب آگیا

موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی
اے کاش مل سکے نگہ یار بھی وہی

ہوگا یونہی فلک پہ سدا ماہ ضوفشاں
مل جائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں

پھر ایک نظم ملتی ہے "آسمان کی زبان سے"، جس میں حفیظ جالندھری کے گیتوں کے تجربے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ایک نظم "جامعہ عثمانیہ اور نونہالان دکن" ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں حیدرآباد کے نوجوان کی زندگی میں اس جامعہ کا قیام ایک عظیم تاریخ ساز واقعہ تھا۔ وہ ان کے لیے ایک تہذیبی نشاۃِ ثانیہ کی علامت بن کر منصۂ شہود پر آئی تھی اور ایک خوش آیند مستقبل کی نوید دے رہی تھی۔

جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا گیا تھا جو انگریزوں اور انگریزی کی علمی اور تہذیبی برتری کے

خلاف چیلنج تھا تو دوسری طرف یہ امید بندھ گئی تھی کہ حیدرآبادی نوجوان اس جامعہ سے فارغ التحصیل ہوکر نکلیں گے تو انھیں ریاست کے نظم و نسق اور یہاں کی سماجی تہذیبی اور سیاسی زندگی میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع ملے گا۔ جب صورت حال یہ تھی کہ معمولی ملازمت کے لیے بھی "غیر ملکیوں" کے مقابلے میں انھیں نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں زور صاحب کی نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجیے۔

اس کے ہر ذرّے کو رشکِ آفتاب اب دیکھیے
عظمتِ ملکِ دکن کو بے نقاب اب دیکھیے
ہو چکا منت کشی کا سدّباب اب دیکھیے
دیکھیے ہاں دیکھیے یہ انقلاب اب دیکھیے
داغ ہائے منتِ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ وطن شاداب ہوتے جائیں گے

زور صاحب کی شاعری کے ابتدائی دور کی صرف چند تخلیقات مرقعِ سخن میں شائع ہوکر محفوظ رہ گئی ہیں ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اور بھی نظمیں اور غزلیں کہی ہوں جو ضائع ہوگئیں۔

آخری زمانے میں ڈاکٹر زور نے غزلیں کہیں جذبات کی گرمی سے تابندہ اور احساس کی روشنی سے منور یہ گویا کارجہاں سے فارغ ہوکر اپنی ذات کی طرف لوٹنے کا عمل تھا۔ یہ غزلیں اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کا مطالعہ ہم کو ایک ایسی شخصیت کے جذبات و محسوسات کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جس نے اپنی ذات کو کبھی اہمیت نہیں دی اور خود کو کھو کر دوسروں کو پانے کی کوشش میں زندگی بسر کر دی۔ بعض اشعار میں بے پناہ عزم اور حوصلے کا اظہار ہوا ہے یہاں تک کہ زندگی سے شدید محبت کے باوجود خندہ پیشانی کے ساتھ مسرت کا استقبال کرتے ہیں۔

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی ۔ زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے۔
موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم ؛ زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

اقبال نے مردِ مومن کی جو پہچان بتائی ہے یہ اشعار اسی کی تفسیر پیش کرتے ہیں ۔ زور صاحب غم ذات کا شکار کبھی نہیں رہے ۔ شدید رنج والم کا سامنا ہونے پر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ تدبیر اور سعی و عمل پر انھیں پورا اعتماد تھا ۔ زندگی میں کچھ کام کر جانے کے لیے زندگی گزارنے کا جو سلیقہ مند اسلوب انھوں نے اختیار کیا تھا اس پر دوسروں کو بھی کاربند ہونے کی دعوت دی ہے

اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے　　اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو
منحصر ہے یہ دنیا ثبات پر　　سب ہی اسباب ہوں گے بہم ساتھیو

اس عزم و حوصلہ کے باوجود جب وہ انسان کے ہاتھوں انسانی قدروں کا خون ہوتا ہوا دیکھتے تو مضطرب ہو جاتے ۔ ان کے خیال میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی عروجِ آدم کا ضامن نہیں بن سکتی

جدید دور کی تہذیب کے یک رخے پن کو انھوں نے اس طرح ہدف طنز بنایا ہے ۔

انسانیت کے رِستے ہوئے زخم چھوڑ کر
دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے
انسان مر چکا ہے مشینوں کا دور ہے
اب کیا کسی کو زہر، کہ امرت پلائیے

اصل تہذیب احترام آدم ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سماجی عدم مساوات استحصال اور ناانصافیوں کا خاتمہ ہو زور صاحب کی ہمدردیاں تمام تر مظلوم اور کچلے ہوئے طبقے کے ساتھ رہیں ۔

کیا ستم ہے وہی بے نام ونشاں رہتے ہیں ٭ جن غریبوں کے پسینے سے نکھرتی ہے زمیں

زور صاحب کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں ان کا تصورِ حیات کہیں کہیں لایعنیت کے احساس سے دوچار ہو گیا ہے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی ہے لیکن وہ بھرم توڑنا نہیں چاہتے ۔

فردا کے انتظار میں کٹتی ہے زندگی
بہتر ہے روز و شب کا نہ پردہ اٹھائیے
شیرازۂ بہارِ گل تر بکھر گیا
اب کس کو کیا بتائیں کہ زیبِ چمن ہیں کون
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
فریب خوردہ خزاں ہیں، نہ خوش بہار ہیں ہیں
کہاں ہے وعدۂ پرویز و جلوۂ شیریں
عجب نہیں جو دل بے ستوں سے چیخ اٹھے

ان اشعار میں گہری اور دور رس معنویت کے ساتھ رمز و ایمائیے اسلوب کو جیسی مہارت کے ساتھ برتا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زور صاحب کا ذوقِ شعر گوئی فن کی اعلیٰ بلندیوں کو چھونے لگا تھا اور یہ افسوس ہمیشہ رہے گا کہ ہم ان کی متاعِ فکر و سخن سے زیادہ مستفید نہیں ہو سکے اور موت نے اس چراغ کو بے دردی کے ساتھ بجھا دیا ۔

(یادِ زور کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

فاطمہ پروین

ڈاکٹر زورؔ ۔ مختصر جائزہ

علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں جن عالموں نے نمایاں خدمات انجام دیں ان کے نام آنے والے زمانوں میں روشنی کے مینار کی ح تابندہ رہیں گے۔ "یوم زورؔ" کے موقع پر ڈاکٹر زورؔ کو صرف اس لیے یاد نہیں کیا جا رہا ہے کہ وہ اردو کے عہد ساز خدمت گار تھے یا یہ کہ نیات کے ماہر تھے بلکہ انھیں اس لیے یاد کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے آنے والی نسلوں کی اس طور سے رہنمائی کی، جن کی بدولت آزاد وستان میں اردو تحقیق و تنقید کا تیز گام قافلہ اپنا سفر جاری رکھ سکا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کی ترویج و ترقی کے لیے جس ماحول کی امید ا رہی تھی ویسا ماحول اردو کی بقا کے لیے میسر نہ ہو سکا جو زبان معاشی وسائل دینے کی طاقت نہیں رکھتی دیکھا گیا ہے کہ وہ زبان زیادہ دن زندہ نہیں رہتی لیکن جس طرح آزادی سے پہلے ہم نے آزاد زندگی کے لیے کشمکش تھی، آزادی کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اسی طرح کی کش مکش اردو بھی مبتلا ہے۔ یہ ڈاکٹر زور جیسے رہنماؤں کی بے لوث خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اردو نہ صرف زندہ ہے بلکہ تحقیق و تنقید اور ر سا دب کی سمت عصری حسیت کے شعور اور ابلاغ کے ساتھ سر گرم عمل ہے۔

زورؔ صاحب کا اگر ان کے شخصی اور خاندانی پس منظر میں دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو صوفیانہ زندگی ر سکتے تھے لیکن حضرت زعم صاحب کے فرزند زورؔ صاحب نے اپنے والد کا جانشین اپنے بیٹے کو بنایا اور خود ادب کی خدمت اس طرح جٹ گئے کہ زندگی بھر اردو کے لیے کمر بستہ رہے اور جب گزرے تو اتنا سرمایہ چھوڑ گئے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ل راہ کا کام دے رہا ہے۔ مایوسی، بے کسی اور بے بسی کے الفاظ ان کی لغت میں تھے ہی نہیں، انھوں نے جس کام میں بھی ہاتھ اٹھایا اس سلیقے سے کر دکھایا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ ان کی تصانیف جن کی تعداد لگ بھگ پچاس ہے ان کے وعات کو دیکھا جائے تو قوس قزح کے سے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں تحقیق و تنقید اور انشاء و افسانے سے لے کر صوتیات انیات، تذکرہ نگاری و تاریخ نویسی بھی ان کی زد میں تھے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کی اشاعت جو دکنی زبان اور ثقافت یک خزانہ ہے زورؔ صاحب کے تحقیقی شغف کا آئینہ دار ہے۔ تنقید نگاری میں ان کی تصانیف روح تنقید، تنقیدی لات اور اردو کے اسالیب بیان خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ "روح تنقید" میں فن تنقید کے اصول اور مبادیات بحث کی گئی ہے اور تنقید کے اہم ترین مسائل پر ڈاکٹر زورؔ نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے یہ کتاب نظریاتی تنقید کے ئل کے بارے میں اردو کی اولین تصانیف میں سے ایک ہے۔ "تنقیدی مقالات" میں ڈاکٹر صاحب نے جدید تنقیدی لوں سے اردو کے مشاہیر فن کی نگارشات کو جانچا اور پرکھا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی یہ تصنیف عملی تنقید نگاری کی عہد آفرین

مثال ہے۔ "اردو کے اسالیب بیان" ایک منفرد تنقیدی تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے زور صاحب کے ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے اس کتاب میں انھوں نے قدیم و جدید اساتذۂ فن کے طرزِ اسلوب پر رائے زنی کی ہے۔ افسانہ نگاری کے باب میں بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا طویل و مختصر ہر دو قسم کے افسانے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں میں تاریخی، رومانی اور اصلاحی رنگ کے ساتھ ساتھ دکنی کلچر روشن نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ "ہندوستانی لسانیات" ہے اسے اردو میں علم لسانیات کے موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب کا درجہ اور شرف حاصل ہے۔ اس میں انھوں نے علم لسانیات کے مقاصد و فوائد اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ زبان کی ماہیت کیا ہے، کسی زبان کا آغاز کس طرح ہوتا ہے اور وہ کن کن ارتقائی منزلوں سے گزرتی ہے، الفاظ کی ساخت اور تشکیل کس طرح ہوتی ہے، زبان سے متعلق عام معلومات فراہم کرنے کے بعد زور صاحب نے دنیا کی زبانوں اور ان کے مختلف خاندان کا بیان کیا ہے اور پھر ہند ایرانی خاندان اور اس کی مختلف زبانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں انھوں نے "ہندوستانی" کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات پیش کئے ہیں اپنے تمام حسن و قبح کے ساتھ یہ کتاب آج بھی اہمیت کی حامل ہے "حیات محمد قلی" اور "حیاتِ میر محمد مومن" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک اچھے مورخ بھی تھے۔ تصانیف سے تقریباً چار گنا زیادہ تعداد ان کے متفرق مضامین کی ہے جن کے موضوعات بھی متنوع ہیں۔

دنیا کی مختلف جامعات میں بیشتر مدبر شخصیتوں نے صرف کام برائے یافت کے اصول کو نہیں اپنایا بلکہ کام برائے خدمت ان کا لائحہ عمل رہا اور یہی حال ڈاکٹر زور کا بھی تھا انھوں نے جس اونچی علمی سطح پر علمی و ادبی کارنامے انجام دیے اس کی نظیر بڑی مشکل سے ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے بیک وقت اردو کی اعلیٰ اور معیاری تدریس، اردو سے متعلق تحقیقی کام، ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے کتب خانے کا قیام جیسے کام انجام دیے۔ اس کتب خانے میں جو کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے آج بھی ہزاروں تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہا ہے تقریباً پانچ ہزار قلمی اور پچیس ہزار سے زائد مطبوعہ کتابیں موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کام میں کتنی دلچسپی لی۔

بہرحال ڈاکٹر زور کے کارناموں کی طویل فہرست یہ ظاہر کرتی ہے کہ خود اعتمادی اور مسلسل محنت کا دوسرا نام ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص نے اپنی مختصر سی زندگی میں اتنے کام کس طرح انجام دیے؟ بقول پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی ہم اپنی زندگی میں چوبیس گھنٹوں کا پروگرام تو بناتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے جیسے ساری زندگی کا پروگرام بنا لیا تھا اور عمر بھر اس پر عمل پیرا رہے اور اتنا کچھ کیا کہ ان کا یہ شعر خود ان کی زندگی کا آئینہ دار ثابت ہوا ؎

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

(یادِ زورؔ کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)

وقار خلیل

ساقیٔ علم و دانش

(بہ یادِ زورؔ)

نہ گیتوں کی فضائیں ہیں نہ حسنِ انجمن ساقی
نگارِ قصرِ اردو کا لٹا ہے بانکپن ساقی

خلوص کار کی راہوں میں کتنے پیچ و خم آئے
نہ آئی تیرے ماتھے پر مگر کوئی شکن ساقی

تری تحقیق سے دکنی زباں نے زندگی پائی
کیا ثابت دکن اردو کا ہے پہلا وطن ساقی

نشانِ منزلِ عظمت دکھائے رہگزاروں میں
سویرا بن کے ابھرے گا ترا دیوانہ پن ساقی

چراغِ علم و دانش بجھ گیا "ایوانِ اردو" کا
افق زارِ سخن پر اب نہیں کوئی کرن ساقی

ترے شہرِ تمنا میں صلیبیں جگمگاتی ہیں
کہیں رسوا نہ ہو جائے جنوں کا بانکپن ساقی

ہزاروں آئیں گے لیکن کوئی تجھ سا نہ آئے گا
نئے ساغر میں لے کر حسنِ صہبائے کہن ساقی

ترے ذوقِ عمل کے آئینے میں لوگ دیکھیں گے
حیات افروز شکلِ اعتبارِ فکر و فن ساقی

دکن والا وطن سے دور کس وادی میں سوتا ہے
تجھے راس آ گیا کیوں آہ! غربت کا کفن ساقی

شہیدِ جنت ارضی تری تربت پہ رحمت ہو
تجھے روئے گا صدیوں حیدرآبادِ دکن ساقی

▲

بانو طاہرہ سعید

یادِ زورؔ

زورؔ صاحب کی یاد آتی ہے
یاد آتی ہے دل دکھاتی ہے
یاد آتی ہیں شفقتیں ان کی
نیکیاں اور محبتیں ان کی
ان کی باتیں تھیں ولولہ انگیز
عزم و ایثار تھا قیامت خیز
وہ جو کہتے تھے کر دکھاتے تھے
نوجوانوں کا دل بڑھاتے تھے
ان کی محفل تھی علم کی محفل
ان کا گھر اہلِ ذوق کی منزل
زلفِ اردو سنوارنے والے
نامِ اردو ابھارنے والے
ڈاکٹر زورؔ ہیں سدا زندہ
تا ابد ان کا نام پائندہ

▲

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

قندِ مکرر

اردو ادب اور سیاست

ادب اور سیاست میں چولی دامن کا سا تعلق ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بڑی اور زندہ زبانوں کی طرح اردو نے ہر دور کی سیاست میں حصہ لیا۔ وہ نہ صرف خود سیاست سے متاثر ہوئی بلکہ اس نے اپنے اثر سے بعض اوقات سیاست کا رُخ موڑنے کا بھی کام انجام دیا۔

اردو ادب کے ابتدائی کارنامے گولکنڈہ اور بیجاپور میں منظرِ عام پر آئے۔ ان دونوں شہروں کو وسیع اور خوش حال سلطنتوں کے پائے تخت ہونے کا شرف حاصل تھا اور حسنِ اتفاق سے دونوں جگہ ۱۵۰۰ء سے ۱۶۵۰ء کے درمیانی زمانے ہی میں اعلیٰ پایے کی اردو کتابیں لکھی گئیں۔ یہ زمانہ دراصل پوری دنیا میں ادب و شعر کے لیے بڑا ساز گار زمانہ تھا۔ فرانس میں لوئی چہار دہم۔ انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ، ایران میں شاہ عباس صفوی، شمالی ہند میں اکبر اعظم، بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو اور گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانشوروں کے فیاض، سرپرست اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ ان تمام حکمرانوں کو حسنِ اتفاق سے طویل عرصہ تک شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ جہاں بانی کے مواقع نصیب ہوئے اور ان ملکوں میں قتل و خون ریزی اور جنگ و جدال اس دور کی سیاست پر قابو نہ پا سکے۔

اکبر اعظم نے آگرہ سے قریب فتح پور سیکری کی بنیاد رکھی۔ ابراہیم عادل شاہ نے بیجاپور سے قریب ایک نیا شہر نورس پور تعمیر کیا اور محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کے نزدیک بھاگ نگر حیدرآباد کی بنیاد ڈالی تینوں مقامات کے شاعر اور ادیب نئے شہر اور نئی زندگی کے ولولوں سے متاثر تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ اپنے ملک کی تابناکیوں اور شہر کی رونق اور شادابیوں میں اپنے کلام سے اضافہ کریں۔ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ نئے نئے نغمے اور گیت نظم کر رہا تھا اور گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ رنگا رنگ غزلیں لکھنے اور ان سے اپنی رقص و سرود کی محفلوں کو گرمانے میں منہمک تھا۔

دکھنی سلطنتوں کے دونوں بادشاہ ہندوستانی اور خاص کر اپنے علاقہ کی تہذیب کو اپنانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی فکر میں تھے اور وضع قطع، لباس، نشست و برخواست اور تعمیر و تزئین میں ایرانی و ترکی عناصر کے ساتھ ہندوستانی عمدہ عناصر کی آمیزش میں منہمک تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کے دماغوں پر بھی اسی امتزاج و انضمام کے بادل منڈلا رہے تھے۔ انھوں نے اردو زبان کے اصلی مخلوطی خمیر سے فائدہ اٹھا کر اس امر کی پوری کوشش کی کہ یہ زبان صحیح معنوں میں اپنے دور کے سیاسی رجحانات اور اپنے حکمرانوں کے ذوقِ رواداری کی کامل نمائندہ بن جائے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی اردو شاعری میں بہت سے تلگو لفظ اور فقرے بے تکلف استعمال کیے اور ابراہیم عادل شاہ نے

کنڑی اور سنسکرت زبانوں کی اصطلاحوں کو اپنے گیتوں میں نگینوں کی طرح جڑ دیا۔ اور یہی رنگ اس عہد کے دوسرے شاعروں نے بھی اختیار کیا۔ چنانچہ عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں اور وجہی اور غواصی نے اپنے کلام میں اسی کو نمایاں رکھا۔ وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" تو ایک قطبیٹ سیاسی مصلحت کی آئینہ دار ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی کا ذکر مغل مورخوں اور ادیبوں مثلاً ملا فیضی اور ابوالقاسم فرشتہ نے ایسی حقارت سے کیا تھا کہ محمد قلی اور اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کو مجبوراً اس کے نام اور واقعہ کو چھپانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ ملک الشعرا ملا وجہی سے ایک ایسی مثنوی لکھائی جائے جس کا قصہ اصل واقعہ کو مسخ کر دے اور لوگ بھاگ متی کے نام ہی کو بھول جائیں۔ مثنوی "قطب مشتری" اردو کی پہلی اونچی (اور مکمل) داستانِ عشق ہے۔ اور اپنی اعلیٰ ادبی اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے اردو کی بہترین عشقیہ مثنوی سمجھی جا سکتی ہے

اردو ادب کی تشکیل میں سیاسی عنصر کا ایک اور نمونہ وہ ہزاروں مرثیے اور سینکڑوں مرثیہ نگار شعرا ہیں جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے زمانے میں اور بعد میں پچاس سال تک دکن کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے تھے اور اپنے ملک کی بربادی کا غم امام حسین علیہ السلام کے ماتم کے بہانے ظاہر کر رہے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے ہاتھوں بیجاپور اور حیدرآباد کی تباہی کے وقت بیسیوں ان پایہ تختوں سے نکل کر کسمپرسی کے عالم میں روپوش ہو گئے۔ بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جو وطن چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے ان تباہ شدہ شہروں ہی میں اقامت اختیار کی اور اپنی بربادی پر آخر وقت تک آٹھ آٹھ آنسو روتے رہے۔ چوں کہ فاتح بادشاہ اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غم زدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا علیہم السلام کے مرثیے لکھ لکھ کر نکال لی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں طویل نظمیں، قصیدے اور مثنویاں نہ لکھی جا سکیں۔ ان کے لیے تو اطمینانِ قلب اور فارغ البالی کی ضرورت تھی۔ اس دور کے شعرا نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کا جس طرح سے آلۂ کار بنا لیا اس کا ثبوت پیرزادہ روحی کے ایک مرثیہ کے چند شعروں سے ہو سکتا ہے ؎

آج غم تاک ہیں چمن کے گل　　بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ، سینہ داغ، حیراں ہیں　　نرگس و لالہ، یاسمن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں　　جل بجھے شمع انجمن کے گل
خوش لگے تجھ طبع سے اے روحی　　دل کے باغات منے سخن کے گل

یہ پوری نظم صرف نام ہی کو ایک مرثیہ ہے اور اگر اس کے پہلے مصرعہ میں بجائے چمن کے دکن کا لفظ لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ بجائے امام حسین کے حیدرآباد کے آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ کا مرثیہ بن جاتا ہے۔

دکن کی شاعری کا یہ رنگ ولی اورنگ آبادی کے زمانہ تک جاری رہا۔ ولی دکن کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے شمالی ہند کا سفر کیا اور دلی کے شاعروں کا دل موہ لیا۔ چنانچہ اس کے قیام دہلی کے بعد وہاں بھی اردو شعر و سخن کا چرچہ شروع ہو گیا۔ لیکن اردو شاعری کے عروج کے ساتھ ساتھ دلی کے مغل بادشاہوں کا ستارۂ اقبال زوال پذیر ہونے لگا اور وہاں کے شاعروں کو وہی

غواصی اور نصرتی جیسی بے فکری امن و امان نصیب نہ ہو سکا۔ وہاں کے ابتدائی اردو شعرا میں شاہ حاتم استاد الاساتذہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا پورا کلام دلی کی سیاسی زندگی اور انتشار و افتراق کا ترجمان ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دور کی سیاسی زندگی کے بارے میں ایک مستقل نظم ہی لکھ دی جس کا پہلا شعر ہے ؎

کیا بیاں کیجئے نیرنگئ اوضاعِ جہاں کہ بہ یک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں

شاہ حاتم کے علاوہ اس دور کے اکثر شعرا سودا، میر، مظہر، یقین، سوز اور تاباں وغیرہ کے کلام میں بھی اس دور کی سیاست جھلکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا سوز و غم، غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کا مرہونِ منت ہے۔ سودا نے تو اپنے استاد شاہ حاتم کی طرح زمانہ اور ابنائے زمانہ کی شکایت اور ہجو طرح طرح سے قصیدوں اور مثنویوں میں لکھی ہے چناں چہ تضحیک روزگار ان کا خاص موضوع بن گیا تھا۔ اردو شاعروں کا یہ رنگ اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ لکھنو شعر و سخن کے ساتھ امن و امان اور عیش و فراغ بالی کا مرکز نہ بن گیا۔ لکھنو میں پھر دکن کی طرح طویل نظمیں (مثنویاں اور قصیدے) لکھے گئے اور جب تک لکھنو سیاسی حیثیت سے مستقر رہا اور شاد کام رہا شاعری کی یہ خصوصیت بھی باقی رہی اور انشا، رنگین اور مصحفی، ناسخ اور آتش، اور انیس و دبیر جیسے بلند مرتبہ شاعر نمودار ہو سکے۔

اس اثنا میں دلی نے بھی آخری بار سنبھالا لیا تھا۔ شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے دور میں وہاں بھی اچھے اچھے شاعر اٹھے۔ شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن اسی دور کی یادگار ہیں۔ چوں کہ اس وقت بادشاہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور کمپنی کی وجہ سے سیاسی لڑائی جھگڑوں سے اہل دہلی کو نجات مل گئی اس لیے دلی والے شعر و سخن اور ادب و انشا کی طرف اطمینان سے متوجہ ہو سکے مگر اس دور کا ادب بھی ایک سیاسی گھٹن کا آئینہ دار ہے۔ لال قلعہ سے لے کر دلی کے گلی کوچوں تک انگریزوں کے آگے مجبوری اور سیاسی بے چارگی کا احساس عام تھا۔ مومن نے جہاد کی مثنویاں، ظفر نے سوز و گداز سے بھری ہوئی غزلیں اور غالب نے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

جیسے شعر اسی سیاسی فضا میں لکھے تھے۔ یہی رنگ اس دور کے دکنی شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ چناں چہ فیض نے لکھا تھا۔

ہے دشمن دکن وہ کلاہ پوش جس نے فیض غارت کیا ہے کشورِ ہندوستاں کو

سن ۱۸۵۷ء کی جد و جہد آزادی نے اردو کے شاعروں اور ادیبوں میں آزادئ خیال اور شدتِ احساس کی رَو دوڑا دی — الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کی نظمیں اسی سیاسی بیداری کا نتیجہ ہیں۔ حالی کا مسدس نہ صرف اسی سیاست کا نتیجہ ہے بلکہ اس نے ہندوستانی سیاست کا رخ موڑنے میں بھی بڑا حصہ لیا۔ اسی نظم نے اقبال کی مفکرانہ شاعری کو جنم دیا اور کار اردو کے ادیب اور شاعر اسی ڈگر پر چل پڑے جو ابو الکلام آزاد کی نثر اور جوش ملیح آبادی کی نظم میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اہل ہند کی سیاسی بے چینی اور آزادئ خیال کی جس خوبی سے نمایندگی کی ہے اس کی نظیر کم زبانوں کی تاریخ میں ملے گی۔ آزادئ ہند میں اردو کا حصہ ایسا موضوع ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور ایک دو لکھی بھی گئی ہیں اور چھپ بھی چکی ہیں۔ اردو زبان نے ہندوستانیوں کے قلب و دماغ کے بنانے اور سنوارنے میں

ں ملک کی کسی اور زبان سے زیادہ ہی حصّہ لیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بعد پریم چند نے اردو نثر اور خاص کر ناولوں اور افسانوں
ذریعہ سے اس نئی ہندوستانی قوم کی تمناؤں اور جاں کاہیوں کی ترجمانی کی جو ملک کی خوش حالی اور آزادی کے لیے گذشتہ
ف صدی سے کوشش کرتی رہی ہے۔

اس سلسلہ میں اردو کی ترقی پسند تحریک کا تذکرہ خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ یہ تحریک دراصل جدید سیاسی نظریوں اور زندگی
ئی قدروں کے سہارے وں اٹھی اور تقریباً ۲۰ سال تک اردو ادب کے ہر شعبہ پر چھائی رہی۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو
اجی مجاز، فیض، جذبی اور مخدوم کی نظم و نثر کا چرچا پوری اردو دنیا میں گھر گھر پہنچ گیا اور ہر نوجوان ادیب و شاعر انھیں کے رنگ میں
ڈھلنے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ سیاسی رجحانات سے اتنا زیادہ متاثر کبھی نہ ہونے پائی تھی اور نہ کسی دور کے
ب و شاعر ملک کی زبان اور شاعری پر اتنی قوت سے کبھی چھا سکے تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس دیس کی تمام خوابیدہ خصوصیتیں جاگ پڑیں اور وہ سیاسی گھٹن دور ہو گئی جس کے باعث
ی پسند تحریک کو ابھرنے اور سنورنے کے مواقع ملے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک نے آزادئ خیال اور تازگئ بیان کے جو چشمے بہائے ہیں ان سے پوری اردو دنیا سیراب
ئی ہے۔ بڑے سے بڑے رجعت پسند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور غیر ارادی طور پر وہ انداز فکر اور طرز بیان اختیار
چکے ہیں۔ جس کی طرف ترقی پسند تحریک ان کو لانا چاہتی تھی۔ اردو ادب اور شاعری دونوں اب افراط و تفریط کی ایک ایسی فضا
ں سانس لے رہے ہیں جو دونوں زائیدہ آزاد مملکتوں میں انھیں نصیب ہو سکی ہے۔ یہ دونوں ممالک جن میں اردو کے ادیب
ر شاعر بستے ہیں نظریات اور ضروریات کے ایک ایسے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں جس سے رہائی دلانے میں شاید اردو کے ادیبوں
پھر اسی طرح جدوجہد کرنی پڑے گی جیسی کہ انھوں نے انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد کرانے لیے کی تھی۔ (ماہنامہ نیا دور لکھنو)

سید رفیع الدین قادری

ڈاکٹر زور لندن میں خطوط کی روشنی میں

مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ خطوط ڈاکٹر زور صاحب نے حیدرآباد سے روانگی کے بعد ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک کے قیام یورپ کے دوران لکھے۔ یہ خطوط ان کے بہت ہی عزیز دوست نواب عبدالرحمان شریف صاحب کے نام ہیں۔ جن کی تعداد (۴۶) ہے، جن سے ڈاکٹر صاحب کو کمال بے تکلفی اور محبت و یگانت تھی۔ اسی خلوص کا ایک مکتوب میں یوں اظہار ہوا ہے "آپ میرے اکیلے بے غرض اور پرخلوص دوست ہیں اور یہ کہ میں ہمیشہ آپ کے مشوروں کو وقعت کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں"

حقیقت یہ ہے کہ موصوف ڈاکٹر صاحب کے ان خاص رفیقوں میں سے ہیں جو تمام زندگی نہ صرف آپ کے مفید مشوروں سے نوازتے رہے بلکہ عملی طور پر ہر کام میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ آپ حیدرآبادی تہذیب کا نمونہ ہی نہیں منکسر المزاج طبیعت کے مالک بھی ہیں۔ جب بھی ملاقات ہو بزرگانہ خلوص اور شفقت کے ساتھ ملتے ہیں۔ دھیمی رفتار، دھیمی گفتار۔ ہر بات پر غور کرنا۔ اور کسی بات پر صحیح مشورہ دینا عبدالرحمان شریف صاحب کے اوصاف حمیدہ کا وصف ہے۔ آپ ایک اچھے آرٹسٹ بھی ہیں۔ ایوان اردو میں آویزاں شعرا کی قلمی تصویریں ڈاکٹر صاحب کی فرمائش پر آپ ہی نے بنائی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ان خطوط سے اُن کے زمانہ طالب علمی کے مختلف پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے۔ آپ کی شخصیت کی ذہنی نشو نما جس ماحول میں ہوئی اور نہ صرف ان کے افکارات، ارشادات اور مشاہدات ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ ایک طالب علم کی جستجو۔ اس کی لگن، اس کی محنت اس کے مستقبل کے تعلق سے خیالات کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔ یہ خطوط ایک ادیب کی نجی اور علمی زندگی کی رنگارنگ تصویریں ہیں، باتیں ہیں دکھ درد کی کار دبار شوق کی، اور سفر و حضر کی۔ وہ بے تکلف باتیں کرتے تھے اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ جو صاف گوئی، سادگی۔ بے باکی اور دل آویزی ان کی شخصیت میں تھی وہ ان خطوط میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر زور ۲۵ اگسٹ ۱۹۲۷ء کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔

قیام بمبئی کے دوران آپ نے اپنی نامکمل کتاب "سلطان غزنوی کی بزم ادب" کی تکمیل کی اور اشاعت کے لیے حیدرآباد روانہ کیا۔ آپ بمبئی سے ۳۱ اگست ۱۹۲۷ء کو اطالوی جہاز "کوکونڈا" سے روانہ ہوئے اور اپنے "سفرنامۂ یوروپ" جو غیر مطبوعہ ہے میں یوں رقم طراز ہیں "جہاز میں سوار ہونے اور احباب سے الوداعی ملاقات کرنے کا منظر اس قدر تکلیف دہ تو نہیں تھا جیسا حیدرآباد کے اسٹیشن پر تھا، تاہم اگر میں ضبط سے کام نہ لیتا تو غالباً اپنے وطن کو چھوڑتے وقت میری آنکھوں سے ضرور آنسو نکل پڑتے۔"

جہاز پر جن خاص شخصیتوں سے ملاقات ہوئی ان کا ذکر یوں کرتے ہیں "پنڈت موتی لال نہرو سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ میں فی الحال ہندوستان کے رہنماؤں کا معتقد نہیں ہوں، اس کے اسباب گوناگوں ہیں۔ اس وقت میری جرأت کے لیے سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ میں ایک طالب علم ہوں اور وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہے کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ ابھی سے کسی خاص فرقہ یا کسی خاص رہنما کا معتقد ہو جانا فرائض طالب علمی پر ظلم کرنا ہے۔ پنڈت جی کی زیارت کا مجھے کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے اس وقت تک جس قدر اخباروں کا مطالعہ کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہندوستان کے ان قائدوں میں سے نہیں ہیں جن کی فطرت کی جانب سے ایک ہی آنکھ ملی ہے۔ پنڈت جی کی زیارت کے بعد میں اپنے قائم کردہ اندازہ میں کوئی بڑا تغیر و تبدیل نہیں کر سکا یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ جہاز میں ہمیشہ مسلمانوں کے لباس میں بسر کرتے ہیں۔ ان کی سفید حیدرآبادی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا وہ لکھنو، دہلی یا حیدرآباد کے کسی امیر خاندان کے ایک سن رسیدہ فرد ہیں۔ ان کے طرز برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھی طبیعت کے انسان ہیں اپنے ملک کے نوجوان افراد کے ساتھ ان کا اسلوب گفتگو نہایت خوش آیند ہے، خدا کرے کہ پنڈت جی اپنی پبلک لائف کو جاری رکھیں اور ان کے ذریعہ ملک کو حقیقی فائدہ پہنچ سکے۔

پنڈت جی کے بعد دوسری قابلِ ذکر شخصیت مسز سروجنی نائیڈو کے چھوٹے بھائی ہرنیدر ناتھ چٹوپادھیا کی ہے۔ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ ہیں۔ ان سے ملاقات کے بعد اس کا صحیح احساس ہو سکا کہ کوئی شخص فنونِ لطیفہ میں محو ہو سکتا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ اب تک انگریزی میں شعر کہتے ہیں جس کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں اب ہندی میں بھی شعر کہنا شروع کیا ہے یہ ایک مبارک تبدیلی ہے۔ انھوں نے کیمبرج میں بھی ایک مدت تک ولیم بلیک کی شاعری پر تحقیقی کام کیا ہے۔ مختصراً تبادلۂ خیال کے بعد معلوم ہوا کہ انھیں انگریزی ادب پر کافی عبور حاصل ہے۔

فنِ موسیقی پر بھی خاص مہارت حاصل ہے۔ اپنے متعدد انگریزی اور اردو گانوں سے ہم لوگوں کو بے حد مسحور کیا۔"

آپ کا جہاز ۱۵ستمبر کو وینس کی بندرگاہ پر پہنچا۔ ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کے ایک خط میں موسم سرما کی پہلی برفباری پر یوں اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ "لندن کی آب وہوا بڑی خراب ہے، میں اس سے بیزار آگیا ہوں گذشتہ دو ہفتوں میں خاصی برف گری۔ یہ چیز میرے لیے بالکل نئی اور ساتھ ہی پرلطف بھی خصوصاً علی الصباح مطلع ابرآلود ہو کر برف سے ڈھکے مکان، درخت اور سڑکیں بقعۂ نور نظر آتی ہیں۔"

ایک اور خط میں یوں لکھتے ہیں "نواب صاحب! ہندوستان سے یہاں آنے کے بعد اس وقت تک جو جو خیالات پیدا ہوئے اور جو جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا اظہار کرنا چاہوں تو ایک کتاب بن جائے گی۔ بعض بعض دفعہ تو جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں میں آجاؤں اور اپنے دل کے وہ تمام ارمان نکال لوں جو حیدرآباد اور اپنے دوستوں کی بہبودی کے متعلق دل میں اکثر دکھاتے ہیں۔"

قیام لندن نے آپ کے افکار اور خیالات میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔ ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:۔
"مجھی میں یہاں وہ آدمی نہیں رہا ہوں جو کبھی تھا۔ میرا لباس بدل گیا، میری صورت بدل گئی، میرا کھانا بدل گیا، میرا طریقۂ بود و باش بدل گیا۔ یہاں تک کہ میری زبان بدل گئی، کیسے پھر میرے خیالات بھی نہ تبدیل ہوئے ہوں"
۱۵ نومبر ۲۸ء کو لکھتے ہیں "جہاں تک میری علمی زندگی کا تعلق ہے میرا قیام یوروپ زیادہ بہتر ہے یوروپ انسان کو زیادہ عقلی بنا دیتا ہے۔ اس کی ہر چیز کاروباری نقطۂ نظر سے سرزد ہوتی ہے خصوصاً پیرس کے دو مہینے کے قیام نے میرے خیالات کی رو کو ایک ایسی طرف پلٹا دیا جس کا رخ شاید ہی تبدیل ہو سکے کاش میرے سارے دن وہیں بسر ہوتے۔"

آپ اپنے وطن سے دور ہوتے ہوئے بھی یہاں کی (علمی و ادبی) سرگرمیوں سے آگاہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں یوں لکھتے ہیں "سروری صاحب کو لکھا تھا "سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب" میں نے جن لوگوں کے نام بھیجے تھے انھیں تقسیم کی جائے" معلوم ہوا کہ نہیں تقسیم کی گئی۔
مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکیم شمس اللہ قادری نے میرے نام دعویٰ کیا ہے کہ میں نے محمود غزنوی کی بزم ادب ان کی کتاب سے نقل کر کے چھپائی ہے اس لیے ہرجانہ انھیں دیا جائے۔ مجھے سروری صاحب اور آپ سے اس کی امید تھی کہ جلد از جلد اس خبر کو میرے یہاں روانہ کرتے اور سروری صاحب سے تو یہ امید تھی کہ اس خبر کے معلوم ہونے کے بعد "رہبر" یا "مکتبہ" میں ایک مضمون شایع کرتے اور یہ دکھاتے کہ سلطان محمود غزنوی اور شمس اللہ کی کتاب میں کہاں تک فرق ہے اگر شمس اللہ قادری کو یہ خیال ہے بھی تو کہاں تک صحیح ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ شمس اللہ قادری نے ایسا کیا۔"

ڈاکٹر زور صاحب وطن سے دور ہوتے ہوئے بھی یہاں کے امور سے واقف رہا کرتے تھے۔ اکثر خطوط میں آپ اپنے دوست احباب کی خیریت دریافت کرتے، ایک خط میں یوں حال پوچھا جا رہا ہے۔ "ردمت

احباب کی خیریت کے تعلق سے لکھیے۔ نیز یہ کہ طاعون نے ہمارے جاننے والوں میں کس کس کو نقصان پہنچایا۔ ناصر الدین احمد کے کیا مشاغل ہیں ذرا تفصیلی حالات لکھیے۔ "مکتبہ" والوں نے خود تو پنجاب سے روپیے وصول کرلیے اور ہمارے (۸۰) نسخوں کی قیمت ادا کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں۔ "روح تنقید" کی قیمت منظور کرلی بغیر میری رضامندی کے کتابوں کی طباعت میں بھی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ میں نے مکتبہ (مکتبۂ ابراہیمیہ) والوں کو کئی خطوط لکھے لیکن ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔ وہاں کے علمی ادبی اور معاشرتی حالات سے آگاہ کرتے رہیے۔"

حیدرآباد کی جن شخصیتوں کا ذکر آیا اس کا ذکر ۱۱ر اپریل ۱۹۲۸ء کے ایک خط میں یوں کرتے ہیں۔ "آئندہ ہفتہ میں نے ضیاء الدین انصاری صاحب انجینیرنگ کالج کے پرنسپل کو دعوت دی ہے۔ وہ مینچسٹر سے آئیں گے یہاں وہی ایک ہیں جن سے مل کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا ہوں۔ ایک اور دوست کے تعلق سے یوں گویا ہیں۔ "یہاں حیدرآباد کے ایک دوست جو ہمارے ساتھ آئے تھے ڈاکٹر جبار ڈگری لے کر واپس گئے ہیں۔ میں نے ان سے سروری صاحب کا تذکرہ کیا ہے۔ آدمی بہت سمجھ دار اور خوش مزاج ہیں۔

۱۵ر اپریل ۱۹۲۸ء کے ایک مراسلہ میں ایک ادبی شخصیت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:۔

"نصیر الدین ہاشمی جوار دو کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اکثر میرے ساتھ رہتے ہیں میں ان سے بھی کام لیا کرتا ہوں۔ بیجاپور کے ایک قدیم شاعر "نصرتی" کے قصیدے نقل کرا رہا ہوں۔ میں نے خود نصرتی پر بڑا کام کیا ہے عمر یافعی صاحب اور ان صاحب میں سخت مخالفت ہے میں کوشش کر رہا ہوں کہ دونوں میں صفائی ہوجائے۔"

۲۳ر جنوری ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں۔ "یہاں سے ایک اور صاحب طاہر علی خاں مسلم (نظام کالج) اس سال کے آخر میں حیدرآباد جا رہے ہیں سنا ہے کہ انھوں نے جرمنی، اٹلی وغیرہ سے صوتیات میں ڈپلوما لیا ہے، دیکھیے کیا جگہ ملتی ہے۔ میرا بھی خیال ہے کہ صوتیات میں ڈپلوما لے لوں کیوں کہ لندن میں میں نے دو سال اس پر کام کیا ہے۔"

۸ر مئی ۱۹۳۰ء کے خط میں یوں لکھتے ہیں "یہاں سے ایک صاحب یوسف حسین خاں نامی ڈاکٹریٹ لے کر حیدرآباد گئے ہیں ان کا مضمون ہندوستان میں تصوف ہے۔ ان کا خط آیا ہے کہ عبدالحق صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور انھوں نے ایک فرانسیسی لسانیات داں واندیر کی کتاب "زبان" کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ہے یوسف صاحب کو میں نے کہا تھا کہ اس کتاب کا میں ترجمہ کرنے والا ہوں مگر انھوں نے عبدالحق کے کہنے پر شروع کردیا۔"

کتابوں اور علمی و ادبی استفسارات کے بارے میں ڈاکٹر زور نے اپنے رفیق دیرینہ جناب عبدالرحمان شریف کو منذکرہ ذیل خطوط میں توجہ دلاتے ہوئے معاونت کی خواہش کی ہے چند اقتباسات یہ ہیں:۔

ایک خط میں یوں تذکرہ کرتے ہیں "میں نے ایک کتاب تذکرۂ مصحفی کو برٹش میوزیم سے نقل کرلیا ہے اور اس پر حاشیے چڑھائے ہیں۔ اس کے علاوہ مصحفی پر ایک خاص کتاب لکھ رہا ہوں جو اردو میں نہایت کام کی

چیز ہوگی، تین حصوں میں اس کو شائع کرانے کا ارادہ ہے۔ ۱۔ سوانح مصحفی۔ ۲۔ تذکرہ مصحفی۔ ۳۔ کلام مصحفی اس کے متعلق میں نے مکتبہ والوں کو لکھا ہے انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا میرا خیال ہے اس کو اپنے خرچ سے شائع کروں جن کی لکھائی، چھپائی کا انتظام مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ خود بلدہ آنے تک ٹھہروں، لیکن جلدی اشاعت کی اس لیے خواہش ہے کہ ایک نسخہ ہندوستان میں صرف ایک جگہ "دارالمصنفین اعظم گڑھ" میں موجود ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لوگ اس کو چھپوا نہ دیں اور میری محنت بیکار نہ جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستان آنے کے بعد تو بہت سی چیزیں چھپانے کی اپنے ساتھ لاؤں گا۔ آخر اس سال بھی تو کوئی چیز چھپے،

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "تذکرہ مصحفی" نہایت اہم چیز ہے لیکن میری غیر موجودگی میں آپ حضرات سے اس کی کما حقہٗ طباعت اور اشاعت بہت دشوار ہے۔ اگر مکتبہ اس کام کو اپنے سر لیتا تو بہتر ہوتا میں نے اس بارے میں ہندوستان کے دوسرے پبلیشروں سے مجبوراً خط و کتابت شروع کردی ہے۔"

۱۰ر اپریل ۲۹ء کے مکتوب میں یوں لکھتے ہیں "میں چاہتا ہوں کہ قدیم دکھنی مصنفوں کی جو قلمی کتابیں ہیں ان کے اچھے اچھے حصّے منتخب کرکے چھپاؤں "دکھنی شہ پارے" یا "اردو شہ پارے" کے نام سے جرمنی میں چھپانے کا ارادہ ہے۔ (۱۵۰) پونڈ اخراجات ہوں گے۔ اس میں بعض شاعروں کی جو یہاں تصویریں دستیاب ہوئی ہیں انھیں بھی چھپاؤں گا۔ جرمنی کی ٹائپ میں اچھے کاغذ پر خوب صورت مجلد کتاب کے ایک ہزار نسخے چھپانے کا ارادہ ہے۔ مگر پہلے اخراجات کا مسئلہ (۲۲۵۰) روپے ہوجائیں گے پھر دیکھنا یہ ہے کہ کتاب فروخت ہوگی کہ نہیں میرا خیال ہے میں ہندوستان میں رہوں تو اشتہاروں وغیرہ کا ایسا انتظام کروں گا کہ ضرور فروخت ہوجائے گی۔ بڑی دل چسپ چیز ہوگی۔ بہت سی کتابیں ہیں اور ان کو کوئی نہیں جانتا میں ان سب کے انتخابات بہترین طور پر کروں گا۔ فی الحال صرف دکھنی ہی کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ غلام رسول صاحب سے پوچھ کر لکھ سکتے ہیں کہ کیا مکتبہ اپنے اخراجات سے جرمنی میں ایسی کتاب چھپانے کے لیے تیار ہے پروف وغیرہ میں خود دیکھ لوں گا کیوں کہ میں جرمنی میں دو مہینے مسلسل آئندہ چھٹیوں میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر مکتبہ تیار نہ ہو تو میں کوئی اور شکل اختیار کروں گا میں نے فرانس ہالینڈ اور انگریز پبلیشروں کے تخمینے منگائے ہیں۔ دو مہینے کے اندر کتاب چھاپنے کا وعدہ کیا ہے غرض ہر چیز تیار ہے۔

۱۵ر اگست ۳۰ء کے خط میں یوں فرماتے ہیں " اس عرصہ میں بندہ نے ایک کتاب "ہندوستانی فونیٹکس" پر ختم کرلی پروفیسر حضرات اس پر نظر ثانی کر رہے ہیں ان میں سے کسی کا مقدمہ بھی ساتھ ہوگا۔ پیرس ۲۰ر اگست تک واپس ہوں گا اور اس کے بعد کتاب کو چھپالوں گا۔"

۱۸ر اپریل کے خط میں اپنی مسرت کا یوں اظہار کرتے ہیں " میری کتاب "اردو صوتیات" کی طباعت شروع ہوگئی ہے انشا اللہ نومبر میں ختم ہوجائے گی اور ڈسمبر میں بندہ روانہ وطن ہوجائے گا۔ آپ اس بات کا لحاظ رکھیے کہ میرا نام بجائے زورؔ کے قادری مشہور ہوجائے مجھے زورؔ بہت خراب لفظ معلوم ہوتا ہے۔"

ایک مکتوب میں درج ہے کہ "نصیر الدین ہاشمی صاحب کا خط آیا لکھتے ہیں کہ آپ کی کتاب شایع نہیں ہوگی اور شمس اللہ قادری اپنی کتاب "اردوئے قدیم" کا دوسرا ایڈیشن تیار کر چکے اور آج کل میں شایع ہوجائے گی۔ انہوں نے ذریعہ بھی بتایا کہ کسی نے میری کتاب کا مواد ان تک پہنچایا۔ آپ سید محمد صاحب سے اس کا ذکر کیجیے اور مولوی صاحب سے ضرور ملیے کیوں کہ مجھے عنایت جنگ سے بھی معلوم ہوا۔"

اپنے دوست کو یوں دعوتِ عمل دیتے ہیں "آپ گھر کے کاموں سے باہر نکلیے اور دنیا کے کام کاج میں عملی حصہ لینا شروع کر دیجئے میرے واپس ہونے تک آپ کو پورا عملی آدمی اور مکتبہ میں خاصا دخیل ہوجانا چاہیے کیوں کہ ہمیں عملی کام شروع کرنا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جن جن مقامات کا سفر کیا ان میں سب سے زیادہ مقام جو انھیں پسند آیا وہ پیرس ہے اس کی تعریف ۲۶؍ دسمبر ۱۹۲۹ء کے خط میں یوں کرتے ہیں "یہاں طرح طرح کے انسانوں سے ملاقات ہوتی ہے، لندن میں یہ موقع نصیب نہیں جو کوئی یوروپ آتا ہے۔ پیرس ضرور آتا ہے اور اسی طرح یہ شہر ہر وقت نئے نئے لوگوں کا مرکز بنا رہتا ہے جہاں کی دلچسپیاں شاید ہی دنیا میں کہیں اور نصیب ہوں۔ کاش آپ بھی ساتھ ہوتے نواب صاحب! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اکیلے ہی مزے لیتے ہیں۔"

پیرس نے ڈاکٹر صاحب کی عملی زندگی کی بنیادوں کو استحکام بخشا اور زندگی کے نئے نئے تجربات عطا کیے چنانچہ ۱۳؍ فروری ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "نواب صاحب! فرانس خاص طور پر پیرس انسان کو زندگی اور اس کے متفرق شعبوں پر اپنی مرضی کے مطابق نظریں ڈالنا اور نقطۂ نظر قایم کرنا سکھاتا ہے۔ میں واقعی بدبخت ہوتا اگر یہاں نہ آتا، ممکن ہے یہاں کا قیام میری زندگی کا بہترین زمانہ ثابت ہو۔"

ایک اور مکتوب مرقومہ ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں لکھتے ہیں "پیرس کی دلچسپیاں اور لطف بیان نہیں کی جا سکتیں اس شہر سے مجھے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ حیدرآباد کے بعد میں اسی کو اپنا وطن بنانے تیار ہوں، دنیا میں یہ ایک شہر ہے جہاں آدمی خود کو ATHOME محسوس کرتا ہے۔ غریب سے غریب اور امیر سے امیر دونوں یہاں آرام سے رہ سکتے ہیں۔ اس کی گلی گلی رومانی فضا سے معمور ہے اور اس کا ذرہ ذرہ محبت اور لطافت سے خالی نہیں۔"

آگے لکھتے ہیں "آپ نہیں جانتے میں کس مجبوری کے ساتھ پیرس چھوڑ رہا ہوں میرا بس چلتا تو تمام عمر یہاں کے گلی کوچوں میں گزار دیتا۔"

۱۵؍ اگست ۱۹۳۰ء کے خط میں سوئزرلینڈ کی یوں تعریف کرتے ہیں "سوئزرلینڈ واقعی بہشت ہے میری صحت اچھی ہو رہی ہے اور زندگی کا بہترین زمانہ گزر رہا ہے۔ بلند برف سے بھرے پہاڑ میلوں تک نظر آتے ہیں۔ سرسبز وادیاں اور پانی کے آبشار واقعی خدا کی قدرت نظر آتی ہے ایسے مناظر سے انسان اسی وقت لطف اٹھا سکتا ہے جب کہ اس کے ساتھ اچھے دوست موجود ہوں نہ تنہائی کا غم اچھا نہ تنہائی کی خوشی اچھی۔"

ایک خط میں یوں پرانی یادوں کو تازہ کیا جا رہا ہے "جب مجھے آپ کے ساتھ ہائی کورٹ کے سامنے یا موسیٰ ندی

کے کنارے گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں اُس کا لطف عمر بھر یاد رہے گا اور امید نہیں کہ ایسے دن پھر آ سکیں وہ دن نہیں رہے۔ وہ طبیعت نہیں رہی، میرے واپس آنے کے بعد فضا ہی دوسری ہوگی۔ ایک ذمہ داری کی زندگی رہے گی مقابل کی چوٹیں ہوں گی اور اس کے لیے سخت سے سخت محنتیں کرنی پڑیں گی ـــــ وہ چاندنی راتیں یاد آتی ہیں جب موسیٰ ندی کے کنارے تصنیف و تالیف کی نسبت بحث ہوتی تھی۔ وہ باتیں یاد آتی ہیں جب حسین ساگر کے کنٹے پر مٹھائی کھاتے بیٹھے تھے تو میں نہیں کہہ سکتا اے میرے عزیز کرم فرما میں کیا محسوس کرنے لگتا ہوں، ہائے اس وقت غالب یاد آرہا ہے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۔ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ۔ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ایک خط میں اپنے بھائی جلال الدین حسین (عرف قادر پاشاہ) کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے یوں فرماتے ہیں "قادر پاشاہ کو سٹی کالج کی بورڈنگ میں شریک کرائیے اور اخلاق و عادات پر خفیہ طور پر نگرانی رکھیے۔ میں بے حد ممنون ہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہفتہ میں دو تین دن ضرور اس لڑکے کو اپنے پاس بلا کر ساتھ چائے وغیرہ پلائیے اور مختلف امور پر گفتگو کیجئے تاکہ لڑکے میں سمجھ پیدا ہو کلچر کی سخت ضرورت ہے اور یہ اچھے لوگوں کی صحبت میں پیدا ہوتی ہے۔"

۲۵ / اکتوبر ۳۰ء کے ایک خط میں یوں دلی جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے: "آپ خوش قسمت ہیں کہ اپنے چہیتے اور چاہنے والوں میں قناعت، اطمینان، آرام اور بے فکری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بے مقصد زندگی انسان کی روح کو ملیا میٹ کر دیتی ہے کیا اس سے بڑھ کر بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ ایک شخص اپنی چاہنے والی ماں اور آپ کے جیسے پُر خلوص اور کم یاب دوست کو چھوڑنے پر بلا کسی بڑے نفع کے لیے مجبور ہو رہا ہے۔"

۱۲ / مارچ ۳۰ء کو لکھتے ہیں "میں نے کسی کو نہیں لکھا آپ کو لکھتا ہوں کہ میں چار ہفتوں سے انفلوئنزا میں مبتلا ہوں۔ یعنی پیرس آیا اور دوسرے روز بیمار پڑا۔ پرسوں تک کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اب ایک ہفتہ سے بخار نہیں آیا مگر کمزوری اس کی ہے کہ سیڑھیاں اترتے ہوئے راستہ میں کئی جگہ ٹھہرنا پڑتا ہے دو ہفتہ مسلسل بے شدھ رہے۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ کسی گرم ملک میں تبدیل ہو جاؤں۔ چار ہفتہ گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا آپ کو میں نے بیماری کا ذکر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ کسی سے نہ کہیں ورنہ والدین بے حد پریشان ہو جائیں گے۔"

جہاں آپ کے خطوط علمی ادبی تذکروں اور تعلیمی مصروفیتوں سے معمور ہیں وہیں آپ اپنے قیمتی مشوروں سے یوں نوازتے ہیں "آپ ڈرائنگ میں مشق کیجئے اور انسانی شکلیں اتارنے کی مشق کیجئے آئندہ آپ بہت بڑے آدمی بن سکیں گے۔ آپ ڈرائنگ چھوڑ کر انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، یاد رکھیے انٹرمیڈیٹ آپ کو صرف (۹۰) روپے کا گریڈ دلا دے گی لیکن اگر آپ اپنے فن میں مہارت پیدا کر لیں گے

تو ماہانہ ۵۰۰ روپے سے کم نہیں کمائیں گے۔ شہرت عزت احترام علاحدہ ہے۔"
اسی طرح ڈاکٹر زور نے اب سے ۵۰ سال پہلے اپنے دوستوں کو خود روزگار اسکیموں سے منسلک ہونے کی افادیت ظاہر کردی آج حکومت اس کی طرف توجہ کر رہی ہے اور خود روزگار اسکیم چلا رہی ہے۔
مکتبہ ابراہیمیہ کے کاروبار کے تعلق سے یوں مشورہ دیتے ہیں:۔ "مجھے افسوس ہے کہ مکتبہ کے کاروبار حسن وخوبی سے نہیں چل رہے ہیں۔ یہاں "رہبر" اور "مشیر" دونوں آتے ہیں کسی میں بھی وہ لوگ اشتہار نہیں دیتے۔ حالاں کہ یہ تجارت کا ایک معمولی گر ہے۔ ہمارے یہاں تاجر ابھی دوسو سال پیچھے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مکتبہ کے متعلق یہاں کی تجارتی دنیا سے فائدہ اٹھا کر کچھ معلومات اور اشارے وقت بہ وقت دیتا جاؤں لیکن اس کے کارکن اس قدر سست اور قدر ناشناس ہیں کہ میرے خطوط کا برابر جواب تک بھی تو نہیں دیتے حالاں کہ یہ بزنس میں بہت بڑا عیب ہے۔"
۶ر ڈسمبر کے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں "میں آج کل بے حد مشغول ہوں پی۔ ایچ۔ ڈی کے تھیسس کے علاوہ جرمنی کے درس بھی لے رہا ہوں۔ سنسکرت اور لسانیات کے لیے بھی خاص تیاری کرکے کلاس میں جانا پڑتا ہے کاش میری زندگی کبھی تو چین سے بسر ہوتی آپ کو معلوم ہے کہ مڈل کے زمانے سے لے کر اب تک مسلسل مصروف ہوں۔ ایم اے کے بعد سے یوروپ کا زمانہ کچھ آرام کا ملا لیکن اس وقت بھی آنے کی تیاریوں اور ایک دو کتابوں کی طباعت میں مصروف ہوں۔"
۲۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کے ایک مراسلہ میں یوں گویا ہیں "یہ زمانہ میرے لیے بڑی مشغولیت کا ہے ارادہ ہے کہ جون میں اپنے کام پیش کردوں لیکن ابھی ختم کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے آپ جانتے ہیں میں اپنے ضمنی کئی کام کرتے رہتا ہوں۔ ہندوستان میں جب تک رہا B.A اور M.A کے امتحانوں کے درمیان مضمون نگاری کرتا رہا۔ یہاں سنسکرت اور فیلا لوجی کی جماعتوں میں شرکت کے علاوہ بہت سے قیمتی قلمی کتابوں کی نقل کرنا اور ان پر نوٹ لینا جاری رہا۔ اگر اس سال (PHD) کی ڈگری مل جائے تو ارادہ ہے کہ اور دو سال رہ کر DLT یا اور کوئی ڈگری کے لیے کام کروں۔"
۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "کرم نامہ" ۲۰ر فروری کا ہے اور خبر دیتا ہے کہ اس وقت تک میری کتاب کرم فرماؤں کی خدمت میں نہیں پہنچ سکی، گویا میری روانگی سے چار مہینے بعد تک بھی وہ کام نہ ہوسکا جس کو میں اور چار دن کے قیام میں کردیتا،
آپ حضرات کی پریشانیاں موجب سوہان روح ہیں خدا ہم سب کو اپنے سایۂ عاطفت میں خوش اور کامیاب رکھے۔ حیدرآباد کی حالتیں ناگفتہ بہہ ہیں۔ نہ معلوم وہ کونسی گھڑی آئے گی جب ہم ترقی یافتہ ممالک کی طرح اس کو بھی ایک پرامن اور قابل رہائش مقام پاسکیں۔ یہاں اس کے مستقبل کے متعلق بڑی بحثیں ہوا

کرتی ہیں ۔ بعض دفعہ تو جی چاہتا ہے کہ فوراً آپ لوگوں میں آجاؤں اور اپنے دل کے وہ تمام ارمان نکالوں جو حیدرآباد اور اپنے دوستوں کی بہبودی کے متعلق دل میں اکثر جوش دکھاتے رہتے ہیں ـــــــ عبدالرحمٰن شریف صاحب آپ نہیں جانتے کہ جب کبھی مجھے وہاں کی یاد آتی ہے تو میری کیا حالت ہوتی ہے۔"

تمام زندگی جس عمارت کی تعمیر میں گزری اس کی بنیادیں قیام یوروپ میں ڈال لی تھیں ۔ اسی خاکِ دکن سے طلوع ہونے والا تابندہ ستارہ تمام زندگی قلب و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر اپنے وطن، اپنی زبان اور اپنی قوم کی خدمت میں صرف کرتا رہا اور گنجینۂ علم و ادب کو مالا مال کر گیا محض اپنی ان تھک محنت لگن، جستجو اور جنوں کی حد تک خدمتِ زبان نے ڈاکٹر زور کے کارناموں کو لافانی بنا دیا۔

ڈاکٹر زور واپسی کا ۱۸ ڈسمبر ۱۹۳۰ء کے خط میں یوں ذکر کرتے ہیں، "۲۱ ڈسمبر کو یہاں سے جنیوا کے لیے روانہ ہو جاؤں گا وہاں سے روم جاؤں گا ۔ روم کے نیپلس نیپلس سے گیارہ جنوری کو جہاز ۵۰ میں سوار ہو کر انشاء اللہ ۲۴ کو کولمبو پہونچوں گا۔ کولمبو سے مدراس اور پھر سیدھا حیدرآباد" اس طرح آپ کا علمی سفر ختم ہوتا ہے۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے، ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ——— (ادارہ)

نام کتاب:- REVERSE DICTIONARY OF URDU (اردو مردف لغت)

مصنف: ڈاکٹر [illegible] بیکر، ناشر منوہر پبلیشنز، انصاری روڈ، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲۔ صفحات ۲۳۲۔ قیمت ۱۵۰ روپے

اردو لغت نویسی کی ابتدائی تاریخ اگرچہ کافی پرانی ہے مگر باقاعدہ لغت نویسی کا آغاز دیگر لسانیاتی موضوعات ہی کی طرح اردو کے مغربی لغت نویسوں کی کوششوں کی صورت میں ہوا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے اوائل سے انیسویں صدی کے اواخر تک اس سمت میں زیادہ پیش رفت ہوئی۔ جان گلکرسٹ، شیکسپیر، ڈنکن فاربس فیلن اور ٹی۔ ایس پلیٹس جیسے متعدد مستشرقین نے بڑی عرق ریزی اور مسلسل کوششوں سے اپنی یک لسانی یا ذولسانی لغات کے ذریعے اردو لغت نویسی کو اس وقت کی مغربی لغت نویسی کی بنیاد پر اصول و ضوابط سے آشنا کیا۔ مستشرقین کی اردو لغت نویسی سے قبل اردو لغات کی تدوین اصول وضوابط کی پابندی کی بجائے ذاتی علمیت اور ذہنی اختراع کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اندراجات کی ترتیب کا التزام بھی نہیں ہوتا تھا۔ قابل ذکر ایک بات یہ بھی ہے کہ جان ٹی۔ ایس پلیٹس نے اردو لغت نویسی کو انیسویں صدی کے آخر میں جس مرحلے میں چھوڑا پوری ایک صدی بیت جانے کے بعد بھی وہ اس سے کیا بڑھتی۔ اصول وضوابط کے نقطۂ نظر سے مزید انحطاط کا شکار رہی کیوں کہ پلیٹس کے اردو، ہندی، انگریزی لغت کے بعد اردو لغت نویسی کے تمام کاروبار اہل زبان تک ہی محدود رہا۔ جس کی وجہ سے لغت نویسی کے جدید اصولوں کے تقاضے پورے نہیں ہوسکے اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مغربی علماء نے اس زبان سے صرفِ نظر کرلیا ہے۔ لیکن حال ہی میں دہلی سے شائع ہونے والی ایک مردف لغت REVERSE DICTIONARY OF URDU سے یہ جمود ٹوٹا اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ مغربی اہل نظر اس زبان سے قطعاً غافل نہیں ہیں۔

اردو میں جس طرح دیگر مختلف قسم کی لغات ملتی ہیں اسی طرح مردف لغت بھی ملتی ہے۔ یہ لغت دراصل قافیائی لغات سے ملتی جلتی چیز ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ قافیائی لغات میں گنے چنے قوافی کو بغیر کسی ترتیب کے درج کر دیا جاتا ہے، اور صحیح معنوں میں لغت کی صورت نہیں ہوتی۔ جب کہ زیر نظر لغت میں پوری اردو زبان کو مردف اعتبار سے یعنی ختم ہونے والے حروف کے اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔ نیز کوئی لفظ یا قافیہ نظر انداز نہیں ہوا۔ ظاہر ہے یہ بڑی جانفشانی اور محنت کا کام ہے۔ اس لغت میں اندراجی ترتیب ابتدائیوں کے بجائے اختتامیوں پر مبنی ہے۔ ایسی قدیم ترین لغت ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی کی مرتب کردہ اور اردو کی سب سے قدیم لسانی لغت، لغات گجری اسی نوعیت کی لغت ہے۔ جس میں اندراجی ترتیب اصطلاح کے ابتدائی حروف کے لحاظ سے قائم کرکے آخری حروف (اختتامیوں) کی ترتیب سے قائم کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر بیکر کی مرتب کردہ یہ زیر نظر مردف لغت REVERSE DICTIONAR OF URDU اردو کی دیگر قافیائی لغات سے اس معنی میں مختلف ہے کہ سابقہ قافیائی لغات میں صرف قافیہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اور صرف مفردات ہی کو شامل لغت کیا گیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر بیکر کی اس لغت میں نہ صرف یہ کہ مرکبات کو بھی شامل کیا گیا

ہے بلکہ لاحقوں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس لغت کے پیش لفظ میں انتہائی بلیغ انداز میں اس لغت کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے اس کے علمی اور لسانیاتی مطالعوں کے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ پروفیسر موصوف کے اپنے الفاظ میں "جس طرح عام لغت کے ذریعے الفاظ کے شروع کے حصے، سابقے اور ابتدائیے سامنے آجاتے ہیں، اس لغت کے ذریعے الفاظ کے آخر کے حصے، لاحقے اور اختتامیے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور یوں زبان کی ساخت، اس کے صوتیاتی نظام اور املاکات و مرکبات کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے ۔"
(پیش لفظ)

ڈاکٹر بیکر نے اس لغت کو قافیائی لغت نہ کہہ کر لغتِ مردف یا لغتِ معکوس (REVERSE DICTIONARY) کا نام اس لیے دیا ہے کہ اس میں اندراج کی یافت اور شناخت اگرچہ اردو رسم الخط کے اعتبار سے ہے لیکن لفظ کے حرفِ اوّل سے نہیں بلکہ حرفِ آخر سے ہے ۔ یعنی اندراجات کی ترتیب اندراج کے ابتدائیہ کے بجائے اختتامیہ کے لحاظ سے ہے ۔

ڈاکٹر بیکر کی ڈکشنری کو عام لغت کے زمرے میں رکھنا مشکل ہے ۔ کیوں کہ یہ معنی کی لغت نہیں الفاظ کی لغت ہے ۔ یہاں سروکار معنی سے نہیں الفاظ کی ساخت اور ان کی اختتامی صوتیات سے ہے ۔ گویا یہ اپنی نوعیت کی بے مثل لغت ہے جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے اردو میں نہیں ملتی ۔ الفاظ کے لسانیاتی مطالعے اور تشکیل تجزیہ کے لیے اس قسم کی لغت کی بہت اہمیت ہے ۔ اور یہ بنیادی اہمیت کا حکم رکھتی ہے ۔ ڈاکٹر ڈونلڈ بیکر نے جس محنت اور جانفشانی سے اس کام کو انجام دیا ہے اس کا ثبوت ہر ہر صفحے سے ملتا ہے ۔ اس کی تدوین و اشاعت سے اردو کے علمی سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے ۔ جس کے لیے اردو دنیا پروفیسر بیکر کی ممنون رہے گی ۔ پروفیسر بیکر نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اردو زبان سے محبت اور اس کے بارے میں کام کرنے کا جذبہ ان کے دل میں پروفیسر نارنگ نے پیدا کیا اور ان کی توجہ اور دلچسپی برابر شاملِ حال رہی ۔" پروفیسر بیکر کے اس کام سے اردو کی ایک بنیادی، لسانی اور صرفی ضرورت پوری ہوئی ہے ۔ جس کا پورا احساس شاید اردو والوں کو برسوں کے بعد ہوگا ۔ امید ہے کہ پروفیسر بیکر اپنی علمی لگن سے اسی طرح اردو کے لسانی اور علمی سرمائے میں اضافہ کرتے رہیں گے ۔ (مسعود ہاشمی)

نام کتاب : ہندوستان میں عورت کی حیثیت (مترجم) صغرا مہدی، ڈیمائی سائز کارڈ بورڈ سرورق، آفسٹ کتابت و طباعت صفحات (۲۶۸) قیمت ۹ روپے ۔ ناشر : ترقی اردو بورڈ (وزارت تعلیم حکومت ہند) ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم ۔ نئی دہلی ۲۲-۱۱

انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ اینڈ سوشل ویلفیئر حکومت ہند کی طرف سے ہندوستان میں عورت کی حیثیت اور درجے کی تحقیق اور اب تک بھی اس کی پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ پوزیشن کے بارے میں ایک ۱۱ رکنی کمیٹی نے سروے کے بعد ایک جامع اور مفصل رپورٹ مرتب کی تھی ۔ زیر کتاب میں اسی رپورٹ کا خلاصہ شائع کیا گیا ہے اور ترجمہ صغرا مہدی کا مرہونِ منت ہے ۔

لیکن ملک میں آئے دن کمیشن بیٹھتے ہیں اور سروے رپورٹیں بھی تیار ہوتی ہیں مگر اصل مسائل دھرے کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں

آٹھ ابواب پر مشتمل اس رپورٹ میں سماج کا ارتقا، تہذیبی اور سماجی صورت حال، عورت اور قانون، اقتصادی پہلوؤں میں عورت کے کردار اور اس کے حقوق، تعلیمی ترقی، سیاسی صورت حال اور خواتین کی فلاح و بہبود کے بہت سے پہلوؤں کا بڑی گہری ہوشمندی اور دردمندی سے اراکین نے محسوس کیا اور رپورٹ قلمبند کر دی ہے۔ اس رپورٹ کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترقی اردو بورڈ نے اسے شائع کیا ہے اور بہت کم قیمت رکھی ہے تاکہ عمومی طور پر اسے خریدا جا سکے۔ کتاب کے آخری حصے میں مختلف جدولیں اور اعداد و شمار بتلائے گئے ہیں جس سے اس کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اردو داں خواتین اور خواتین کے مسائل اور ترقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ رپورٹ ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ (وقار خلیل)

نام کتاب "وضاحتی کتابیات (جلد اول) ۱۹۷۶ء" مرتبہ: گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی۔ ڈیمائی سائز، خوب صورت کپڑے کی جلد، آفسیٹ طباعت، کتابت اور کاغذ بہت نفیس، اشاعت ۱۹۸۰ء۔ صفحات (۳۱۸)، قیمت صرف ۱۷/۰۰ روپیے، ناشر: ترقی اردو بیورو، بلاک آر کے پورم، نئی دہلی - ۱۱۰۰۶۶

اردو زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ترقی اردو بورڈ نے جامع اور منصوبہ بند اشاعتی پروگرام کو عملی شکل دے کر ہر سال تقریباً ۲۵ کتابیں شائع کر رہا ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی پروگرام کے تحت منظر عام پر آئی ہے۔ ہماری زبان میں ادھر چند سال سے سینکڑوں کتابیں چھپنے لگی ہیں، علمی اداروں اور اکیڈیمیوں کی اعانتوں اور انعامات کے باعث اچھے بُرے ہر قسم کے مسودوں کی اشاعت ہونے لگی ہے۔ ایسی کوئی جامع فہرست اب سے پہلے نئی مطبوعات سے متعلق سرورقی وضاحتوں کے ساتھ منظر عام پر نہ آسکی اور اسکالروں کو نئی کتابوں سے استفادہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ترقی اردو بورڈ اور وضاحتی کتابیات جلد اول کے مرتبین اس اہم کام کی بشت تکمیل کے لیے قرار واقعی اردو دنیا کی طرف سے ہدیۂ تشکر کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے دیباچہ اور مقدمہ میں وضاحتی کتابیات کے لیے مروجہ اصولوں اور ان کی افادیت پر اجمالی طور پر اظہار خیال کیا ہے اسکالروں کے نزدیک ایسے کیٹلاگ یا فہرستوں کی حیثیت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ زیر نظر کتابیات میں پیش کش ہے اس میں ۱۹۷۶ء کی تمام مطبوعات تو شامل نہیں ہیں پھر بھی (۴۰۲) کتابوں کے بارے میں اہم معلومات درج کر دی گئی ہیں جن میں شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما، ادبی تحقیق و تنقید، مضمون، انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ، مکتوبات، زبان، تاریخ و تہذیب و سیاسیات، تعلیم، صنعت و حرفت، کامرس، مذہبیات، ادب اطفال اور متفرقات شامل ہیں۔ اس کام کو بڑی حد تک مکمل بنایا جا سکتا ہے وہ یوں کہ اردو بورڈ ملک کے اخبارات و رسائل میں اعلانات کے ذریعہ ناشروں، مصنفوں اور اداروں تک ہر سال کی مطبوعات کی چند جلدیں اس مقصد کے لیے قیمتاً طلب کرے اور ایسی مطبوعات جن کا وضاحتی کتابیات میں اندراج ہو اسکالروں کے استفادہ کے لیے شمال، جنوب، مشرق، مغرب کے حصوں کی اسکول لائبریریوں میں محفوظ کر دے اور کتابیات میں اس کا ذکر بھی کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ "وضاحتی کتابیات" جامعات کے اسکالروں اور ادب و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑا قیمتی مفید پیش کش ہے اور اس کا ہر معیاری کتب خانہ میں خریدا جانا مفید اقدام متصور ہوگا۔ (وقار خلیل)

نام کتاب: خدا بخش لائبریری جرنل (شمارہ ۸،۷ ، ۱۹۷۸-۷۹ء) ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ صفحات [illegible]
قیمت: ۳۰ روپے۔

بہت کم عرصہ میں اس موقر مجلّہ نے معیاری اور نادر مواد و ماخذ کو حسنِ سلیقہ سے پیش کرکے ادبی اور علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ بلاشبہ اچھے انتخاب کے لیے مرتبین قابلِ مبارک باد ہیں۔

یہ شمارہ معروف ادبی مجلّہ ادیب (الٰہ آباد) کے جنوری ۱۹۱۰ء تا جولائی ۱۹۱۳ء جملہ ۳۴ شماروں کا انتخاب ہے۔ انگریزی حصہ میں پروفیسر سید حسن عسکری کا مضمون "ملفوظات" گنج ارشدی کے مطالعہ کے طور پر ہے۔ یہ مطالعہ جون پور کے تاریخ کے معاشرتی اور تہذیبی شعبہ کا جائزہ ہے۔ اردو شعبہ کے تین حصے ہیں۔ حصہ اول نثر کا انتخاب ہے، حصہ دوم نظم و نثر انتخاب ہے اور درمیان میں نادر تصاویر جمع کی گئی ہیں۔

اس خوش سلیقگی سے یہ نادرات طبع کی گئی ہیں کہ دل خوش ہوجاتا ہے۔ نثری حصہ میں چند مضامین تو ایسے ہیں کہ ادب کی تنقید و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہی ان کی قدر سمجھ سکیں گے مثلاً درخشاں پر نظم طباطبائی کا مضمون جس میں درخشاں کی غزلیات کا اسلوبیاتی جائزہ ہے۔ زبان کی فنی خوبیوں اور خامیوں کو طباطبائی نے جس قابلیت سے پیش کیا ہے اس سے اردو تنقید کے ابتدائی انداز پر روشنی پڑتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کا مضمون "املائے اردو" نقاد لکھنوی کا مضمون "جلال لکھنوی" اور شاہ دل گیر کا "ریاض خیرآبادی" پر مضمون خاصے کی چیزیں ہیں۔ استاد جلال اور ریاض دونوں ہی پر بہت کم لکھا گیا ہے ان دنوں کچھ ایسی تنقیدی مارا ماری چل رہی ہے کہ اربابِ اردو نے مستند اساتذہ کے بارے میں پڑھنا ہی بند کردیا ہے۔ امید ہے کہ یہ اشتہاریت جلد ختم ہوجائے گی۔ بخشی تراش در تذکرۂ شعر و سخن، محمد شفیع الدین مراد آبادی کا "شاہنامہ فردوسی" پر مضمون، پریم چند کا اردو زبان اور ناول پر مضمون اور پھر ان کے افسانوں (ممکن ہے کہ یہ افسانے ان کے مجموعوں میں نہ ہوں لیکن سب ہی عام ہیں) کا اجتماع، کیا خوب چیزیں ہیں۔

دوسرے حصے میں بھی نظم و نثر کا انتخاب دوبارہ کیا گیا ہے (اصول کچھ سمجھ میں نہیں آتا) کئی اہم منظومات اور مضامین ادیب میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں کئی اہم مباحث، سوانح اور اس دور کی شعری نہج کی مثالیں ہیں۔ انتخاب کا یہ دوسرا حصہ وسعتِ نظر سے کیا گیا ہے۔ اچھی طباعت، اچھے انتخابات اور مناسب گٹ اپ کے باوجود کتاب کی چند کمیاں جو مجھے محسوس ہوئیں وہ یہ ہیں۔ انتخاب کے اصول جو بہتر طور پر بیان کئے جاسکتے تھے۔ نثر اور نظم دونوں کے انتخابات متوازی طور پر پیش کئے جاتے رسالہ ادیب کے بارے میں، جس دور میں یہ نکل رہا تھا اس کے بارے میں اور اس کے معاصرین کے بارے میں ایک "پیش لفظ" لکھا گیا ہوتا تو رسالہ کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ شعری حصہ کا انتخاب، اختصار کی نذر ہوگیا۔

خدا بخش لائبریری جرنل ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک اہم کتاب ہے اور اس کے مرتبین نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس کو معیاری بنا کر پیش کیا ہے۔ ادبی حلقوں میں یہ کوشش مستحسن کہلائے گی اور اس کتاب کی قدر دانی کی جائے گی۔ (اسلم عمادی)

• • • • •

اردو نامہ

مرتب: وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

۴ر اکتوبر: بزم نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب شاہ حمید الدین قادری حسینی کی صدارت میں منعقد ہوا، قدیم طرز سخن کے کئی شاعروں نے غزلیں سنائیں۔

۵ر اکتوبر: شہنشاہ ادب کی ماہانہ شعری محفل علی سرور کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ بزرگ غزل گو شاعر منوہر لال بہار مہمان خصوصی تھے۔ تخمیم نصرتی، ناگپال، عظیم دہلوی، معراج صوفی اور گومر اسحاقی معتمدین منتخب ہوئے۔

۱۰ر اکتوبر: سنٹرل حیدرآباد یونیورسٹی کی اردو اسوسی ایشن کا ادبی اجلاس گولڈن تھری شولڈ میں بصدارت ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو ہوا۔ اسکالر طلبا حبیب نثار، محبوب حسین اور طالبہ انیس سلطانہ نے علی الترتیب اقبال کی شاعری، اردو ذریعہ تعلیم اور جگر کی شاعری پر مضامین پیش کئے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر سید جعفر، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بھی اجلاس میں شرکت کی۔ کلیم قریشی سکریٹری اردو اسوسی ایشن نے اجلاس کو کنونس کیا اور شکریہ ادا کیا۔

۱۱ر اکتوبر: محفل خواتین کا ادبی اجلاس بصدارت ڈاکٹر فرحت لطیف منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صالحہ قریشی اور ناظمہ انصاری نے ادبی اور سماجی موضوعات پر مخاطب کیا، خواتین شاعرات نے کلام سنایا۔ سیدہ طیبہ معتمد محفل خواتین نے شکریہ ادا کیا۔

۱۲ر اکتوبر: عثمانیہ یونیورسٹی نے معروف اہل قلم و مصنف جناب سید جعفر صادق (ایس جے صادق) کو "آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح" پر مقالہ پیش کرنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

۱۳ر اکتوبر: ریاستی انجمن ترقی اردو اور اردو تعلیمی ٹرسٹ کے زیر اہتمام آصفیہ ہائی اسکول میں اردو کوچنگ سنٹر کو مخاطب کرتے ہوئے جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ہائی اسکول کے ناکام اردو طلباء کو کوچنگ مراکز سے عمومی استفادہ کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، سرینواس لاہوٹی اور سنٹر کے پرنسپل مظہر الحسن نے بھی اردو کے تعلیمی اور تدریسی امور پر روشنی ڈالی۔

۱۵ر اکتوبر: ریاست کے نئے چیف منسٹر مسٹر ٹی انجیا کابینہ کے دو وزراء مسٹر ایم باگا ریڈی (پنچایت راج) اور احمد شریف (وقف بورڈ) نے اردو میں حلف لیا۔

۱۷ر اکتوبر: علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے زیر اہتمام یاد سرسید کا اہتمام کیا گیا۔ احمد جنگ صدر اسوسی ایشن کی صدارت میں جناب عابد علی خاں سکریٹری ادبی ٹرسٹ، ڈاکٹر منظور عالم لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی اور پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے سرسید اور مسلم یونیورسٹی پر مخاطب کیا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی کی یاد میں احتراماً خاموشی منائی گئی۔

حضرت سعید شہیدی کی صدارت میں محفل مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ بانو طاہرہ سعید، ثریا مہر، مظفر النسا، ناز، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، محمد منظور احمد، فیض الحسن خیال، جوہر ہاشمی، روشن خیال، رئیس اختر اور ناظم میرزا نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دئے۔ جناب عبد المنان قادری معتمد اسوسی ایشن نے شکریہ ادا کیا۔

● بزرگ اور نامور خوشنویس جناب محمد رشید الظفر سینئر استاد مرکزی خوشنویسی ایوان اردو

رحلت کر گئے۔ ۱۸ اکتوبر کو ایوان اردو میں جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ مرکز خوشنویسی کے استاد غوث خاں اور وقار خلیل نے غفار مرحوم کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ طالبات اور طلباء نے دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ قراردادِ تعزیت منظور کی۔

۲۳ اکتوبر: نامور مستشرق ڈاکٹر انا ماری شمل پروفیسر انڈو مسلم کلچر ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ نے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے، اردو میوزیم اور مرکز خوشنویسی کا معائنہ کیا اور ڈاکٹر زور بانی ادارہ کی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ مرکز خوشنویسی کی بہتر کارکردگی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر شمل نے خطاطی کے چند نمونے بطور یادگار قبول کئے۔

● پریم چند سوسائٹی اور ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام اردو ہال میں پریم چند سے متعلق ایک سیمینار منعقد ہوا۔ پاکستان کے دانشور ادیب جناب سبطِ حسن نے بطور خاص شرکت کی اور سیمینار میں "پریم چند اور آزادیٔ وطن" کے موضوع پر مقالہ سنایا۔ پروفیسر یادگیر صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونی ورسٹی نے سیمینار کی صدارت کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر گیان استھانہ، ڈاکٹر وامن مکی رنگا چاریہ نے مباحث میں حصہ لیا۔ مسٹر اختر حسن نے اکیڈیمی کی طرف سے سبطِ حسن کا گرمجوشانہ خیر مقدم کیا اور رشید قریشی صاحب نے موصوف کی گل پوشی کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے سیمینار کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۳ اکتوبر: اگروال مہاویر دل کے زیر اہتمام ہندی اردو کا ملا جلا مشاعرہ ڈاکٹر راج کشور پانڈے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کنول پرشاد کنول، صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیال، عابد سلطان شاہین، اوم پرکاش نرمل، اور کالی چرن گپتا راہی نے کلام سنایا۔

● اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس پروفیسر سراج الدین پرنسپل ایونگ کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ممتاز شاعر جناب س۔ ا۔ عشرت کی شعری اور شخصی زندگی پر جناب امان ارشد نے ادبی انٹرویو لیا۔ آج کا شاعر کے زیر عنوان قدیر الانصاری نے کلام پیش کیا۔ رحمت یوسف زئی نے جلسہ کنڈکٹ کیا۔

۲۴ اکتوبر: حیدرآباد کے مصنفین اور شعراء مسرز منوہر لال بہار، رشید الدین، [illegible] الدین احمد، فیض الحسن خیال، عزیز احمد عقیل کی مطبوعات پر بہار اردو اکیڈیمی کے ادبی انعامات ملے۔

● اردو ریسرچ اسوسی ایشن عثمانیہ یونی ورسٹی کا ادبی اجلاس پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نامور دانشور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (دہلی یونی ورسٹی) نے اردو میں تحقیق کے مسائل پر سیر حاصل مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر شعبہ اردو نے پروفیسر فاروقی کا خیر مقدم کیا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری اردو اسوسی ایشن نے شکریہ ادا کیا۔

● عثمانیہ یونی ورسٹی نے جوان فکر دکنی اسکالر اور شاعر جناب محمد علی اثر کو ان کے مقالہ "دکنی غزل کی نشوونما" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ڈاکٹر اثر جامعہ عثمانیہ میں لکچرار ہیں اس دوران ان کی ایک کتاب "تحقیقی تبصرے" (رپوتاژ ریاست میں اردو تحریک پر) کے علاوہ شعری مجموعہ "ملاقات" منظر عام پر آچکے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ نے جناب عقیل ہاشمی کو بھی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ موصوف جواں فکر شاعر اور مخلص اردو کارکن ہیں۔

● حیدرآباد لٹریری فارم کے زیر اہتمام جدید فکر و نظر کے سخن وروں کی ایک محفل ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو

جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی ڈاکٹر ناصری شکل مہمان خصوصی تھیں۔ مسز رشاد نکہت، راشد آذر، اسلم عمادی، تاج مہجور، بلقیس علاؤ الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، حسن فرخ، رؤف خلش، علی الدین نوید، لطیفات متین، طالب خوندمیری، علی ظہیر، مسعود عابد، ذکی بلگرامی، ماجد حلیم، مظہر مہدی اور یوسف اعظمی (معتمد مشاعرہ) نے کلام سنایا۔

● غزل اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک منعقدہ محفل غزل و موسیقی میں ممتاز فن کار بیگم وڈاکٹر رمنی الدین نے حیدرآباد کے شعراء سعید شہیدی، مغنی تبسم، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، ثریا مہر اور عزیز النساء صبا کے پیش کردہ کلام کو سازوں کے ساتھ موسیقی کے ساحرانہ اسلوب میں سنایا اور داد حاصل کی۔ جناب احمد شریف ریاستی وزیر اوقاف مہمان خصوصی تھے۔ اس محفل کی آمدنی سے معذور افراد کی اعانت کی گئی۔

● نامور ادیبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کو ریاستی حکومت نے ریٹائر ہونے کے بعد ...کیا۔

۲۶ر اکتوبر: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب صادق احمد شریک معتمد ریاستی محکمہ قانون نے سروجنی نائیڈو کی ہمہ رنگ شخصیت پر مقالہ اور جناب طیب انصاری صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج گلبرگہ نے سراج اورنگ آبادی کی شاعری پر مقالہ سنایا۔ جناب سرخوش لاہوتی معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے ساحر لدھیانوی (متوفی ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء) کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ محفل شعر میں بانو طاہرہ سعید، خیرات ندیم، محمد منظور احمد، امان ارشد، رحمن جامی، سعد حسن نسیم اعجاز، اور قدیر انصاری نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکر ادا کیا۔

● بزرگ نعت گو مسدس رقم شاعر الحاج عارف بیابانی کی خدمات کے اعتراف میں ادارۂ قومی ادب اور بزم شباب کی طرف سے جلسہ تہنیت جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ "منصف" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز چندر سری واستو ڈائرکٹر اردو اکیڈمی اوج یعقوبی، معز الدین قادری ملتانی اور شاعر محبوب علی افسر نے جناب عارف کی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ اس موقع پر شاعر کی خدمت میں کیسہ زر بھی پیش کیا گیا۔ رات دیر گئے تک نعتیہ شعری محفل گرم رہی، قدیم مکتب فکر کے ۳۰ شعراء نے کلام پیش کیا۔

۲۷ر اکتوبر: ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی کے خیر مقدمی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے ریاستی وزیر داخلہ جناب پربھاکر ریڈی نے کہا کہ ریاستی حکومت اردو کی ترقی و ترویج کے امور سے گہری دلچسپی رکھتی ہے اور اردو کے مسائل کو حل کرنا چاہتی ہے۔ جناب لطیف الدین قادری ایڈیٹر رہنمائے دکن نے صدارت کی مسٹر یدمہ ویرا ایڈیٹر ملاپ اور جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف نے بھی مخاطب کیا۔

● سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کا تعزیتی جلسہ نامور شاعر ساحر لدھیانوی کو خراج عقیدت ادا کرنے کے لیے جناب صادق احمد صدر اسوسی ایشن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صلاح الدین نیر اور قادر جاوید صاحبان نے ساحر پر اپنے خیالات ظاہر کیے آخر میں قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

۳۰ر اکتوبر: حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر سراج الدین کی صدارت میں نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے احاطے میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صفدر علی بیگ نے کرشن مراری کے شعری مجموعہ "ساز رگ جاں" پر تبصرہ کیا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی کی رحلت پر قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔ محمد منظور احمد معتمد حلقۂ ارباب ذوق نے شکریہ ادا کیا۔

VEMBER 1980

R. N. 10922/57
Regd. H/HD. 134

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500004. (A. P.)



National Fine Printing Press, Charkaman Hyderabad—500 002. A. P.



12

باہتمام ڈاکٹر محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

جلد ۴۳ ڈسمبر ۱۹۸۰ء شمارہ ۱۲

مدیر اعزازی ڈاکٹر مغنی تبسم
معاون مدیر وقار خلیل

ادارۂ ادبیاتِ اردو ✧ پنجہ گٹہ ✧ حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴

قیمت : ایک روپیہ پچہتر پیسے

سالانہ
معمولی ڈاک سے ۲۰/ روپیے
رجسٹری سے ۴۵/ روپئے
طلبہ سے ۱۵/ روپے

بیرونی ملکوں سے
ہوائی ڈاک سے — بحری ڈاک سے
مشرقِ وسطیٰ - ۱۰ ڈالر — ۴ ڈالر
امریکہ ۱۶ ڈالر — ۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر — ۳½ ڈالر

فہرس

مولوی کریم الدین مراد : غیر معروف اہم ڈرامہ — ابراہیم یوسف — ۲
غزلیں — نصیر احمد نصیر گلبرگوی — ۱۶
امان ارشد
اقبال سب کے لیے : ایک مطالعہ — پروفیسر ریاض صدیقی — ۱۷
غزلیں — شہاب اشرف — ۲۲
ساجد رضوی
کتب خانہ جامع مسجد بمبئی : علوم اسلامیہ کا مخزن — نظام الدین ایس، گوریکر — ۲۳
سمجھوتہ (نظم) — محمد حمید اللہ صدیقی — ۲۶
غزل — شہیر رسول
واپسی (ڈرامہ) — اظہر افسر — ۲۷
(نقد و نظر)
نئی کتابوں پر تبصرے — اسلم عمادی — ۳۳
اردو نامہ — وقار خلیل — ۳۸

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد-۲

ابراہیم یوسف

مولوی کریم الدین مراد
(ایک غیر معروف اہم ڈراما نگار)

منشی کریم الدین مراد (بعض حضرات نے کریم الدین کریم لکھا ہے جو غلط ہے) قدیم ڈراما نگاروں میں اس لیے اہم ہیں کہ ان کے فن کا اعتراف ہر صاحب ذوق نے کیا ہے اور احسن لکھنوی تو انھیں اپنا استادِ روحانی مانتے ہیں۔ ان کے متعلق معلومات کے دو ذرائع ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا "اردو تھیٹر۔ جلد دوم" اور دوسرا نامۂ احسن۔ ڈاکٹر نامی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "کریم الدین نام مراد تخلص ۱۸۴۳ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور مدرسۃ العلوم بریلی کے فاضل درس ہوئے۔ بعدہٗ ایک مقامی مدرسہ میں مدرسی کے فرائض انجام دینے لگے۔ غالباً اسی زمانے میں مختلف سازوں اور موسیقی میں کافی مہارت حاصل کی۔" (اردو تھیٹر جلد دوم: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی۔ ص ۱۵۹-۱۶۰) نائب حسین صاحب نقوی نے ان کے ایک ڈرامے چتر بکاولی کے ایک ایڈیشن کا ذکر کیا ہے جو سکندرآباد میں ۱۸۷۲ء میں چھپا ہے اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس سنہ یعنی ۱۸۷۲ء وہ بمبئی پہنچ چکے تھے اور تھیٹر سے وابستہ تھے ڈاکٹر نامی نے لکھا ہے کہ "وکٹوریہ ناٹک منڈلی جب برما سے واپس آئی تو فرام جی اپوا اور دادا بھائی ٹھونٹی اس سے علاحدہ ہو گئے۔ وکٹوریا ناٹک منڈلی نے برما کے دو سفر کئے تھے پہلا ۱۸۸۱ء میں اور دوسرا ۱۸۸۲ء میں ۱۸۸۱ء میں جو لوگ کمپنی کے ساتھ گئے تھے ان میں ٹھونٹھی کا نام نہیں ہے۔ ڈاکٹر نامی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "مانڈلے سے واپسی پر شرکاء کمپنی نے دادا بھائی ٹھونٹھی کو مجبور کیا کہ وہ دوبارہ کمپنی میں شریک ہو جائیں لیکن وہ اپنا کل سرمایہ کاروبار میں لگا چکے تھے اس لیے معذرت ظاہر کی آخر یہ طے پایا کہ ان کی پوری دوکان معہ ساز و سامان خرید لی جائے چنانچہ کپڑے کی پوری دوکان خرید لی گئی اور دادا بھائی ٹھونٹھی پھر دنیائے تھیٹر میں داخل ہو گئے۔" (اردو تھیٹریکل کمپنیوں کے سفر۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی۔ سووینیر جشن نامی کمیٹی حیدرآباد ص ۸۰۷)
اب دوسرے سفر میں ٹھونٹھی کمپنی کے ساتھ مانڈلے گئے اور واپسی پر الگ ہو گئے اور بمبئی ناٹک منڈلی کے نام سے اپنی کمپنی الگ قایم کر لی۔ دادا بھائی ٹھونٹھی اندر سبھا پیش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ہر مرتبہ اس کو ایک نئے ڈھنگ سے اسٹیج کرتے تھے اس لیے سب سے پہلے اپنی کمپنی میں انھوں نے اندر سبھا پیش کیا جو بے حد کامیاب ہوا۔ اب انھیں دوسرے ڈراموں کی فکر ہوئی چنانچہ انھوں نے۔ "پستن جی بھراج کو یوپی اور دہلی کے دورے پر روانہ کیا وہ دہلی، لکھنو اور

رام پور ہوتا ہوا بریلی پہنچا اور مولوی کریم الدین کریم (مراد) دہلوی (بریلوی) سے بھی ملا جو ایک مکتب میں عربی اور فارسی کے معلم تھے اس نے مولوی صاحب سے ایک غزل لکھنے کی فرمائش کی جو مولوی صاحب نے لکھ دی۔ اس کے بعد "ٹوپی والے سانوریا" کے طرز پر ایک گیت لکھوایا مولوی صاحب نے یہ فرمائش بھی پوری کردی۔ پستن جی جو گانے ناچنے میں مشاق تھا گیت سنکر پھڑک اٹھا اور ستار پر سننے کی فرمائش کی مولوی صاحب نے یہ گیت کچھ اس انداز سے گایا کہ پستن جی بے قرار ہوگیا اور ٹھوٹھی کو بطور نمونہ لکھ کر بھیجا اور مولوی صاحب کو ہمراہ لانے کی اجازت طلب کی۔ ٹھوٹھی نے سازوں پر گیت سنا اور منظوری دے دی۔ پستن جی نے چالیس روپے ماہوار کے حساب سے دو مہینے کا اڈوانس دیا اور اپنے ہمراہ لے آیا۔" (اردو تھیٹر جلد چہارم: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ص ۱۰۷ - ۱۰۸) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وکٹوریا ناٹک منڈلی کے دوسرے سفر کے بعد مولوی کریم الدین بمبئی گئے اور کمپنی نے دوسرا سفر ۱۸۸۲ء میں کیا تھا اس لیے نائب حسین نقوی کا یہ خیال کردہ ۱۸۸۲ء میں بمبئی پہنچ چکے تھے صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے چترا بکاولی کا کون سا اڈیشن دیکھ لیا کہا نہیں جاسکتا۔ ڈاکٹر نامی مولوی صاحب کا سنہ پیدائش ۱۸۴۲ء بتلاتے ہیں اور بمبئی جانے کے وقت ان کی عمر اکتالیس سال لکھتے ہیں اس حساب سے بھی وہ لگ بھگ ۱۸۸۳ء میں بمبئی پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی کریم الدین نے بمبئی میں جو ڈراما سب سے پہلے لکھا وہ گل بکاؤلی تھا جو ۱۸۸۳ء میں کھیلا گیا۔ چترا بکاؤلی کا نمبر ان کے ڈراموں میں ترتیب کے اعتبار سے تیسرا ہے۔ یعنی گل بکاؤلی اور چترا بکاؤلی کے درمیان ایک اور ڈراما "گلستان خاندان ہامان" لکھا گیا پھر کہیں جاکر چترا بکاؤلی۔ جس کا سنہ اشاعت ۱۸۸۴ء ہے۔ اس لیے بھی ۱۸۸۲ء میں کسی صورت میں بھی ان کا بمبئی جانا یا کسی تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ ہونا درست معلوم نہیں ہوتا۔ دادا بھائی ٹھوٹھی سے پہلی ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر نامی لکھتے ہیں کہ ٹھوٹھی خود کو اپنی مختصر دنیا کا سب سے بزرگ انسان سمجھتا تھا۔ کریم صاحب کو دیکھ کر ناچ اٹھا جوڑے چکلے انسان، سفید لہراتی ہوئی ڈاڑھی، لمبا کرتا اس پر عمامہ، عمامے پر پگڑی آتے ہی اسلام علیکم اس زور سے کہا کہ دادا بھائی ٹھوٹھی جیسا سنجیدہ آدمی خیر مقدم کے لیے کھڑا ہوگیا۔ جب دونوں میں بات چیت ہوئی تو ٹھوٹھی واقعی خوش ہوا اور اپنی خوش بختی پر ناز کرنے لگا ان کی خوب خاطر و مدارت کی اور رونق کا ڈراما گل بکاؤلی دے کر فرمائش کی کہ وہ اس کے وزن پر ایک ڈراما لکھیں۔" (اردو تھیٹر جلد چہارم: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ص ۱۰۸) اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ ٹھوٹھی نے ان سے سب سے پہلے رونق کے ڈرامے گل بکاؤلی کو ترمیم و تنسیخ کے بعد دوبارہ لکھنے کی فرمائش کی۔ رونق کے ڈرامے کا سنہ تصنیف ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۳ء کے درمیان ہے اس لیے مولوی کریم الدین مراد نے رونق کے ڈرامے سنگین بکاؤلی کو ۱۸۷۹ء کے بعد ہی لکھا ہوگا اس لیے مولوی صاحب کا ۱۸۷۹ء سے پہلے بمبئی پہنچنا ثابت نہیں ہوتا۔

احسن لکھنوی جب ۱۸۹۳ء میں بمبئی پہنچے تو مولوی کریم الدین کا انتقال ہوچکا تھا چوں کہ انھوں نے اپنا آخری ڈراما "خداداد" ۱۸۹۰ء میں لکھا تھا اس لیے ان کا انتقال ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان کسی وقت ہوا ہوگا۔ احسن لکھنوی انتقال کے وقت ان کی عمر ساٹھ سال بتلاتے ہیں اگر ان کی عمر ساٹھ سال مان لی جائے اور سنہ وفات ۱۸۹۳ء تو ان کی پیدائش کا سنہ ۱۸۴۲ء غلط ہوجاتا ہے اس حساب سے انھیں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہونا چاہیے۔ ہمارے پاس ایسے کوئی شواہد نہیں ہیں کہ جن کے ذریعہ

ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ اس لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ نامی صاحب کے بیان کی ہوئی تاریخ پیدائش ۱۸۴۲ء اور تاریخ وفات لگ بھگ ۱۸۹۳ء تسلیم کرلیں۔ ہمارے لیے اہم ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۰ء زیادہ اہم ہے جن کے درمیان انھوں نے درج ذیل چار ڈرامے لکھے۔

۱۔ گل بکاؤلی ۱۸۸۳ء

۲۔ گلستان خاندان ہامان ۱۸۸۵ء

۳۔ چترا بکاؤلی ۱۸۸۷ء

۴۔ وادیٔ دربار عرف بادشاہ خداداد ۱۸۹۰ء

۱۔ گل بکاؤلی :۔ اس ڈرامے کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ سوائے اس کے کہ ۱۸۸۳ء میں دادا بھائی رتن جی ٹھوٹھی کی فرمائش پر رونق کے ڈرامے کو ترمیم و تنسیخ کے بعد لکھا گیا۔ مولوی صاحب اس کے کچھ حصے کو لکھ کر ٹھوٹھی کو دکھلاتے اور ان کے مشورے سے اس میں ضروری ترمیمات کرتے بقول نامی صاحب۔ "چار مہینے میں گل بکاؤلی تیار ہو گیا۔ اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ ٹھوٹھی نے اس میں نئی نئی کلیاں اور بیل بوٹے لگائے اور کرلوسکر کے پرانے اداکاروں کی مدد سے ارکو گانے مرہٹی طرز پر بٹھائے۔ طبلہ اور سارنگی کے ساتھ ہارمونیم بھی سازوں میں شامل کیا گیا جو لوگ صرف ستار پر گانے سننے کے عادی تھے وہ اس تبدیلی سے بہت محظوظ ہوئے...... ۱۸۸۳ء میں گل بکاؤلی پیش ہوا۔ اس کے متعلق دادا بھائی ٹھوٹھی کے صاحبزادے اردیشر کا نظریہ پیش کیا جائے تو کئی صفحات درکار ہوں گے یہاں اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ یہ تماشا دو سال تک مسلسل ایک ہی تھیٹر میں چلتا رہا کئی کئی دن پہلے ٹکٹ فروخت ہو جاتے اور اور تماشے کے دن دگنی اور تگنی قیمت پر بکتے۔" (اردو تھیٹر۔ جلد چہارم؛ ڈاکٹر عبد العلیم نامی؛ ص ۱۰۸-۱۰۹)۔

۲۔ گلستان خاندان ہامان :۔ تین ایکٹ کا ڈراما ہے۔ پہلے ایکٹ میں آٹھ، دوسرے میں چار، اور تیسرے میں پانچ سین ہیں اور ۱۸۸۵ء میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر نامی کا خیال ہے کہ یہ رونق کے ڈرامے سے ماخوذ ہے قدیم ڈراموں میں ہامان سے متعلق پانچ ڈرامے ملتے ہیں۔

۱۔ ستم ہامان عرف فریب عزرائیل ۱۸۸۱ء مصنفہ محمود میاں رونق۔
(حافظ عبد اللہ نے اس کا عرف فریب عزرائیل لکھا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے)۔

۲۔ تماشا گلستان خاندان ہامان ۱۸۸۸ء غلام حسین معروف بہ حسینی میاں ظریف۔

۳۔ ستم ہامان فریب شیطان ۱۸۸۳ء، ولفہ حافظ عبد اللہ۔

۴۔ ستم ہامان (سنہ اشاعت معلوم نہ ہو سکا) از مولوی الٰہی بخش نامی۔

۵۔ گلستان خاندانِ ہامان :۔ کریم الدین مراد

ان میں رونق اور حافظ عبد اللہ کے ڈرامے ایسے ہیں جو مراد کے ڈرامے سے پہلے لکھے گئے ہیں اس لیے اگر مراد نے استفادہ کیا ہوگا تو انھیں دونوں کے ڈراموں سے۔ یہ استفادہ دو طرح سے ہو سکتا ہے اول تو اشعار میں

دو بدل کرکے اپنانے سے یا پھر پلاٹ کو اپنانے سے۔ جہاں تک شاعر ہونے کا تعلق ہے مراد، رونق اور حافظ عبداللہ سے بدرجہا بہتر شاعر تھے اس لیے ایک بہتر شاعر کمتر شاعر سے استفادہ کرے گا قرینِ قیاس نہیں ہے۔ پلاٹ میں استفادہ ا امکان موجود ہے اس لیے پلاٹ کو پیشِ نظر رکھ کر مقابلہ کیا جاسکتا ہے چوں کہ رونق کا ڈراما میری نظر سے نہیں گزرا ہے لیکن ڈاکٹر نامی نے اس کا پلاٹ اردو تھیٹر جلد دوم صفحہ نمبر ۸۹ پر تحریر فرما دیا ہے اسے یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

ستم ہامان عرف فریب عزرائیل از محمود میاں رونق

" ہامان یادِ الٰہی میں اپنی زندگی گزارتا ہے اس کی بیوی تادینہ اور بچے مظفر اور جہانگار غربت افلاس کی زندگی بسر رتے ہیں اور ہر وقت فقر و فاقہ کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ہامان اس چیخ و پکار سے گھبرا کر جنگل چلا جاتا ہے اور یادِ الٰہی ں اپنا وقت صرف کرنا چاہتا ہے کہ شیطان داخل ہوکر دل میں وسوسے پیدا کرتا اور آخر میں کامیاب ہوکر اس کی بادت اور ریاضت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ "شیطان اسے بے حد و حساب روپیہ دیتا اور اس کے عوض اس کی دح خرید لیتا ہے۔ ہامان اپنی بیوی اور بچوں کو بھی اپنے راستے پر ڈالنا چاہتا ہے لیکن وہ غربت و افلاس کی زندگی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ "شیطان ہامان کو آہستہ آہستہ پھانستا ہے مقررہ وقت پورا دتے ہی شیطان فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا ہوا آتا اور ہامان کی روح لے کر بحرِ شعاع میں غائب ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نامی نے جس طرح پلاٹ کا خلاصہ بیان کیا ہے وہ اگرچہ تشنہ ہے اور مکمل نقشہ سامنے نہیں آتا بہرحال یہ بات اضح ہو جاتی ہے کہ ایک خاص مدت کے عیش و عشرت کے لیے ہامان اپنی روح شیطان کو بیچ دیتا ہے۔

ستم ہامان و فریب شیطان از حافظ عبداللہ

اپنے اس ڈرامے کے دیباچے میں حافظ عبداللہ لکھتے ہیں کہ۔ "قصہ ناٹک ہذا قریب قریب ستم ہامان معروف بہ فریب زازیل پارسیان کے لیے ہے لیکن دونوں میں اس قدر فرق شاعری و بیان سے کہ اگر اس کو زمین تصور کریں تو یہ آسمان ہے۔" حافظ صاحب نے اپنے ڈرامے کا خلاصہ نظم و نثر دونوں میں ڈرامے کے شروع میں درج کر دیا ہے۔ اختصار کے اتھ اسے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

ملکِ یمن میں ایک زاہد اور نیک شخص یادِ خدا میں مصروف رہتا ہے اور بیوی بچوں کے رزق تک کی پروا نہیں تا۔ بیوی بچوں کے رزق طلب کرنے پر عاجز آکر جنگل میں چلا جاتا ہے اور یادِ الٰہی میں مشغول ہوکر خدا سے ابدی زندگی نگتا ہے اسے بشارت دی جاتی ہے کہ اسے ابدی زندگی دی گئی مگر شرط یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے گا۔ یطان اس پر تلملا اٹھتا ہے اور جادو سے سارے جنگل میں آگ دیتا ہے جس سے جنگل کا سارا پانی سوکھ جاتا

ہے۔ ہامان پیاس سے بے تاب ہوکر موت کی دعا کرتا ہے مگر شیطان ظاہر ہوکر اسے بشارت یاد دلاتا ہے اور شراب پیش کرتا ہے اور آخر کار ہامان شراب سے اپنی پیاس بجھا لیتا ہے۔ شیطان اسے بتلاتا ہے کہ اس کی قسمت میں بادشاہ ہونا لکھا ہے۔ فرخ سیر شاہ یمن کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ شیطان اسے خواب میں بتلاتا ہے کہ ہامان وارثِ تاج و تخت ہے فرخ سیر سے نامزد کر دیتا ہے اور ہامان بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔

نادیبہ اپنے بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بھوک سے مرتا نہیں دیکھ سکتی اس لیے انھیں جنگل میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ دونوں بچے بھیک مانگتے شہر آتے ہیں ہامان انھیں پہچان لیتا ہے اور شاہانہ کپڑے پہنوا کر دربار میں بلاتا ہے اور شیطان کے کہنے پر مجبور کرتا ہے مگر دونوں انکار کر دیتے ہیں۔ ہامان ناراض ہوکر مظفر کو قید کرا دیتا ہے اور مہر نگار کو پھر جنگل میں چھوڑ دیتا ہے۔ جنگل میں مہر نگار کو سانپ ڈس لیتا ہے۔ شیطان ظاہر ہوکر پھر اسے شراب پلانا چاہتا ہے مگر مہر نگار پھر انکار کر دیتی ہے۔ ایک تاجر چنگیز وہاں آتا ہے اور ایک جن کے دیئے ہوئے مہرے سے مہر نگار کو اچھا کرتا ہے اور الماس کے ساتھ اسے گھر بھیج دیتا ہے جہاں الماس اس کے ساتھ بدکاری کرنا چاہتا ہے کہ وہاں چنگیز پہنچ جاتا ہے اور الماس کو زخمی کرکے مہر نگار کو پھر جنگل میں لے جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہے کہ دو وحشی چور وہاں آجاتے ہیں اور چنگیز کو ختم کر دیتے ہیں پھر مہر نگار کے لیے آپس میں لڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

مہر نگار کی ملاقات جنگل میں پھر اپنی ماں سے ہو جاتی ہے۔ ہامان بھی وہاں آجاتا ہے اور دونوں کو محل میں لے جاتا ہے اور پھر شراب پینے پر دونوں کو مجبور کرتا ہے اور ان کے انکار کرنے پر دونوں کو قید خانے میں ڈال دیتا ہے۔ ماں، بیٹا اور بیٹی پھر یکجا ہو جاتے ہیں۔ ہامان اب قید خانے میں آکر پھر انھیں شراب پلانا چاہتا ہے ان کے انکار کرنے پر انھیں قتل کرنا چاہتا ہے اور غصہ میں ایک ستون کو ٹھوکر مارتا ہے۔ ستون پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے ملک الموت نکل کر ہامان کی روح قبض کر لیتا ہے۔ مظفر بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔

یہ ہے حافظ عبداللہ کے ڈرامے کا پلاٹ۔ آئیے اب مولوی کریم الدین مراد کے ڈرامے کے پلاٹ کا خلاصہ بھی دیکھیں۔

گلستان خاندان ہامان از مولوی کریم الدین مراد

پہلے ایکٹ کا خلاصہ:۔ ہامان یادِ الٰہی میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ اسے اپنے بال بچوں کا بھی خیال نہیں رہتا اور اور جب اس کی بیوی یہ شکایت کرتی ہے تو گھر بار چھوڑ کر جنگل میں چلا جاتا ہے اور عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک دن وہ پیاس سے بے تاب ہوتا ہے کہ شیطان آکر شراب سے اس کی پیاس بجھا کر اس کی ساری عبادت و ریاضت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ چوں کہ وہاں کا بادشاہ لاولد ہے اور ہامان اس کا قریبی رشتہ دار ہے اس لیے مرتے وقت ہامان کو اپنا جانشیں مقرر کر دیتا ہے اور وزیر ہامان کو جنگل سے لاکر تخت پر بٹھلا دیتے ہیں۔ ایک دن مظفر ہامان کا لڑکا جو اپنی ماں اور بہن سے بچھڑ گیا ہے خیرات مانگتا ہوا ہامان کے دروازے پر پہنچتا ہے۔ ہامان اسے پہچان کر شہزادوں کا لباس پہنا کر دربار میں بلاتا ہے۔

اور شراب پینے کے لیے کہتا ہے مگر مظفر شراب پینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس پر ہامان اسے جیل بھیج دیتا ہے پھر جیل میں جا کر مظفر کو شراب پینے پر مجبور کرتا ہے مگر مظفر پھر انکار کر دیتا ہے اس پر ہامان غصہ سے ایک ستون کو ٹھوکر مارتا ہے۔ ستون پھٹ جاتا ہے اور اس سے ایک سانپ نکل کر ہامان کو ڈس لیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ مظفر بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔

دوسرے اور تیسرے ایکٹ کا خلاصہ:۔ مہر نگار ہامان کی لڑکی جنگل میں بھٹک رہی ہوتی ہے کہ ایک سوداگر اسے اپنے گھر لے جاتا ہے اور اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر اس کی آبرو ریزی کرنا چاہتا ہے۔ مہر نگار کے شور و غل مچانے پر پڑوسی جمع ہو جاتے ہیں۔ آخر کار سوداگر اسے ایک نائکہ کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے نائکہ ہر چند اسے اپنے راستے پر چلانا چاہتی ہے مگر جو بھی گاہک آتا ہے مہر نگار اس سے ایسی پند و نصائح کی باتیں کرتی ہے کہ گاہک اس سے پریشان ہو جاتا ہے۔ ایک دن وزیر کا لڑکا روشن ضمیر اس کے کوٹھے پر آتا ہے اور مہر نگار کی نیکی اور پاکبازی سے متاثر ہوتا ہے اور نائکہ سے اسے خرید کر نکاح کر لیتا ہے جب وزیر کو یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ روشن ضمیر کو اپنے گھر سے نکال دیتا ہے۔ روشن ضمیر مظفر شاہ کے دربار میں جا کر نوکر ہو جاتا ہے۔ ایک دن دربار میں یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ کیا ناچنے گانے کا پیشہ کرنے والی عورت بھی پاک دامن ہو سکتی ہے۔ روشن ضمیر کہتا ہے کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے میری بیوی ایک طوائف ہے اور پاک دامن ہے اس پر ایک وزیر یقین نہیں کرتا دونوں میں شرط لگ جاتی ہے وزیر یہ اعلان کر کے جاتا ہے کہ وہ روشن ضمیر کی بیوی کو پھسا کر رہے گا لیکن جب وہ روشن ضمیر کے وطن پہنچتا ہے اور حالات کا جائزہ لیتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مہر انگیز اس کے قابو میں آنے والی نہیں وہ نائکہ کو رشوت دے کر مہر انگیز کا رومال، انگشتری، کٹارا اور تصویر کسی صورت سے حاصل کر لیتا ہے اور اسے مظفر شاہ کو لے جا کر بتلاتا ہے کہ وہ مہر انگیز سے فیض یاب ہو کر آیا ہے اور مہر انگیز نے یہ چیزیں نشانی کے طور پر دی ہیں چوں کہ روشن ضمیر بظاہر شرط ہار گیا ہے اس لیے جیل خانے بھیج دیا جاتا ہے جب مہر انگیز کو اس کا علم ہوتا ہے تو وہ طوائف کے بھیس میں مظفر شاہ کے دربار میں جاتی ہے ناچ گا کر اسے خوش کرتی ہے اور شکایت کرتی ہے کہ وزیر ایک رات اس کے گھر رہا تھا اور خرچی دیے بغیر چلا آیا۔ اب اس کی خرچی دلوائی جائے وزیر بار بار قسمیں کھاتا ہے کہ وہ اس عورت کی شکل پہلی بار دیکھ رہا ہے یہ عورت مکار اور جھوٹی ہے آخر کار مہر نگار اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس نے نائکہ سے مل کر وہ چیز حاصل کی تھیں اور مہر نگار پاکباز ہے۔ روشن ضمیر آزاد کر دیا جاتا ہے اور آخر کار یہ راز بھی کھل جاتا ہے کہ مظفر شاہ اور مہر نگار بہن بھائی ہیں۔

ان تینوں ڈراموں کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اسٹارٹ تو تینوں ایک ہی جگہ سے لیتے ہیں لیکن تھوڑی دور ساتھ ساتھ چلنے کے بعد الگ الگ ٹریک میں دوڑنے لگتے ہیں رونق مکمل طور پر ہامان کو موضوع بناتے ہیں تو حافظ عبداللہ مظفر اور مہر نگار کے کرداروں پر زور دیتے ہیں جب کہ مولوی کریم الدین مراد مہر انگیز کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور پلاٹ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ گرہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہیں اور دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ سید وقار عظیم فرماتے ہیں کہ "گلستان خاندان ہامان کا مطالعہ نئے نقطہ نظر سے کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار نے اسے مختلف حیثیتوں سے دلچسپ بنانے کی کوشش اور قصہ کے پلاٹ سے قطع نظر (جو اسے پہلے سے بنا بنایا ہوا مل گیا ہے) اس نے مناظر کی ترتیب میں خاصی کاوش سے کام لیا ہے۔" (کریم الدین مراد کے ڈرامے مرتبہ سید امتیاز علی تاج ص ۱۹) گویا سید وقار عظیم بھی ڈاکٹر

نامی کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہیں کہ مراد نے رونق کے پلاٹ سے استفادہ کیا ہے۔ حالاں کہ مراد نے پلاٹ میں ایسی تبدیلیاں کردی ہیں کہ وہ ایک علاحدہ ڈرامہ بن گیا ہے اور اس کا رونق کے پلاٹ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اگر ہم مراد کے ڈرامے سے پہلا ایکٹ نکال دیں تو دوسرا اور تیسرا ایکٹ ہی ایک مکمل ڈراما ہوگا جس میں فنی اعتبار سے زیادہ ڈرامائیت ہوگی اور پلاٹ دو حصوں میں بٹا ہوا نہ ہوگا جس نے ڈرامے میں ایک سقم پیدا کر دیا ہے۔

مراد کے ڈرامے کے دوسرے اور تیسرے ایکٹ کے سلسلے میں ہمیں حسینی میاں ظریف کے ایک ڈرامے کو مرتب کر کے "ظریف کے ڈرامے" میں اس یقین کے ساتھ شامل فرمایا ہے کہ حسینی میاں ظریف اس کے مصنف ہیں۔ پروفیسر سید حسن صاحب بھی اس کو ظریف ہی کی تصنیف مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کے سرورق پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "تصنیف کیا ہوا حسینی میاں المتخلص بہ ظریف کا" ڈاکٹر نامی فرماتے ہیں کہ "کتاب کے آخری صفحہ پر تحریر ہے ماہ دستگیر تاریخ ۱۱ کو ابتدا کیا ۲۵ کو انجام پایا ۱۳۱۱ھ" (اردو تھیٹر جلد دوم، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ص ۱۲۹) لیکن تاج صاحب نے اپنے مرتب کیے ہوئے ڈرامے میں اس عبارت کو سرورق پر لکھا ہے۔ تاج صاحب اس ڈرامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ کھیل غالباً ابتدائی زمانے کے نہ صرف کامیاب بلکہ اس زمانے کی سفری کمپنیوں کے ان مقبول کھیلوں میں سے تھا جو انھوں نے لاہور اور دوسرے مقامات پر پیش کیے۔ یا اس کھیل نے اتنی زیادہ شہرت پائی تھی کہ لاہور میں پیش نہ کیے جانے پر بھی یہاں کے بعض پبلشروں کو اسے شائع کرنا غیر منفعت بخش معلوم نہ ہوا" (ظریف کے ڈرامے: مرتبہ سید امتیاز علی تاج ص ۱۲۷-۱۲۸) لاہور میں اس کے چھپنے کی تصدیق نامی صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں "میاں چراغ الدین سراج الدین تاجر کتب نے اس ڈرامے کو نیرنگ عشق کے نام سے شائع کیا اس پر ۱۳۰۸ھ درج ہے" (اردو تھیٹر جلد دوم: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ص ۱۲۹) ڈاکٹر نامی کے اس بیان نے یہ الجھن پیدا کر دی کہ اگر ان کی دی ہوئی تاریخ ۱۳۱۱ھ صحیح ہے تو یہ ڈراما تین سال پہلے کیسے چھپ گیا جب کہ ظریف خود اس کو ۱۳۱۱ھ کا تصنیف کردہ بتلاتے ہیں اس لیے یہ امکان بعید از قیاس نہیں ہے کہ ۱۳۰۸ھ میں چھپنے والا نیرنگ عشق جس کو میاں چراغ الدین سراج الدین نے لاہور سے شائع کیا ہے کسی غیر معروف مصنف کا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے سرورق پر کسی مصنف کا نام ہی نہ ہو اور ظریف نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس کے مصنف بن بیٹھے ہوں۔ ظریف کے ڈرامے "گلزار عصمت عرف نیرنگ عشق" کا پلاٹ ہو بہو وہی ہے جو مراد کے ڈرامے "گلستان خاندان ہامان" کے دوسرے اور تیسرے ایکٹ کا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہے کہ مراد نے اس غیر معروف مصنف کے پلاٹ سے اپنے دوسرے اور تیسرے ایکٹ میں استفادہ کیا اور ظریف نے یا تو مراد کے ڈرامے کا چربہ اتارا یا پھر اس غیر معروف مصنف کے ڈرامے میں جزوی تبدیلیاں کر کے قبضہ کر لیا اس طرح مراد کا ڈراما "گلستان خاندانِ ہامان" رونق اور غیر معروف ڈراما نگار کے ڈراموں کا مرکب ہے۔

مراد کے ڈرامے "گلستان خاندان ہامان" میں کل سترہ سین ہیں جن کی طوالت میں فرق ہے کوئی بہت مختصر ہے کوئی درمیانی اور کوئی طویل۔ اس سے ڈراما نگار کے احساس فن پر روشنی پڑتی ہے۔ بقول سید وقار عظیم "منظر کا مختصر یا طویل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اسٹیج پر کتنے کرداروں کو آنا ہے اور ان کے لیے کہانی کے رُخ میں اہم یا غیر اہم کس طرح کی تبدیلی ہوتی ہے۔

(کریم الدین مراد کے ڈرامے مرتبہ سید امتیاز علی تاج ص ۲۱۔۲۲) فن کے اس احساس نے ڈرامے کی فنی حیثیت بلند کر دی ہے اور یہ ڈراما رونق اور حافظ عبداللہ کے ڈراموں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بات اور۔ رونق اور حافظ عبداللہ کے ڈرامے منظوم ہیں جب کہ مراد کے ڈرامے میں نظم و نثر کا بہترین امتزاج ہے اس سے قبل لکھے جانے والے ڈراموں میں نظم و نثر کا یہ امتزاج مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نامی اس کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " اس میں مراد بریلوی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ادبی اور چٹخارے دار ہے ایسے لطیف استعارات و کنایات اور برمحل اشعار استعمال کیے ہیں کہ سن کر دل پھڑک اٹھتا ہے " (اردو تھیٹر جلد دوم: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ص ۱۶۰)۔

۳۔ چتر بکاؤلی:۔ یہ ڈراما کریم الدین مراد نے ۱۸۸۵ء میں لکھا ہے یہ تین ایکٹ کا ڈراما ہے پہلے ایکٹ میں پانچ دوسرے میں تین اور تیسرے میں پانچ سین ہیں۔ بکاؤلی کا قصہ سب سے پہلے عزت اللہ بنگالی نے ۱۷۲۲ء میں فارسی میں لکھا تھا پھر نہال چند لاہوری نے اردو میں لکھا دیا تھا گلزار نسیم کی بنیاد بھی بکاؤلی کے قصہ پر ہے اردو کے ابتدائی ڈراما نگاروں کے لیے بھی یہ قصہ دلچسپی کا سبب رہا ہے اور اکثر ڈراما نگاروں نے اس پر ڈرامے اپنے اپنے طور پر لکھے ہیں اگرچہ بنیادی قصہ میں تھوڑے بہت اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ جن ڈراما نگاروں نے اس قصے کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ گل بکاؤلی:۔ آرام
۲۔ نگین بکاؤلی:۔ رونق
۳۔ نگین بکاؤلی:۔ طالب بنارسی
(رونق کے ڈرامے میں معمولی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کئی جگہ رونق کا تخلص بھی موجود ہے)
۴۔ بکاؤلی عرف غنچۂ عشق: ظریف
۵۔ بکاؤلی و تاج الملوک عرف ثمرہ نیک و بد سلوک:۔ حافظ عبداللہ
۶۔ گل بکاؤلی عرف تالک ہمت عالی:۔ مولوی الٰہی بخش نامی
۷۔ چتر بکاؤلی عرف گلزار عاشقی:۔ مرزا نظیر بیگ
۸۔ ثمرہ نیک و بد سلوک معروف بہ عشق بکاؤلی اور تاج الملوک:۔ بی امیر جان ادا

چوں کہ انیسویں صدی کے ہر معروف ڈراما نگار نے بکاؤلی کے قصہ کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا ہے اس لیے ڈاکٹر نامی اسے بہت فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ احسن لکھنوی 'نامۂ احسن' میں لکھتے ہیں کہ " میں ۱۸۹۷ء میں پہلے پہل بمبئی پہنچا ہوں۔ رتن جی فرامجی جو دنیائے ڈرامے کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں ان کی ملازمت کا فخر مجھے سنہ مذکور میں حاصل ہوا۔ دادا بھائی انجمائی چتر بکاؤلی کے طرز نگارش کے والہ و شیدا تھے۔ منشی کریم الدین کے انتقال کے بعد..... ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ڈراما نگاروں کی تلاش میں سرگرداں تھے اسی تلاش میں ایک مرتبہ میں ان کو مل گیا اور چتر بکاؤلی کا نمونہ پیش کر کے مجھ سے اسی زبان میں ڈراما لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ میرا پہلا ڈراما جو کسی مالک کے احمد کنٹرول لکھا گیا وہ

چندراولی ہے صاحبان مذاق جانتے ہیں کہ چترابکاولی کی چٹخارے دار زبان کا جواب چندراولی میں موجود ہے ۔" احسن لکھنوی کے اس بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چترابکاولی اپنے دور کا کس قدر مقبول ڈراما رہا ہوگا کہ اسے نمونہ بنا کر دوسرے ڈرامے لکھوائے جارہے تھے ۔ چترابکاولی کی نمایاں خصوصیت اس کی زبان اور گانے ہیں اس کے گانوں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مرزا نظیر بیگ نے ۱۸۹۴ء میں چترابکاولی عرف گلزار عاشقی لکھا تو اس کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اس میں جو طرزیں استعمال کی ہیں وہ الہ دین علی بابا، چترابکاولی، آب ابلیس اور خاندان ہامان کی طرزوں پر بنائی ہیں ۔ گویا مراد کے دو ڈراموں چترابکاولی اور خاندان ہامان کی طرزیں اس قدر مقبول تھیں کہ ان کی طرزیں دوسرے ڈراما نگار استعمال کررہے تھے ۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ " مکالموں میں استعمال ہونے والی نثر بھی سلیس اور سادہ ہے ۔ جملوں کی ساخت میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے ہم وزن یا ہم قافیہ فقروں سے مدد لی گئی ہے اور اس طرح نثر میں بھی نظم کا سا خوش گوار اور مترنم تاثر پیدا ہوگیا ہے ۔ سادگی کے علاوہ ان جملوں میں جا بجا زبان کا چٹخارہ بھی ملتا ہے اور لطف زبان بھی ۔" (کریم الدین مراد کے ڈرامے : مرتبہ سید امتیاز علی تاج ص ۱۵۴) غرض یہ کہ ہر لحاظ سے چترابکاولی اپنے دور کا ایک اہم ڈراما ہے ۔

۴ ۔ وادی دریا عرف بادشاہ خداداد : ۔ سید امتیاز علی تاج نے اس ڈرامے کو مرتب کرکے " کریم الدین مراد کے ڈرامے " میں شامل فرمایا ہے ۔ یہ تین ایکٹ کا ڈراما ہے پہلے ایکٹ میں بارہ، دوسرے میں دس اور تیسرے میں تین سین ہیں اور ۱۸۹۵ء میں لکھا گیا ہے مولوی کریم الدین نے یہ ڈراما لکھ کر کس ہی کیا تھا کہ کمپنی ٹوٹ گئی پھر پتہ نہیں چلتا کہ اسے کس کمپنی نے کھیلا ۔ اس ڈرامے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس ڈرامے میں چوبیس جگہ ظریف کا تخلص موجود ہے کہیں ظریفو، کہیں ظریف اور کہیں حریف ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

مالک ہے تو حسینوں کا اور یا خداوند گنہ ظریف زار با ہم ۔ یا خداوند
ہستی کی موج سے ٹکرائی صبح و شام ہے دنیا کو اے ظریف ! بالکل نہیں قیام ہے
اس درجہ ہے ظلم کو اگر مجھ سے عداوت رہنا ظریف اچھا نہیں بالکل مرا تجھ کا
ظریفو نہیں کچھ خطا بادشاہ کی مگر میرے حاسد کو میں جانتا ہوں

ڈاکٹر نامی نے ظریف کے ڈراموں کے سلسلے میں اس ڈرامے " بادشاہ خداداد عرف وادی دریا " کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے پلاٹ کا خلاصہ بھی لکھا ہے ان کی اطلاعات کے بہ موجب اس میں چوبیس جگہ ظریف کا تخلص موجود ہے اس میں تین ایکٹ ہیں جن میں پچیس سین ہیں اور سرورق پر یہ رباعی لکھی ہے ۔

از سر تو تماشا یہ تصنیف کر خداداد کا کیا ہے ظریف
چھاپے ہے اس کو بہتا جنا داس کہ دیکھو ہے قابل تعریف

یہ ساقط الوزن اور غیر موزوں اشعار رباعی کیوں کر ہوگئے سمجھ میں نہیں آتا باوجود اس کے کہ

۱ ۔ ظریف کے ڈرامے میں چوبیس جگہ ظریف تخلص آیا ہے مراد کے ڈرامے میں بھی چوبیس جگہ ظریف موجود ہے ۔

۲۔ ظریف کے ڈرامے میں تین ایکٹ اور پچیس سین ہیں۔ مراد کے ڈرامے میں بھی تین ایکٹ اور پچیس سین ہیں۔
۳۔ ڈاکٹر نامی نے ظریف کے ڈرامے کا جو پلاٹ بیان فرمایا ہے ہو بہو وہی پلاٹ مراد کے ڈرامے کا بھی ہے۔
۴۔ ظریف کے نام سے تھا جسنا د اس کا چھاپا ہوا نسخہ بھی موجود ہے۔ پھر بھی امتیاز علی تاج اسے مراد ہی کا ڈراما مانتے ہیں اور انھیں کے ڈراموں میں شامل فرماتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مراد کی جگہ ظریف بہت آسانی سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ظریف کے ڈراموں کی فہرست طویل ہے مگر وہ دوسروں کے ڈرامے ہیں جن کو معمولی تبدیلی کے بعد اور وہ بھی بھونڈی تبدیلی کے بعد ظریف نے اپنا بنالیا ہے لیکن سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ نائب حسین صاحب نقوی نے تاج صاحب کو مراد کے اس ڈرامے کے گانوں کی کتاب بھیجی تھی جب ان گانوں اور ظریف کے گانوں کا مقابلہ تاج صاحب نے کیا تو معلوم ہوا کہ یہ گانے مراد کے ہیں جن پر ظریف نے بلا تکلف قبضہ کرلیا ہے۔ وقار عظیم صاحب نے اس ڈرامے پر جو تبصرہ لکھا ہے اس میں تاج صاحب کی یادداشتوں کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے مراد اور ظریف کے اشعار اوپر نیچے لکھ کر مقابلہ کیا ہے چند اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں۔

ظریف :۔ ظریفو نہیں کچھ خطا بادشاہ کی
مراد :۔ مراد اس میں کیا ہے خطا بادشاہ کی
ظریف :۔ آخر ظریف زادہ پاک کردگار
مراد :۔ آخر مراد وہ ہے پاک کردگار
ظریف :۔ ظریف کیوں کر خشک نہ ہو گلزار جہاں میں نخلِ مراد
مراد :۔ کیوں کر خشک نہ ہو گلزار جہاں میں نخلِ مراد
ظریف :۔ دل میں ظریف بحرِ محبت ہے جوش زن
ظریف :۔ گر نہیں ملتا خدا داد اے ظریف
مراد :۔ گر نہیں ملتا خداداد اے مراد

وقار عظیم صاحب نے ایسے چودہ شعر نقل کیے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ جہاں ظریف نے مراد کے مصرعوں میں علاوہ تخلص داخل کرنے کے چھیڑ چھاڑ کی ہے مصرعے ساقط الوزن اور اکثر بے معنی ہوگئے ہیں اس سے تاج صاحب نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ اصل ڈراما مراد کا ہے اور ظریف مقطعوں میں ردوبدل کرکے اس کے مالک بن بیٹھے ہیں اور پھر تاج صاحب نے بلا تکلف اسے مراد کے ڈراموں میں شامل کرلیا ہے باوجود اس کے کہ اس میں بار بار ظریف تخلص آیا ہے۔

اس ڈرامے میں زبان کی کچھ ایسی غلطیاں نظر آتی ہیں جو مراد کے دوسرے ڈراموں میں نہیں ہیں مثلاً

۱۔ کرکے ظلم وزیر بہ بیداد
۲۔ اللہ تجھے بسائی سردار بنایا

۳۔ میں دیکھی یہی شکل تھی خواب میں

۴۔ خدا میری شکل کو آسان کیا ——— وغیرہ

اسی طرح کی اور بھی مثالیں ہیں جن میں فاعل کے ساتھ "نے" کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے جس کی توقع مراد سے نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ تذکیر و تانیث کی غلطیاں موجود ہیں بعض جگہ اس کے بجائے یہ اور اس کے بجائے وہ بھی ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ ظریف ہی کی چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ ہو اور تاج صاحب نے مراد کا ڈراما ظریف کے نسخہ سے مرتب کیا ہو ایسا معلوم ہوتا ہے۔

زبان کی غلطیوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ڈرامے میں بہت سی فنی خوبیاں موجود ہیں ایک تو وہی جوان کے ہر ڈرامے میں موجود ہے یعنی نظم و نثر کا حسین امتزاج۔ اس کے علاوہ ایک چیز جو اس ڈرامے میں بطورِ خاص نظر آتی وہ یہ اگر کہیں گانے کا محل نہیں ہے لیکن موقع ایسا ہے کہ نثر کے بجائے نظم استعمال کی جائے تو مراد نے مکالموں میں صرف ایک مصرعے سے کام چلایا ہے جس سے مراد کے احساسِ فن کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پورے ڈرامے میں بڑے ہلکے پھلکے انداز میں مزاح کی چاشنی موجود ہے کوئی کردار بھرتی کا نہیں یہاں تک کہ مزاحیہ کردار بھی ڈرامے میں اپنا کردار مناسب طور پر انجام دیتا ہے۔ ڈرامے کی یہ خوبیاں ایسی ہیں جو ڈرامے کو مراد کا ثابت کرتی ہیں کہ ظریف کے متعلق احسن لکھنوی کا یہ قول لفظ بہ لفظ صحیح ہے کہ "جو کچھ کہتے خود بھی نہ سمجھتے"۔ ایسی صورت میں ان سے ایسے اچھے ڈرامے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کریم الدین مراد اپنے دور کے باکمال فن کار تھے۔ احسن لکھنوی ان کو اپنا استاد روحانی مانتے اور ان کے فن کو قابلِ تقلید قرار دیتے ہیں نامۂ احسن میں لکھتے ہیں کہ "خاندانِ ہامان، خداداد، چترا لکا وٗلی ان کے کارنامے ہیں وہ پچاس برس پہلے وہ کام کر گئے جس کی باعتبارِ ترقی آج یعنی پچاس برس کے بعد امید کی جا سکتی تھی۔ عورتوں کی زبان محبت کے سین، سہیلیوں کی شوخی دربار نسواں کی مہذب ظرافتیں لکھنے میں جھلک دکھاتے ہیں .... ان کی نثر فصاحت سے ممزوج ہے ان کا خیال ترفع سے وابستہ ہے ان کا کمال فن محاسن سے مالامال ہے اگر وہ زندہ ہوتے تو سفید ڈاڑھی کے سامنے سیاہ موچھوں والوں کا چراغ نہ جلتا"۔ ان کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر نامی کی رائے گلستان خاندانِ ہامان کے سلسلے میں بیان کی جا چکی ہے۔ ان کی زبان کی تعریف سب ہی نے کی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب ان کے یہاں وہ خامیاں نظر آتی ہیں جن کی نشاندہی خداداد کے سلسلے میں کی گئی ہے تو تعجب ہوتا ہے۔ سید وقار عظیم کا خیال ہے کہ ایسی غلطیاں اس آواگون کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ ڈراما اردو میں لکھا جاتا تھا اور پھر گجراتی رسم الخط میں چھپتا تھا اور پھر گجراتی سے اردو میں۔ اس آواگون میں جو غلطیاں پیدا ہوئی تھیں اردو میں طباعت کے وقت ان پر دھیان نہیں دیا جاتا تھا اس لیے اس قسم کی غلطیوں کو مصنف کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔

مراد اپنے نثری مکالموں میں چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتے ہیں اور یہ عموماً مقفیٰ ہوتے ہیں لیکن ثقیل اور پرشکوہ الفاظ کا استعمال نہیں کرتے چوں کہ جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اس لیے قافیے پاس پاس آتے ہیں جس سے نثر میں ترنم پیدا ہوتا ہے ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وزیر:— اے واہ ری تیری سفا کی بے باکی، خوب پھلواری تا کی، جن شہزادوں کو عطا کی چالاکی ایسے ہی تمہاری طرح وعظ سناتے ہیں، ساذی کا بھیس بناتے ہیں، غیر ملک میں جاتے ہیں، رعیت سے فوج و سپاہ کی ٹٹول لگاتے ہیں

موقع جب اپنے دل کے مطابق پاتے ہیں تو محمود شاہ غزنوی کی طرح دھر دباتے ہیں۔

(چترا بکاؤلی:۔ باب تیسرا۔ پردہ دوسرا)

مسخرا:۔ میں الماس شاہ کو عاقل سمجھتا تھا مگر وہ پاگل نکلا بھلا سوچو تو ایک آرزو اتنے شہزادوں کا کیا کرے گی۔ آخر ایک ہی سے شادی ہوگی۔ باقی سب نامراد ہوں گے۔ تو یہ تو یہ سینکڑوں شاہزادوں کو ناحق تکلیف دینا کیا ضرور تھا اگر بادشاہ آرزو کی شادی کا مجھ سے مشورہ لیتے تو خوب تھا۔ کیوں کہ میں وہ پہلوان، جوان، ہاتھ میں تیر و کمان، بر سرِ میدان، شہر کروں ویران، آرزو اگر دیکھے میری شان ہووے گی قربان، کردے گی مال یان مگر میں ایسا نہیں نادان جو مانوں اس کا فرمان، وہ شہزادی میں عالی خاندان، کہاں زمیں آسمان، کہاں اس کی شوکت اور کدھر میری شان، وہ عورت میں مرد، وہ ہوا میں گرد، وہ گرم میں سرد، وہ جوڑا میں فرد، وہ آرام میں درد، وہ سرخ میں زرد، وہ بساط میں نرد، واہ واہ کیا میں شطرنج کھیلتا ہوں یا باتیں کر رہا ہوں، خیر گزشتہ را صلواۃ۔

(بادشاہ خداداد: باب پہلا پردہ آٹھواں)

میں نے جان بوجھ کر یہ طویل مکالمے انتخاب کیے ہیں ورنہ ان کے مکالمے بالعموم مختصر ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے جہاں گانے کا محل نہیں ہوتا وہاں مکالمے میں وہ اکثر ایک مصرعے سے کام چلاتے ہیں جس سے گفتگو میں دلچسپی برقرار رہتی ہے ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وزیر:۔ افسوس کس بلا میں گرفتار ہو گیا
نائکہ:۔ تم سے ہزاروں آکے یہاں پا گئے مزا
وزیر:۔ ممکن نہیں وصال تو دیدار ہو نصیب
نائکہ:۔ طاقت فرشتوں کی نہیں انسان ہے کیا غریب
وزیر:۔ کیا ایسی نیک چال ہے صاحب ! مہر نگار
نائکہ:۔ پھر کیا کہوں چھنال ہے صاحب ! مہر نگار

(گلستان خاندان ہامان: تیسرا باب۔ دوسرا پردہ)

ہامان:۔ یہاں کون ہے دکھا بھی لے ساغر
مظفر:۔ خدا کی نظر سے ہے کیا چیز باہر

ہامان :۔ ارے نادان کہہ یہ کہ کہاں خدا ہے
مظفر : ستون میں شجر میں، خدا جا بجا ہے
ہامان :۔ خدا ہے ستون میں بھی کہتا ہے نادان
مظفر :۔ وہ ہر شئے میں موجود ہے میرا سبحان

(گلستان خاندان ہامان : پہلا باب : آٹھواں منظر)

وزیر :۔ الفت تمہارے جیلے کی کیا دل سے ڈھل گئی
بکاؤلی :۔ وہ خواب کی تھی بات پر اب آنکھ کھل گئی

(چترابکاؤلی : باب تیسرا۔ پردہ پانچواں)

مراد بالعموم چھوٹی بحروں کا استعمال کرتے ہیں جہاں بڑی بحروں کا استعمال کرتے ہیں وہاں مصرعے کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں کہ انھیں پڑھنے یا بولنے میں دقت نہ ہو۔ مثلاً

کوئی ہے تاج الملوک نامی مسافرت میں چلا ہوا ہے
جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی مگر بلا کا بنا ہوا ہے
جو پوچھو پورب بتا دے پچھم کسی نے پایا نہ اس کا مطلب
لباس تن پر امیروں کا جیک ویک کا سجا ہوا ہے
ہماری تعمیل یہ بجاؤ جہاں ہو تم اس کو ڈھونڈ لاؤ
حضوری میں اس کو بھیج دو تم، دلوں میں کھٹکا پڑا ہوا ہے

(چترابکاؤلی : باب تیسرا۔ پردہ پہلا)

مراد اپنے ڈراموں کو دلچسپ بنانے کے لیے مزاح سے کام لیتے ہیں لیکن یہ مزاح عمل سے نہیں بلکہ مکالمے سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ڈرامے خداداد میں آرزو دے شادی کے خواستگار شہزادے آتے ہیں۔ ان شہزادوں پر درباری مسخرے کے ریمارک ملاحظہ ہوں۔ ہرات کے شہزادے کے بارے میں کہتا ہے

مسخرا :۔ ہائے ہائے یہ باوا آدم کی نشانی عوج بن عنق کا ثانی۔ پندرہ فٹ کا جوان بس سند صور کہاں سے آیا۔ البتہ آرزو دان کو قبول فرمائے گی کیوں کہ تمبو کو چوب کی حاجت نہیں۔ اس کو بیچ میں کھڑا کر کے تمبو تان چوگردی میں میخیں ٹھونک دینا۔ توبہ توبہ یہ آدمی ہے یا بلا

جب چین کا شہزادہ واپس جانے لگتا ہے تو ریمارک ملاحظہ ہو

مسخرا:- ٹھنڈے ٹھنڈے چین کو جلدی سدھارو ناہداریاں نہیں کھانے ملے گا چوہے مینڈک کا اچار

پولس کس طرح معصوم لوگوں کو نشانہ بنا کر اپنی جیبیں بھرتی ہے اس پر مراد نے طنز کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ کوتوالی کے سامنے سپاہی گزری ہوئی رات کی رپورٹ پیش کر رہے ہیں کہ انھوں نے رات کو کیا کیا کارنامے انجام دیے ہیں کوئی کسی دوکان کا تالا کھلا ہوا پاکر اس میں سے سامان مار لیتا ہے کوئی کسی چور کے گھر میں موربن کر داخل ہوجاتا ہے کوئی کسی کو بلا وجہ پکڑ کر رشوت لے لیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

تیسرا سپاہی:- سنیے حضرت، پٹھان کی فطرت، میرے پہرے کا ٹھکانہ تھا، دو گولی کا پلہ، چڑی مار محلہ، دیکھا جو ایک مال دار اللہ بلا، لکھنو کا چھیلا، بغل میں داغے مصلا، میں نے لگا دیا بہتان کا ٹھلا، ابے تو چرا لایا ہے گلا، پھر تو بات بات میں کرنے لگا واللہ یا اللہ، آخر ش دے کے اس نے سونے کا چھلا مجھ سے چھڑایا پلا، میں بجاتا ہوا کلا، کرنے لگا جاگو جاگو کا ہلا، اللہ اللہ خیر سلا۔

چتر ابکاؤلی: باب تیسرا۔ پردہ پہلا

ان کی نظم کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ "جس طرح مکالموں کی نثر صاف ستھری ہے اسی طرح عموماً مکالموں میں آنے والے اشعار کی زبان بھی آسان ہے اس میں شبہ نہیں کہ شعروں اور مصرعوں میں جابجا تعقید بھی ہے لیکن خاصے اشعار ایسے بھی ہیں جو تعقید کے عیب سے خالی ہیں خواہ ان میں لطف شعر نہ ہو۔" (کریم الدین مراد کے ڈرامے: مرتبہ سید امتیاز علی تاج ص ۲۶)

مراد کے ڈراموں میں ان کے فن کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ وہ ڈرامے کی تدبیر کاری میں اختصار کو مد نظر رکھتے ہیں اور سین کی طوالت کو اس طرح قائم کرتے ہیں جتنا کہ وہ سین واقعات کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے نیز سین کی طوالت پر کرداروں کے اسٹیج پر آنا بھی اثر انداز ہوتا ہے اگر سین میں زیادہ کردار نمودار ہوتے ہیں تو سین قدرے طویل ہوجاتا ہے اور اسی مناسبت سے واقعات بھی آگے بڑھتے ہیں اور اگر ایک یا دو کردار اسٹیج پر آتے ہیں تو سین کی طوالت اسی مناسبت سے کم ہوجاتی ہے سین کی یہ فن کارانہ تدبیر کاری ناظر کو بور نہیں ہونے دیتی۔ فن کا یہ احساس ہمیں دوسرے ڈرامانگاروں کے یہاں کم ملتا ہے۔ مراد کے یہاں نہ تو کوئی کردار بھرتی کا ہوتا ہے اور نہ غیر اہم اگر کسی کردار کو غیر اہم سمجھ کر نکال دیا جائے تو ڈرامے کی کڑیاں بکھر جائیں گی یہاں تک کہ مسخرہ جو بظاہر مسخرہ معلوم ہوتا ہے ڈرامے کے واقعات کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ ان کے کردار بھی بالعموم ان کے ہم عصر ڈرامانگاروں کے کرداروں کی طرح بے جان مورتوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ واقعات سے متاثر ہوتے اور واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں

غرض یہ کہ مراد اپنے دور کے ایک اہم فن کار تھے اور اگر احسن لکھنوی ان کو اپنا استاد روحانی مانتے ہیں تو کچھ غلط نہیں کرتے۔

نصیر احمد نصیر گھگی

○

بھنور میں تھا نہ کسی موج کے بہاؤ میں تھا
کوئی نقص ہماری انا کی ناؤ میں تھا
اسی کو ڈھونڈ رہی ہے مرے لہو کی شفق
چھپا ہوا جو رگِ جاں کے گھاؤ گھاؤ میں تھا
متاعِ برگ و ثمر لے گئی خزاں ورنہ
بڑا غرور تری شاخ کے جھکاؤ میں تھا
پگھل کے پھیل گئے نفرتوں کے سنگِ گراں
کچھ ایسا سحر تری بات کی کٹاؤ میں تھا
سلگتے پھول پہ شبنم چمک اٹھی تو نصیر
بڑا سکون مرے درد کے الاؤ میں تھا

▲

امان ارشد

○

ذرّہ ذرّہ میں ایک عالم ہے
اور مجھے فرصتِ نظر کم ہے
جادۂ جستجوئے یار کی شرط
دشتِ امکاں میں جہدِ پیہم ہے
مطمئن ہوں کہ میرا زادِ سفر
دلِ پرسوز و دیدۂ نم ہے
یاس و حرماں کے خشک پتوں پر
گریۂ نیم شب کی شبنم ہے
آپ جس کو سمجھ نہیں سکتے
بس اسی بات کا مجھے غم ہے
خلعتِ زخم پر ہے ناز مجھے
باعثِ شرم فکرِ مرہم ہے
ظلمتوں میں ہے رہنما اب بھی
شعلۂ دل اگرچہ مدھم ہے
ترک کر دی منافقت جب سے
ہائے ہر شخص مجھ سے برہم ہے

▲

پروفیسر ریاض صدیقی

"اقبال سب کے لیے" ایک مطالعہ

پچھلے دو تین سال اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں کہ اقبالیات کے موضوع پر بہت سی نئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور مصنفین نے اس قلم رو میں نئے گوشے تلاش کرنے کی سعی کی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اقبال سب کے لیے" اسی تلاش کا حاصل ہے۔ معنی و مقاصد اور زبان و بیان کے پس منظر میں یہ تصنیف اقبالیات کی قلم رو میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ گذشتہ دہائیوں میں اقبال کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کی تعبیر و تشریح کے سلسلے میں بڑے کارہائے نمایاں منظرِ عام پر آتے رہے ہیں۔ اہلِ نظر اور اقبال پر عبور رکھنے والوں نے بھی برصغیر کے مختلف علمی و ادبی مراکز میں رہتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق کام کیا ہے اور سرکاری و نیم سرکاری اداروں نے بھی تحقیقی۔ سوانحی۔ تجزیاتی اور تنقیدی سرمائے میں اضافے کئے ہیں اقبال کے افکار و نظریات اور ان کی شخصیت کو بین الاقوامی سطح پر بھی ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ اقبال پر تحقیق کرنے والوں نے ان تمام موضوعات کا احاطہ ضرور کیا ہے لیکن زیرِ نظر تصنیف میں اقبال کی آفاقی شخصیت پر جس نقطۂ نظر اور تجزیاتی انداز میں ڈاکٹر فرمان نے روشنی ڈالی ہے وہ تصویر کا ایک نیا رخ پیش کرتی ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ کون سی ذہنی و فکری اور تخلیقی صلاحیتیں ہیں جن کی بناء پر انھیں زندگی ہی میں ایک عظیم فن کار اور مفکر کی حیثیت سے برصغیر اور مغربی ممالک میں قبولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ "اقبال کا عہد عظیم مفکروں دانشوروں فن کاروں اور سیاسی شخصیات اور سائنس دانوں کا عہد تھا اور ان بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیات کے اطراف رہتے ہوئے عالمی شہرت کا اعزاز حاصل کر لینا غیر معمولی صلاحیتوں کی دلیل ہے"۔

"اقبال سب کے لیے" میں مصنف نے اس حقیقت کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے کہ اقبال کو بحیثیت شاعر انسان سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اہلِ نقد و نظر نے شروع ہی سے اس عظیم آفاقی شخصیت کو فلسفی اور مفکر کا لباس پہنا کر اس کے افکار و نظریات کو فلسفیانہ اور عالمانہ اسلوب بیان کے تنگ دائرے میں محیط کر دیا۔ چنانچہ اقبال کے عوام اور نئی نسل کے درمیان فاصلوں کی دیوار کھڑی ہو گئی" اقبال سب کے لیے" ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتی ہے کہ اقبال ایک آزاد فکری مزاج رکھتا ہے اور اس نے اسلام کو اس کی حقیقی روح معنوی اعتبار سے ایک مکمل انقلاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس کے افکار و نظریات کلیتاً کسی بھی دینی مکتبۂ فکر کی ترجمانی نہیں کرتے ہیں۔ آج جب کہ اقبال کو سیاسی محاذ آرائی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور مختلف دینی مکاتبِ فکر سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے اقبال کو پارٹی لائن کے ترجمان کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں، اس حقیقت کا اظہار سب سے بڑی ضرورت بن گیا ہے۔ اقبال پر کام کرنے والے اداروں اور

اقبال کے نقادوں نے ابھی تک کوئی ایسی دستاویز پیش نہیں کی ہے جس میں زبان و بیان کی ایک خاص سطح کو برقرار رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہو۔ زیرِ نظر تصنیف کا سب سے اہم پہلو زبان و بیان کی وہ سطح ہے جو موضوع و مباحث کو عام تعلیم یافتہ لوگوں۔ نئی نسل اور طلبا و طالبات کے لیے قابلِ قبول بناتی ہے۔ مصنف اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہے کہ سماجی و مادّی ماحول میں تغیر و ارتقا کے ساتھ ساتھ ذہنی و فکری سطح اور طرزِ اظہار کے اسالیب بھی بدل جاتے ہیں۔ "اقبال سب کے لیے" میں موضوعات کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے کہ اقبال کی پوری شخصیت اور اس کے افکار و نظریات کا احاطہ ہو سکے۔ چنانچہ یہ فہرست "کتاب سے پہلے"۔ "ماحول زندگی اور شخصیت"۔ "تصانیفِ اقبال"۔ "فلسفۂ خودی"۔ "تصورِ تعلیم"۔ "سیاسی افکار و تحریکِ پاکستان"۔ "دنیائے اسلام و اقبال"۔ "اقبال کا فن اور نظریۂ فن"۔ "اقبال کا تصورِ عقل و عشق"۔ "اقبال پر مغرب و مشرق کے اثرات"۔ "اردو شاعری"۔ "فارسی شاعری"۔ "اقبال اور نئی نسل"۔ اور "علمی دنیا پر اقبال کے اثرات" پر مشتمل ہے۔ ماحول زندگی اور شخصیت کے ذکر میں اقبال کے عہد اور ان کے سوانحی کوائف کو نہایت خوش اسلوبی سے سمیٹا گیا ہے اس موضوع پر حقائق و تفصیلات کی صحت مندی کو نظر انداز کئے بغیر فاضل مصنف نے سوانحی تحقیق کی تازہ ترین معلومات سے استفادہ کیا ہے۔ "اقبال سب کے لیے" سے پہلے اقبال کی سوانح پر متعدد کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں لیکن شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو تاریخ کے سنین اور واقعات و حالات کے اعتبار سے مستند اور قطعی قرار دی جا سکے۔ سوانحی تفصیلات میں اقبال کے خاندانی ماضی پر حوالوں اور دلائل کے تحت اظہارِ رائے ہوا ہے اور کشمیری برہمن گھرانے سے ان کے تعلق کی وضاحت کی گئی ہے۔ تصانیفِ اقبال پر تفصیلی بحث میں ان تمام مسودوں کا ذکر کیا گیا ہے جو زیرِ ترتیب تھے یا مکمل ہو چکے تھے لیکن زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئے۔ ساتھ وہ درسی کتب اور دیگر کتابیں بھی زیرِ بحث آئی ہیں جو اقبال کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے اقبال کی انسان دوستی ان کے غیر فرقہ وارانہ طرزِ عمل اور آفاقی حیثیت پر خصوصیت کے ساتھ کھل کر بحث کی ہے یہ بحث درحقیقت ان علما اور مکاتبِ فکر کے حوالے سے اٹھائی گئی ہے جو اقبال کو محض مسلمانوں کا شاعر تصوّر کرتے ہیں اور اس پر مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کے الزامات عاید کرتے ہیں۔ اقبال کی انسان دوستی اور عدمِ فرقہ واریت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سری شنکر راما نج۔ بھرتری ہری۔ گوتم۔ گرونانک۔ تلسی داس۔ سری کرشن۔ مارکس اور قرۃ العین طاہرہ جیسی شخصیات کی صرف تعریف ہی نہیں کی ہے بلکہ خلوصِ دل سے ان کے لیے عقیدت و احترام کا اظہار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ سوال کہ بین الاقوامی سطح پر ٹیگور۔ ملٹن۔ فردوسی۔ دانتے۔ تلسی داس اور گوئٹے کے مقابلے میں اقبال کو صرف اس لیے کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اسلامی افکار و نظریات کی تعبیر و تشریح کو مقصدِ حیات جاننے والے اس شاعر کے یہاں ان اقدار کی ترجمانی بھی ہوئی ہے جو ساری انسانیت کے لیے مشترکہ میراث ہیں۔ ملٹن۔ دانتے اور گوئٹے عالمی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں حالاں کہ ان شہرۂ آفاق شعرا کا بنیادی موضوع بھی مذہبی تبلیغ ہے بلکہ ان میں سے بعضوں نے دوسرے مذاہب اور ان کے پیشواؤں کی توہین و تضحیک بھی کی ہے۔ اقبال کے یہاں اس کے برعکس ہر عظیم انسان بلا امتیازِ رنگ و نسل اور عقائد محترم ہے۔

ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی ملت ہی کو اپنا حقیقی مخاطب بنایا ہے اور اس لحاظ سے ان کا پیغام عمومی ہوتے ہوئے بھی خاص علاقوں اور گروہوں کے لیے مخصوص ہے بلکہ ان میں سے بعض نے تو کھل کر اپنے مذہب کی پُرجوش تبلیغ کے ساتھ

دوسرے مذاہب اور ان کے بانیوں پر رکیک حملے بھی کیے ہیں۔ اب اگر اس گناہ کے باوجود ان کی شاعری صرف ان کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے اور اس کا لب ولہجہ، ہمہ گیر و آفاقی ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اقبال بھی کسی خاص علاقہ یا ملت کا شاعر نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کا شاعر ہے اور اس کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں سب کے لیے ہے۔ اقبال سب کے لیے ص ۔ ۱۰۰

زیرِ نظر تصنیف اس اعتبار سے بھی قابلِ ستائش ہے کہ یہاں اقبال کے نظریۂ تعلیم کا سنجیدہ حقائق کے تحت جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال کا نظریۂ تعلیم، فہرست عنوانات کا کوئی ایسا جزو نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ ایک مکمل اور مستند دستاویز ہے۔ ماضی میں اس موضوع پر جس قدر بھی لکھا گیا ہے ٹیکنیکی اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ بعض عقیدت مندوں نے تو اقبال کے افکار و نظریات ہی سے ان کا نظریۂ تعلیم دریافت کر لیا ہے۔ خواجہ غلام السیدین کی تصنیف " اقبال کا فلسفۂ تعلیم" اسی رویے کا مظہر ہے۔ اقبال کے نظریۂ تعلیم پر نور الحسن اور عائشہ بلقیس عمر نے بھی شعری افکار ہی کی مدد سے موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب نے تعلیم کے موضوع کا اس کی ٹیکنیکی تعریف کے تحت احاطہ کیا ہے جس میں نصاب۔ مدرسہ۔ تنظیم۔ اور طریقہ ہائے تعلیم (METHODOLOGY) جیسے اجزا شامل ہیں۔ اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال، طرزِ تعلیم، طریقۂ تعلیم اور تنظیم جیسے مسائل سے ناآشنا نہیں تھے تعلیم کے مسئلے سے اقبال کی دل چسپی کا آغاز ۱۹۱۲ء سے ہوتا ہے اسی سال انھوں نے امپیریل کونسل میں پیش کرنے والے "جبری تعلیم" کے نقطۂ نظر سے اتفاق کا اعلان کیا تھا اور مسلمانوں کو اس کی مخالفت سے باز رکھنے کے لیے ۱۸ فروری ۱۹۱۲ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں ایک بڑے جلسے سے خطاب بھی کیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سینٹ میں جے۔ ایف بروس کی یہ تجویز کہ تاریخ اسلام کو اعلیٰ درجوں کے نصاب سے خارج کر دیا جائے اقبال کے لیے قابلِ قبول نہ تھی، انھوں نے نہ صرف تجویز کی مخالفت کی بلکہ اس کے خلاف پبلک بیانات بھی دیے اور احتجاجی جلسے کا اہتمام بھی کیا۔ تاریخ اسلام کی نصابی اہمیت کا احاطہ کرتے ہوئے اقبال نے مسئلہ کا عالمانہ تجزیہ کیا اور یہ تجزیہ کسی طرح بھی ایک ماہرِ تعلیم کے تجزیے سے کم نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ صرف ایک قوم کی تاریخ نہیں بلکہ اجتماعی حیثیت سے روحِ انسانی کی عکاس اور پورے عالمِ انسانی کی تاریخ ہوتی ہے۔ چناں چہ تاریخ اسلام بھی صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ کُل اقوامِ عالم کی تاریخ ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کی تعلیمی تحریک، تنظیم اور نصابی سرگرمیوں سے ان کی علمی دل چسپی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اسلامیات کے نصاب سے متعلق علی گڑھ، پنجاب یونیورسٹی۔ دیوبند اور ندوہ کے حوالوں سے اقبال نے طرزِ تعلیم کا ایک لائحہ عمل بھی متعین کیا تھا۔ وہ پنجاب میں ایک تعلیمی اسلامی مرکز کے قیام کا منصوبہ بھی تیار کر چکے تھے جیسا کہ شیخ الجامعہ الازہر کے نام لکھے گئے مکتوب سے ثابت ہوتا ہے۔ ۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی میں وائسرائے نے جو تعلیمی کانفرنس طلب کی تھی اقبال بھی اس میں مدعو تھے اور اس سب کمیٹی کے بھی رکن تھے جو لندن میں قایم کی گئی تھی۔ تعلیم کے نصاب اور انتظامات جیسے مسائل پر سفارشات پیش کرنے کے لیے حکومت افغانستان کی دعوت پر اقبال سید سلیمان ندوی اور راس مسعود کے ساتھ افغانستان بھی گئے تھے۔ ان تمام حقائق کو مجتمع کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا نظریۂ تعلیم محض شعری اور فکری حلقہ تک محدود نہ تھا بلکہ نظامِ تعلیم کی میکنک پر بھی انھیں گرفت حاصل تھی، اقبال کی شاعری اور افکار و نظریات کی تہوں میں اگر کوئی تعلیمی فلسفہ تلاش کیا جا سکتا ہے تو وہ ان کا نظری رویہ ہے جس کو مصنف نے جامع انداز میں مختصراً بیان کیا ہے۔

وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جس کی بنیاد رنگ و نسل یا علاقائی تفریق کے بجائے اخوتِ انسانی اور عالمگیر انسانی برادری پر رکھی گئی ہو۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تعلیمی درس گاہیں آدمی کو انسان بنائیں، دماغ کے ساتھ روح کی غذا کا سامان بھی فراہم کریں، دنیاداری کے ساتھ دین داری بھی سکھائیں۔ علم و فکر کی روشنی کے ساتھ قلب و نظر کی روشنی بھی عام کریں مادی وسائل کے ساتھ ساتھ باطنی شعور و خود آگہی کی قوتوں سے بھی کام لیں۔"

(اقبال سب کے لیے۔ ص ۱۰۸ اور ۱۲۰)

مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی شیرازہ بندی کا احاطہ کرتے ہوئے اقبال نے مشرقی طرزِ تعلیم کی قدامت پسندی پر ہمیشہ تنقید کی ہے دوسری جانب مغربی طرزِ تعلیم کی خالص مادیت سے بھی انھیں اختلاف رہا ہے۔ جدید سائنسی تعلیم اور علوم کے وہ قطعاً مخالف نہ تھے اس حقیقت کا اظہار ان کے خطبات میں جابجا ہوا ہے۔ اقبال باطنی شعور کا ذکر کرتے رہے ہیں لیکن یہ باطنی شعور فلسفۂ تصوف کی تعلیمات سے تعلق نہیں رکھتا وہ ایسی تعلیم و تربیت سے اختلاف کرتے ہیں جو افراد کو ترکِ دنیا کا سبق دے اور ان کی مجتمع قوتوں کو مضمحل کرنے کا سبب بن جائے۔ موضوعات کی فہرست میں اقبال اور عقل و عشق جیسے موضوع پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بحث ایک نئے اور قابلِ قبول نقطۂ نظر کی نشاندہی کرتی ہے اس موضوع پر آج تک جتنی بھی آرا قلم بند ہوئی ہیں انتہا پسندانہ نقطۂ نظر کی عکاس ہیں، علماء کا ایک طبقہ مصر ہے کہ اقبال عقل کی نفی کرتے ہیں چنانچہ ان کا شمار رجعت پسندوں میں کیا جانا چاہیے جب کہ بعض اہلِ نظر اس الزام کی تردید کرتے ہیں لیکن تردید کے حق میں منطقی دلائل فراہم نہیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دلائل و حقائق کے پس منظر میں اس مسئلے سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اقبال عقل کی برتری اور اس کے کردار کی نفی نہیں کرتے بلکہ وہ تو وجدان جیسے حسی وسیلے کو بھی عقل ہی کا ایک ترقی یافتہ شعبہ (FACULTY) تصور کرتے ہیں اقبال کا عشق جو کہ جذبہ کے ارتکاز اور باطنی قوتوں کی تسخیر کا ترجمہ ہے اردو شاعری کے روایتی تصورِ عشق سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس خیال کو وسعت دیتے ہوئے مصنف نے ایک ایسا نیا گوشہ تلاش کیا ہے جس کی طرف صاحبانِ نظر کی توجہ نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اقبال ——— طالب کو مطلوب میں گم کر دینے یا فنافی الشیخ کا قائل نہیں ہے وہ اپنے مطلوب کا دیدار و وصال ضرور چاہتا ہے لیکن ایک خاص فاصلے سے جہاں اس کے وجود یا احساسِ وجود کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ اقبال کا عشق قرب و وصالِ محبوب کے سلسلے میں اتنا محتاط ہے کہ اگر اس کے وجود کا ایک ذرہ بھی خطرے میں ہو تو وہ اس قسم کے وصال یا قرب کو قبول نہیں کرتا۔"

(اقبال سب کے لیے ص ۲۵۳ - ۲۵۴)

اس اقتباس سے احترامِ انسانیت اور عظمتِ انسانیت کا وہ رویہ ثابت ہوتا ہے جو ہمیشہ اقبال پر حاوی رہا یہی وجہ ہے کہ اقبال 'مقامِ بندگی' دے کر شانِ خداوندی لینے سے گریز کرتے ہیں۔ عقل کی برتری اور اس کے کردار کی توضیح کرتے ہوئے فرمان صاحب لکھتے ہیں۔

"انسانی زندگی کی مادی ترقی میں علم و عقل کی رہنمائی کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں البتہ روحانی ترقی عشق کی رہبری کی محتاج ہے۔ اقبال کا دعویٰ ہے کہ عشق و جنون کی سرمستی میں بھی اوروں کی طرح نہ تو وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے ہیں اور نہ

پاس گریباں سے غافل رہتے ہیں ـــــ ایک جگہ انھوں نے بتایا ہے کہ عقل و عشق میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ عقل جب سوز سے ہمکنار ہو جاتی ہے تو عشق بن جاتی ہے"۔

(اقبال سب کے لیے ص ۲۶۲ - ۲۶۳)

اس تصنیف کے ذریعہ ایک اور سوال جس کی اہمیت کم نہیں ہے ہمارے سامنے آیا ہے کہ کیا اقبال محض مقلّد ہیں؟ عموماً کہا جاتا ہے کہ اقبال رومی کے مقلّد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ سوال قابلِ توجہ ہے کہ اگر وہ رومی کے مقلّد ہیں تو پھر ان کے افکار و نظریات کی معنوی اہمیت کیا رہ جاتی ہے اس سوال کا دلائل کے پس منظر میں جواب دیتے ہوئے فاضل مصنّف نے ان گوشوں کی نشاندھی کی ہے جہاں اقبال اپنے پیر و مرشد کے افکار و نظریات سے آگے نکل گئے ہیں اور نئے امکانات کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

رومی کے یہاں عشق ہی سب کچھ ہے اور اقبال عشق کے توسط سے خودی کی تکمیل پر زور دیتے ہیں۔ رومی نے چھ سو سال پہلے جو باتیں کشف و الہام کی مدد سے کہی تھیں اقبال نے انھیں بیسویں صدی کے فکری تقاضوں کے مطابق نئے طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے مصنّف نے بہت سی مثالوں کی مدد سے جہاں اقبال اور رومی کی فکری مطابقت کی نشاندھی کی وہاں اقبال اور رومی کے مابین نقطۂ نظر کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ غرض کہ

"اقبال سب کے لیے" میں جا بجا ایسے حقائق اور گوشوں کا بھی انکشاف ہوا جو تا حال نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ پانچ سو ستائیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب صاف ستھری اور بڑی حد تک اغلاط سے پاک ہے کتابت، طباعت، گٹ اَپ اور جلد بندی کی نفاست نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا ہے اقبالیات کی قلم رو میں یہ کتاب ایک ایسا اضافہ ہے جو اس عظیم آفاقی فن کار کی شخصیت اور فکر و نظر کو معاشرے کی ذہنی سطحوں تک پہنچا دے گی۔

شہاب اشرف

○

گلوں میں رنگ کہاں تیرے پیرہن کی طرح
کہاں یہ ناز و نزاکت تیرے بدن کی طرح

افق سے تابہ افق سرمئی فضاؤں میں
گھٹا اٹھی ہے ترے سانولے بدن کی طرح

یہ گفتگو، یہ سلیقہ، یہ شوخیوں کی بہار
وہ اپنے آپ میں ہیں ایک انجمن کی طرح

وہ چھپ کے آئے مرے گھر میں لوگ جان گئے
مہک اٹھے در و دیوار یاسمن کی طرح

جہاں سے شاعرِ فطرت چلا گیا شاید
چمک رہی ہے یہ کیوں چاندنی کفن کی طرح

ترے جمال کی خوشبو بسی ہے آنکھوں میں
مری غزل میں مہک ہے ترے بدن کی طرح

کہو تو کاٹ کے رکھ دیں مصیبتوں کے پہاڑ
ہمارے ہاتھ میں تیشہ ہے کوہکن کی طرح

کسی کو جیسے کسی سے کوئی لگاؤ نہیں
جسے بھی دیکھیے لگتا ہے بے وطن کی طرح

کہیں بہ پیچ کے ناسور بن نہ جائے شہاب
ابھی تو یاد وہ آتے ہیں اک چبھن کی طرح

▲

ساجد رضوی

○

بے چین محبت ہے بہت پچھلے پہر سے
ان آنکھوں نے دیکھا ہے مجھے میری نظر سے

طے راہ محبت کی جو کرتے نہیں سر سے
واقف ہی نہیں وہ ابھی آدابِ سفر سے

چلتے ہیں مرے سائے سے دامن کو بچائے
جب بھی وہ گذرتے ہیں مری راہ گذر سے

بدنام زمانے میں بہت شمع ہے لیکن
پروانے جلے اپنے ہی خود سوزِ جگر سے

کانٹوں کی طرح اپنی نگاہوں میں نہ کھٹکوں
دیکھا نہ کرو یوں مجھے پھولوں کی نظر سے

گذرا ہوں میں اس راہ سے بھی آپ کی خاطر
گذرا نہیں اب تک کوئی جس رہ گذر سے

دشوار ہے اب ان کی نگاہوں میں سمانا
وہ دیکھ رہے ہیں مجھے میری ہی نظر سے

گھبرا کے شبِ ہجر میں مانگی تھیں دعائیں
تاریکیاں بڑھنے لگیں آغازِ سحر سے

ساجد نے بھی سر اپنا جھکایا پئے سجدہ
بنتے ہوئے دیکھا جو مقدر ترے در سے

▲

نظام الدین گوریکر

کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی ۔ علوم اسلامیہ کا مخزن

میرے استاد محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی سابق ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی عروس البلاد کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے تھے کہ بمبئی اپنی گوناگوں دلچسپیوں، اپنی بے شمار کششوں، اپنی لاتعداد خوبیوں اور اپنی ان گنت دل فریبیوں کی وجہ سے نہ صرف ایک ارضِ رنگ و بُو، ایک دنیائے حسن و جمال، ایک معمورۂ آرزو و تمنا بلکہ یہ وہ جنتِ ارضی ہے جہاں حسن اپنی تمام دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور یہ وہ فردوسِ خاکی ہے جہاں رعنائی اپنے تمام عشووں اور غمزوں کے ساتھ برسرِ اقتدار ہے ۔ چوپاٹی کنارہ، اپالو بندر، ملبار ہل، جوہو بیچ جیسے خوشگوار اور پُر فضا مقامات کے ساتھ مختلف قوموں کی شہرۂ آفاق عبادت گاہیں اور تعلیمی ادارے، مختلف لسانی اقلیتوں کے بڑے بڑے کتب خانے اور دار المطالعے، مختلف مذہبی فرقوں کے قابلِ قدر ادبی، ثقافتی اور سماجی انجمنیں اور بزمیں بھی ہیں ۔ یہ وہ خوبیاں اور صفات ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہر بمبئی تجارتی مرکز ہونے کے باوجود مختلف مذہبوں، قوموں، تہذیبوں اور زبانوں کا ایک بڑا سنگم ہی نہیں بلکہ اشتراکِ عمل اور یک جہتی کا بہترین مظہر ہے ۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں کوکنی مسلمان طبقہ بمبئی میں ہر اعتبار سے پیش پیش تھا ۔ یہ وہ مسلم طبقہ تھا جنھوں نے فراوانیٔ دولت اور بحری تجارت کے ذریعہ علم و ادب کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور باہر سے آئے ہوئے علما، اُدبا، شعرا وغیرہ کی حتی المقدور نہ صرف اعانت کی بلکہ ترتیب و تدوین اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں بھی بڑا حصہ لیا اور اس طرح عربی و فارسی میں دست گاہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی عوامی بلکہ شمالی زبان اردو کی نشر و اشاعت اور ترویج و ترقی کی خاطر ہر ممکن کوشش کی ۔ اس ضمن میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بابائے اردو مولوی عبد الحق ایک اردو کانفرنس میں اہلِ بمبئی کی اردو دوستی اور ادب نوازی کے سلسلہ میں مولوی نذیر احمد کے ایک شعر کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ یوں فرماتے ہیں ؎

خوشا بمبئی تجھ یہ اردو کا سایا
تجھے جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا

آج کی اس علمی صحبت میں بمبئی کی جامع مسجد کے کتب خانے موجود ہیں لیکن مشرقی علوم کے کتب خانوں میں

ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی یونیورسٹی، کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کریمی لائبریری اور کتب خانۂ مدرسۂ محمدیہ قابل ذکر ہی نہیں بلکہ لائق تعریف وتحسین ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی یونیورسٹی اور کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی لائبریریوں میں انگریزی، جرمن، فرانسیسی، سنسکرت، اوستا پہلوی، اور ہندوستان کی دیگر ریاستی زبانوں کی کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی مطبوعہ کتب اور قلمی نسخے اور مخطوطے بڑی تعداد میں ملتے ہیں لیکن کریمی لائبریری اور کتب خانۂ مدرسۂ محمدیہ جو آج کل جامع مسجد لائبریری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، نادر اور نایاب مطبوعات اور مخطوطات کے بڑے علمی خزانے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں لائبریریاں مشرقی کتب کی بالعموم اور اسلامی علوم کی بالخصوص قابل ذکر علمی مخزن شمار کئے جاتے ہیں۔

" کریمی لائبریری کا قیام ۱۸۹۸ء میں عمل میں آیا اور قاضی عبدالکریم صاحب نے لائبریری کی مطبوعہ فہرست کی ابتدائیہ میں اس لائبریری کی ضرورت کے تعلق سے اس طرح رقم طراز فرمایا ہے کہ "بمبئی میں اہل علم کثرت سے موجود ہیں بہ مقابلہ ان کے اسلامی کتب خانے بہت کم نظر آتے ہیں۔ کوئی ایسا وسیع ہال اور کافی کتابوں کی لائبریری نظر نہیں آتی تھی کہ جہاں فرصت کے وقت ہمارے علم دوست دینی بھائی جمع ہو کر اپنے اپنے مذاق کے موافق کتابوں کے مطالعے سے دل ودماغ کو تر وتازہ فرماتے اور دل خواہ رسالوں کی سیر سے اپنی معلومات بڑھاتے۔ اس لیے مدتوں سے میرا خیال تھا کہ کسی وسیع جگہ پر ایک ایسی اسلامی لائبریری کھولی جائے کہ ہمارے دینی بھائیوں کی مطالعہ کتب کا استفادہ حاصل ہوا کرے۔ اس لیے میں نے عالی جناب آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی، صدر انجمن اسلام بمبئی کو درخواست لکھ کر بھیج دی کہ اگر انجمن اسلام ہائی اسکول کا ہال عنایت کیا جائے تو میں اس میں ایک کتب خانہ قائم کردوں۔ صاحب موصوف نے نہایت خوشی کے ساتھ میری رائے سے اتفاق کیا اور میری درخواست کو منظوری کا شرف بخشا۔ اس میں سالہا سال کی تجسس اور تلاش سے کتابوں کا سرمایہ جمع کر کے اسی سال ہال میں ایک کتب خانہ بنام کریمی لائبریری انجمن اسلام بمبئی اپنے دلبند جگر پیوند میاں غلام محمد عرف دادا میاں کی یادگار میں جاری کیا۔"

کریمی لائبریری کے قائم ہونے کے بعد اہل بمبئی بالخصوص کوکنی مسلم طبقہ نے جامع مسجد سے ملحق مدرسۂ محمدیہ کے لیے ایک لائبریری کا منصوبہ تیار کیا اور ۱۹۰۳ء میں یعنی کریمی لائبریری کے قیام کے پانچ سال بعد کتب خانہ مدرسہ محمدیہ قائم ہوا۔ اس کتب خانہ کی ترتیب وتزئین کے سلسلے میں جامع مسجد بمبئی کے اُس وقت کے قابل ناظم مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی صاحب ایک علمی شخصیت کے باوجود ایک اچھے اہل علم تھے۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کتب خانہ کی فہرست جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے ۱۳۲۱ھ ہجری میں منظر عام پر آئی۔ اس مطبوعہ فہرست میں قلمی اور مطبوعہ کتب کی کیفیت اور ان کے مصنفوں اور مؤلفوں کے حالات درج ہیں ۱۹۵۷ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی زیر نگرانی میں حامد عبداللہ ندوی نے اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کی۔ اس کتب خانے میں عربی اور فارسی کی بیشتر کتابیں موجود ہیں جن کا تعلق درس نظامیہ سے ہے اور جو عموماً درس گاہوں کے نصابوں میں داخل ہوتی ہیں۔ اس کتب خانے کا ایک حصہ مطبوعہ ہے اور دوسرا غیر مطبوعہ۔ مطبوعہ کتابوں میں کوئی ایک ہزار عربی، پانچ سو فارسی اور دو سو اردو میں بلکہ غیر مطبوعہ کتابوں میں تقریباً ایک ہزار عربی، پانچ سو فارسی اور ایک سو اردو ہیں۔ اس طرح کتابوں کی تعداد تین ہزار

سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

درس نظامیہ کے علاوہ اس کتب خانے میں قرآن، احادیث، فقہ، ادبیات اور دیگر علوم وفنون پر قیمتی کتابیں موجود ہیں۔ قرآن کے نادر نسخوں میں یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ، احادیث میں ائمہ اربعہ کے مسانید، فقہ میں خصوصاً امام ابن تیمیہ کی ملفوظات، اور ادبیات میں بہت سے شعرا اور ادبا کے دواوین اور تالیفات ملتی ہیں۔ عربی ادب اور اسلامی علوم کا سرمایہ کراچی لائبریری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہ کتب خانہ مشاورین امور مسجد جامع بمبئی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے اور اس کے لیے اہلِ علم و ادب جملہ مشاورین کا بالعموم اور جناب بدرالدین نور اور جناب عبدالقادر جیتیکر کا بالخصوص سراپا سپاس گزار ہے کہ انھوں نے اپنی فراخدلی اور وسعت نظری کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ بہت ساری کتابیں اس کتب خانہ کو عنایت فرمائیں اور قلمی نسخے اور مخطوطے چھان بین کے بعد اس کے قیمتی ذخیرے میں جمع کیں۔ دراصل اس کتب خانے کی اہمیت، عظمت اور مقبولیت کی بڑی وجہ مطبوعہ کتب نہیں ہیں بلکہ عربی، فارسی اور اردو کے نایاب اور نادر قلمی نسخے ہیں۔

اس ضمن میں مولانائے محترم خواجہ حسن نظامی صاحب کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کتب خانے کی اکثر نادر و نایاب مطبوعات و مخطوطات کو ملاحظہ فرمایا ہے اور اپنے روزنامچہ سفر میں بہ تفصیل تذکرہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ روزنامچہ خواجہ صاحب نے ۱۹۱۱ء میں بمبئی کے قیام کے دوران تیار کیا اور معتقدین کے اصرار پر ۱۹۱۲ء میں دہلی سے شائع کیا۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ "پنج شنبہ ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو مولوی محمد یوسف کٹکٹے کا آدمی بلانے آیا۔ گئے، بہت اخلاق سے پیش آئے اور عجیب و غریب قلمی کتابیں اور قرآن شریف دکھائے۔ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا قرآن شریف دیکھا اور ایک قرآن شریف خاص حضرت بہاؤالدین نقشبند کے پڑھنے کا جس پر ان کی یادگار ثبت ہے۔ اس کے بعد ہی قرآن شریف بابر بادشاہ کے پاس آیا۔ اس کی تحریر بھی درج ہے۔ مولانا صاحب موصوف بڑے ذی علم اور نیک شوقین علم دوست مسلمان ہیں (ص ۴۴)۔" اور شنبہ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۱ء کو دوسری بار کتب خانے میں تشریف فرما ہوئے۔ لکھتے ہیں کہ "کتب خانے میں کتابیں دیکھیں۔ اوّل ایک مکتوب حضرت خواجہ بزرگ کا خواجہ قطب صاحب کے نام دیکھا۔ پھر نشاط العشق عبداللہ بن حسن بن علی الکل الجیلانی کا جو حضرت غوث الاعظم کے کلمات کی شرح میں ہے، دیکھا۔ یہ ذاتِ باری سے مکالمہ ہے جو شاید عالم کشف میں حضرت غوث کو پیش آیا۔ حضرت غوث ذاتِ باری کو مخاطب کر کے کچھ سوال فرماتے ہیں۔ وہاں سے جواب ملتا ہے۔ یہ جواب انسان کی بلند شان ظاہر کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔ ایک رسالہ ناطقیہ دیکھا جس میں تصوف اور اخلاق کو بائیس نطق میں بیان کیا ہے۔ دوران مطالعہ میں مولوی یوسف صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے ذریعے سے عجیب و غریب کتابیں دیکھنے میں آئیں مثلاً عبدالواحد بلگرامی کی شرح کافیہ جو بالکل تصوف میں لکھی گئی ہے۔ اور ایک کتاب جس کے ہر صفحے پر چار کتابیں مثلاً یوں ہی مسلسل پڑھیں تو ایک کتاب، اور پہلے حروف نیچے تک ملاتے جائیں تو دوسری کتاب اور درمیانی حروف ملائیں تو تیسری کتاب اور آخری ملائیں تو چوتھی ــــ اس طرح علیحدہ علیحدہ علوم میں چاروں کتابیں مرتب ہو جاتی ہیں۔ عجیب کتاب ہے (ص ۴۸-۴۹)۔"

حضرت خواجہ حسن نظامی کے ان کلمات سے زیر بحث کتب خانے کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے

(باقی ۳۶ پر)

محمد مجید اللہ صدیقی

سمجھوتہ

زخم
جو ذہن کے جسم پہ لگتے ہیں
عجیب ہوتے ہیں
نہ لہو رستا ہے
نہ پیپ بہتا ہے
تلوار کی طرح
کرب کی تیز دھار
روح کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے
وجود کا گلا
ماحول کی پھانسی پر لٹک جاتا ہے
ایسا لگتا ہے ـــ
نگہ کی آنکھوں میں ریت پوت دی گئی ہو
قدم کے پاؤں کاٹ دیے گئے ہوں
روشنی کا خراج اندھیروں سے مانگیں گے
سورج کی آرزو ؟
سمندر کے دل سے پوچھنا ہوگا ۔
چلو آؤ ۔ ۔ ۔ ۔
دو گھڑی
نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں بسر کر لیں
کتنا وقت باقی ہے ؟
گھڑی دیکھو !
سمجھوتہ کر لیں
زندگی کی نبض چل رہی ہے
شکر ہے
زندگی بانٹ لیں !!

شہپر رسول

وعدہ کر کے بھول جانے کی ادا بھی کیا لکھوں
آس کے اندھے قلم سے کچھ گلا بھی کیا لکھوں
ٹوٹتے پتوں کا تھر تھر کانپنا بھی کیا لکھوں
ہے بہت بے درد موسم کی ہوا بھی کیا لکھوں
اب میری ٹوٹی حویلی کے نشاں تک بھی نہیں
کچھ نہیں اپنے پرائے کا پتا بھی کیا لکھوں
یاد کے تاروں کو تیری خوشبوئیں چھو تو گئیں
اے نسیم تازہ کچھ بتا بھی کیا لکھوں
آپ نے دیکھا تھا مجھ کو اور کچھ کترائے تھے
آپ سے اک دن ہوا تھا سامنا بھی کیا لکھوں
ٹوٹتا جاتا ہے شہپر میرے خوابوں کا طلسم
ان دنوں نا مہرباں ہے کچھ خدا بھی کیا لکھوں

اظہر افسر

واپسی

چچا (۵۰ سالہ ایک بوڑھا)
مُنّا ۲۲ سالہ ایک نوجوان
چچی ۵۴ سالہ ایک خاتون

منظر۔ اوسط گھرانے کا ایک کمرہ، درمیان میں ایک تخت بچھا ہے جس پر اُجلا فرش ہے، تخت کے آس پاس کچھ کرسیاں بھی ہیں، دیوار پر گھڑی لگی ہے جس میں ایک بجا ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو اسٹیج پر اندھیرا ہے، دہنی جانب قفل کھولنے اور دروازہ کھلنے کی آواز ہوتی ہے اور چچی اور مُنّا داخل ہوتے ہیں مُنّا دیوار پر کسی طرف ہاتھ لگا کر روشنی کرتا ہے۔ چچی تھکے ہوئے انداز میں تخت پر بیٹھ جاتی ہے

مُنّا ۔ (گنگناتا ہے) بول رے منوا بول مت ہو ڈانوا ڈول، بول رے منوا بول۔ (بڑا سا قفل تخت پر رکھتا ہے)
چچی ۔ بہت پسند آیا یہ گانا۔
مُنّا ۔ بہت اچھا فلم تھا چچی جان۔ گانے تو کیا کہنے ہیں۔ واقعی اگر آج اُسے نہ دیکھتے تو بڑا افسوس ہوتا،
چچی ۔ ہاں مالتی نے بھی جب یہ کہا کہ آج اُس کا آخری شو ہے تو میں نے سوچا لاؤ دیکھ ہی ڈالیں،
مُنّا ۔ خوب فلم تھا، ڈھشوں ڈھشوں بھی خوب ہے۔
چچی ۔ (گھڑی کی طرف دیکھ کر) دیکھا تمہارے چچا مشاعرے سے اب تک نہیں آئے ہیں۔
مُنّا ۔ ابھی تو صرف ایک بجا ہے چچی جان۔
چچی ۔ (جماہی لیتی ہے) مجھے تو نیند آرہی ہے، میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔ (اُٹھ کر بائیں جانب چلی جاتی ہے)

مُنّا ۔ (آہستہ سے) چچا جان ۔
چچا ۔ (تخت کے نیچے سے آواز آتی ہے) میں یہاں تخت کے نیچے ہوں ۔
چچی ۔ (اندر سے) منّا کیا تمہارے چچا آ گئے ہیں ۔
مُنّا ۔ جی نہیں جی نہیں ۔ وہ ابھی سے کہاں آنے والے ۔ دو ڈھائی بج جائیں گے مشاعرے سے لوٹتے لوٹتے ۔
چچی ۔ (اندر سے) پھر ؟
مُنّا ۔ ویسے ہی ذرا چچا جان کی یاد آ گئی تھی ۔ یہ ہیروئن نئی تھی نا چچی جان ۔
چچی ۔ (اندر ہی سے) ہاں نئی ہے ۔ یہ اس کا پہلا فلم ہے ، مگر خوب کام کیا ہے ۔
مُنّا ۔ چچی جان اُس کی صورت آپ سے بہت ملتی ہے ۔
چچی ۔ (بائیں جانب سے آتے ہوئے) کیا کہا مُنّا ۔
مُنّا ۔ نہیں میں نے کہا اس ہیروئن کی صورت آپ سے بہت ملتی ہے ۔
چچی ۔ مجھ سے ؟
مُنّا ۔ ہاں بھنویں ، ناک ہونٹ ، آنکھیں ۔
چچی ۔ چل ہٹ ۔
مُنّا ۔ نہ سہی کپڑوں کی حد تک تو آپ سے بہت ملتی ہے ۔
چچی ۔ سچ ؟
مُنّا ۔ اور کیا ۔ آئیے آئیے یہاں بیٹھیے ، یہیں تخت پر ۔
چچی ۔ کیوں اب سونے کا ارادہ نہیں ہے ۔
مُنّا ۔ نہیں چچی جان ، بیٹھیں گے تھوڑی دیر آئیے نا ۔ ابھی اتنی جلدی سونے کو جی نہیں چاہتا ۔
چچی ۔ (پاس ہی بیٹھ جاتی ہے) اچھا تم کچھ ہیروین کے بارے میں کہہ رہے تھے ۔
مُنّا ۔ ہاں چچی جان ہیروین نے بہت اچھا کام کیا ہے ۔ اور پھر کیا گاتی ہے ۔
چچی ۔ نہیں مُنّا اُسے گانا نہیں آتا ۔
مُنّا ۔ گانا نہیں آتا ۔
چچی ۔ بالکل نہیں ، وہ گانے بیک گراونڈ تھے ۔ کوئی اور گا رہی تھی ۔
مُنّا ۔ گانے بیک گراونڈ تھے ، چچی جان سچ مچ ؟
چچی ۔ ہاں وہ اتنا اچھا نہیں گا سکتی ۔
مُنّا ۔ چچی جان مجھے تو اس کی ایکٹنگ بھی بیک گراونڈ دکھائی دے رہی تھی ، پہلی بار ایک ہیروئن اس قدر اچھا کام کیسے کر سکتی ہے ۔

پچی - (ہنستی ہے)
منّا - کوئی کہانی سنائیے نا چچی جان۔
چچی - کہانی — اتنی رات کو —
منّا - ہاں کچھ باتیں کیجیے نا۔ پتہ نہیں آج نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ بس باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے
چچی - (جماہی لیتی ہے) بھئی وہ۔
منّا - ابھی تو چچا جان بھی نہیں آئے نا۔
چچی - تم انتظار کروان کا۔ آئیں تو کہنا کھڑکی میں ادھر کھانا رکھا ہے۔ کھالیں۔ اور دروازہ بند کر کے سوجائیں۔ (اٹھتی ہے)
منّا - چچی جان۔
چچی - ہاں
منّا - وہ بالکل آپ کی طرح مسکراتی تھی۔
چچی - (بیٹھ جاتی ہے) کون منّا
منّا - کون کیا وہی اس فلم کی ہیروین، جو ابھی ہم دیکھ کر آئے ہیں۔ چلتی بھی آپ ہی کی طرح تھی۔
چچی - (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) ہائے منّا۔
منّا - کیا بات ہے چچی جان۔
چچی - کچھ نہیں۔
منّا - کہیے نا چچی جان۔
چچی - اب تم سے کیا کہوں منّا۔ بہت برس بیت گئے۔ میرا بھی ارادہ تھا کہ (رک جاتی ہے)
منّا - ارادہ تھا کہ۔ کیا ارادہ تھا۔
چچی - ہاں بہت پہلے میں ڈراموں میں کام کرتی تھی نا۔ ایک مرتبہ ہمارے ہائی سکول میں سالانہ جلسہ تھا۔ اس میں ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ جس کا جوتا اسی کا سر۔
منّا - یہ ڈرامے کا نام تھا۔ جس کا جوتا اسی کا سر۔
چچی - ہاں منّا
منّا - بہت اچھا نام تھا۔
چچی - میں اس میں ہیروین تھی۔ اس جلسے کی صدارت ان دنوں کے ایک مشہور فلم ڈائرکٹر جمبو بھائی ڈٹے نے کی تھی۔ انہوں نے جب یہ ڈرامہ دیکھا تو میری بڑی تعریف کی اور کہا تھا کہ جب بھی آپ کو موقع ملے آپ بمبئی آجائیے میں اپنی اگلی فلم میں ہیروین بناؤں گا۔

منّا ۔ آپ کو موقع ہی نہیں ملا ۔
چچی ۔ کہاں ملا تمہارے چچا نے موقع ہی نہیں دیا ۔
منّا ۔ اچھا چچی جان آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں ۔
چچی ۔ پوچھو ۔
منّا ۔ آپ فلم جائن کرلیتیں اور بہت بڑی فلم ایکٹرس ہوجاتیں تو ۔ تو چچا جان سے شادی کرتیں ۔
چچی ۔ چل ہٹ ۔
منّا ۔ بتائیے نا ۔
چچی ۔ میں جس سے بھی شادی کرتی وہ تیرے چچا ہوتے ۔
منّا ۔ ارے واہ یہ کیسے ؟
چچی ۔ چل چھوڑ یہ قصہ، دوسری باتیں کر ۔
منّا ۔ اچھا دوسرا سوال ۔ آپ جب بھی اندر اور اندر والے صندوق کا ذکر آتا ہے تو چچا جان سے خوب لڑتی ہیں ۔ آگ بگولہ ہوجاتی ہیں ۔
چچی ۔ ایسا ہے منّا ۔ وہ صندوق میری شادی پر میرے ساتھ آیا تھا، وہ مجھے بہت عزیز ہے، اس میں میرے وہ سب زیور ہیں جو میرے ابا نے، میرے چچا نے، میرے بھائیوں نے بچپن سے شادی تک مجھے دیے ہیں ۔ ان زیوروں کو میں نے بڑی جی جان سے رکھا ہے، ایک بھی اِدھر اُدھر ہونے نہیں دیا ۔
منّا ۔ تو بہت ہوں گے زیور ۔
چچی ۔ ہاں بہت ہیں ۔ اپنے چچا سے کہنا نہیں ۔
منّا ۔ ارے ارے یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، میں بھلا چچا جان سے کیوں کہوں گا ۔ وہ خود معلوم کرلیں گے ۔
چچی ۔ کیا کہا ؟
منّا ۔ نہیں نہیں میں نے کہا کہ میں کیوں کہوں گا اُن سے، وہ خود آپ سے پوچھ لیں گے ۔
چچی ۔ اجی بہت کوشش کی انھوں نے، میں نے پتہ ہی نہ لگنے دیا ۔ بس انھیں یہ معلوم ہے، صندوق ہے مگر اس میں کیا ہے ۔ کیا کیا ہے یہ ان کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ۔ کہیں لاڈ میں آکر کہہ دو ۔
منّا ۔ کون میں ؟ بالکل نہیں چچی جان بالکل نہیں ۔ لیکن کیا کیا زیور ہیں چچی جان اس میں ؟
چچی ۔ میں چھ برس کی تھی جب ابا میاں نے مجھے گریبان کے سونے کے بٹن لاکر دیے تھے ۔
منّا ۔ سونے کے بٹن ؟
چچی ۔ ہاں سونے کے بٹن، چھ تھے ایک زنجیر سے بندھے ہوئے ۔ جب میں نے ساتویں کا امتحان دیا اور بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئی تو چچا جان نے مجھے ایک سونے کا کلپ اور ابا نے سونے کے ایرنگ دیے ۔

مُنّا - سونے کا کلپ؟
پچی - ہاں بالوں میں لگانے کا۔ نگوں والا کلپ۔
مُنّا - سونے کا کلپ اور سونے کے ایرنگ۔ آپ کے ابّا اور چچا بہت اچھے تھے پچی جان۔
پچی - ہاں بہت اچھے تھے وہ ہر سال مجھے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔
مُنّا - کاش ہر شخص کے چچا ایسے ہوتے۔ میرا مطلب ہے۔ ہوں۔
پچی - اس صندوق میں کئی کئی ہار ہیں مُنّا۔
مُنّا - سونے کے؟
پچی - ہاں کئی کرن پھول ہیں، نکلس ہیں۔
مُنّا - سونے کے؟
پچی - ہاں ہاں سب سونے کے۔ کئی مرزا بے پروا ہیں۔
مُنّا - مرزا لاپروا کا نام تو سُنا تھا یہ مرزا بے پروا کون ہے۔
پچی - ہے ایک بڑا خوب صورت زیور ہے، پیشانی پر لٹکایا جاتا ہے۔
مُنّا - پیشانی پر؟
پچی - ہاں دو تین مرزا بے پروا ہیں۔ جھومر ہے۔

(تخت کے نیچے سے چچا کے کھانسی روکنے کی آواز آتی ہے)

پچی - یہ کیسی آواز ہے
مُنّا - آپ کیسے آپ کہیے۔ شاید کوئی باہر ہے
پچی - کڑے ہیں، کنگن ہیں۔ ست لڑا ہے، پہنچیاں ہیں۔
مُنّا - ست لڑا۔
پچی - ہاں جس میں آٹھ لڑ ہیں۔
مُنّا - آٹھ لڑ۔
پچی - ہاں وہ اس طرح بنتا ہے۔ ایک لڑ کو نہیں گنتے۔ ٹھُسّی ہے۔
مُنّا - ٹھُسّی۔ ٹھُسّی کیا۔
پچی - ہوتا ہے بڑا قدیم زیور ہے، خالص سونے کا۔ بہت موٹے موٹے موتی ہوتے ہیں اسی کے اور نزدیک نزدیک گندھے ہوتے ہیں۔ چندن ہار ہے۔ چمپا کلی ہے۔
مُنّا - کئی کلیاں ہیں کہیے۔
پچی - ہاں۔

چچا ۔ (کھانستا ہے)

چچی ۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) کھانسی۔ یہ کون ہے۔

مُنّا ۔ کوئی باہر ہے۔ رکشا والا ہوگا۔

چچی ۔ رکشے والا۔

مُنّا ۔ ہاں، شاید باہر کوئی رکشے والا ہے۔

(تخت کے نیچے سے چچا غصّے میں نکلتے ہوئے)

چچا ۔ رکشے والا۔ تم ہوگے رکشے والے۔ واہ حد کر دی۔

مُنّا ۔ ارے چچا جان۔

چچی ۔ تم ـــ ؟

چچا ۔ اور ـــ اور اس قدر گرد ہے تخت کے نیچے کہ (کھانستا ہے) توبہ ہے

مُنّا ۔ مگر چچا جان۔

چچا ۔ چُپ۔

چچی ۔ تم تخت کے نیچے تھے۔ تم کب آئے۔ تمہاری واپسی کب ہوئی۔

چچا ۔ میں گیا ہی کب تھا۔

مُنّا ۔ چچا جان۔ چچا جان

چچا ۔ چپ

مُنّا ۔ چچی جان جب آپ کپڑے بدلنے اندر گئی تھی نا۔ چچا جان اُس وقت آئے۔

چچی ۔ (اِدھر اُدھر دیکھتی ہے)۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ (تخت پر رکھا ہوا قفل اٹھا کر چچا کی طرف دے مارتی ہے اور پھر پاندان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

چچا ۔ ارے ارے بھئی کیا کر رہی ہو۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ بھئی سنو تو ـــ سنو تو

(اچانک پردہ گرتا ہے)

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں —
(ادارہ)

کتاب : انشاء کے حریف و حلیف مصنف : عابد پیشاوری
ناشر : اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔ ۳ ضخامت : ۲۰۴ صفحات قیمت : ۳۰ روپیے

خدا نے بعض شاعروں کو بلا کی تخلیقی صلاحیت سے مالا مال کیا۔ میر انشا اللہ خاں بھی ان شاعروں میں ہیں۔ مطالعے کی یہ گہرائی کہ شعر باندھنے پہ آئے تو ایسے ایسے دقیق مضامین اٹھا لائے کہ ہم سوچتے رہ جائیں، اسلوب میں وہ تازہ جواں مردی کہ حسن بیان انگشت در دہن ہو، زبان میں وہ نیرنگی کہ فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت اس طرح باہم دگر کہ اردو کا صحیح لطف ملے۔ غزل گویوں کے استاد، مثنوی نگاری میں بانکے، تاریخ گوئی، ہجو و ہزل، قصیدہ ہر فن سخن میں چست و چالاک اور تو اور انشاء نے قواعد اور لسانی اصولوں پر بھی کام کیا ہے۔ سنہ ۱۲۰۰ھ کے اطراف لکھنوی ادبی ماحول بہت گرم تھا۔ شعرا کے درمیان شاعری کا اکھاڑہ رہا تھا۔ تیرھویں صدی کے پہلے ربع میں نوابانِ لکھنو نے اپنی تمام تر توجہ ادب، کلچرل تماشوں اور داد و دہش پر مرکوز کر دی تھی۔ اسی دور میں لکھنو کے ادبی افق پر انشاء اور مصحفی جگمگا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ دربار اور عوام میں مقبولیت کے حصول کے لیے کیا گیا نہ معرکے ہوے ہوں گے جن میں تمام مثبت اور منفی حربے آزمائے گئے ہوں گے، طرحی غزلیں، پھر مقابل کی غزلوں میں نقص نکالنا اور پھر عربی شاعروں کی طرح تعلّی اور تضحیک، ہزل سب کچھ اس دور میں روا تھے۔

عابد پیشاوری کی یہ کتاب ان معرکوں کی تفصیل بھی بیان کرتی ہے اور انشاء کے حریفوں اور حلیفوں کے معیار کا بھی جائزہ لیتی ہے۔ عابد کی زبان خوب صورت ہے اور ان کا لب و لہجہ خشک معلوماتی نہیں بلکہ تخلیقی اور پہلودار ہے۔ ان کے جائزوں میں تحقیقی ہے اور مناسب منطق سے ماخذ کا استعمال کرنے کی وجہ سے وکالت اور جانب داری کا احساس نہیں ہوتا لیکن جانب داری ہے ضرور، وہ انشاء کے حریفوں کو ناقابل تذکرہ بنانے میں مستعد ہیں۔ یہاں تک کہ مصحفی کے بارے میں فرماتے ہیں "حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری کے تمام تر دعووں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مصحفی اپنا کوئی امتیازی رنگ پیدا نہیں کر سکے۔ انفرادیت ہی شاعر کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلاتی ہے جو مصحفی کے یہاں نہیں۔ دراصل وہ زندگی بھر اپنی آواز کو بدلنے کی کوشش اور انفرادیت پیدا کرنے کی سعی کرتے رہے۔" میں اور بہت دوسرے ادیب اس بات کو قبول نہیں کر سکتے کہ مصحفی کی شاعری میں انفرادیت نہیں تھی۔ اس طرح مصحفی پر عابد نے کئی حملے کیے ہیں۔ کبھی وہ ان کو دماغی فتور میں مبتلا بتاتے ہیں تو کہیں "یعنی مصحفی کو تعلّی کرنا بھی نہیں آتا" کہیں

مصحفی نے اگرچہ زورِ طبیعت دکھانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن بیشتر مقامات پر پھس پھسے ہو کر رہ گئے ہیں" اور پھر "کینہ توزی، منافقت، خشک دماغی اور خشونت مزاجی ان کی طبیعت کے خاص جوہر ہیں، ان میں شوخی ہے نہ شگفتگی شاگردی بھی شہدے اور لفنگے ملے" یہ ساری باتیں عابد صرف یوں ہی نہیں کہتے بلکہ وہ مصحفی کے اشعار کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں۔ لیکن چند باتوں سے وہ صاف طور پر چشم پوشی کرتے ہیں۔ (۱) مصحفی کی شاعری بھی اثرانگیزی اور اسلوب میں خاص ندرت رکھتی ہے۔ (۲) ہزل گوئی، شہر آشوب اور ہجو کے لیے نفس زبان کا استعمال ہو بھی نہیں سکتا۔ ویسے انشاء نے بھی تھرڈ کلاس پن اور مغلظ زبان سے پہلو تہی نہیں کی وہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ (۳) تعلّی میں ہر شاعر نے یہی کیا ہے کہ اساتذہ کو زیر قدم، اپنی شاعری کو کلام صحفِ سماوی سے برتر اور تمام شعرا کو اپنے سامنے گنگ و حقیر قرار دیا ہے۔

میاں مصحفی کوئی واحد شاعر نہیں ہیں ایسا اسلوب اختیار کرنے میں۔ اسکے باوجود مصحفی کی ان ہی منظومات میں جو اس کتاب میں بر سبیلِ تذکرہ آگئی ہیں کئی ایسے اشعار ہیں کہ سر دھنتے رہیے۔ مثلاً

جس دیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں — ناسور ہے سینے کا اگر آب رواں ہے
آتا ہے نظر جوں دلِ عشاق شکستہ — اس شہر میں جو قصر فلاں ابن فلاں ہے

وغیرہ۔ ویسے بھی بیانیہ شاعری میں ہر شعر کا کامل ہونا ممکن نہیں

عابد پشاوری کی نثر رواں دواں ہے۔ اور ان کی تحقیق کے ذریعے انشاء کی زندگی کا معرکہ آرا پہلو سامنے آیا ہے۔ اور لکھنؤ کے ان معرکوں کا زور و شور بھی محسوس ہوتا ہے۔ عابد نے تمام تذکروں کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ لمبی چوڑی تلخیص، اور بیانات، سے احتراز کر کے مناسب حاشیوں سے عبارت کو متشرح کر کے، اچھی محققانہ کتاب لکھی ہے۔ ان کے حاشیے انکے تخلیقی تنقیدی شعور کی گواہی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں انشاء اور عظیم / قدرت اللہ قاسم، انشاء اور مصحفی، انشاء اور فائق، انشاء اور قتیل، انشاء اور آزاد اور بیانات میں رنگیں، ناسخ، جرأت وغیرہ کا بھی نام آجاتا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ عابد انشاء اور نواب سلیمان شکوہ کے تعلقات پر بھی لکھیں گے اور انشاء کے معتوب ہونے کا تذکرہ بھی کھل کر آئے گا۔ لیکن ممکن ہے کہ پورے مقالہ میں (جس کا یہ کتاب ایک حصہ ہے) یہ تذکرہ ایک مناسب مقام پر آیا ہوگا۔

عابد کی زبان کی مثال لیجیے۔

"اردو کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ بڑی حد تک کساد بازاری سے جڑا ہوا ہے، علمی و تحقیقی کتابوں کے پڑھنے والے ہیں ہی کتنے؟ اس لیے بہت سے تحقیقی مقالے یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں پڑے سڑا کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ بہت سے کھوٹے سکے ٹٹ پونجیوں کی ساکھ کی ضمانت میں جاتے ہیں اور نقصان یہ کہ کئی کھرے سکے بھی دفینوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور نتیجے میں تکرارِ بے جا کا چکر چل نکلتا ہے" عابد کچھ اس طرح مہذب انداز میں آپ سے باتیں کرتے جاتے ہیں کہ واقعات دلچسپ طور پر ارسال ہوتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ انکی ساری تحقیق شایع ہوتی اور انشاء اللہ خاں جیسی عظیم شاعر شخصیت کا مکمل مطالعہ

کتابی شکل اختیار کرلیا۔

سلیم اللہ نیر کی خوشنویسی نے اور اردو رائٹرس گلڈ کی مستعدی نے اس کتاب کو خوب تر بنادیا ہے اس کے گٹ اپ اور طباعت کے سبب۔ یہ کتاب اردو کے طالب علموں کے لیے اور محققین کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ معیار اور افادیت کی بنا پر کتاب کی قیمت مناسب ہے۔

مجموعہ کلام : حرف و صدا ، شاعر : عبدالمتین نیاز
ضخامت : ۱۲۰ صفحات قیمت : دس روپے

" حرف و صدا " باطن و خارج کی دو علامتیں ہیں، جسے عبدالمتین نیاز نے اپنے کلام کے لیے منتخب کیا ہے۔ تاکہ ذاتی اور شخصی تجربات کے اندرونی اور بیرونی عوامل کو پیش کرسکیں۔ نیاز نے خوب صورتی سے کہا ہے کہ " ہماری تخلیق میں ہمارے ذاتی اور شخصی تجربات و احساسات کا تین چوتھائی حصہ شامل ہوتا ہے۔ بقیہ چوتھائی حصہ خارج سے منسلک رہتا ہے۔ نیاز کی شاعری کو جدید قرار نہیں دیا جاسکتا نہ ہی ان کی شاعری کے تار و پود میں جدت و تجربا تیت ملتی ہے نہ وہ تشبیہہ و استعارہ کی منزل پار کرسکے ہیں۔ ہاں مزاجی طور پر ان کی شاعری جدید ہے کہ اس میں داخلی عنصر ذات کے تجربات پر مبنی ہے اور شاعر کے خالص احساسات کا اظہار ہے۔ نیاز بنیادی طور پر ایسے شاعر ہیں جس کے پاس انسانیت کا دکھ درد، بے حسی سے اختلاف، سیتیوں اور زندگی کے شور شرابے سے نجات، عقائد کی شکست و ریخت سے متاثر شاعری ہے، وہ اختصار پر قادر ہیں اور اسی لیے غزل میں ان کا رنگ روشن ہو جاتا ہے۔

نیاز کی شاعری، احمد ندیم قاسمی اور رجائی کی طرح جدت اور ترقی پسندی کے درمیانی راستے پر گامزن ہے۔ جہاں انسان واحد عل کردار ہے جس پر تجربات و احساسات کے سائے مختلف رنگوں میں اپنی جولانی دکھاتے ہیں۔ راحت کی آرزو، خواب کا داہمہ ہونا، ضبطِ اظہارِ کرب، آگہی کے سائے، ظاہر و باطن میں تفاوت، مصلحتوں کے بدلتے رُخ یہ سارے موضوعات نیاز کی شاعری میں ملتے ہیں۔

عبدالمتین نیاز کی زبان میں کوئی تجربہ نہیں، نہ ہی کوئی نئی ترکیب تخلیق کرنے کی کوشش ہے، وہ رائج زبان ہی میں شستگی کے ساتھ اپنا فنی اظہار کرتے ہیں، ان کی شاعری کا حسن ان کے تشبیہہ و استعارہ میں اور سلاست میں ہے۔ ان کے پاس باتیں ساری دلیل اور حجت سے آتی ہیں، غزل کے اشعار بھی دونوں مصرعوں میں یہ دونوں رُخ لیے ہوئے ہیں۔ پہلا مصرع دلیل یا حجت کہتا ہے تو دوسرا مصرعہ اس کے دوسرے تتمہ کو بیان کرتا ہے۔

بحیثیت مجموعی حرف و صدا، عبدالمتین نیاز کا ایک متوازن اور معیاری شعری مجموعہ ہے جس میں خوب صورت غزلیں اور اچھی نظمیں ملتی ہیں اور اس لیے ادب ذوقوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔

نیاز کے اشعار کی مثالیں لیجئے، ایسے خوب صورت اشعار سے ان کا مجموعہ مالا مال ہے۔

رنگ چڑھ گئے کتنے میری سادہ لوحی پر ؎ کچھ سے کچھ ہوا میں بھی شہر کی ہوا کھا کر

جسم کے اندر بھی جھانکیں کل نہ تھا اتنا شعور ؎ دُور کے نظارے دیکھیں اتنی بینائی نہ تھی
مفاہمت نہ کبھی مصلحت سے کی ہم نے ؎ زمانہ سازوں کے آگے ہوے نہ خم نہ رکے
میرے ہونٹوں پہ محبت کی صدا ہے کب سے ؎ کبھی دیکھے تو سہی پھول کھلا ہے کب سے
ہم کو کہاں وہ صورت رعنا دکھائی دے ؎ جب آئینے ہی اس کی ادا کو ترس گئے
وہ خون کا پیاسا درندہ ہے کیسے ٹلنے لگا ؎ لہو کا ذائقہ اس کی زبان پر رکھ دے

عبدالمتین نیاز کی شاعری اوسط لب ولہجہ کی شاعری ہے، اس کا رشتہ عوامی زندگی سے قریب تر ہے، ان کے تجربات ہمارے آپ کے عام تجربات ہیں اور اسی لیے یہ شاعری "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" والی کیفیت رکھتی ہے۔

حرف وصدا ایک خوب صورت مجموعہ ہے، اس کے سرورق اور کتابت وطباعت اوسط ہیں۔

کتاب: یادِ وطن مصنف: ڈاکٹر عبدالمجید شمس عظیم آبادی
ناشر: سائنٹیفک پبلشر، مجید ویلا، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶
ضخامت: ۱۲۶ صفحات قیمت دس روپیے

نہ جانے کتنے ہی لوگوں کا تجربہ مجھ جیسا ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتا، راقم الحروف نے بھی یوپی کے ایک موضع میں وہ ادبی، کلچرل محفلیں اور جمگھٹے دیکھے ہیں جو ہمارے فرشتہ صفت بزرگوں کی تربیت دی ہوئی تھیں، وہ الہ رودل کی گائیکی، وہ سرشام داستان گوئی، وہ بیت بازی کی محفلیں، درون خانہ بھی، بیرون خانہ بھی، وہ کشتیوں کے دنگل، وہ محرم کے جلسے، وہ محفلیں بلا اختلاف مذہب، تعزیوں کا بننا پھر ان کا دفن ہونا، نوحہ گوئی کی محفلیں۔ اگر غور سے یاد کیا جائے تو ہماری معاشرت میں بول چال کے الفاظ کتنے ہی عربی فارسی کے تھے اور عربی فارسی کے اشعار زبان زد تھے۔ میں تو چھوٹا تھا اور اس قسم کی محفلوں کو بہت کم ہی دیکھ سکا ہوں بزرگ محترم شمس صاحب کے مقابل۔ جب میں عبدالحلیم شرر کی کتاب "گذشتہ لکھنؤ" پڑھ رہا تھا، تو بیکایک یہ بات دماغ میں آئی کہ ہماری ان محفلوں پر کیوں نہ لکھا گیا۔ ہوا یہ کہ زمانہ کے بیت جانے پر ادب اور اس کی اصناف سب ہی بدل گئے ہیں اور اس قسم کے تذکرے دشوار ہو گئے ہیں۔

عبدالمجید شمس ایک جری، قابل اور ماہر ادب ہیں، انھوں نے یادِ وطن کے تحت بہت خوب صورتی سے وطن کی بھولی بسری تصاویر کو منقش کر دیا ہے۔ اگر اس کتاب کو ماضی قریب کا اجنتا کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ تو شمس اس کتاب کو بھی مثنوی کہتے ہیں لیکن اس کتاب میں کرداروں کا تعارف ہے، گاؤں کی ان محفلوں کا تذکرہ ہے، زبان وبیان پر قدرت ہونے کے سبب اس قسم کی بیانیہ شاعری میں بھی ایک عجیب سا شاعرانہ حسن آگیا ہے۔ شخصیات کا تذکرہ نیک نیتی اور خلوص پر مرکوز ہے شاعر نے کسی قسم کی جزیاتی لغزش کو راہ ہی نہ دیا۔ یوں بھی بھولی بسری

یادوں میں زخم اتنے گہرے نہیں لگتے جتنا پُرلطف یادوں کا درد ہوتا ہے۔ ہندوستان ان ہی خوب صورت متوازی گاؤں اور قریوں میں زندہ تھا اور ہے، ہاں اب حرص و ہوس نے ماحول میں وہ قلندرانہ حسن باقی نہیں رکھا۔ بہرحال ان معاشرتی، اقتصادی اور یک جہتی کی اکائیوں (جنھیں ہم گاؤں کہتے ہیں) سے مل جل کر ملک کا ایک مزاج تھا، افسوس آزادی کے بعد تقسیم اور بد سیاستی نے ان اکائیوں کو بھی ریزہ ریزہ کر دیا۔

ڈاکٹر شمس نے خوب کہا کہ اپنے تجربہ سے اپنے ہی گاؤں کی تصویر اس طرح کھینچی گئی کہ اور گاؤں اور قریوں کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ بھی ایک کارنامہ ہے۔ شمس کے اشعار کی ایک مثال لیجئے ؎

نوکری کرنے گر کہیں جاتے — چھٹیوں میں ضرور گھر آتے
جاتے تھے گھر تو ہوتی تھی وہ خوشی — جس کا آساں نہیں بیان کوئی
دور سے گاؤں جب نظر آتا — دل کنول کی طرح سے کھل جاتا
اس خوشی کو کہاں سے لاؤں اب — دل سے کیسے اسے بھلاؤں اب
جن یہاں آگے سنانے تھے — دنیا کو یوں بھلانے تھے

دیکھئے کیسی سلیس زبان ہے، لیکن دردونی کرب بھی کس طرح شریک بیان ہے۔ کتاب کی طباعت گٹ اَپ معیاری ہیں۔

(اسلم عمادی)

(کتب خانہ جامع مسجد صفحہ ۲۵ سے آگے)

اور اسکی قدر و قیمت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔ ہندوستان اور بیرون ہند سے تشنگانِ علم و ادب اس کتب خانے سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کرتے رہے ہیں اور انشاءاللہ کرتے رہیں گے۔

آخر میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج اس کتب خانہ کی حیثیت وہ نہیں رہی جو تین چوتھائی صدی پہلے اس کے قیام کے وقت تھی۔ اول ۱۹۱۳ء میں بارش کی زیادتی کی وجہ سے سڑکوں کا پانی مسجد کے اندر تک چلا آیا کیوں کہ مسجد نشیبی علاقہ میں واقع ہے۔ اس کی وجہ سے کئی نایاب کتب اور نادر مخطوطات بہہ گئیں اور دوم مشاورین صاحبان کی لاعلمی بلکہ لاپرواہی کی وجہ سے کتب خانے کا بیشتر سرمایہ دیمک کی نذر ہوگیا۔ تاہم یہ تہی دامن نہیں ہے۔ اب بھی اس کی خاطر خواہ پرداخت اور نگہداشت کی گئی تو یہ قیمتی علمی سرمایہ اور ادبی ذخیرہ تشنگانِ علم اور طالبانِ ادب کو برابر سیراب کرتا رہے گا۔

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یکم نومبر: مسٹر ٹی انجیا چیف منسٹر آندھرا پردیش نے ایک تلگو کتاب کی رسم رونمائی کے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی سرکار نے تلگو، اردو کے قلمکاروں، مصنفوں اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اردو مشاعروں کا ریاست کے مختلف حصوں اور شہر حیدرآباد کے متعدد مقامات پر انعقاد بھی حکومت کے پیش نظر ہے تاکہ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ قومی ایکتا کو بھی تقویت حاصل ہو۔

۴ر نومبر: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش اور ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر انتظام تاسیس آندھرا پردیش سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر ایک مقصدی مشاعرہ چیف منسٹر ٹی انجیا کی صدارت میں بہ مقام جوبلی ہال منعقد کیا گیا۔ مرکزی وزیر داخلہ سردار گیانی ذیل سنگھ نے اردو زبان کے قومی اور جدوجہد آزادی کے زمانے کے کردار پر معلوماتی تقریر کی اور اردو کے مشاعروں اور شاعروں کو ملک کے ہندوستان میں قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں موثر ذریعہ قرار دیتے ہوئے اردو میں اشعار بھی سنائے۔ چیف منسٹر اور ریاستی وزیر داخلہ مسٹر کے پربھاکر ریڈی کے علاوہ مسٹر پریم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی نے بھی اردو زبان کے تعلق سے ریاستی حکومت کے واضح رجحان کا اعلان کیا۔ جناب چندر سری واستو، ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے اکیڈمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ جناب ملک محمد علی خاں ایڈیٹر ماہنامہ آندھرا پردیش نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس مشاعرہ میں شعراء کو شال اور کیسہ زر پیش کیا گیا۔ جن میں شاذ تمکنت، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، خواجہ شوق، خیرات ندیم، بانو طاہرہ سعید، منوہر لال بہار، اختر حسن، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، ناصر کرنولی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، تاج مہجور، علی الدین نوید، نظیر علی عدیل، عزیز النساء صبا، حسن فرخ، رؤف خلش، علی اقبر، داؤد نصیب، ڈاکٹر غیاث صدیقی، راز عابدی، نیپال سنگھ ورما، طالب خوندمیری، مصطفےٰ علی بیگ کے علاوہ حفیظ خاں مذاق اور ہرنام سنگھ صحرائی شامل تھے۔

۵ر نومبر: نیو ہوٹل نیاگرا کے تہذیبی اور ادبی ونگ کی طرف سے قیام ہوٹل کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ایک شاندار محفل مشاعرہ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر اترپردیش کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ مہمان شعراء جناب خمار بارہ بنکوی اور محترمہ صدیقہ شبنم (لندن) کے علاوہ میزبان شعراء کنول پرشاد کنول، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، شاذ تمکنت، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر مغنی تبسم، راشد آذر، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، بانو طاہرہ سعید، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، خواجہ شوق، وقار خلیل، رحمٰن جامی، علی الدین نوید، امان ارشد، ثریا مہر، بانو طاہرہ سعید، عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ مرزا اقبال احمد بیگ اور بشیر احمد صدیقی ڈائرکٹر نے خیر مقدم کیا اور جناب ولی تنویر نے شکریہ ادا کیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے معتمد مشاعرہ کی ذمہ داری سنبھالی۔

۶ر نومبر: تاسیس آندھرا پردیش کی سلور جوبلی کے سلسلے میں ریاستی اردو پیریاڈیکلس اسوسی ایشن کی طرف سے ایک شعری نشست جناب سید رحمت علی ایم پی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ قدیم و جدید شعراء بشمول سعید شہیدی، اوج یعقوبی

امیر احمد خسرو، بشیر وارثی اور وقار خلیل نے کلام سنایا۔ جناب انور ہاشمی نے خیر مقدم کیا اور مشاعرہ کی کاروائی کو آگے بڑھایا۔

۷ر نومبر: صاحب طرز انشاء پرداز، ادیبہ اور مصنفہ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کو ریاستی حکومت کی طرف سے "بہتر استاد" کا اعزاز ملنے پر ایک تہنیتی تقریب جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر پروفیسر جی رام ریڈی کی صدارت میں بمقام "اردو ہال" آراستہ ہوئی۔ ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈمی جناب بم باگا ریڈی نے بحیثیت مہمان خصوصی جلسہ کو خطاب کیا اور ڈاکٹر ساجدہ کی علمیت اور دانش ورانہ ترقی پسند شعور کی ستائش کی۔ دیگر مقررین میں پروفیسر حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر پراتمک، پروفیسر ام ین ریڈی (نظام کالج)، سید رحمت علی رکن راجیہ سبھا، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، طیب انصاری (گلبرگہ کالج)، نذیر الدین احمد سابق رکن مجلس بلدیہ، رفیع روف اور شعراء بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر اور بشیر جعفری قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رشید موسوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر ساجدہ کی ان کے شاگردوں کی طرف سے بہ کثرت گل پوشی کی گئی۔

۸ر نومبر: منوہر لال شارب آنجہانی کی یاد میں احباب اور شعراء کی طرف سے مشاعرہ "یاد شارب" کا جناب کنول پرشاد کنول کی صدارت میں اہتمام کیا گیا۔ جناب منوہر لال بہار نے شارب کی شخصیت اور شاعری پر مقالہ سنایا۔ محفل شعر میں کنول، بہار، علی احمد جلیلی، سعید شہیدی، خیرات ندیم، تاج مہجور، اوم پرکاش نرمل، نیپال سنگھ ورما، روشن خیال، اسمعیل ظریف، فضل الرحمٰن فضل، راجہ لال راجہ اور جگجیون استھانہ سحر نے کلام سنایا۔

•• محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس اور ڈاکٹر زینت ساجدہ کو ایوارڈ ملنے کی مسرت میں تہنیتی جلسہ مسز روڈا مستری رکن راجیہ سبھا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں محترمہ بانو طاہرہ سعید کو ان کی شعری خدمات کے اعتراف، اعزازی ڈاکٹریٹ ملنے پر مبارکباد دی گئی اور ہر دو خواتین کی گل پوشی کی گئی۔ ایک مذاکرہ "ساس اور بہو کا رویہ نئے حالات کی روشنی میں" کے موضوع پر منعقد ہوا جس میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ، لکشمی دیوی راج، عائشہ ارشاد، وزیر النساء اشتیاق اور زبیدہ ضیاء الدین نے حصہ لیا۔ محترمہ عظمت قیوم صدر محفل خواتین نے خیر مقدمی تقریر کی اور محترمہ سیدہ طیبہ نے معتمدی کے فرائض انجام دیے۔

۹ر نومبر: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی یونٹ کی طرف سے سعادت علی خاں رضوی مرحوم کی تالیف "عادل شاہی سلطنت کے مراثی اور سلام" کی رسم رونمائی انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر میر اکبر علی خاں نے انجام دی۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے مولف اور کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سلسلۂ رحمت یوسفیہ کے بانی سالار جنگ کی علمی خدمات اور دکنی مخطوطات کی اشاعت میں ان کے انہماک اور سرپرستی کے جذبات پر روشنی ڈالی۔

۱۸ر نومبر: نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری میں حلقہ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب حامد علی عباسی (آئی اے ایس) کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ ممتاز نقاد اور دانشور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (پروفیسر دلی یونیورسٹی) نے امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک دلنواز خاکہ سنایا۔ جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر و معتمد نظامس ٹرسٹ نے خیر مقدمی تقریر کی، جناب محمد منظور احمد معتمد حلقہ ارباب ذوق نے شکریہ ادا کیا۔

۲۰ر نومبر: اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) کے زیر انتظام ہفتہ کتب خانہ کے سلسلے میں منعقدہ

ایک اجلاس کو ریاستی وزیر سیول سپلائز مسٹر جی وینکٹ سوامی نے مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ کتابوں کی دولت سکوں کی دولت سے زیادہ انمول اور قائم رہنے والی ہوتی ہے۔ حیدرآباد لائبریری سوسائٹی کے صدر مسٹر بھوج ریڈی نے صدارت کی۔ جناب عبدالقادر لائبریرین نے کتب خانہ آصفیہ کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالی اور اس کتب خانہ کے گراں قدر علمی و ادبی ذخیرہ کو ملک کا اہم اثاثہ قرار دیا۔ اور مہمانوں کو ان کی آمد پر خوش آمدید کہا۔

۲۲ نومبر: انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کے معتمد جناب غلام صادق الدین نے چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر ٹی انجیا سے ملاقات کے بعد ایک میمورنڈم کے ذریعہ سرکاری اور امدادی مدرسوں میں اردو تعلیم، نصابی کتابوں اور اردو کے استادوں کے تقرر اور فرائض کی نگرانی کے سلسلے میں توجہ دہانی کی۔ چیف منسٹر نے ان مسائل سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پیش رفت کا یقین دلایا۔

۲۶ نومبر: بزرگ اردو رہنما پروفیسر حبیب الرحمن معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے ریاستی وزیر پنچایت راج جناب بم باگا ریڈی کی اردو دوستی اور اردو کے ساتھ ان کی روایتی مخلصانہ خدمات کو مستحسن قرار دیتے ہوئے ایک مکتوب میں پنچایتی سطح سے سکریٹریٹ تک تلگو کے استعمال کی مجریہ ہدایات کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظم و نسق کے اس شعبے میں اردو کے مناسب استعمال کے تعلق سے حکومت کی طرف سے وضاحت کرنے کا مطالبہ کیا۔

۲۸ نومبر: جناب بم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ پروفیسر حبیب الرحمن کے اخباری مکتوب کے جواب میں کہا کہ محکمۂ پنچایت راج میں تلگو کے چلن کے ساتھ اردو کے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنی مساعی کی تفصیلی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ محض وزارتی عہدہ پر فائز رہنا ہی اردو سے میری وابستگی نہیں بلکہ میری اپنی پوری سیاسی، سماجی اور تعلیمی زندگی اور علمی و ادبی شب و روز میں اردو ہی کا راج اور غلبہ رہا ہے۔ خدمت اردو کا میرا جذبہ قدرتی اور فطری ہے۔

۲۸ نومبر: حلقۂ ارباب ذوق (انتظامیہ اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے ڈاکٹر سید محمد عقیل کی دو تصانیف "تنقید اور عصری آگہی۔ سماجی تنقید" پر فاضلانہ تبصرہ مقالہ کی شکل میں سنایا۔ جناب محمد منظور احمد (معتمد حلقہ) نے شکریہ ادا کیا۔

مردم شماری میں اردو کو مادری زبان لکھوانا نہ بھولیے۔

CEMBER 1980

R N. 10922/5
Regd. H/HD. 13

The "SABRAS" Urdu Monthly

rgan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P.)



National Fine Printing Press, Charkaman Hyderabad—500 002. A. P.